گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
جولائی 2015
نگران اعلیٰ
معراج رسول

عید مبارک

قیصرہ حیات کا نیا سلسلے وار ناول

نگہت سیما، شیریں حیدر و نبیلہ ابر راجا کی خوب صورت تحریریں

اختر شجاعت کا پُر فکر مضمون "خشیتِ الٰہی"



ماڈل: عروبہ
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر: موسیٰ رضا

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

نگرانِ اعلیٰ: معراج رسول
مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار
معاون: آمنہ حماد



رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
رانا اے حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے
قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات
زرِ سالانہ (اندرون ملک) 800 روپے ..... جلد: 43، شمارہ: 04 جولائی 2015ء

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

منی ناول

افسانے

خصوصی مضامین

مستقل عنوانات

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی



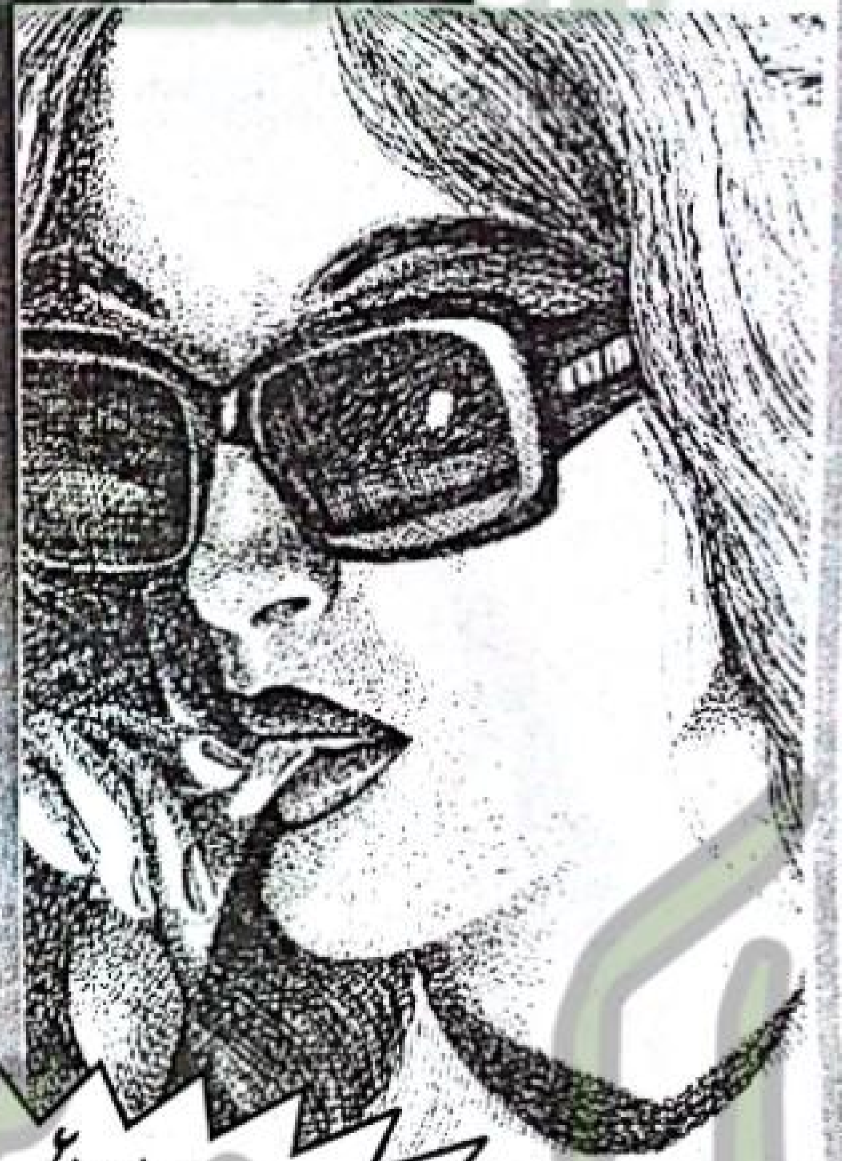
Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

معروف اور مقبول قلم کار

طاہر جاوید مغل

کی نئی سلسلے وار کہانی

انگارے



جولائی ۲۰۱۵ء سے

جاسوسی ڈائجسٹ

میں پیش کی جا رہی ہے

زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں

اپنے دامن میں سمیٹے

ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحیر انگیز کہانی

جسے قارئین ایک ہی نشست میں پڑھنے پر

خود کو مجبور پائیں گے



عقل مند کہتے ہیں کہ انسان کو دو چیزوں پر کبھی پریشان نہیں ہونا چاہیے، ایک وہ جس پر اس کا اختیار ہے اور دوسری وہ جس پر اختیار نہیں ہے۔ یہ بات ہمیں بخوبی جان لینی چاہیے کہ انسان کا رویہ، طرزِ عمل یا عادت وہ خود تو تبدیل کرسکتا ہے مگر کوئی اور فرد اس کو تبدیلی پر مائل نہیں کرسکتا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد آپ وہ طرز زندگی اختیار کرسکتے ہیں جو آپ کی زندگی کو سچی مسرتوں سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ جو سمجھ بوجھ کے ساتھ زندگی کا شعور بھی رکھتے ہیں وہ زندگی کو بہترین انداز میں برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں اور لوگوں کے رویے بھی بہ آسانی پرکھ لیا کرتے ہیں......(جبکہ دوسروں کو جاننا مزید مشکل کام ہے) مگر یہ ایک بہت خوب صورت سچ ہے کہ ہم جب اپنی زندگی کا مقصد جان لیں گے تو زندگی کا ہر لمحہ اور ہر دن پُر مسرت اور عید کا سا ہوگا۔

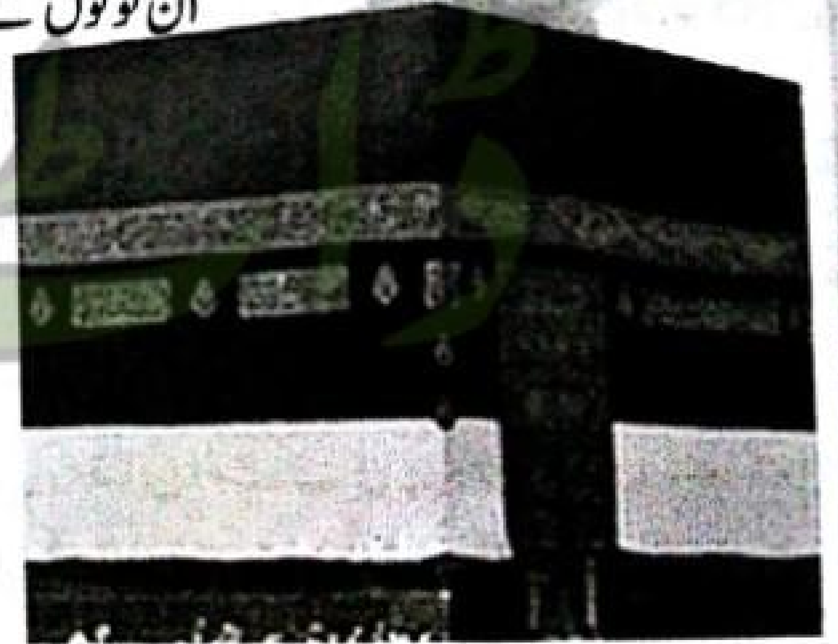
اور یہی ہمیں آپ سے کہنا ہے...... بری باتوں، بری یادوں اور مشکل وقت کو بھول کر بکھرے ہوئے مواقع سے پورا، پورا فائدہ اٹھائیں اور بکھری ہوئی مسرتوں سے اپنا دامن بھر لیں......خوشی چاہے کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو......اسے کبھی کم تر نہ سمجھیں اور نیکی چاہے کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اسے کر ڈالیے...... کہ چھوٹی، چھوٹی نیکیاں آپ کو بڑی، بڑی خوشیاں عطا کریں گی (انشاء اللہ)

اور مجھے یقین ہے کہ آپ سب رمضان المبارک کی پُر نور ساعتوں سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ، ساتھ جہاں اپنی عید کی تیاریوں میں مشغول ہوں گے وہاں اپنے آس پاس کے غریب غربا اور یتیموں کی عید کی بھی تھوڑی بہت تیاری تو ضرور کروا رہے ہوں گے۔ ہے ناں......! (جزاک اللہ)

مدیرہ
انجم انصار

دین کی باتیں

(دیکھو) اللہ نے کعبے کو جو بزرگی کا گھر ہے اور ماہِ حرام کو اور قربانی کو اور رسی والے جانوروں کو لوگوں کے امن کا سبب بنایا ہے تا کہ تم جان لو کہ اللہ جانتا ہے اس چیز کو جو آسمانوں میں ہے اور اس چیز کو (بھی جانتا ہے) جو زمین میں ہے اور یہ کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے(۹۷) (یہ بھی) جانے رہو کہ اللہ سخت عذاب والا ہے اور یہ کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے (۹۸) (ہمارے) پیغمبر پر سوا (پیغام) پہنچا دینے کے اور کچھ (فرض) نہیں ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو(۹۹) (اے نبی ﷺ ان سے) کہہ دو کہ ناپاک اور پاک (عنداللہ) برابر نہیں ہیں اگرچہ تمہیں ناپاک کا زیادہ ہونا تعجب میں ڈالے پس اے عقل مندو اللہ سے ڈرو تا کہ تم بامراد رہو(۱۰۰) اے ایمان والو ایسی باتوں کا سوال (نبی ﷺ سے) نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں اور اگر قرآن کے اترنے کے زمانے (یعنی نبی کی زندگی) میں تم ان کو پوچھو گے تو (ضرور) تم پر ظاہر کر دی جائیں گی (جو سوالات تم پہلے کر چکے) اللہ نے ان سے درگزر فرمائی اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔(۱۰۱) بے شک یہ (سوالات) ان لوگوں نے جو تم سے پہلے تھے (اپنے انبیا سے) پوچھے تھے پھر (جب ان کا تحمل ان سے نہ ہو سکا تو) وہ ان کے منکر ہو گئے (۱۰۲) (سنو) اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے اور نہ سائبہ اور نہ وسیلہ اور نہ حامی ولیکن کافر اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں اور ان میں کے اکثر لوگ (اس افترا کو) نہیں سمجھتے۔(۱۰۳) (سورۂ مائدہ آیت نمبر ۹۷ تا ۱۰۳)





سیدنا محمود ﷺ

۳: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ سے میرے لیے وسیلے کا سوال کیا کرو۔ فرمایا وسیلہ جنت کا اعلیٰ درجہ ہے، صرف ایک آدمی ہی اس کو حاصل کر سکے گا اور مجھے امید ہے کہ وہ میں ہی ہوں گا۔ (ترمذی)

۴: آپ ﷺ نے حوضِ کوثر کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایک نہرِ جنت ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے جس میں خیر کثیر ہے۔

(مسلم، احمد)

۵: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کا حصہ جنت کی ایک کیاری ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے۔''

(متفق علیہ)

۶: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''ایک مرتبہ میں جنت سے گزرا ناگہاں میرا گزر ایک نہر پر سے ہوا جس کے کنارے اندر سے خالی موتیوں کے بنے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا، اے جبرائیل یہ کیا ہے انہوں نے کہا۔ یہ حوضِ کوثر ہے جو آپ ﷺ کے رب نے آپ ﷺ کو عطا کیا ہے اور اس کی مٹی مشک سے تیز خوشبو دار ہے۔

(بخاری) قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس

قسط 11

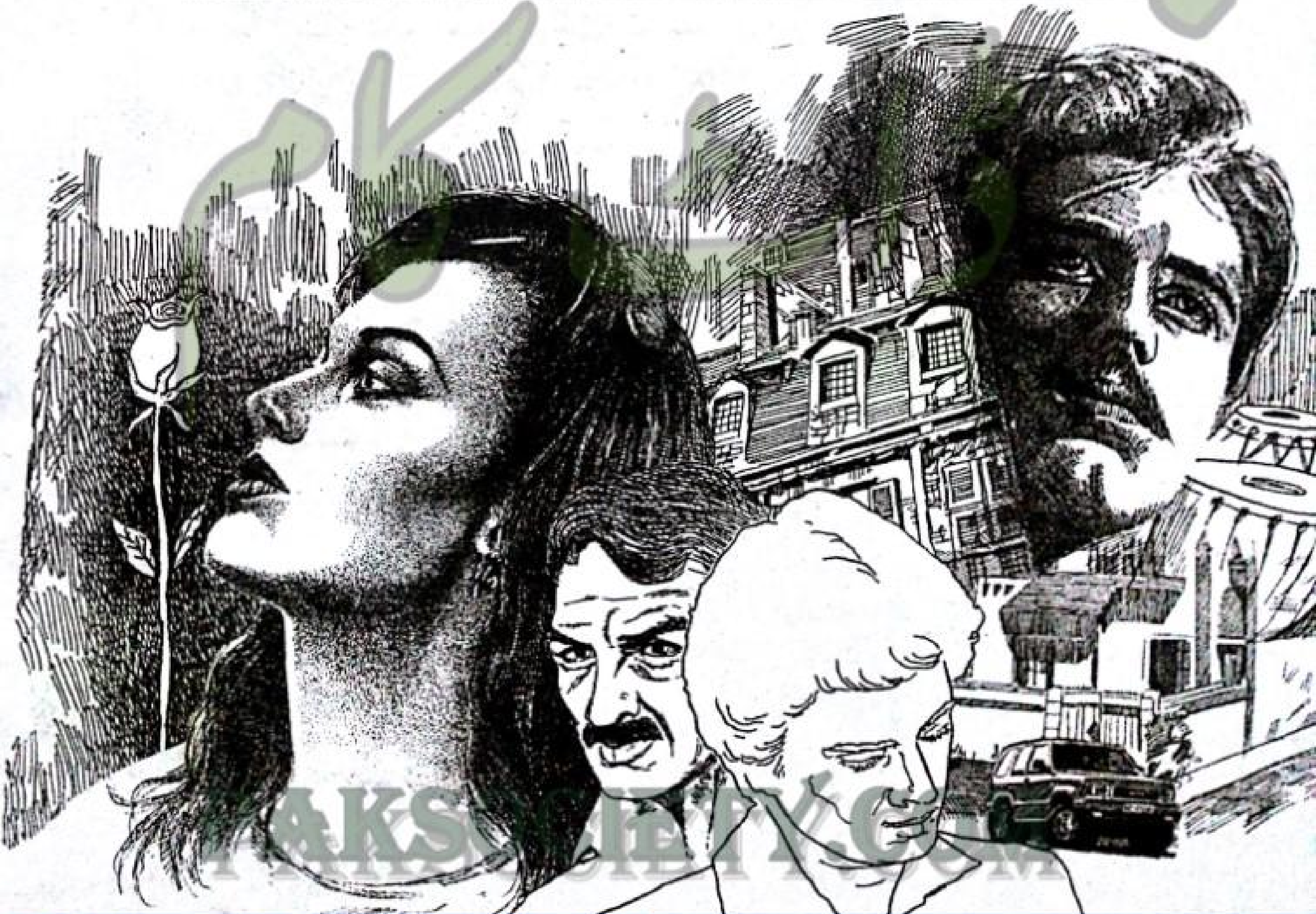
اعتبارِ وفا

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا . . . گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے . . . کہ دل ودماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔ ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے . . . لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کرلیا جائے . . . اور مان لیا جائے . . . کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے . . . اور وفا کے غُنچے وہیں کھلتے ہیں . . . جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں





دوڑتے، دوڑتے اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا...... وہ غلیظ آنکھوں والا چوکیدار اس کے پیچھے آرہا تھا۔ گو وہ بھاری بھرکم تھا اور اس کی عمر بھی کچھ زیادہ تھی اور اس کے مقابلے میں ارتفاع ینگ تھی. وہ اپنے کالج اور اسکول کے زمانے میں بہترین ایتھلیٹ رہی تھی اور ریس کے کئی مقابلے جیت رکھے تھے پھر بھی اسے لگا جیسے کچھ ہی دیر کی بات ہے وہ چوکیدار اس کے قریب پہنچ جائے گا۔ ظفری اس کے پیچھے نہیں بھاگا تھا شاید اسے یقین تھا کہ چوکیدار اسے بھاگنے نہیں دے گا۔

''یااللہ میری مدد فرما۔''

سڑک پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑی تو یک دم سیدھا دوڑتے، دوڑتے اس نے اپنا رخ سڑک کی طرف کرلیا اور اندھا دھند سڑک کی طرف دوڑنے لگی۔

''اچھا ہے گاڑی کے نیچے آکر مر جاؤں۔ یااللہ تو ہی عزت بچانے والا ہے۔ میری عزت بچالے۔'' دل ہی دل میں دعا مانگتے ہوئے اس نے سڑک پر قدم رکھا۔ بہ مشکل دو منٹ لگے ہوں گے اسے سڑک تک پہنچنے میں اور گاڑی اس کے بالکل قریب آکر اچھلی اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں...... لیکن ڈرائیور نے بڑی مہارت سے گاڑی کے بریک لگائے تھے۔ اس نے بے بسی سے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے رواحہ نے جھلا کر سڑک کے وسط میں اپنی گاڑی کے عین سامنے کھڑی لڑکی کی طرف دیکھا اگر جو اس نے عظام کا فون اٹینڈ کرنے کے لیے گاڑی کی رفتار کم نہ کی ہوئی ہوتی تو آج اس لڑکی کا خون اس کی گردن پر ہوتا۔ ''کیا یہ لڑکی مرنے کے لیے یوں سڑک پر......؟'' اس نے پھر اس کی طرف دیکھا جو ابھی تک خوفزدہ سی گاڑی کے سامنے کھڑی تھی اور چونک پڑا۔

''رتی......'' اس کے لبوں سے نکلا اور بے اختیار وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

''رتی......تم یہاں کیسے؟''

''رواحہ......!'' ایک گہری سانس لیتے ہوئے ارتفاع نے اس کی طرف دیکھا۔

''پلیز رواحہ......'' اس کی وحشت زدہ نظریں رواحہ پر پڑیں تو اسے کسی انہونی کا احساس ہوا۔

''وہ......'' ارتفاع نے رخ موڑ کر دیکھا چوکیدار گرین پٹی پر کھڑا خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''او کے، تم گاڑی میں بیٹھو رتی۔'' اس نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا اور ارتفاع تیزی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

رواحہ چکر کاٹ کر ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھا اور ارتفاع سے کچھ پوچھے بغیر گاڑی اسٹارٹ کی۔ ارتفاع نے شیشے سے باہر دیکھا چوکیدار گرین پٹی سے اتر کر سڑک کی طرف آرہا تھا۔

''رواحہ جلدی......جلدی نکلو یہاں سے وہ اِدھر ہی آرہا ہے۔''

غیر ارادی طور پر ایکسی لیریٹر پر رواحہ کے پاؤں کا دباؤ بڑھ گیا...... کچھ آگے جا کر رفتار کم کرتے ہوئے اس نے ارتفاع کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

''رتی پلیز ریلیکس......ہم کافی دور نکل آئے ہیں۔ وہ شخص بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو بتاؤ کہ وہ شخص کون تھا، تمہارا پیچھا کیوں کر رہا تھا۔ اور تم رات کے اس وقت یہاں اکیلی......؟ تمہاری گاڑی کدھر ہے، کہیں چھن تو نہیں گئی؟'' رواحہ کو ایک دم ہی خیال آیا تھا کہ ممکن ہے کسی نے اس کی گاڑی چھین لی ہو اور یہ جان بچا کر بھاگی ہو......اگرچہ بہت رات تو نہیں ہوئی تھی ابھی دس بھی نہیں بجے تھے لیکن ان دنوں گاڑی چھننے کی تین چار وارداتیں اسی علاقے میں ہوئی تھیں۔ موبائل وغیرہ چھیننا تو اب معمول بن چکا تھا۔ ابھی نومان کے گھر میں بھی یہی ذکر ہو رہا تھا۔ چند دن پہلے نومان کے بڑے بھائی سے گاڑی چھین لی گئی تھی۔ نومان اس کا کلاس فیلو تھا۔ اس کا دو دن پہلے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بازو کا فریکچر ہوا تھا سو وہ دوسرے دوستوں کے ساتھ اس کی مزاج پرسی کے لیے گیا تھا۔ عظام کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے وہ گھر پر ہی تھا اور اب ایک کلاس فیلو کو اس کے گھر ڈراپ کرکے وہ واپس جا رہا تھا اور......

اس نے ذرا سا رخ موڑ کر ارتفاع کی طرف دیکھا۔ جس کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔ اپنی پوری زندگی میں وہ اس طرح بے بسی سے نہیں روئی ہوگی جس طرح اب رو رہی تھی۔

''پلیز رتی اپنے آپ کو سنبھالیں۔ گاڑی اگر چلی بھی گئی ہے تو وہ آپ کی زندگی سے زیادہ قیمتی تو نہ تھی، اللہ کا شکر ادا کریں کہ اللہ نے آپ کی زندگی اور عزت بچالی۔''

''وہ...... نہیں گاڑی نہیں چھینی کسی نے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''تو پھر......؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا لیکن وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

''اگر تم بتانا مناسب نہیں سمجھتیں تو کوئی بات نہیں...... یہ بتاؤ کہاں ڈراپ کروں؟''

''گھر......'' ارتفاع نے آہستگی سے کہا۔

اور ڈرائیو کرتے، کرتے رواحہ نے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر اس کی گود میں ڈالا۔

''پلیز رتی خود کو سنبھالو۔''

ارتفاع نے بھیگی آنکھوں سے رواحہ کی طرف دیکھا جو بے حد سنجیدہ سا ڈرائیو کر رہا تھا۔

''رواحہ یقیناً سوچ رہا ہوگا کہ میں رات کے اس وقت اکیلی کہاں سے آ رہی تھی۔ وہ میرے متعلق کچھ غلط بھی تو سوچ سکتا ہے۔'' اس پر یک دم گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ اس نے گود سے ٹشو اٹھا کر چہرہ اچھی طرح صاف کیا۔

''وہ، رواحہ میں......'' اس نے تھوک نگلا اور پھر سر جھکائے سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

''مجھے ہرگز علم نہیں تھا کہ اس نے صرف مجھے انوائٹ کیا ہے، آج صبح یونی میں اس نے مجھے انوائٹ کیا...... میں نے سوچا میں اس کی برتھ ڈے پارٹی میں بھی نہیں گئی تھی تو وہ بہت ناراض ہوا تھا۔ اور یہ تو یہاں اسی شہر کی بات ہے...... سب ہی تو جا رہے ہیں تو......''

''کم از کم تم عالیہ سے تو پوچھ سکتی تھیں، دوست ہے وہ تمہاری۔'' رواحہ کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

''عالیہ کو میں نے کئی بار فون کیا لیکن اس کا فون بند تھا۔''

''دولت کے نشے میں کچھ لوگ خود کو نہ جانے کیا سمجھنے لگتے ہیں۔ میں ظفری کو اتنا گھٹیا نہیں سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ آپ کو پسند کرتا ہے بلکہ محبت کرتا ہے اور شاید...... آپ بھی......'' وہ کبھی تم اور کبھی آپ سے اس سے مخاطب تھا۔

رواحہ کی آنکھوں میں ہلکا سا خفگی کا تاثر ابھرا تھا۔

''نہیں......'' وہ یک دم بلش ہوئی۔

''میں تو اسے صرف اپنا دوست سمجھتی تھی۔ مجھے اس کے دل کی خبر نہیں تھی کہ وہ کیا سوچ بیٹھا ہے اور چاند رات والا واقعہ تو میرے تصور میں بھی نہیں تھا۔ یاد ہی نہیں تھا کہ کبھی میں......''

''تم صبح ظفری کی شکایت کر دینا۔'' اس نے ونڈ اسکرین پر نگاہیں جمائے، جمائے کہا۔

''لیکن اس واقعے کا یونی سے تو کوئی تعلق نہیں رواحہ! میں اپنے گھر سے اپنے پیرنٹس کی اجازت سے اس کے گھر گئی تھی اور پھر اس میں میری ہی بے عزتی ہے۔ پلیز رواحہ تم بھی کسی سے ذکر مت کرنا...... آئی ریکوئسٹ یو......'' اس کی آنکھیں پھر نم ہوئی تھیں۔

''او کے...... ڈونٹ وری......'' رواحہ کا لہجہ نرم تھا تسلی دیتا ہوا سا۔

''ماما تو اجازت نہیں دے رہی تھیں لیکن پاپا نے دے دی...... دراصل پاپا نے میری بات کبھی ٹالی نہیں؟'' اس نے خود ہی وضاحت کی تو رواحہ نے آہستگی سے کہا۔

''بعض اوقات والدین کو پتا نہیں چلتا کہ بے جالاڈ پیار سے اپنی اولاد کے لیے وہ خود ہی گڑھا کھود رہے ہیں...... آپ کے پاپا کو اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔''

اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے تھے۔

رواحہ کا دل جیسے پگھلا اس کا جی چاہا اپنی انگلی کی پوروں سے اس کے آنسو چن لے......اپنی اس چور سوچ سے گھبرا کر اس نے نگاہوں کا زاویہ بدلا اور ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ سوں، سوں کر کے روتی جاتی اور ٹشو سے ساتھ، ساتھ اپنے آنسو پونچھتی جاتی۔

''پلیز رتی اب رونا بند کریں، مجھے آپ کے رونے سے تکلیف ہو رہی ہے۔ اللہ کا شکر ادا کریں اس نے آپ کو بچا لیا۔ آئندہ احتیاط کیجیے گا۔''

''جی اللہ کا شکر ہے کہ آپ وہاں آگئے اور......اور میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ مر جاؤں گی لیکن......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر رونے لگی تھی۔

''رتی پلیز......ریلیکس ہو جائیں اور چہرہ اچھی طرح صاف کر لیں......گھر والوں سے کیا کہیں گی......آپ کو بچانا مقصود تھا سو اللہ نے مجھے وسیلہ بنا دیا۔'' اس نے سر ہلایا اور دوپٹے کے پلو سے اچھی طرح چہرہ صاف کیا۔

''دراصل غلطی میری تھی اگر عالیہ کا فون بند تھا تو مجھے اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا......لیکن میں......'' اس نے پھر چہرے کو صاف کیا اور رواحہ سے پوچھا۔

''اب ٹھیک ہے ناں......پتا تو نہیں چل رہا کہ میں روئی ہوں۔'' وہ معصومیت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی رواحہ نے ذرا رخ موڑ کر اسے دیکھا اور اس کے دل پر ایک ضرب سی پڑی۔ بہ مشکل اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

وہ کیسے اپنے آپ کو رتی سے محبت کرنے سے روک پائے گا۔ کتنے دنوں سے وہ خود کو سمجھا رہا تھا لیکن دل تھا کہ اختیار میں نہیں تھا......اور اگر......میں اللہ سے ارتقاع کو مانگوں تو اللہ ضرور اس کے دل میں میری محبت پیدا کر دے گا لیکن ہم انسان دنیاوی سہارے ڈھونڈتے پھرتے ہیں حالانکہ اللہ اپنے بندوں کے بہت قریب ہے اور ان کی پکار سنتا ہے۔

رواحہ سوچ رہا تھا اور ارتقاع چور نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی عالیہ نے ایک بار کہا تھا کہ رواحہ اسے پسند کرتا ہے لیکن اس نے عالیہ کی بات پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا اور اس کی کہی بات دوسرے ہی دن بھلا دی تھی لیکن اس وقت اسے عالیہ کی بات یاد آ رہی تھی......اور اس کا دل یک دم تیزی سے دھڑکنے لگا وہ اپنے دل کی تیز دھڑکن سے پریشان ہو کر باہر دیکھنے لگی۔

رواحہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ دونوں اپنی، اپنی جگہ گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اتقاع اپنے دل کی کیفیات پر حیران تھی اور رواحہ اپنی سوچوں میں گم تھا یوں کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا اور ارتقاع کا گھر آگیا۔ اس نے بریک لگائی تو ارتقاع بھی چونکی۔

''ارے گھر آگیا......!'' رواحہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''تھینک یو رواحہ......اگر آپ نہ......''

''اوں......ہوں......'' رواحہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے رتی......انسان تو بس وسیلہ بنتے ہیں۔'' اس کی پلکیں بھیگنے لگیں تو رواحہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''رونا نہیں اب پلیز......''

اور اس نے پلکیں جھپک، جھپک کر آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا...... اور گاڑی سے اترتے ہوئے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ رواحہ اس وقت تک ٹھہرا رہا جب تک وہ اندر نہیں چلی گئی...... اور پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

سجل کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کی گود میں کوئی کتاب کھلی پڑی تھی۔ لیکن وہ کتاب نہیں پڑھ رہی تھی۔ پتا نہیں اس کا دھیان کہاں تھا اور وہ کیا سوچ رہی تھی۔ سنہری بہت دیر سے اس کے بیڈ پر اوندھی لیٹی کہنیاں تکیے پر ٹکائے اور ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھے اسے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی موتیا سے چھوٹی سی جھڑپ کے بعد وہ سجل کے کمرے میں آ گئی تھی جب بھی اس کی موتیا سے کوئی بات ہوتی وہ ناراض ہو کر سجل کے کمرے میں آ جاتی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد سب کچھ بھول کر موتیا کو پکارتی ہوئی واپس اس کے کمرے میں پہنچ جاتی تھی۔ سجل نے جب بہت دیر تک سر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا اور یوں ہی کتاب پر نظریں گاڑے کسی گہری سوچ میں گم بیٹھی رہی تو سنہری ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''سجو......''

سجل نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''رات میں نے ایک خواب دیکھا...... بہت انوکھا اور خوب صورت خواب......'' اس نے آنکھیں میچ کر جیسے اس خواب کو تصور میں لانے کی کوشش کی اور پھر آنکھیں کھول کر سجل کی طرف دیکھا جو سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''پتا ہے......'' اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''میں نے خواب میں ایک گھر دیکھا...... جیسے ڈراموں میں ہوتے ہیں۔ بڑے، بڑے خوب صورت گھر...... میں ایسے ہی ایک گھر کے لان میں بیٹھی ہوں۔ لش لش کرتی سبز گھاس اور چاروں طرف خوب صورت پھول اور میں لان کے بیچوں بیچ ایک کرسی پر بیٹھی ہوں اور میری کرسی کے قریب ایک کیری کاٹ پڑا ہے اور کیری کاٹ میں ایک بہت پیاری سی بچی ہے۔ بالکل تمہارے بچپن کی کاپی...... میں بچی کو دیکھ رہی ہوں کہ ایک تین چار سال کا بچہ ماما...... ماما کہتا... دوڑتا ہوا میری طرف آتا ہے اور میں اسے باہوں میں بھر کر چوم رہی ہوں۔ اور پھر اسی وقت میری آنکھ کھل گئی...... اس خواب کی کیا تعبیر ہو گی سجو......'' اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ ''بتاؤ ناں...... کیا تعبیر ہو گی۔''

''خواب دیکھنے سے صحراؤں میں چشمے نہیں پھوٹ پڑتے سنہری اور نہ ہی آک کے پودوں پر گلاب اُگ آتے ہیں۔'' سجل نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا...... سنہری نے پلکیں جھپکائیں جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو...... اور پھر ہولے سے ہنسی۔

''مجھ سے اتنی...... مشکل باتیں مت کیا کرو سجو...... میں نے تو صرف اپنے خواب کی تعبیر پوچھی ہے۔''

''ایسے خوابوں کی کیا تعبیر ہوتی ہے سنہری جو ہمارے دل میں چھپی آرزوؤں کا پرتو ہوتے ہیں اور ہماری آرزوئیں......'' اس کے لبوں پر ایک مجروح سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ہمارے دلوں میں صرف حسرتیں بننے کے لیے جنم لیتی ہیں۔'' سجل کے لہجے میں عجیب سی شکستگی اور درد تھا۔

''تمہارا دل بھی شاید ایسے ہی گھر اور بچوں کی تمنا کرتا ہے اور تم اپنے خوابوں میں اسے دیکھ لیتی ہو۔''

''دفع......'' سنہری نے اپنا دایاں ہاتھ بالکل شاہجہان کے انداز میں جھٹکا۔

''کون بچوں کی ریں...... ریں...... چیں، چیں میں زندگی خراب کرے...... میرا دل نہیں کرتا ایسی آرزوئیں۔ اپنی نیند سوتی ہوں...... اپنی نیند جاگتی ہوں۔ سنہری نہیں پالتی بچوں کا کھڑاگ......''

وہ بیڈ سے نیچے اتری۔

''سنہری کیا سچ مچ تیرا دل نہیں چاہتا ایک ایسے گھر کا بھلے وہ اتنا خوب صورت نہ ہو لیکن ایک مکمل گھر ہو...... میاں، بیوی، بچے، تم خود ہی تو کہتی تھیں کہ......''

''لو...... وہ تو میں ایسے ہی بک، بک کرتی رہتی ہوں۔'' سنہری نے اس کی بات کاٹی اور جھک کر بیڈ کے نیچے سے اپنی چپل نکالی اور پہن کر سیدھی ہوئی تو نظریں سجل سے ملیں جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً نظریں جھکا لی تھیں لیکن اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا کرب، بے بسی، لاچاری اور تکلیف تھی کہ سجل کو لگا جیسے کسی خنجر کی تیز نوک نے اس کا دل چھولیا ہو...... سجل بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''سنہری تم اماں کو بتا کیوں نہیں دیتیں کہ تم کیا چاہتی ہو؟''

''کیا چاہتی ہوں میں؟'' سنہری نے اب کے آنکھیں اٹھا کر سجل کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں لحہ بھر پہلے والے تاثرات نہیں تھے بلکہ اس کی آنکھیں تمسخر اڑاتی سی محسوس ہوئی تھیں۔

''میں کچھ نہیں چاہتی سجو، میں تو بس ایسے ہی وقت پاس کرنے کو باتیں کرتی رہتی ہوں...... ورنہ مجھے تو یہ سب ہی پسند ہے۔ ناچنا، گانا، ہلا، گلا اور......'' وہ مسکرائی اور سجل نے حیرانی سے سوچا۔

''پتا نہیں سنہری کی آنکھیں پل، پل رنگ کیوں بدلتی تھیں؟ اب وہ ہنس رہی تھیں اور ان میں محبت ہی محبت تھی...... اور یہ محبت سجل کے لیے تھی۔

''لیکن مجھے پتا ہے ناں کہ تمہیں یہ سب پسند نہیں ہے...... تمہیں پڑھنا لکھنا اچھا لگتا ہے اور یہ جو میں نے خواب دیکھا تھا ناں تو تمہارے لیے تھا...... وہ کاٹ میں لیٹی ہوئی ننھی سی بچی تم تھیں اور...... میں نے ہمیشہ سوچا کہ تم غلط جگہ غلط گھر میں پیدا ہو گئیں، تمہیں تو بس ایسے ہی کسی گھر میں پیدا ہونا چاہیے تھا ناں...... اور خواب تو یوں ہی الٹ پلٹ کر آتے ہیں ناں......'' وہ ہنسی تو سجل کو لگا جیسے سمندر کی موجیں یلغار کر کے آنکھوں کے کناروں تک آ ئی ہوں...... اس نے انہیں پیچھے دھکیل دیا لیکن وہ اپنی نمی چھوڑ گئی تھیں۔ نم آنکھوں کے ساتھ اس نے سنہری کو گلے لگالیا۔

''تم بہت اچھی ہو سنہری اور میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ پتا ہے لاہور میں وہ جو میری کلاس فیلو تھی ناں آمنہ...... اس نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے مجھے ایسی پیاری سی موہنی سی صورت دی ہے بلکہ مجھ پر تو اللہ کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ تب میں نے سوچا تھا کہ اور کیا ہے اس موہنی صورت کے علاوہ مجھ میں جس کا میں شکر ادا کروں تو مجھے لگا تھا کہ کچھ بھی نہیں...... کیا میں اس بات پر اللہ کا شکر ادا کروں کہ میں شاہی محلے میں پیدا ہوئی اور مجھے میری ماں نے میرے باپ کا نام تک نہیں بتایا لیکن آج میں اعتراف کرتی ہوں میرے پاس شکر کرنے کے لیے اور بھی کچھ ہے...... اللہ نے مجھے تمہارے جیسی اور موتیا جیسی بہنیں دی ہیں۔''

سنہری نے حیرت سے اسے دیکھا یہ سجل تھی جو اپنے سپاٹ چہرے اور بے تاثر آنکھوں کے ساتھ اسے کوئی بے جان مجسمہ لگتی تھی۔ ''اس کے اندر یہ نرمیاں کہاں سے اتر آئیں، کہیں دل میں تو کوئی نہیں بسالیا......'' اس نے بالکل موتیا کے سے انداز میں سوچا اور پھر خود ہی نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں بھلا کون ہو سکتا ہے...... ضرور اماں سے کوئی بات ہوئی ہے۔''

''چل چھوڑ یہ بتا تیرا چہرہ کیوں لٹکا ہوا ہے، کیا اماں نے......؟'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں، اماں نے میری بات نہیں مانی سنہری۔'' وہ بیڈ پر بیٹھ گئی اس کی آنکھوں میں وہی بے بسی، وہی لاچاری دکھائی دینے لگی جو کچھ دیر پہلے اسے سنہری کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔

''اماں نے موتیا سے کہا کہ بہت پڑھ لیا جتنا پڑھانا تھا پڑھا دیا۔''

''تو تم اس لیے اتنی دیر سے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور اس لیے اتنی اداس ہو......؟'' سنہری نے پوچھا۔

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ تو مجھے پہلے ہی پتا تھا بس موتیا سے یونہی کہہ دیا تھا۔''

''تو پھر......؟'' سنہری نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں......بس ویسے ہی۔'' اس کا چہرہ پھر سپاٹ ہو گیا تھا اور آنکھیں بے تاثر لگنے لگی تھیں۔

''یونہی ایک کہانی پڑھ رہی تھی تو اسی کے ایک کردار کے متعلق سوچ رہی تھی۔''

''کیا ہمارے جیسا کردار تھا؟'' سنہری متجسس ہوئی۔

''نہیں بس ایسے ہی ایک مظلوم سا کردار تھا۔''

''اچھا......کیا ہمارے جیسا مظلوم......؟'' سنہری نے پھر کہا۔

''کیا تم سمجھتی ہو ہم مظلوم ہیں......؟ نہیں سنہری......مظلوم تو وہ ہوتا ہے جس پر جبر کیا گیا ہو......لیکن ہم پر تو جبر نہیں ہے ناں......تم، موتیا، کرن سب اپنی خوشی اور مرضی سے سب کرتی ہو ناں......تم نے کہا تھا ناں کہ ہم نے کبھی خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔''

''تم جبر کسے کہتی ہو سجو؟'' سنہری نے اس سے پوچھا اس کی آنکھوں کا تاثر لحہ بھر کے لیے پھر بدلا تھا۔

''ہم سب جبر کی ہی پیداوار ہیں۔ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ہم جیسی لڑکیاں سب مظلوم ہیں؟''

''نہیں......'' سجل نے نفی میں سر ہلایا۔

''سب نہیں......جیسے رادھا کے چوبارے پر آنے والی وہ کم سن لڑکی......یاد ہے ناں......پتا نہیں کہاں سے آئی تھی وہ......اور رادھا......اسے مار کر نیلوں نیل کرتی تھی لیکن وہ پھر بھی رادھا کی بات نہیں مانتی تھی۔ وہ میری نظر میں مظلوم ہے اور اس جیسی سب......''

''اور یہ تمہاری کتابیں لکھنے والے تو ہمیں مظلوم ہی کہتے ہیں۔''

''نہیں کوئی ہمیں مظلوم کہتا ہے اور کوئی ظالم......'' سجل نے جواب دیا۔

''اور پتا نہیں ہم کیا ہیں ظالم یا مظلوم......؟'' سنہری زور سے ہنسی......اور بہت دیر تک ہنستی رہی۔ سجل حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے کرب جھلکتا تھا۔

''سجو......'' ہنستے ہنستے اس نے آنکھوں کے کونوں میں آجانے والی نمی کو انگلی کی پور سے پونچھا اور اس کی آنکھوں سے جھلکتے کرب کو محسوس کیا۔

''ایک بات سچ، سچ بتاؤ گی سجو؟''

''کیا......؟'' سجل نے نگاہیں اٹھائیں۔

''کیا تمہیں کسی نے اسیر کرلیا ہے؟'' سنہری پُرشوق نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''نہیں......'' اسے سنہری کے سوال سے خوف آیا اور اس نے زبردستی لہجے میں شگفتگی کا تاثر بھرا۔ ''بھلا مجھے کس نے اسیر کرنا ہے پگلی......!''

''کیوں، کیا تمہیں کوئی اسیر نہیں کرسکتا......یاد ہے ناں......وہ جو ہوٹل میں تمہیں دیکھ کر ساکت ہو گیا تھا۔ مانو بے جان مجسمہ ہو......کیا وہ تمہیں دوبارہ ملا؟''

''نہیں......'' سجل نے نفی میں سر ہلایا لیکن اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

''کمال ہے......'' سنہری نے آنکھیں مٹکائیں۔ ''وہ اسی گھر میں تو رہتا ہے جس میں تم اماں کے ساتھ گئی تھیں......میں نے کئی بار اسے اس گھر میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ ایک اور لڑکا بھی ہوتا ہے اس کے ساتھ شاید اس کا بھائی ہے، باپ، دو بیٹے اور ایک ملازم بس اتنے ہی افراد ہیں اس گھر میں۔'' سنہری اسے تفصیل بتا رہی تھی جو یقیناً شاہجہان نے

اسے بتائی ہوگی...... اور یہ ہفتہ بھر پہلے کی ہی تو بات تھی جب شاہجہان اسے ساتھ لے کر سڑک پار اس گھر میں گئی تھی حالانکہ اس نے شاہجہان کو منع کیا تھا۔

''ہم کیا کریں گے وہاں جا کر اماں......''

''اب یہاں آ کر رہے ہیں تو اڑوس پڑوس سے ملنا ملانا تو رکھنا چاہیے ناں......'' شاہجہان سادہ سے شلوار قمیص میں ملبوس ہلکے میک اپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار کھڑی تھی اور اسے شاہجہان کی بات پر حیرت ہوئی تھی کہ پہلے تو خود ہی سب سے کہا تھا کہ آس پاس والوں سے زیادہ میل جول نہ رکھنا اور اب یہاں آتے ہی......

''اکیلی ہی چلی جائیں ناں، میرا جانا کیا ضروری ہے؟''

''لو تم نے وہاں جا کر کیا ہل جوتنا ہے...... بس ذرا آسرے کے لیے لے جا رہی ہوں۔''

اور اس کے نہ، نہ کرنے کے باوجود شاہجہان اسے زبردستی ساتھ لے گئی تھی...... اور وہاں ان کی ملاقات ایک بے حد باوقار اور گریس فل آدمی سے ہوئی تھی جو لاؤنج میں تنہا بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ جب وہ ایک ملازم کے ساتھ لاؤنج میں آئی تھیں تو وہ احتراماً کھڑے ہو گئے تھے۔

''آئیں پلیز ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''ارے نہیں بھائی صاحب...... اپنا ہی گھر ہے یہاں ہی ٹھیک ہیں۔'' اس وقت شاہجہان بیگم سادہ سے کپڑوں اور بڑے سے دوپٹے میں خاصی گھریلو سی خاتون لگ رہی تھی۔

''دراصل ہم یہاں کچھ ہی دن ہوئے شفٹ ہوئے ہیں۔ یہ سڑک پار 209 نمبر میں...... سوچا پاس پڑوس سے مل آئیں...... آپ کی بیگم صاحبہ......؟''

''وہ تو نہیں ہیں۔'' ان صاحب کی آنکھوں میں لحہ بھر کے لیے اداسی کا تاثر ابھرا تھا۔

''ویسے آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟''

''ہم لاہور سے آئے ہیں۔''

''ارے آپ لاہور سے آئی ہیں۔'' ان کے لہجے میں ایک انوکھی سی خوشی در آئی تھی۔

''ہم بھی لاہور سے ہی یہاں آئے تھے۔ آپ وہاں لاہور میں کہاں رہتی تھیں اور کیسے آنا ہوا؟''

''گلبرگ میں......'' شاہجہان نے دھڑلے سے جھوٹ بولا تھا اور آدھے سوال کا جواب پی گئی تھی۔ اور سجل کا تعارف کروانے لگی تھیں۔

''یہ میری بیٹی ہے سجل، اس سے بڑی دو اور بیٹیاں ہیں، بیٹا کوئی نہیں......''

''کیا کرتی ہیں آپ...... پڑھتی ہیں؟'' وہ شخص اس سے مخاطب ہوا تھا۔

''میں نے انٹر کے بعد چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''اسے تو پڑھنے کا بہت شوق ہے لیکن میں نے منع کر دیا...... کیا کرنا ہے دماغ کھپا کر لڑکیاں کتنا ہی پڑھ لکھ جائیں کرنا تو وہی چولھا چوکی ہے ناں!''

''آپ کی بات بھی صحیح ہے بہن لیکن بہر حال تعلیم اچھی چیز ہے، برے بھلے کا شعور دیتی ہے، ہاں آپ نے بتایا نہیں کہ کراچی کیوں شفٹ ہوئے آپ لوگ...... آج کل تو کراچی آتے لوگ ڈرتے ہیں......''

''کیا بتائیں بھائی صاحب...... کراچی میں میرا میکا ہے، سسرال لاہور میں، شوہر کا انتقال ہو گیا، کچھ جائداد وغیرہ کے جھگڑے ہیں اور یہاں کچھ میکے کے عزیز ہیں۔ انہی کے آسرے پر بچیوں کو لے کر چلی آئی۔ دو تین خاندانی پرانے ملازم ہیں ساتھ...... جائداد کا تصفیہ ہو گیا تو چلے جائیں گے واپس......'' شاہجہان فراٹے سے جھوٹ پہ جھوٹ بول رہی

تھی...... بیزار ہو کر اس نے نظریں لاؤنج میں دوڑائیں اور پھر فرسٹ فلور سے نیچے لاؤنج میں آتی سیڑھیوں کے پاس ریلنگ پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑے اجنبی پر ٹھہر گئیں جو بظاہر ساکت کھڑا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے روشنیاں نکلتی تھیں اور ان میں روح دھڑکتی محسوس ہوتی تھی۔ ان نظروں کی حدت سے اس کے رخسار تپ اٹھے اور اس کی نظریں جھک گئیں۔ شاہجہان نہ جانے کیا، کیا کہہ رہی تھی، وہ سن نہیں رہی تھی وہ تو بس نگاہیں جھکائے سوچ رہی تھی کہ یہ کیسا اتفاق ہے کہ آج تیسری بار وہ اس اجنبی کو دیکھ رہی ہے...... اور......

''ارے عظمی بیٹا وہاں کیوں کھڑے ہو گئے، اِدھر آؤ ان سے ملو...... یہ مسز شاہجہان......''

ان صاحب نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور وہ جیسے کسی ٹرانس سے باہر آیا تھا...... اس کی آنکھوں میں حیرتوں کا ایک جہاں آباد تھا...... وہ ہولے، ہولے چلتا ہوا قریب آیا تھا اور شاہجہان سے دعائیں لے کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا...... پتا نہیں ان صاحب نے کیا کہا تھا اس نے سنا نہیں تھا بس اس کا نام ذہن میں رہ گیا تھا۔ ''عظام...... وہ عظام تھا......''

اس کی نظریں بار، بار اس کی طرف اٹھتی تھیں اور اسیر کرتی تھیں۔ سنہری سچ ہی کہتی ہے کہ کہیں کسی نے اسیر تو نہیں کر لیا مجھے...... کر ہی تو لیا ہے ان خوشنما آنکھوں کے سحر نے۔'' نہ، نہ کرنے کے باوجود ان کا ملازم ٹرالی سجا کر لے آیا تھا۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھی تھیں لیکن جتنی دیر وہ وہاں بیٹھی رہیں اس نے گاہے گاہے عظام کو اپنی طرف تکتے پایا تھا اور جب بھی اس کی نظریں عظام سے ملیں اسے اپنا دل پہلو سے نکلتا محسوس ہوا تھا...... اور جب شاہجہان اٹھی تو اس نے شکر ادا کیا تھا اور گھر آتے ہی شاہجہان، ظہورے پر برس پڑی تھی۔

''یہ شیدے لمبے کا دماغ سچ مچ میں چل گیا ہے کیا...... اب مت کرنا اس پر بھروسا...... بھلا اس گھر میں حیاتی دادا کا کیا کام...... باپ پروفیسر اور یونیورسٹی میں جاتے لڑکے...... عورت کوئی گھر میں نہیں پروفیسر کی بیوی مر کھپ گئی مدت ہوئی۔ خواہ مخواہ میں ٹائم ضائع اور مفت میں تیرہ، چودہ سو کیک پر اٹھ گئے۔''

حالانکہ ہزار تو واپس ہی مل گئے تھے۔ ان صاحب نے آتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہزار روپے رکھے تھے۔ ''بیٹی پہلی بار گھر آئی ہے تو خالی ہاتھ تو نہیں جائے گی۔'' شاہجہان کے انکار پر انہوں نے کہا تھا۔

''ارے مفت میں کہاں شاہجہان بیگم......'' ظہورا بھی اپنے پروں پر پانی تک نہیں پڑنے دیتا تھا۔

''آس پاس لوگوں سے تعلق رکھنے میں بڑے فائدے ہیں۔''

''لے خاک فائدے ہیں، اصلیت کھل گئی ناں کسی روز تو پھر ٹکنے نہیں دیں گے یہاں تجھے یہ آس پاس والے......'' شاہجہان کا افسوس کم نہیں ہو رہا تھا شاید......

''یہ پندرھویں صدی ہے شاہجہان بیگم کوئی 1950 نہیں ہے۔ آج کل کوئی پروا نہیں کرتا کہ پڑوس میں کون آباد ہے۔''

''چل رہنے دے اپنی منطق......'' شاہجہان کا موڈ خراب تھا اور وہ تو حیران تھی، ششدر تھی اپنے دل کی کیفیات پر، اس کے سیدھے سادے نو خیز دل کے ساتھ یہ کیا واردات ہو گئی تھی۔

''سجو......'' وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

سنہری کی نظریں جیسے اسے اندر تک کھوج رہی تھیں۔

''وہ لڑکا ہے تو بالکل ہیرو جیسا کتنا اچھا ہو، وہ تمہیں دیکھے اور پھر تمہیں دل دے دے اور پھر......''

''تم بھی کیا فضول باتیں سوچتی رہتی ہو سنہری......''

''نہیں فضول تو نہیں......'' سنہری اب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی...... اس نے نظریں جھکا لیں۔

''عورت کی اصل زندگی تو یہی ہوتی ہے ناں گھر، شوہر، بچے......''

''سنہری تم......'' اس نے سنہری کی بات پر بے حد حیرت سے اسے دیکھا اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''نہیں...... '' سنہری نے اس کی بات کاٹی۔ '' یہ میں نہیں کہہ رہی ٹی وی پر ایک ڈرامے میں سنا تھا۔ کسی کو کہتے ورنہ مجھے کیا پتا عورت کی اصل زندگی کیا ہے..... بھئی ہماری زندگی تو یہی ہے..... اور یہی ہمیں اصل لگتی ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''اور حقیقت کو جھٹلانا کیا اتنا ہی آسان ہے جتنا سنہری سمجھتی ہے۔ اپنے آپ سے جھوٹ بولنا دوسروں سے جھوٹ بولنے کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔'' سجل چپ چاپ اسے دیکھے گئی وہ اس اذیت کو اپنے دل میں اترتا محسوس کر رہی تھی جو سنہری کی آنکھوں میں نظر نہیں آتی تھی لیکن محسوس ہوتی تھی۔

''ویسے سجو...... '' سنہری کی آنکھیں کسی خیال سے چمکیں...... اسے بات بدلنے میں ملکہ حاصل تھا۔

''اگر سچ مچ تیری اس ہیرو سے شادی ہو جائے تو...... ؟'' یہ کیسی لاحاصل خواہشیں دل میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ خواب جو وہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی، سنہری اسے دکھاتی تھی...... ایسے بے تعبیر خواب سوائے اذیت کے اور کیا دے سکتے ہیں...... وہ جانتی تھی...... پر پتا نہیں کیوں سنہری......

''پھر تو تم بیگم صاحبہ بن جاؤ گی، شام میں صاحب اور بچوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گھومنے جاؤ گی اور کبھی جو بیچاری سنہری اور موتیا تمہاری محبت میں تم سے ملنے آئیں گی تو تمہارا موڈ خراب ہو جائے گا... اور تم گیٹ سے ہی واپس بھجوادو گی کہ بھلا شاہی محلے...... '' سنہری مزے لے، لے کر کہہ رہی تھی اور سجل کو لگ رہا تھا جیسے کوئی بیدردی سے اس کے دل کو نوچ کھسوٹ رہا ہو۔ دانتوں تلے ہونٹ کو سختی سے کچلتی ہوئی وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سنہری سے رخ موڑ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی...... اور اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''سنہری تمہیں تو کہانی نگار ہونا چاہیے۔ لمحوں میں کیسے کہانیاں گھڑ لیتی ہو۔''

''لو...... '' سنہری زور سے ہنسی۔ ''الف، ب تو آتا نہیں کہانی کیا لکھوں گی...... پھر ہمیں کیا لکھنے کی اپنی زندگی خود ہی کسی کہانی سے کم ہے کیا؟''

''چل چھوڑ دفع کر ادھر آ تجھے ایک بات بتاؤں۔'' سنہری نے دایاں ہاتھ ذرا سا اوپر کر کے جھٹکا وہی شاہجہان کا سا انداز......

''ہمیں کیا کوئی ہیرو ہو یا زیرو...... ہماری سجو خود کسی ہیروئن سے کم ہے کیا؟'' سجل ایک گہری سانس لے کر واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

''پتا ہے...... '' سنہری اس کے قریب کھسکی۔

''اماں نے تیرے لیے دو تین بندوں سے بات کی ہے وہ جو موتیا والے صاحبزادہ صاحب ہیں ناں انہوں نے سفارش کی ہے کسی سے...... ایک بار تم ٹی وی پر آ جاؤ ناں تو پھر دیکھنا کتنا نام ہوتا ہے تمہارا...... پورے ٹی وی پر تیرے جیسی کوئی نہیں ہے۔''

کچھ دیر پہلے وہ اس کے لیے کچھ اور خواب دیکھ رہی تھی اور اب کچھ اور، موتیا سچ ہی کہتی تھی ایک لمحہ وہ آسمان پر ہوتی ہے اور دوسرے لمحے زمین پر یونہی پل، پل بدلتی سنہری، سجل کو حیران کرتی تھی۔ ایک وہ تھی جو ایک ہی احساس میں گھنٹوں گھری رہتی تھی۔

''سنہری تم...... تم کیوں نہیں بن جاتیں اداکارہ میرے بجائے؟ اماں کو تو بس کسی ایک بیٹی کو اداکارہ بنانا ہے ناں...... '' اس نے ملتجی نظروں سے سنہری کو دیکھا۔

''میں...... ؟'' سنہری اپنی طرف اشارہ کر کے ہنسنے لگی۔

''ہاں تم...... اور کیا...... '' سجل نے اس کے ہاتھ تھامے......

''مجھے یقین ہے تم بہت اچھی اداکارہ بن سکتی ہو۔''

''اور تم کیا بیگم صاحبہ بنو گی یا پروفیسر......؟'' وہ پھر ہنسنے لگی تھی اور سجل کے پہلو میں جھوم سا ہو گیا تھا۔ تب ہی موراں نے دروازہ کھولا تھا۔

''کیا بات ہے موراں......؟'' سنہری نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''شاہجہان بیگم... سجو کو بلا رہی ہیں نیچے......''

''کیوں......؟'' سجل نے پوچھا۔

''لو مجھے کیا پتا کیوں...... شاید مہمانوں سے ملوانا ہے۔''

''ہیں، کون آیا ہے؟'' سنہری چونکی۔

''میں نے تو دیکھا نہیں ظہورا انہیں ڈرائنگ روم میں لے گیا تھا۔''

''ضرور صاحبزادہ صاحب ہوں گے۔'' سنہری نے اندازہ لگایا۔

''سجو تیار ہو کر جانا۔''

''ٹھیک ہوں ایسے ہی......'' سجل کے چہرے پر بیزاری تھی۔

''ویسے تمہیں ضرورت بھی کیا ہے تیاری کی......'' سنہری نے تنقیدی نظروں سے اسے دیکھا...... وہ سفید بے حد نفیس سی چکن کی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ سفید ہی ٹراؤزر تھا۔ سفید رنگ اسے بے حد پسند تھا اور اس پر جچتا بھی بہت تھا وہ جیسے سفید لباس میں دمک اٹھتی تھی۔

''تم بھی چلو ناں......'' اس نے سنہری سے کہا۔

''میں کیا کروں گی اماں نے صرف تمہیں بلوایا ہے، یوں بھی مجھے نیند آرہی ہے۔'' سنہری نے بے نیازی سے کہا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ سجل چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر کرسی پر پڑا دوپٹا اٹھا کر اچھی طرح لیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

کتاب پڑھتے، پڑھتے انہوں نے سامنے کلاک کی طرف دیکھا۔ دس بجنے والے تھے رواحہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ حالانکہ وہ صرف تھوڑی دیر کے لیے کسی دوست کی طرف جانے کا کہہ کر گیا تھا۔ عظام کو ہلکا سا فلو ہو رہا تھا اس لیے وہ گھر پر ہی تھا۔ کتاب تکیے پر اوندھی کر کے رکھتے ہوئے وہ بے چین سے ہو کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ خدا بخش لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''رواحہ ابھی تک نہیں آیا خدا بخش......'' پریشانی ان کے لہجے سے جھلکتی تھی۔

''ہو سکتا ہے دوست نے کھانے پر روک لیا ہو۔'' خدا بخش نے خیال ظاہر کیا۔

''اگر ایسا ہوتا تو وہ فون کر دیتا۔'' رواحہ کے لیے وہ یونہی پریشان ہو جایا کرتے تھے۔

''آپ فون کر کے پوچھ لیں ناں صاحب......''

''اوہ...... ہاں......''

انہیں خود اسے فون کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ آج کل یونہی ان کا ذہن الجھا ہوا سا رہتا تھا...... کئی بار سامنے کی بات بھی انہیں سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

''خدا بخش میرے کمرے سے میرا فون لے آؤ...... بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوگا۔''

وہ کمرے میں واپس جانے کے بجائے وہاں ہی لاؤنج میں بیٹھ گئے تھے۔ خدا بخش فون لے کر آیا تو انہوں نے بے چینی سے اس کا نمبر ملایا۔ رواحہ نے فوراً ہی اٹینڈ کیا۔

''سوری...... بابا میں کچھ لیٹ ہو گیا...... ایک دوست کو ڈراپ کرنے ڈیفنس چلا گیا تھا۔ اب گھر کی طرف ہی آرہا ہوں۔ بس پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا......'' انہوں نے فون آف کرتے ہوئے اطمینان بھری سانس لی۔

''کھانا کھا کر آئیں گے؟'' خدا بخش ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''نہیں...... خدا بخش وہ بس دس پندرہ منٹ میں پہنچ جائے گا۔ تم ٹیبل لگا دو اور ہاں ذرا اعظام کو بھی پہلے دیکھ آؤ کہیں زیادہ طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔''

عظام بھی انہیں رواحہ کی طرح ہی عزیز ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہیں وہ صاحب، ابھی پانی دینے گیا تھا تو لیپ ٹاپ کھولے بیٹھے تھے۔'' خدا بخش بتا کر کچن کی طرف چلا گیا تو انہوں نے ٹی وی کی طرف دیکھا۔ جسے خدا بخش چلتا ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ٹی وی کی آواز بند تھی...... شاید کوئی ڈراما تھا انہوں نے ریموٹ اٹھایا تا کہ آواز تھوڑی سی بلند کریں اور پھر جیسے ان کی نظریں ٹی وی پر ہی ٹھہر گئیں۔

''چندا......'' ان کے لبوں سے سسکی کی طرح نکلا۔

''لیکن نہیں بھلا چندا کیسے ہو سکتی ہے...... وہ تو؟'' وہ جو کوئی بھی تھی چندا تو ہرگز نہیں تھی۔ وہ بے یقینی سے ٹی وی کی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ وہ جو لمحہ بھر پہلے تھوڑا سا رخ موڑے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی...... اب بالکل سامنے دیکھ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ انہوں نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے سر جھکا لیا۔ یہ آج کل انہیں کیا ہو رہا تھا کہ انہیں کسی نہ کسی چہرے پر چندا کا گمان ہونے لگتا تھا شاید ان دنوں وہ ماضی کے متعلق کچھ زیادہ سوچنے لگے تھے۔ جب، جب وہ رواحہ کے متعلق سوچتے، اسے دیکھتے تو ماضی ان کے سامنے آ جاتا ورنہ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ انہیں کسی اور پر چندا کا گمان ہو...... شاید یہ ان کا الیوژن تھا ورنہ...... انہوں نے نظر اٹھا کر پھر ٹی وی کی طرف دیکھا۔ وہ اداکارہ اب بھی ٹی وی اسکرین پر موجود تھی، وہ اس کے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں، اس کے ہونٹ، اس کا چہرہ کچھ بھی تو چندا سے نہیں ملتا تھا پھر پتا نہیں کیوں انہیں لگا تھا کہ...... انہوں نے ٹی وی آف کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ریموٹ صوفے پر رکھ دیا...... اس روز بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ رواحہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئے تھے۔ اگرچہ دو تین سالوں سے رواحہ اپنی شاپنگ خود ہی کرنے لگا تھا...... اور جب اس روز اس نے انہیں اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے چلنے کو کہا تو وہ حیران ہوئے تھے لیکن بنا کچھ کہے اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلے آئے تھے۔

''ایسی کیا خاص شاپنگ تھی جو تم نے میرے ساتھ کرنی تھی...... عظمی کے ساتھ چلے جاتے۔'' فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''خاص ہی تو ہے بابا......'' وہ مسکرایا تھا۔

''عظمی کو بھی ساتھ ہی لے لیتے، وہ گھر میں اکیلا کیا کرے گا......؟''

انہیں عظام کی تنہائی کا خیال آیا تھا۔

''عظمی کی آپ فکر نہ کریں بابا...... وہ اور خدا بخش چاچا اس وقت لوڈو کھیل رہے ہیں...... اور اس وقت تک کھیلتے رہیں گے جب تک خدا بخش چاچا جیت نہ جائیں...... دو بار عظام انہیں ہرا چکا ہے۔''

وہ بھی مسکرا دیے، جانتے تھے کہ خدا بخش کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے رواحہ اکثر خدا بخش کے ساتھ لوڈو کھیلنے بیٹھ جاتا تھا اور لوڈو کھیلتے ہوئے خدا بخش کے چہرے پر جو خوشی ہوتی...... وہ رواحہ کو بہت مطمئن کرتی تھی اور اب عظام بھی اس کے ساتھ کبھی کبھار خدا بخش کے ساتھ کھیلنے بیٹھ جاتا تھا۔

''دراصل مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت تھی؟''

''کیا کسی خاص ہستی کے لیے گفٹ لینا ہے؟'' انہوں نے اندازہ لگایا تھا۔

''جی بابا......'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ ''عظمیٰ کے لیے گفٹ لینا ہے کل اس کا برتھ ڈے ہے اور میں اسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں...... اس لیے اسے خدا بخش چاچا کے ساتھ معروف کر دیا ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

''دراصل چند روز پہلے یوں ہی باتوں، باتوں میں عظام نے کہا کہ بچپن میں اس کا بڑا دل چاہتا تھا کہ اس کے پاپا اس کے لیے بھی برتھ ڈے پارٹی ارینج کریں...... وہ تالیوں کی گونج میں کیک کاٹے لیکن پاپا اتنے معروف رہا کرتے تھے کہ انہیں کبھی میرا برتھ ڈے یاد نہیں رہا...... تو میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ اس بار ہم اس کا برتھ ڈے سلیبریٹ کریں گے۔ آپ کو اس لیے بھی ساتھ لایا ہوں کہ گفٹ کے علاوہ کل شام کے لیے کسی اچھی جگہ پر بکنگ بھی کروالیں...... کیک وغیرہ کا بھی انہیں بتا دیں گے۔''

اور اس سے انہیں رواحہ پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا...... ان کا رواحہ ایسا ہی تھا نرم دل، ہمدرد...... حالانکہ خود انہوں نے رواحہ کا برتھ ڈے بھی کوئی خاص اہتمام سے نہیں منایا تھا...... جب وہ تھوڑا سمجھدار ہوا تھا تو خود انہیں یاد دلاتا تھا کہ آج اس کا برتھ ڈے ہے اور وہ اسے کوئی گفٹ دلا دیتے، کیک لے آتے...... اور پھر جب وہ اور بڑا ہوا تو وہ اس کے یاد دلائے بغیر ہی کچھ نہ کچھ گفٹ لے آتے تھے۔ کبھی کوئی پارٹی ارینج نہیں کی، کبھی اس کے دوستوں کو گھر نہیں بلایا، بچے بہت حساس ہوتے ہیں ضرور رواحہ بھی سوچتا ہوگا کہ اگر میری ماما ہوتیں تو دھوم دھام سے یہ دن مناتیں...... میرے دوستوں کو بلاتیں......

''تم بھی عظمیٰ کی طرح سوچتے ہوگے۔'' دل ہی دل میں تھوڑا سا نادم ہوتے ہوئے انہوں نے رواحہ کی طرف دیکھا...... ''ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال تو ماں ہی رکھ سکتی ہے۔''

''ارے نہیں بابا...... میں نے تو ایسا کبھی نہیں سوچا...... آپ کا گفٹ اور خدا بخش چاچا...... کی دعائیں ہی مجھے سرشار کر دیتی تھیں۔'' وہ جیسے ان کی سوچ کو سمجھ گیا تھا۔

''پھر بھی چندا ہوتی تو......'' وہ جیسے اندر سے اب بھی نادم تھے۔

''چھوڑیں بابا یہ بتائیں کون سی جگہ مناسب رہے گی؟'' رواحہ نے ان کی بات کاٹی تھی۔

''کتنے لوگ ہوں گے؟'' انہوں نے پوچھا تھا۔

''بس میں آپ خدا بخش چاچا، جواد اور عظام......'' اس نے بتایا تھا۔

''اور دوستوں کو بھی بلا لو۔''

''نہیں بابا...... بس ہم خود ہی کافی ہیں۔'' وہ مسکرایا تھا۔

''دھیان رکھیے گا عظام کو پہلے سے پتا نہیں چلے اور خدا بخش چاچا کو بھی مت بتایئے گا۔ ہو سکتا ہے...... وہ جوش میں سارے سرپرائز کا بیڑا ہی غرق کر دیں۔''

وہ سر ہلا کر رہ گئے تھے، اللہ نے ان کے رواحہ کے دل میں کتنی نرمیاں اور محبتیں اتار دی تھیں، سچ میں اس کا دل محبتوں سے گندھا ہوا تھا اور پھر جب وہ عظام کے لیے گفٹ پسند کر رہے تھے تو انہیں سائڈ سے گزرتی خاتون پر چندا کا گمان ہوا تھا...... وہ تیزی سے مڑے تھے۔ خاتون شاپنگ بیگ اٹھائے گیٹ کی طرف جا رہی تھی...... اب اس کی پیٹھ ان کی طرف تھی لیکن hugo boss کی دھیمی، دھیمی سی خوشبو جیسے وہ وہاں ہی چھوڑ گئی تھی۔ چندا کو بھی hugo boss بہت پسند تھا۔ رواحہ جو کسی دوسرے کاؤنٹر پر کھڑا ٹائی پسند کر رہا تھا عین اسی وقت ٹائی لیے ان کے قریب آیا تھا۔

''بابا یہ ٹائی کیسی ہے؟''

''ہاں......'' وہ چونکے تھے، خاتون گلاس ڈور کھولتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ اگر رواحہ اس وقت نہ آ جاتا تو یقیناً وہ اپنے وہم کی تصدیق کے لیے اس کے پیچھے باہر تک چلے جاتے...... دل مسلسل کہہ رہا تھا یہ وہی تھی اور دماغ اس کی نفی کر رہا تھا

کہ نہیں بھلا وہ کیسے......؟"

"کیا ہوا بابا؟" رواحہ نے پوچھا تھا تو وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئے تھے۔ کیا بتاتے کہ وہ کس الیوژن کا شکار ہو گئے تھے۔ بچھڑ جانے والوں کے ہجر اور جدائی میں شاید ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے اور بچھڑنے والے بھی وہ جو رگِ جاں ہوں......زندگی سے زیادہ پیارے ہوں۔

ایک گہری سانس لے کر انہوں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی اور کئی مناظر آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ ان دنوں زندگی یک دم کتنی خوب صورت ہو گئی تھی۔

"کیا دنیا واقعی اتنی خوب صورت ہے جتنی مجھے لگتی ہے چندا......!" اس روز وہ یونیورسٹی کے لان میں نیچے گھاس پر بیٹھے تھے۔

"لگتا ہے جیسے ہر شے رقص میں ہو......پودے، درخت، پتے، پھول سب رقصاں ہوں......مست ہوں۔"

"ہم دنیا کو اپنے اندر کے غم اور خوشیوں کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ہم خوش ہوں تو ہمیں لگتا ہے کہ دنیا بہت خوب صورت ہے......مجھے بھی ان دنوں دنیا بہت خوب صورت لگتی ہے اس لیے کہ خوشی کی تتلیاں میرے اندر رقص کرتی ہیں۔ جب میں اداس تھی تو مجھے ہر سو تاریکی نظر آتی تھی۔" چندا نے تجزیہ کیا تھا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو چندا......" انہوں نے تائید کی تھی۔

"جب بابا جان نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے ڈیڈی نے انکار کر دیا ہے تو میرے لیے دنیا کی ساری خوب صورتیاں بے معنی ہو گئی تھیں۔ میں سوچتا تھا میں اس رنگوں سے خالی دنیا میں جی کر کیا کروں گا......اور زندگی میرے اندر دھیرے، دھیرے مرنے لگی تھی اور پھر جب بابا جان نے بتایا کہ تمہارے ڈیڈی مان گئے ہیں تو کتنی ہی دیر تک مجھے یقین ہی نہیں آیا اور جب یقین آیا تو ارد گرد جیسے رنگ سے بکھر گئے تھے۔

"وہ جو تیرگی تھی چہار سو وہ سمٹ گئی
وہ جو برف ٹھہری تھی روبرو
وہ جو بے دلی تھی صدف صدف
وہ جو خاک اڑتی تھی ہر طرف"

انہیں جانے کب کی پڑھی ہوئی کسی کی نظم یاد آئی تھی۔

"مگر اک نگاہ سے جل اٹھے
جو چراغ جاں تھے بجھے ہوئے"

"یہ تمہیں شاعری سے کب سے دلچسپی ہو گئی؟" چندا ہنسی تھی لیکن وہ سنجیدہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کبھی کبھی میں اب بھی بے یقین ہونے لگتا ہوں چندا......جیسے یہ کوئی خواب ہے اور آنکھ کھلی تو سب بکھر جائے گا......تمہارے ڈیڈی کیسے مان گئے چندا......؟"

"میرے ڈیڈی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔" چندا کی آنکھوں میں اپنے ڈیڈی کے لیے فخر تھا، مان تھا۔ "ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا......مشکل تھا لیکن انہوں نے میری خاطر کیا کیونکہ وہ میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے۔"

"اور اگر تمہارے ڈیڈی نہ مانتے تو؟" پتا نہیں کیوں انہوں نے پوچھا تھا۔

"تو شاید زندگی میرے اندر بھی مر جاتی اور دنیا کی خوب صورتیاں میرے لیے بے معنی ہو جاتیں۔" اس سے انہیں لگا تھا کہ جیسے وہ دنیا کے سب سے خوش نصیب شخص ہیں کہ جسے انہوں نے چاہا جس سے محبت کی وہ بھی انہیں اتنا ہی چاہتی ہے۔ ان دنوں وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ جسے چاہا تھا اسے پانے والے تھے۔ یہ احساس اتنا خوش کن تھا کہ

وہ گھنٹوں اس احساس میں گھرے بیٹھے رہتے تھے۔
بابا جان نے ان کے ایگزام کے فوراً بعد شادی کا پروگرام بنایا تھا۔ چندا کے ڈیڈی کو بھی اعتراض نہیں تھا...... منگنی کا باقاعدہ فنکشن نہیں ہوا تھا کیونکہ چندا کے ڈیڈی منگنی کے قائل نہیں تھے لیکن وہ چندا کے لیے منگنی کی رِنگ خریدنا چاہتے تھے اور جب چندا کے ڈیڈی سے اجازت لے کر وہ چندا کے ساتھ جیولری شاپ سے چندا کی پسند سے رنگ لے کر باہر نکلے تھے تو اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ دو آنکھیں انہیں دیکھ رہی ہیں اور ان دو آنکھوں میں ان کے لیے نفرت ہے...... ایسی نفرت جو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ رنگ خریدنے کے بعد انہوں نے اکھٹا لنچ کیا تھا اور یہ دن ان کی زندگی کے خوب صورت ترین دنوں میں سے ایک دن تھا...... وہ اپنی زندگی کے ان خوب صورت لمحوں کو انجوائے کر رہے تھے اور بابا جان ان کی شادی کی تیاری میں مصروف تھے۔
''بابا جان پہلے مجھے کوئی جاب تو مل جائے۔''
''ہو جائے گی جاب بھی...... میں تاخیر نہیں کرنا چاہتا۔'' بابا جان کو جلدی تھی انہوں نے پلاٹ اور آبائی گھر فروخت کر کے دس مرلے کا ایک گھر لے لیا تھا۔
''میں نہیں چاہتا کہ میری بہو کرایے کے گھر میں آئے۔'' چندا کو بھی گھر بہت پسند آیا تھا اور بابا جان نے چندا کے مشورے سے ہی گھر کے لیے فرنیچر خریدا تھا...... گھر کی ہر چیز چندا کے مشورے سے لی گئی تھی...... رزلٹ آنے کے بعد انہوں نے بابا جان کے مشورے سے پبلک سروس کا امتحان بھی دے دیا تھا اور جس روز ان کا تقرر ایک مقامی کالج میں ہوا تھا اسی روز بابا جان نے ان کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی تھی۔
ان کی شادی کی ساری شاپنگ مونا اور اس کی امی نے کی تھی۔ بابا جان نے دل کھول کر پیسے خرچ کیے تھے اور بہت دھوم دھام سے ان کی شادی کی تھی۔ چندا ان کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔
چندا جو اُن کی پہلی نظر کی محبت تھی جس کو پانا ایک ایسا خواب لگتا تھا انہیں جو شاید کبھی تعبیر نہ پاتا...... لیکن انہوں نے جو خواب دیکھا تھا چندا اس کی تعبیر کی صورت ان کے سنگ، سنگ تھی۔ زندگی کا ہر لمحہ حسین ہو گیا تھا۔
ایسی ہی زندگی کا تو خواب دیکھا تھا انہوں نے اور چندا کی عمر بھر کی رفاقت کی تمنا کی تھی...اور چندا ان کی تھی کیا اس روئے زمین پر ان سے بھی زیادہ کوئی خوش نصیب شخص ہوگا...؟ وہ ماضی میں سفر کرتے چلے جا رہے تھے کہ باہر رواحہ کی گاڑی کے ہارن کی آواز نے انہیں چونکا دیا اور خدا بخش کچن سے ہاتھ پونچھتا ہوا لاؤنج میں آیا۔
''رواحہ صاحب آگئے ہیں۔''
انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ خدا بخش لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا...... وہ بے دھیانی سے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں الوہی سی چمک جیسے وہ تصور میں اب بھی چندا کے سنگ ہوں۔
رواحہ کی گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر عظام بھی لاؤنج میں آگیا تھا۔
''کیسے ہو عظمی بیٹا؟'' وہ عظام کی طرف متوجہ ہوئے۔
''پہلے سے بہت بہتر ہوں۔'' عظام دائیں طرف والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
''لیکن مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہے ہو، تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔'' وہ تشویش سے اسے دیکھ رہے تھے۔
''رواحہ آگیا ہے تو اس کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف چلے جاؤ۔ ڈاکٹر پراچہ کا کلینک بارہ بجے تک کھلا رہتا ہے۔''
''نہیں بابا معمولی فلو ہے، اس نے بہر حال اپنا سرکل تو پورا کرنا ہے اب بہت بہتر ہوں میں......'' عظام نے اپنے دل میں ان کے لیے بے حد محبت محسوس کی...... رواحہ اور اس کے بابا جس طرح اس کا خیال رکھتے تھے۔ وہ اس کے لیے

دل ہی دل میں ان کا ممنون رہتا تھا۔ بہت محبتیں دی تھیں انہوں نے اسے اور اُس روز جس طرح رواحہ نے اس کے لیے برتھ ڈے پارٹی ارینج کی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''رواحہ یہ سب کیا ہے...... میں کوئی چھوٹا بچہ ہوں۔''

''زندگی میں کبھی، کبھی چھوٹا بچہ بننا چاہیے۔'' رواحہ نے اس کے کندھے تھپتھپائے تھے۔

بابا اور رواحہ نے الگ، الگ اسے گفٹ دیے تھے۔ پاپا کو اپنی بے پناہ کاروباری مصروفیات کی وجہ سے کبھی اس کے برتھ ڈے پر اسے وش کرنا یاد نہیں رہتا تھا۔

''السلام علیکم......'' رواحہ لاؤنج میں آیا۔

''بڑی دیر لگا دی۔'' عظام نے اس کی طرف دیکھا۔

''سوری...... یار کچھ دیر ہی ہو گئی۔''

''خدا بخش کھانا لگا دو۔'' انہوں نے کچن کی طرف جاتے خدا بخش سے کہا۔

''ٹیبل سیٹ ہے صاحب، بس پانچ منٹوں میں کھانا لگ جاتا ہے۔''

''سوری...... بابا......'' رواحہ، عظام کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''مجھے آپ کو فون کرنے کا خیال ہی نہیں رہا آپ کو پریشانی ہوئی۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا......'' وہ مسکرائے...... رواحہ کی یہی باتیں تو انہیں اس کا دیوانہ بناتی تھیں۔ وہ بے حد حساس اور ہمدرد تھا۔ انہیں بھی اپنے بابا جان سے بہت محبت تھی لیکن وہ رواحہ کی طرح نہیں تھے۔ کچھ بے پرواسے تھے...... کبھی کبھار بابا جان کو بتائے بغیر ہی دوستوں کے ساتھ چلے جاتے تھے اور پھر بابا جان کو اپنے لیے پریشان دیکھ کر پشیمان ہوتے تھے لیکن رواحہ نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا...... ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو فوراً فون کر دیتا تھا۔

وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

رواحہ ان کی تمام عمر کا حاصل

ان کی عمر بھر کی محرومیوں......

ان کے رستے زخموں کا مرہم تھا......

''کیا بات ہے بابا... آج آپ بہت خوش لگ رہے ہیں۔'' رواحہ نے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''خوش......'' انہوں نے اپنے اندر جھانکا...... چندا کی رفاقت کی یاد نے ہی اندر چراغاں کر دیا تھا اور جب وہ ان کے ہمراہ تھی تو کیسے چراغ جلتے ہوں گے ان کے اندر اور کیسی ست رنگ روشنیاں ان سے پھوٹتی ہوں گی ان کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''جن کے رواحہ اور عظام جیسے بیٹے ہوں ان کے باپ خوش ہی ہوتے ہیں۔ عظام کے پاپا بھی جب عظام کے متعلق سوچتے ہوں گے تو میری طرح خوش ہوتے ہوں گے۔''

''اس کا مطلب ہے آپ میرے متعلق سوچ رہے تھے۔'' رواحہ شوخ ہوا۔

''لیکن بابا آپ کیا سوچ رہے تھے میرے متعلق......؟''

''جب بیٹے جوان ہوں تو باپ، بیٹوں کی شادیوں کے متعلق سوچ کر خوش ہوتے ہیں۔'' خدا بخش ہاتھ میں ہاٹ پاٹ لیے کچن سے نکلا تھا۔

''خدا بخش، اللہ وہ دن جلد لائے۔'' انہوں نے مسکرا کر خدا بخش کی طرف دیکھا۔

''آ جائیں صاحب......'' وہ ہاٹ پاٹ ٹیبل پر رکھ کر مڑا...... اور رواحہ کی طرف دیکھا۔

''انشاء اللہ ہمارے رواحہ کے سر پر جلد ہی سہرا بندھے گا۔''

''لاحول ولا، خدا بخش چاچا میں سہرا ہر گز نہیں باندھوں گا۔''

رواحہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''لو بھلا یچ مچ کا سہرا تھوڑا ہی باندھنے کو کہہ رہا ہوں۔ بس ایک گلابوں کا ہار گلے میں ڈال دیں گے کیوں صاحب......؟'' اس نے ان کی طرف دیکھا۔

''پتا تو چلے کہ دولہا ہے آخر۔''

''بالکل خدا بخش......'' وہ کھڑے ہو گئے۔

''چاچا ہار کے ساتھ ایک رومال بھی ہاتھ میں لے لوں گا منہ پر رکھ لوں گا تو پکا والا دولہا لگوں گا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ عظام نے بغور اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ گھر سے نکلا تھا تو اس کی آنکھیں بجھی، بجھی سی تھیں اور اب جیسے ان بجھے چراغوں میں یک دم کسی نے امید کی روشنی بھر دی تھی...... جگر، جگر کرتی مسکراتی آنکھیں......

''لو رومال کیوں پکڑیں گے بھلا آج کل تو دیہاتوں میں بھی دولہے رومال نہیں رکھتے منہ پر۔'' خدا بخش کے لہجے کی ناراضی محسوس کر کے رواحہ پھر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

''بہت خوش لگ رہے ہو رواحہ کیا بات ہے؟'' عظام نے آہستہ سے کہا تو وہ ٹپٹا کر کھڑا ہو گیا۔

''میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں آپ لوگ شروع کریں کھانا......''

''او کے بیٹا، تم دونوں کھانا کھاؤ میں اب آرام کروں گا۔''

''آپ کھانا نہیں کھائیں گے کیا بات ہے بابا؟'' رواحہ جاتے، جاتے مڑا۔

''کچھ نہیں یار بس بھوک نہیں ہے۔''

''یہ آج کل آپ کی بھوک پیاس کیوں اکثر اڑی رہتی ہے خیریت ہے ناں...... کہیں پھر تو بیگ صاحب کی سسٹر نیک اختر......'' وہ پھر شوخ ہوا تھا۔

''رواحہ......'' انہوں نے اسے گھورا۔

''یہ اپنے خدا بخش چاچا سے پوچھو جنہوں نے شام کی چائے کے ساتھ زبردستی مجھے کیک کھلایا۔'' یہ الگ بات تھی کہ انہوں نے خدا بخش کے اصرار پر ذرا سا پیس ہی لیا تھا۔

''ہاں تو...... خالی سادی چائے تو سیدھی دل کو جا کے لگتی ہے...... اور پھر اس روز سے کیک یونہی پڑا تھا۔ آخر کو ماسی کا پیٹ ہی بھرنا تھا اس کیک سے...... اتنی محبت اور پیار سے تو لائی تھیں وہ اور یہاں کسی نے چکھا تک نہیں......'' وہ بڑبڑایا...... اسے کھانے پینے کے متعلق ایسے شکوے رہتے ہی تھے۔

''خدا بخش کھانا کھا کر مجھے ایک کپ چائے بنا دینا۔'' انہوں نے خدا بخش سے کہا تو کچن کی طرف جاتے ہوئے اس نے مڑ کر ناراضی سے انہیں دیکھا۔

''بس چائے پی، پی کر جگر ساڑتے (جلاتے) رہیں۔''

''چائے کے ساتھ پھر کیک مت لے جانا چاچا صبح ماسی کو دے دینا۔ اس کے بچے کھا کر خوش ہوں گے۔'' وہ ہنسا...... انہوں نے رواحہ کی طرف دیکھا اس کی ہنسی میں بے ساختگی تھی اور آنکھوں میں وہی پرانی چمک تو وہ اس غم سے باہر نکل آیا تھا جس میں وہ پچھلے کئی دنوں سے گھرا ہوا تھا۔ انہوں نے پھر اس روز کے بعد رواحہ سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی وہ چاہتے تھے کہ وہ خود ہی دکھ کے اس فیز سے باہر نکل آئے اور وہ نکل آیا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر اور دل ہی دل میں اس کی دائمی خوشیوں کی دعا کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آ گئے...... اندر اب بھی چراغ ٹمٹماتے تھے

اور وہ چندا کے ساتھ گزرے ایک، ایک لمحے کو یاد کر کے ایک بار پھر وہی خوشی محسوس کرنا چاہتے تھے...... آج ایک رات اور ماضی کی نذر ہونے والی تھی۔

رواحہ بھی مسکراتا ہوا چلا گیا تھا اور عظام کی آنکھوں کے سامنے بار، بار وہ منظر آ رہا تھا جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر نیچے لاؤنج میں آیا تھا...... سجل ان کے گھر کے لاؤنج میں بیٹھی تھی اس کا چہرہ ویسا ہی تھا سپاٹ اور آنکھوں سے بیزاری جھلکتی تھی۔ وہ سیڑھیوں کے پاس مبہوت سا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

پتا نہیں وہ کون تھی۔ شاید رواحہ کی کوئی عزیزہ لیکن اس نے تو کبھی کسی عزیز، رشتے دار کا ذکر تو نہیں کیا تھا...... شاید کوئی ملنے والے ہوں۔ وہ جیسے سحر زدہ سا ہو گیا تھا۔

''ارے یار تم ابھی تک یہاں ہی بیٹھے ہو۔''

رواحہ ہاتھ دھو کر آ گیا تھا۔

وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ فلو کی وجہ سے اس کا بھی کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن خدا بخش کی ناراضی کے خیال سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں تو خدا بخش چاچا وہ خاتون پھر تشریف نہیں لائیں۔ افسوس میری ملاقات نہیں ہو سکی۔'' رواحہ کرسی کھینچ کر بیٹھا۔

''ارے کیوں آنا تھا بھلا، یہاں سب چھڑے چھانٹ ان کا کیا کام اِدھر...... اس روز تو غلط فہمی میں چلی آئی تھیں۔'' خدا بخش نے پانی کی بوتل ٹیبل پر رکھی۔

''سچ پوچھیں تو مجھے کچھ اچھی نہیں لگی تھیں وہ، بڑی بناوٹی سی تھیں۔''

''یہ بناوٹی کیا ہوتا ہے چاچا؟'' رواحہ کے لبوں پر شرارتی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ایسے ہی بن، بن کر بول رہی تھیں۔''

''اس روز تو ان کی صاحبزادی کی آپ خود ہی بڑی تعریف کیے جا رہے تھے۔''

''ہاں تو صاحبزادی تو ٹھیک ہی تھیں۔ خاموش طبع سی۔''

''تو ایسا کریں چاچا کسی روز آپ بھی کچھ فروٹ کیک وغیرہ لے جائیں ان کے گھر۔''

''کاہے کو لے جائیں، ہم نے کوئی نائی بھیجا تھا کہ اِدھر کیک لے کر آ جائیں...... اور پھر اتنی خاطر تواضع کر دی تھی...... ہو گیا کیک کا بدلا...... خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بیگم صاحبہ نے نگٹس کی پوری پلیٹ خالی کر دی تھی۔ آٹھ دس تو تھے ہی...... اور باقی چیزیں علاوہ...... دو تین سموسیاں اور......''

''توبہ، توبہ خدا بخش چاچا آپ مہمانوں کے کھانے پینے پر نظر رکھتے ہیں!''

''میں کیوں نظر رکھنے لگا۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''وہ تو ٹرالی کچن میں لایا تو برتن سنبھالتے ہوئے دیکھا...... نگٹس کی ڈش خالی تھی۔''

''آپ بھی آ جائیں چاچا...... ساتھ ہی کھا لیں۔'' خدا بخش واپس جانے لگا تو رواحہ نے کہا۔

''نہیں بچوں آپ کھاؤ......'' خدا بخش کی آنکھیں ہمیشہ ہی اس عزت افزائی پر نم ہو جاتی تھیں۔ کبھی خاص موقعوں پر ان کے اصرار پر ساتھ بیٹھ جاتا لیکن زیادہ تر وہ کچن میں ہی کھاتا تھا۔ وہاں وہ زیادہ ایزی محسوس کرتا تھا۔ انہیں کھاتے دیکھ کر وہ مطمئن سا کچن میں چلا گیا تو عظام نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''آج بہت چہک رہے ہو روی، بہت دنوں بعد میں نے تمہیں اس موڈ میں دیکھا ہے۔''

''ہاں شاید یہ اس کا اعجاز ہے۔''

''کس کا......؟'' عظام کی سوالیہ نظریں اس پر ٹکی تھیں۔

''رتی کا.......'' مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔
''رتی ملی تھی مجھے.......'' اس نے کھانا کھاتے ہوئے اسے تفصیل بتائی تو عظام کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔
''یہ شخص مجھے کبھی اچھا نہیں لگا لیکن یہ اس قدر گھٹیا ہوگا مجھے اندازہ نہیں تھا۔''
''وہ ہمارے تصور سے بھی زیادہ گھٹیا ہے۔''
''چلو کم از کم اس واقعے کے بعد رتی کو سمجھ آگئی ہوگی کہ وہ کیسا شخص ہے۔'' عظام نے کہا تو رواحہ نے اس کی تائید کی۔
''ہاں یقیناً......ویسے میں حیران ہوں عظمی کہ کیسے اچانک میں اٹھ کر چل پڑا۔ حالانکہ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس وقت تو نومان کی طرف جانے کا یہ خیال تھا کہ کل یونیورسٹی سے ہی چلے جائیں گے دونوں پھر نہ جانے کیوں شاید محبت میں دل کے تار جڑے ہوتے ہیں۔''
''کیا یک طرفہ محبت میں بھی؟'' عظام کے لبوں سے نکلا۔
''پتا نہیں......'' لمحہ بھر کے لیے رواحہ کی آنکھوں کی چمک ماند پڑی......لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر چمکنے لگی تھیں۔
''شاید اللہ تعالیٰ اسے میرے ذریعے سے بچانا چاہتا تھا۔ چلو چھوڑو اس سارے قصے کو تم بتاؤ کچھ دنوں سے بہت اپ سیٹ لگ رہے ہو...کیا پاپا یاد آرہے ہیں؟''
''ہاں......اس بار میں انہیں بہت مس کر رہا ہوں، کافی دنوں سے ان کا فون بھی نہیں آیا۔''
وہ آج بھی رواحہ کو نہیں بتا سکا تھا کہ اس کا دل بھی اس کی طرح محبت آشنا ہو چکا ہے۔ کیا بتاتا کہ وہ اس لڑکی سے محبت کر بیٹھا ہے جسے جانتا تک نہیں جسے تیسری بار اس نے یہاں اس کے گھر کے لاؤنج میں دیکھا ہے۔ اور وہ اس کے

متعلق صرف اتنا ہی جان سکا ہے کہ وہ اس خاتون کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے اور اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔

''کیا محبت اتنی ہی سحر انگیز ہوتی ہے روی کہ محبوب کو محض ایک نظر دیکھ کر ہی اندر پھول کھل اٹھتے ہیں۔'' اس نے رواحہ کی مسکراتی جگر جگر کرتی آنکھوں کو دیکھا۔

رواحہ اس کی بات سمجھ کر مسکرایا۔

''ہاں یار عظمی' یہ محبت اتنی ہی سحر انگیز ہوتی ہے۔ میں نے صرف اسے دیکھا۔ اس کے لہجے کی نرمی...... اس کی ممنون نظریں...... میں نہیں جانتا کہ میں اسے پاسکوں گا یا نہیں...... پھر بھی اندر امید کی ایک لو سی جل اٹھی ہے۔ ننھی سی لو...... لیکن اندھیرے کو ختم کرتی اور مارتی ہوئی......''

''لیکن امید کی یہ لو جلانے کے لیے بھی تو کوئی بیرونی عوامل ہوتے ہوں گے۔'' اس کے پاس تو ایسا کچھ نہیں تھا وہ کتنا بھی اس لو کو جلانے کی کوشش کرتا وہ جلتی بھڑکتی اور بجھ جاتی تھی۔

یک دم رواحہ کی نظر عظام کی پلیٹ پر پڑی۔ اس نے جو ذرا سا سالن ڈالا تھا وہ ایسے ہی تھا اور روٹی بھی یوں ہی پلیٹ میں رکھی ہوئی تھی۔ صرف ایک نوالہ توڑا گیا تھا۔

''عظمی تم کچھ کھا نہیں رہے۔''

''ہاں......'' وہ چونک کر پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

رواحہ اسے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ بہت دنوں سے کھویا کھویا سا تھا۔

''خیر کبھی تو کھلے گا میرا دوست......'' وہ مسکرا کر اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔

☆☆☆

وہ سیل فون ہاتھ میں لیے اسکرین پر چمکتے نبیل احمد کے نام کو دیکھ رہا تھا۔ بیل ایک بار بند ہو کر پھر دوبارہ ہونے لگی تھی۔ یوں ہی وقفے وقفے سے دو تین بار بیل ہوئی لیکن اس نے فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد بیل ہونا بند ہو گئی تو اس نے اِک گہری سانس لے کر اپنے فون سے وہ سم نکال دی جس کا نمبر نبیل احمد کے پاس تھا۔ اسے اب نبیل احمد سے رابطہ نہیں رکھنا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے اس کے مسلسل فون اور میسجز آ رہے تھے کہ اس کے ابو اور اس کے دادا جان اس سے بات کرنا چاہتے ہیں...... پلیز فون پک کر لیں ابو آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں...... لیکن نہ تو اس نے اس کی کوئی کال اٹینڈ کی تھی اور نہ ہی اس کے کسی میسج کا جواب دیا تھا۔ حالانکہ کئی بار اس کا جی چاہا تھا کہ وہ بڑے ماموں منصور احمد کے مزید حالات دریافت کر لے...... نبیل احمد نے بتایا تو تھا کہ اس کے والد کے تایا کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ پتا نہیں ان کے بیٹے شادی شدہ تھے یا نہیں...... اگر شادی شدہ تھے تو ان کی اولاد ہے بھی یا بڑے ماموں اکیلے رہ گئے ہیں لیکن وہ نبیل احمد سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نبیل احمد سے بات کرنے کا مطلب تھا کہ اسے اس کے والد اور دادا سے بھی بات کرنی پڑتی اور وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''کیا یہ مکافاتِ عمل ہے......؟ ماموؤں نے جو کچھ میرے ساتھ کیا تھا یہ اس کی وجہ سے ہے؟'' ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال آیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔

''میں بھلا کہاں کا ایسا برگزیدہ بندہ ہوں جو میری وجہ سے۔'' اس نے ایک جھرجھری سی لی۔

وہ جو کچھ بھی تھا لیکن بااختیار ہونے کے باوجود وہ ماموؤں کے پاس اپنا حق لینے نہیں گیا تھا۔ جلیل خان کے کہنے کے باوجود اس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا اور اللہ نے کیسے...... ہاں اپنے دوسرے معاملات میں اس نے اللہ پر بھروسا نہیں کیا تھا بلکہ جلیل خان کو ہی سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ اپنا مسیحا، اپنا مددگار...... اور اسی کے بتائے راستے پر چلنے لگا تھا۔

فرحی نے اس سے بحث کرنا چھوڑ دی تھی۔ لیکن کبھی، کبھی شاکی نظروں سے اسے دیکھتی تھی اور وہ اس کی شاکی نظروں سے نگاہیں چرا لیتا تھا۔ فرحی کچھ کہتی نہیں تھی لیکن وہ جانتا تھا وہ اس کی اس زندگی سے خوش نہیں ہے۔ اسے اس کا جلیل خان کے ساتھ کام کرنا پسند نہیں ہے۔ اسے یہ بھی برا لگتا ہے جب جلیل خان کے ساتھی اسے دادا کہہ کر بلاتے ہیں لیکن اسے خود برا نہیں لگتا تھا۔ جب سے اس کے نام کے ساتھ دادا کا اضافہ ہوا تھا وہ اپنے اندر بڑی تقویت محسوس کرتا تھا جیسے وہ بہت مضبوط ہو گیا ہو اور اب کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے...... وہ جلیل خان کے ساتھ اپنی اس زندگی سے مطمئن تھا جو اس کی من چاہی نہیں تھی لیکن فرح اکثر بہت بے چین اور مضطرب ہو جاتی...... وہ جب جلیل خان کے ساتھ لاہور ہوتا تب بھی ہفتے میں ایک چکر ضرور لگاتا اور کبھی کئی، کئی ہفتے وہ خانیوال میں ہی رہتا...... اور کبھی پندرہ، پندرہ دن خانیوال آنہ پاتا...... ایسے میں اس کے آنے پر فرحی بہت مضطرب اور بے چین نظر آتی تھی اور اس کے آنے کے بعد بھی کئی دن تک بے چین رہتی...... وہ بہت کم سوال کرتی تھی لیکن وہ اس کی آنکھوں میں مچلتے سوال پڑھ سکتا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ اس کے زیادہ دن نہ آنے پر کیوں پریشان ہو جاتی ہے...... وہ خوف زدہ رہتی تھی کہ کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے اور ایک بار اس کا یہ خوف اور خدشہ سچ ہو گیا...... سرحد پار کرتے ہوئے رینجرز کی گولی سے اس کا دایاں کندھا زخمی ہو گیا تھا۔ گو ہڈی بچ گئی تھی اور گولی گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی پھر بھی خون کافی بہہ گیا تھا اور جلیل خان کے اصرار پر وہ آرام کرنے کے لیے خانیوال چلا آیا تھا۔

''اب مہینہ بھر ریسٹ کرو ثمر حیات...... سمو اور بالی ہیں ناں یہاں اور میری بیٹی بھی خوش ہو جائے گی۔ اکیلے رہتے، رہتے گھبرا جاتی ہے۔'' ہمیشہ کی طرح فرحی نے اس کے اتنے دن بعد آنے پر اس پر ایک شاکی نظر ڈالی تھی اور پھر کندھے کے زخم کا سن کر لمحہ بھر کو تو وہ شاکڈ سی بیٹھی رہ گئی تھی اور پھر دلگرفتگی سے بولی تھی۔

''کبھی تم نے سوچا ہے ثمر اس طرح کے لوگوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟''

''جانتا ہوں، شہباز کی طرح کسی روز زخمی ہو کر آنے کے بجائے شاید لاش کی صورت میں تم تک آؤں تو مرنا تو ہے ہی ایک دن۔'' اس نے بے پروائی سے کہا تھا اور اپنے کندھے کی ڈریسنگ دیکھنے لگا تھا۔

''ثمر......'' بہت سارے دنوں کے بعد فرحی کے لبوں پر شکوہ آیا تھا۔ ''تم ایسے تو نہیں تھے اتنے سخت دل، اتنے پتھر، تم تو بہت نرم تھے، ریشم کی طرح نرم......''

''حالات آدمی کو ریشم سے پتھر میں تبدیل کر دیتے ہیں فرحی...... میں بھول گیا ہوں کہ میں کبھی ریشم تھا، مجھے لگتا ہے جیسے میں تو صدیوں سے ایسا ہی تھا پتھر...... مجھے اسی کام کے لیے تخلیق کیا گیا ہے جو میں کر رہا ہوں۔''

''نہیں ثمر تم پتھر نہیں ہو...... تمہارے دل میں آج بھی وہی نرمیاں ہیں...... اور تم اسمگلر بننے کے لیے تخلیق نہیں کیے گئے تھے ثمر، تم نے ماسٹر کیا تھا...... یہ کام تمہیں زیب نہیں دیتا...... ثمر چھوڑ دو یہ سب کچھ، آؤ ہم مل کر پھر سے زندگی کو شروع کریں۔ یہاں سے دور کہیں کسی اور جگہ...... کسی چھوٹے سے شہر یا کسی گاؤں میں ہم روکھی سوکھی کھا لیں گے۔ اچھی نوکری نہ ملی تو مزدوری کر لیں گے لیکن یہ ہر وقت سر پر لٹکتی تلوار والی یہ زندگی...... ثمر پلیز اس زندگی کو خیرباد کہہ دو...... تم کیا جانو تمہارے جانے کے بعد کیسے ایک، ایک پل مشکل گزرتا ہے میرا ڈر، وسوسے، خوف...... یہ سب مجھے مار ڈالیں گے ثمر......'' اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ وہ بارہ سال بعد آج پھر اسے یہ زندگی چھوڑنے کو کہہ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کی نم آنکھوں کو دیکھتا رہا اور پھر نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''اس زندگی کا انتخاب ہم نے خود نہیں کیا...... ہمیں اس زندگی کی طرف دھکیلا گیا ہے۔''

''نہیں ثمر...... انتخاب کا حق بہرحال ہمارے پاس تھا۔ لیکن ہم نے اللہ پر بھروسا نہیں کیا...... بلکہ اللہ کے بجائے جلیل خان پر بھروسا کیا...... ہم صبر کرنے والوں میں سے نہیں تھے ثمر...... ہم نے جلیل خان کو اپنا مسیحا سمجھا۔'' فرحی نے نم

آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''تو اور کیا کرتے؟ ہم کہاں جاتے؟ کون تھا ہمارا...... ہمیں بے قصور سزا ملی فرحی...... ہمارے ساتھ جو ہوا ہم کیا اس کے مستحق تھے؟ ہم نے ایسا کیا، کیا تھا جس کی اتنی بڑی سزا ملی ہمیں۔ ابا، اماں، گھر سب چھن گئے۔''

ان دنوں وہ یوں ہی خفا، خفا اور ناراض رہتا تھا اپنے آپ سے، اپنے اللہ سے۔

''تم بے قصور تھے ثمر حیات لیکن میں نے تو قصور کیا تھا ناں...... اپنے ممی، ڈیڈی کا مان اور بھروسا توڑا اور گھر کی دہلیز پار کرلی...... بغیر سوچے سمجھے......''

''لیکن تمہیں اپنی غلطی کا احساس بھی تو ہو گیا تھا پھر...... پھر کیوں کیا اللہ نے ہمارے ساتھ ایسا؟ کیوں ہمیں سزا دی۔''

''اللہ نے ہمیں آزمایا تھا ثمر...... یہ ہماری آزمائش تھی لیکن ہم اس آزمائش پر پورے نہیں اترے...... فیل ہو گئے...... اللہ ہمیں تکلیف دے کر آزماتا ہے ثمر کہ ہم اس تکلیف پر صبر کرتے ہیں یا نہیں اور پھر صبر کرنے والوں کے لیے وہ بہترین اجر کا بھی کہتا ہے لیکن ہم نے صبر کرنے کے بجائے اس کے بندے کو اپنا سب کچھ جان لیا...... اپنا محافظ، رازق بندوں کو سمجھ لیا۔ ہمیں اللہ پر یقین رکھنا چاہیے تھا۔ وہ تو جانتا تھا ناں سب...... وہ ضرور ہمیں اس مشکل سے نکالتا لیکن ہم نے اللہ پر یقین نہیں کیا اور شیطان کے بہکاوے میں آگئے اور اللہ کو ناراض کر دیا۔'' وہ رونے لگی۔

''ہم اس پر بھروسا تو کرتے...... وہ ہماری زندگی میں ضرور آسانیاں پیدا کرتا...... بارہ سال ہو گئے ثمر اللہ نے ہمیں اولاد کی نعمت نہیں دی۔''

''بہت سارے لوگوں کی اولاد نہیں ہوتی فرحی...... تو کیا اللہ ان سب سے ناراض ہوتا ہے اس لیے وہ محروم رہتے ہیں؟'' اسے فرحی کا رونا بے چین کر رہا تھا۔

''مجھے دوسروں کا نہیں پتا ثمر لیکن ہم نے اللہ کو ناراض کیا ہے...... صبر نہ کر کے اس پر بھروسا نہ کر کے اور میں نے تو ممی، ڈیڈی کا دل بھی دکھایا ہے۔ پتا نہیں وہ مجھے کتنا یاد کرتی ہوں گی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ آپی سے بھی زیادہ...... اور ڈیڈی...... کی میں کتنی لاڈلی تھی۔ جان تھی ان کی مجھ میں، وہ ہمیشہ مجھے تلچھٹ کہا کرتے تھے اور جب انہوں نے آخری سانسیں لی ہوں گی تو کیا انہوں نے مجھے دیکھنے کی چاہ نہیں کی ہو گی اور میں کتنی بدنصیب ہوں کہ ان سے معافی بھی نہ مانگ سکی اور وہ مجھ سے ناراض ہی دنیا سے چلے گئے۔'' وہ زاروقطار رونے لگی۔

''کیا مطلب......؟'' وہ حیران ہوا تھا۔

''ممی، ڈیڈی دونوں ہی اس دنیا میں نہیں رہے ثمر...... میں نے ایک روز گھر فون کیا تھا کسی ملازم نے اٹھایا تھا۔ اس نے بتایا کہ ممی دو سال پہلے اور ڈیڈی چار ماہ پہلے......'' وہ اونچا، اونچا رونے لگی۔

''میں نے تب کسی کا نہیں سوچا تھا ثمر...... ممی، ڈیڈی، آپی، بھائی کسی کا بھی نہیں اور دیکھو اللہ نے مجھے اولاد نہیں دی۔''

''ایسا نہیں ہے فرحی......'' اس نے اسے گلے لگا کر تسلی دی تھی لیکن وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

''ان بیتے دنوں میں، میں نے ہر روز اللہ سے معافی مانگی ہے۔ رو، رو کر گڑ گڑا کر لیکن اللہ میری نہیں سنتا...... میری توبہ قبول نہیں کرتا ثمر...... ہم بے صبرے تھے۔ ہم نے سوچا تھا ناں کہ ہم خود ہی سب کچھ ٹھیک کر لیں گے لیکن ہم خود کیسے سب ٹھیک کر سکتے ہیں...... تم اب بھی چھوڑ دو یہ زندگی ثمر اللہ پر بھروسا کرو، توبہ کرلو...... معافی مانگ لو۔''

''کرلوں گا توبہ...... مانگ لوں گا معافی......'' وہ ہولے، ہولے اسے تھپکنے لگا تھا۔ اس کا رونا اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

بڑی دیر بعد وہ سنبھلی تھی۔

''وعدہ کرو ثمر اگر اللہ نے ہمیں اولاد دی تو تم جلیل خان کا ساتھ چھوڑ دو گے۔'' اس نے وعدہ کر لیا تھا۔

''ہاں اگر اللہ نے ہمیں اولاد دی تو میں یہ زندگی چھوڑ دوں گا۔''

''ہم اپنے بچوں کو یہ زندگی نہیں دیں گے ثمر خوف والی زندگی...... میں نہیں چاہتی کہ ہمارے بچے کسی اسمگلر کی اولاد کہلائیں۔'' وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ بڑے دنوں بعد اس کے خوابوں نے اس کی آنکھوں میں رنگ بکھیرے تھے اور ان رنگوں سے امید کی جو روشنی پھوٹی تھی اس نے اس سے نظریں چرا لیں۔ وہ اس کے خوابوں کا شریک بن گیا۔ وہ یہ کہہ کر اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا کہ اگر بارہ سال اولاد نہیں ہوئی تو بھلا اب کہاں ...... لیکن وہ پُرامید تھی۔

''تم سچے دل سے اللہ سے معافی مانگو گے تو اللہ ضرور معاف کر دے گا۔'' اسے اللہ پر یقین تھا اور اللہ نے اس کا یقین نہیں توڑا...... ان کی توبہ قبول ہوگئی اور اللہ نے انہیں اولاد کی خوشخبری سے نوازا۔

وہ اس روز ہانگ کانگ میں جلیل خان کے ساتھ اس کے فلیٹ میں بیٹھا ہوا تھا جب فرحی کا فون آیا تھا اس کی آواز میں چہکار تھی۔

''تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے ناں ثمر......؟''

''کون سا وعدہ؟'' اس وقت اس کے ذہن میں دو سال پہلے کیے گئے وعدے کا خیال تک نہیں تھا۔

''تم نے وعدہ کیا تھا ثمر کہ اگر اللہ نے ہمیں اولاد دی تو تم یہ زندگی چھوڑ دو گے؟'' اس نے یاد دلایا ہے۔

''ہاں...... تو......؟'' اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

''تو اللہ نے ہماری توبہ قبول کر لی، ہمیں معاف کر دیا ثمر......''

وہ اتنی دور بیٹھا بھی اس کے لہجے سے جھلکتی خوشی کو محسوس کر سکتا تھا۔

''کیا مطلب...... کیا......؟'' اس کی آواز قدرے بلند ہوئی تھی۔ فاصلے پر بیٹھا جلیل خان اسے چونک کر دیکھنے لگا تھا۔

''ہاں ثمر اللہ نے ہمیں......'' اس کی آواز بھرا گئی تھی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور اسے بات مکمل کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا۔

''سچ...... فرحی...... ایک بار پھر کہو...... کہیں میرے کانوں نے غلط تو نہیں سنا۔''

''نہیں......'' فرحی کی آواز بوجھل تھی۔

''میں چاہتی تھی یہ خوشخبری تمہیں فون پر نہ سناؤں ثمر بلکہ جب تم آؤ تو تب لیکن تم نے اتنے دن لگا دیے۔'' اب اس کی آواز میں ناز بھرا شکوہ تھا۔

''سوری...... فرحی بس یہاں کوئی کام اٹک گیا ہے، اس لیے واپسی میں دیر ہو رہی ہے لیکن میں جلد آنے کی کوشش کروں گا تم اپنا بہت خیال رکھنا اور باقاعدگی سے ڈاکٹر سے چیک اپ کرواتی رہنا۔''

''اور تمہارا وعدہ...... تم......''

''ایسا ہی ہوگا فرحی جیسا تم چاہو گی بے فکر رہو۔'' اس نے اسے بہت ساری ہدایات دے کر فون بند کیا تھا لیکن خود کتنی ہی دیر بے یقین سا بیٹھا رہا...... اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ چودہ سال بعد...... اللہ ان پر مہربان ہو گیا تھا...... فرحی سچ ہی کہتی تھی کہ انہوں نے صبر نہیں کیا تھا اور اللہ نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ وہ جب آ رہا تھا تو فرحی کی طبیعت خراب تھی، چکر آ رہے تھے اسے اور وہ اسے ڈاکٹر کی طرف جانے کی تاکید کر کے آیا تھا۔ جلیل خان...... سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہتا تھا لیکن جلیل خان کی نظروں میں اب تشویش بھی شامل

ہو گئی تھی۔

''کیا بات ہے ثمر حیات...... فرحی بیٹی تو ٹھیک ہے ناں......؟''

''ہاں......'' اس نے سر ہلایا تھا اور پھر اپنی نم آنکھیں پونچھتے ہوئے جلیل خان سے سب کچھ کہہ دیا۔ فرحی کی خواہش، اپنا وعدہ...... اور جلیل خان لمحہ بھر سوچنے کے بعد مسکرایا تھا۔

''ٹھیک ہے ثمر حیات، فرحی مجھے بھی کچھ کم عزیز نہیں ہے۔ بیٹی ہے میری۔'' جلیل خان نے روکا نہیں تھا منع نہیں کیا تھا بلکہ فراخدلی سے اجازت دے دی تھی کہ بچے کی پیدائش کے بعد جیسے چاہے زندگی گزارے۔ اس نے فرحی کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ ان کے لیے جلیل خان کے دل میں بہر حال ایک نرم گوشہ تھا اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اڑ کر فرحی کے پاس پہنچ جاتا لیکن یہاں جلیل خان کا ایک کام پھنسا ہوا تھا اور وہ اتنا احسان فراموش ہرگز نہیں تھا کہ جلیل خان کو اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا گو جلیل خان نے اسے رکنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ دراصل جلیل خان نے کچھ گولڈ کا سودا کیا تھا اور خاصی بڑی رقم پھنسا بیٹھا تھا۔ اب نہ وہ پارٹی رقم دے رہی تھی نہ مال...... اس سودے میں جلیل خان کے ساتھ وہ بھی شامل تھا۔ اس لیے اسے مناسب نہیں لگا تھا کہ وہ جلیل خان کو معاملہ سنبھالنے کے لیے اکیلا چھوڑ جائے تاہم وہ تقریباً ہر روز فرحی کو فون کرتا...... اسے تسلی دیتا اور اپنا بہت خیال رکھنے کو کہتا...... معاملہ سیٹ ہوتے ہوتے وقت لگ گیا...... اور یوں خلافِ توقع ہانگ کانگ میں اسے کئی مہینے لگ گئے اور جب وہ واپس آیا تو لاہور میں رکے بغیر سیدھا خانیوال چلا آیا تھا...... فرحی بہت خوش تھی...... اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں بہت اچھی ہو گئی تھی اور چہرے سے مامتا کا جو نور جھلکتا تھا اس نے اسے مبہوت کر دیا تھا۔ کتنے سالوں بعد وہ دل سے ہنسا تھا، اس کے لبوں پر سچی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور وہ خوشی سے لبریز دل لیے فرحی کو والہانہ نظروں سے دیکھتا رہا اور اس خوشی میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا تھا جب فرحی نے بتایا تھا کہ وہ جڑواں بچوں کی ماں بننے والی ہے۔

''کیا واقعی......؟'' اسے یقین نہیں آیا تھا۔

''میں جب پہلی بار ڈاکٹر کے پاس گئی تھی تو اس نے پوچھا تھا کہ کیا ہمارے خاندان میں کسی کے جڑواں بچے بھی ہیں اور جب میں نے بتایا کہ میرا بھائی اور بہن دونوں جڑواں ہیں تب ڈاکٹر نے کہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بھی اپنی والدہ کی طرح جڑواں بچوں کی ماں بنیں۔'' اور اس رات دونوں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو آرام کرنے کے لیے کہتے اور پھر کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتے تھے۔

''اگر اماں زندہ ہوتیں تو وہ بہت خوش ہوتیں۔ انہیں بہت شوق تھا کہ میری شادی ہو، بچے ہوں، میں اکلوتا تھا ناں اور اماں کو بہت چاہ تھی کہ میرے کم از کم تین چار بچے ہوں۔'' وہ افسردگی سے ہنسا تھا۔

نہ فرحی کے والدین زندہ رہے تھے اور نہ اس کے اور اماں کا...... تو پھر پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس رات وہ دونوں روئے بھی تھے اور ہنسے بھی تھے۔ زندگی یک دم بہت خوب صورت ہو گئی تھی۔ خانیوال کے اس چھوٹے سے گھر میں جیسے خوشیوں کی پریاں اتر آئی ہوں، ہر دم رقص کرتی، گاتی ہوئی اور وہ جو ہر وقت اینگری ینگ مین بنا رہتا تھا۔ اب مسکراہٹ اس کے لبوں سے ہٹتی ہی نہیں تھی۔

اس نے فرحی کے ساتھ مل کر آنے والے بچوں کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کی تھی...... وہ گھنٹوں بیٹھے پروگرام بناتے رہتے کہ انہیں اب کیا کرنا ہے...... کہاں رہنا ہے، جلیل خان بھی ڈھیروں تحائف اور مٹھائی لے کر آیا تھا...... اور ان کی خوشی میں برابر کا شریک تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ثمر حیات کوئی بزنس کر لے جبکہ فرحی کی خواہش تھی کہ وہ کوئی جاب کر لے...... آخر ماسٹر کر رکھا تھا اس نے...... بالآخر فیصلہ یہ ہی ہوا کہ وہ کوئی بزنس ہی کرے گا۔

''ٹرن......ٹرن......'' اس کا فون بج رہا تھا۔ وہ ماضی میں سفر کرتا حال میں پہنچ گیا۔ اس نے چونک کر فون اٹھایا اور

دیکھا اسکرین پر بگ با کا نام جگمگا رہا تھا لحہ بھر وہ خالی، خالی نظروں سے یونہی اسکرین کو دیکھتا رہا جیسے ابھی تک وہ وہاں ہی ہو' خانیوال کے اس چھوٹے سے گھر میں...... فون کی بیل مسلسل ہو رہی تھی۔ اس نے ایک جھرجھری سی لے کر فون آن کیا۔

''ثمر حیات کہاں ہو؟'' بگ با کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

''یہاں ہی ہوں بگ باڈی ون میں۔''

''تمہاری ولسن سے ملاقات نہیں ہوئی؟''

''سوری...... بگ با...... ولسن نے مجھے عثمانیہ میں بلایا تھا۔ میں وہاں ولسن کا انتظار کر رہا تھا لیکن مجھے وہاں سے آنا پڑا کیونکہ وہاں عظام بھی تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ لے اور اسے دکھ ہو کہ میں پاکستان میں ہوں اور اسے خبر تک نہیں دی۔''

''آج کل تم عظام کے متعلق کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہے ہو۔'' بگ با کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ اس نے بگ با کے لہجے کے طنز کو نظرانداز کیا۔

''عظام میرے لیے دنیا کی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے بگ با......''

''ایرک بہت ناراض ہو رہا تھا...... یہ ملاقات بہت ضروری تھی ثمر حیات......'' بگ با کا لہجہ قدرے نرم ہوا۔

''میں نے ولسن سے کہا تھا کہ وہ کلفٹن والے کیفے میں آجائے اور میں وہاں دو گھنٹے انتظار کرتا رہا لیکن وہ وہاں نہیں آیا...... دو تین بار میں نے فون بھی کیا...... لیکن دوبارہ اس نے فون ہی اٹینڈ نہیں کیا۔''

''ہاں اس کا مزاج کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ غالباً اس وقت عثمانیہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ تمہارے فون کی وجہ سے اس کا موڈ خراب ہو گیا خیر تم ایسا کرو کہ آج رات آٹھ بجے بالی کے ساتھ ایرک کے بنگلے پر چلے جانا۔'' بگ با کا لہجہ بدستور نرم تھا۔

''وہ تمہیں ایک بریف کیس دے گا وہ لے کر ڈی ون کے لاکر میں رکھ دینا۔''

''بگ با میں نے آپ سے ایک ریکوئسٹ کی تھی کہ میں اب اس دلدل سے نکلنا چاہتا ہوں۔''

''تم نے کبھی دلدل کو دیکھا ہے ثمر حیات؟ شاید نہیں...... لیکن اتنا ضرور جانتے ہو گے کہ جو ایک بار دلدل میں دھنس جاتا ہے تو وہ پھر دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔''

ثمر حیات کا دل لحہ بھر کے لیے ڈوب سا گیا وہ بگ با کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا...... ''تو کیا اب وہ کبھی......'' وہ ایک بار پھر آزمائش پر پورا نہیں اترا تھا فرحی نے کتنا سچ کہا تھا...... وہ صابروں کے قبیلے سے نہیں تھا۔ اس نے صبر نہیں کیا تھا۔ وہ اللہ کی رضا پر راضی نہیں ہوا تھا اور اس نے جلیل خان کو ہی سب کچھ سمجھ لیا تھا...... اس نے اپنا آپ اللہ کے حوالے کرنے کے بجائے جلیل خان کے سپرد کر دیا تھا۔

اس کی خاموشی پر لحہ بھر کے توقف کے بعد بگ با نے کہا۔

''ثمر حیات میں نے تم سے کہا تھا کہ اس پر سوچیں گے۔ فی الحال تو میں یہاں دبئی میں پھنسا ہوں جس بندے سے ملنا تھا وہ ابھی تک مل نہیں رہا...... لیکن میں جلد واپس آجاؤں گا۔''

''یس بگ با......'' اس کی آواز بجھی بجھی سی تھی۔

''ثمر......'' بگ با نے جیسے اس کی اداسی محسوس کر لی تھی۔

''عظام کو اپنی مجبوری مت بناؤ، زیادہ مت سوچا کرو اس کے متعلق۔''

''کیسے نہ سوچوں اس کے متعلق بگ با...... میرا اس کے سوا ہے ہی کون...... اور اس کا بھی میرے سوا کوئی نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔

''ثمر حیات......'' بگ با کچھ کہتے، کہتے خاموش ہو گیا۔

''او کے آٹھ بجے یاد سے ایرک سے ملنے جانا......'' اس نے فون آف کر دیا تو وہ کچھ دیر یونہی فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ اگر بگ بانے اسے ڈی ون میں ٹھہرنے کا حکم نہ دیا ہوتا تو وہ کب کا اپنے گھر جا چکا ہوتا۔ جب سے اس نے عظام کو عثمانیہ میں دیکھا تھا تب سے وہ اس سے ملنے کو بے چین ہو رہا تھا۔ وہ ولسن کے انتظار میں کونے والی ٹیبل پر بیٹھا تھا جب ایک ویٹر ٹرالی پر بڑا سا بلیک فوریسٹ کیک سجائے اس کے پاس سے گزرا تھا۔

''شاید کسی کی برتھ ڈے پارٹی ہے یہاں۔'' اس نے بالکل غیر ارادی طور پر پاس سے گزرتے ویٹر سے کہا تھا جو اس کا صورت آشنا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا اکثر یہی ویٹر اس کی ٹیبل پر سرو کرتا تھا۔

''جی صاحب......''

ویٹر ہلکے سے مسکرایا تھا۔

''کوئی عظام حیات صاحب ہیں۔ ان کا برتھ ڈے ہے آج...... پارٹی نہیں ہے بس گھر کے ہی چند افراد ہیں۔''

اس نے بے اختیار مڑ کر اُدھر دیکھا جدھر ویٹر ٹرالی لے کر گیا تھا اور پھر فوراً ہی رخ موڑ لیا۔ سامنے ہی رواحہ اور اس کے ساتھ غالباً اس کے بابا تھے اور رواحہ کے دائیں طرف عظام تھا...... اس کا آدھا چہرہ نظر آیا تھا اسے...... اس کا دل دھڑ، دھڑ کرنے لگا تھا۔ شکر ہے کہ رواحہ یا عظام نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ تب ہی کچھ لوگ ہوٹل میں داخل ہوئے تھے اور اب درمیان میں کھڑے ٹیبل کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑا رہے تھے وہ فوراً اٹھا تھا اور ان کی آڑ میں باہر نکل آیا تھا۔ اور باہر آ کر ولسن کو فون کر دیا تھا کہ وہ فلاں کیفے میں آ جائے...... ولسن نہیں آیا تھا اور وہ ساری رات بے چین رہا تھا...... کئی بار اس نے عظام کا نمبر ملایا تھا اور پھر دو تین digit ملا کر بند کر دیا۔ اس نے تو کبھی عظام کی سالگرہ کا اہتمام نہیں کیا تھا کبھی اسے وِش نہیں کیا تھا...... شاید وہ اچھا باپ نہیں بن سکا تھا۔ یکا یک اسے پشیمانی نے آ لیا تھا اس نے فون اٹھایا اور نمبر ملانے لگا تب ہی دروازے پر دستک دے کر بالی گھبرایا ہوا سا اندر آیا...... اس نے فون آف کر دیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہ باس، سیمو کو دمے کا اٹیک ہوا ہے...... بہت اوکھی اوکھی سانس لے رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اِن ہیلر کا استعمال نہیں کیا اس نے؟'' وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

''کیا تھا باس کوئی فائدہ نہیں ہوا...... اور اب تو اکھڑی، اکھڑی سانسیں آ رہی ہیں۔'' سیمو کو پچھلے دو تین سال سے دمے کی تکلیف تھی اور کبھی، کبھی تو اٹیک اتنا شدید ہوتا کہ اسپتال لے جانا پڑتا۔

''تم سیمو کو لے کر آؤ میں گاڑی نکالتا ہوں۔'' اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا ابھی صرف چھ بجے تھے۔ وہ میز سے گاڑی کی چابی اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آیا...... وہ اسے ایک پرائیویٹ کلینک میں جو نزدیک ہی تھا لے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے فوراً ہی ٹریٹ منٹ شروع کر دیا تھا تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کی حالت سنبھل گئی تھی...... آٹھ بجے...... اسے ایرک سے بھی ملنا تھا سو وہ وہاں مزید نہیں رکے تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر اور رک جائیں تاکہ طبیعت کچھ اور بہتر ہو جائے...... لیکن مجبوری تھی...... وہ کلینک سے باہر آنے لگا تھا کہ ممتاز خان کا فون آ گیا اور وہ اس سے باتیں کرتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا...... بالی، سیمو کو سہارا دیتا ہوا اس کے ساتھ ہی چل رہا تھا۔

''ٹھیک ہے ممتاز خان ابھی مجھے کہیں جانا ہے، رات میں تفصیل سے بات کروں گا۔'' اس نے فون بند کر کے پاکٹ میں ڈال کر جوں ہی گیٹ سے باہر قدم رکھا ٹھٹک کر رک گیا۔ مقابل بھی اسے دیکھ کر ٹھٹکا تھا اور پھر اس کے لبوں پر بڑی طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی...... اس کے سامنے وہ شخص کھڑا تھا جسے وہ کبھی زندگی میں دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن دنیا واقعی گول ہے...... وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہے تھے۔

''تم......؟'' چند لمحوں بعد ثمر حیات کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

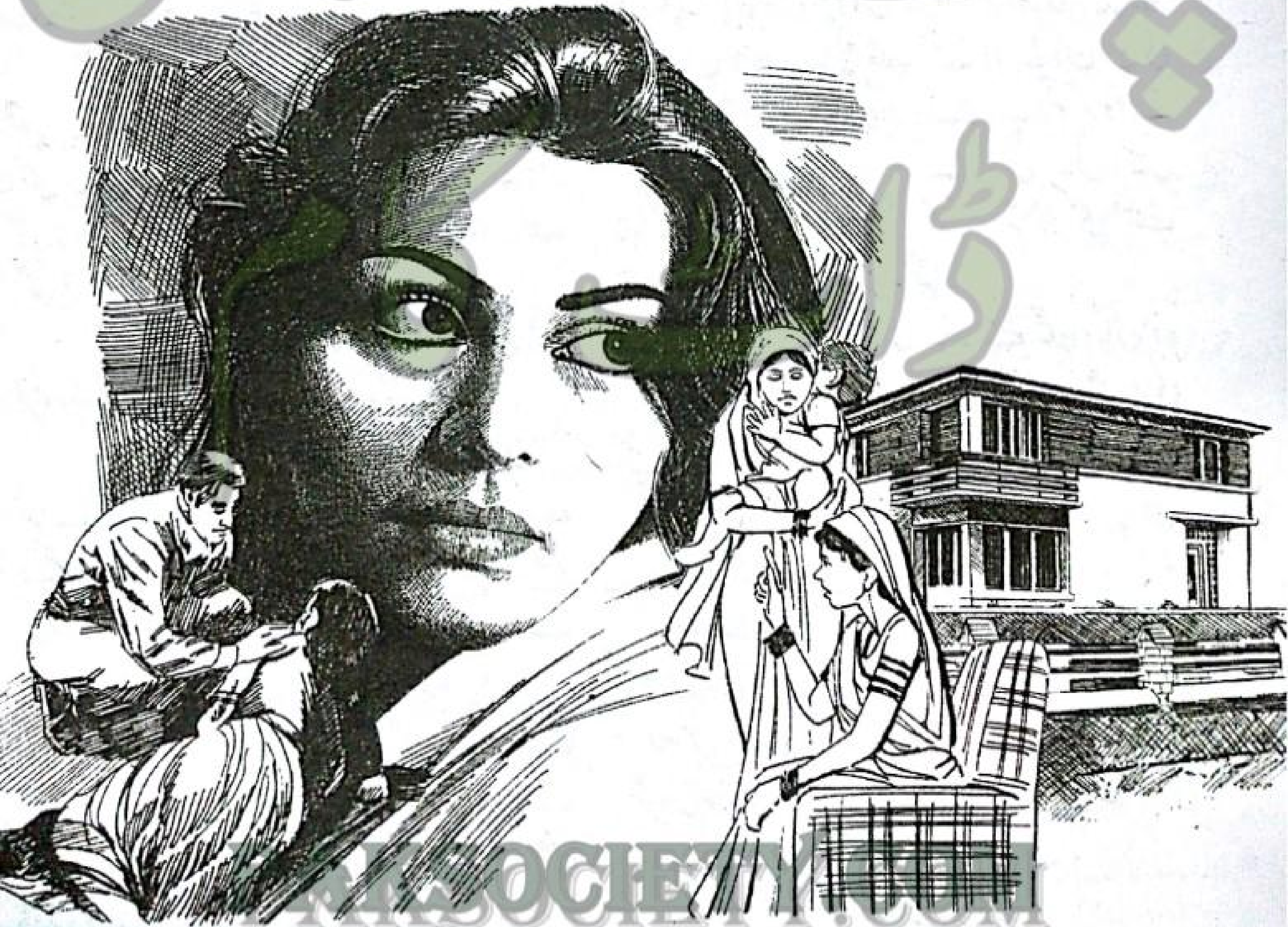
جاری ہے

میرے یار جولاہے

فرحین اظفر

گھر کے کسی کونے سے بیگم اسما جہانگیر کے چلّانے کی آوازیں کافی دیر سے آرہی تھیں۔ وہ جانتے تھے وہ اتنی جلدی تھکنے والی نہیں البتہ خود ان کو اپنے روم، روم میں اترتی تھکن کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی کسی افسوس بھرے پچھتاوے کی دھند میں لپٹا ایک بہت مانوس، بہت پرانا اور جانا پہچانا احساس انہیں گھیرے میں لے رہا تھا۔

سامنے ٹیبل پر رکھی چائے میں سے بھاپ اٹھنا



بند ہو چکی تھی۔ انہوں نے کپ کی طرف ایک نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے برعکس اس کپ کے علاوہ لاؤنج میں موجود ہر چیز پر اُن کی نظریں ایک عجیب سے خالی پن کے ساتھ بھٹک رہی تھیں۔ ان بے چین پتلیوں کے پیچھے بتیس سال پرانے منظروں کی اڑتی دھول تھی۔ لحظہ بہ لحظہ منظر دھندلا رہا تھا اور چنگھاڑتی ہوئی اسما جہانگیر کی آواز اس منظر کو بار، بار صاف کر دیتی تھی۔

''اماں......اماں بہت اچھی ہے وہ۔ بہت خوش اخلاق، ملنسار۔'' ایک بار پھر پیش منظر دھندلا اور پس منظر زندہ ہونے لگا۔

''اچھا مجھے تو وہ اچھی اور ملنسار کے بجائے کچھ اور لگ رہی ہے۔'' اماں کی کاٹ دار اور طنزیہ باتوں سے تو ایک زمانہ عاجز تھا۔ وہ تو پھر عجز و انکسار کا مثالی نمونہ تھے۔

''اماں! کیوں کرتی ہیں ایسی باتیں۔'' بہت بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

''لو بس......جو گھر میں آئی نہیں اس کے قصیدے زبان پر پہلے چڑھ گئے اور اماں کی باتیں ابھی سے ایسی ویسی لگنے لگیں۔'' اماں کی پاٹ دار آواز ان کے لب کھلتے ہی آس پاس کے گھروں تک گونج جاتی تھی۔

''صاحب جی!'' ان کی ادھ کھلی آنکھوں میں مُردہ ہوتی بصارت ایک دم زندہ ہوگئی۔

''چائے ٹھنڈی ہوگئی دوسری لا دوں؟'' سامنے کُل وقتی ملازمہ کھڑی تھی، وہ چند لمحے اسے دیکھتے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ شعور کی سطح کو کسی نے بتیس سال پہلے کی گرہوں سے باندھ رکھا تھا۔ مکمل حواس جاگنے میں ذرا دیر لگی۔

اسما جہانگیر کی آواز بند ہو چکی تھی۔ گھر میں بولتا سناٹا بڑا غیر معمولی اور تکلیف دہ حد تک چبھن آمیز تھا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر خود پر پڑی ماضی کی گرد جھاڑی۔ عابدہ ابھی تک انتظار میں کھڑی تھی۔

''نہیں بس رہنے دو، تم جا کر سو جاؤ اب۔''

انہوں نے ہاتھ میں پکڑی عینک سامنے گلاس ٹاپ ٹیبل پر رکھ دی اور وہیں پیر پھیلا کر نیم دراز ہوتے ہوئے ماضی کی بھول بھلیوں میں اتر گئے۔ اب جانے کب تک انہیں بھٹکنا تھا۔

☆☆☆

اسما کو شکایت تھی کہ گھر میں ان کا اس طرح استقبال نہیں کیا گیا جس طرح ایک نئی نویلی دلہن کا کیا جانا چاہیے تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ اس گھر کی پہلی اور بڑی بہو تھی۔ جہانگیر سمجھتے تھے لیکن کچھ بول نہیں سکے۔

''تم جانتی ہو، اماں اور نگین اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھیں۔ اب اتنی ناراضی تو دکھائیں گی ناں۔ چھوٹی بہنیں بھی ان کے کہنے میں ہیں تو......''

''تو آپ پہلے انہیں منا لیتے پھر شادی ہو جاتی۔'' اسما دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئیں کہ نئی نویلی دلہن کا حجاب مانع تھا۔ آنے والے دن ان کی زندگی میں تلخیوں کے کون سے نئے باب رقم کروانے والے تھے اس حقیقت سے بے خبر فی الحال انہیں جہانگیر کی محبت اور زندگی بھر کا ساتھ کسی نعمتِ خداوندی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

جہانگیر ...سے شادی سے پہلے تین سال وہ اپنے ایک کزن سے منسوب اور اس کی محبت میں بری طرف گرفتار رہی تھیں خاندان میں چپقلش کی بِنا پر منگنی ٹوٹی اور ساتھ ان کا دل بھی۔

جہانگیر اسے نوکری کے پہلے دن سے پسند کرتے تھے۔ منگنی ختم ہونے کی خبر کے ساتھ ہی انہوں نے اسما کو اپنانے کی پُرخلوص کوششیں شروع کر دیں اور بالآخر کامیاب بھی ہوئے۔ اسما بھی شروع، شروع میں راضی نہیں تھیں مگر پھر جہانگیر کی محبت اور اصرار کے آگے مانتے ہی بنی۔

☆☆☆

اسما کی سسرال وہی روایتی سسرال تھی۔ تین بہنوں اور تین بھائیوں میں جہانگیر سب سے بڑے تھے سو خود بخود بھائیوں کی تعلیم اور بہنوں کی شادی کی ذمے داری بھی انہی کے سر پر آ گئی تھی۔ کچھ وہ زمانہ اتنا مہنگا بھی نہیں تھا اور کچھ تنخواہ اور نوکری معقول تھی اس لیے گزارہ چلتا رہا۔

گھر میں اماں اور ان کے بعد نگین کی حکومت چلتی تھی۔ اسما کے آنے کے بعد انہوں نے سب کام کاج پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اسما نے سب کا دل جیتنے کے لیے کچن کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔

اماں کو اس کی نوکری پر سخت اعتراض تھا۔ وہ صبح اس کے نکلتے وقت گھر سے بن ٹھن کر نکلنے والی عورتوں کے متعلق اخلاق سے گری ہوئی باتیں بہت جلدی کرنے لگیں۔ انہوں نے چند دن بھی اس کے دلہناپے کا بھرم نہیں رکھا تھا۔

اسما سے شروع میں سب سننا اور برداشت کرنا بہت مشکل ہوا۔ ایک دو بار اس نے کچھ بولنے کی کوشش بھی کی۔ اماں نے صبح صبح وہ طوفان اٹھایا کہ اللہ کی پناہ۔

''دیکھا، دیکھا...... کھل گئے خوش اخلاقی کے تالے۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ ان نوکری پیشہ عورتوں کی زبانیں دو دھاری تلواریں ہوتی ہیں۔''

''اماں......!'' وہ حیرت سے انہیں تکنے لگی۔

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟''

''اسما!'' جہانگیر نے بڑھ کر اس کا ہاتھ دبایا۔ ''چلو دیر ہو رہی ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گھسٹتی چلی گئی۔

''میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ سب عورتیں برابر نہیں ہوتیں۔'' بائیک پر اس کے پیچھے وہ دلگرفتہ سی بیٹھی تھی۔ جہانگیر جانتا تھا۔ وہ زبان دراز ہے نہ بدتمیز مگر اپنی اماں کے آگے اس کی حمایت کر کے مزید طوفان کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

زندگی نے کسی تیز رفتار ٹرین کی طرح معمول کی رفتار پکڑی تھی۔ صبح سے شام آفس میں ہوتی پھر واپسی پر دن بھر کے گندے برتنوں کا ڈھیر اور اپنا پھیلا ہوا گھر اس کا منتظر ہوتا۔

اس کی تھکن کئی گنا بڑھ جاتی۔ گھر آتے ہی کھانے کی تیاری میں لگنا پڑتا۔ دو ٹائم کا کھانا ایک ہی وقت تیار کر کے وہ صبح ناشتے کے لیے انڈوں کا آمیزہ تک ریڈی کر دیتی۔ رات کو سب گھر والوں کو چائے اور اماں کو نیم گرم دودھ دے کر کمرے میں جاتی تو جسم کا جوڑ، جوڑ فریاد کرتا۔ ایسے میں جہانگیر کی قربت کی خواہش اس کی اپنی ہوتی یا جہانگیر کی...... نیند سے بوجھل جڑتی پلکوں اور تھکے ماندے دماغ کے آگے بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔

جہانگیر کبھی تو خود بھی جلدی نیند کی آغوش میں چلے جاتے کبھی بے بسی سے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ تکتے اس کے مدہوش وجود میں اپنی محبت کی باقیات تلاش کرتے اور اکثر ناکام رہے۔

☆☆☆

''تم لوگ بچوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے اسما؟'' قدرے سکون کے دن تھے۔ نگین کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہوئے ابھی چند دن گزرے تھے۔

''کیا کریں گے سوچ کر بھی۔ اپنی تھکن میں اضافہ۔'' اس نے مایوسی سے کہتے ہوئے اپنی ہمدرد دوست کو دیکھا۔

''یہ کیا بات ہوئی، بچوں کی خواہش کس کو نہیں ہوتی اور بچے ہوں گے تو لائف میں بڑا چینج آئے گا یار۔''

''میری لائف میں کوئی بھی چینج منفی تو ہو سکتا ہے مثبت نہیں۔'' سوچیں بہت تیزی سے مایوسی کے رنگ میں رنگ رہی تھیں۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو اور کیوں کہہ رہی ہو؟'' نازش شاید اس سے بحث کے موڈ میں تھی۔ اس نے بیزاری سے آنکھیں موند لیں۔

بند ہو چکی تھی۔ انہوں نے کپ کی طرف ایک نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے برعکس اس کپ کے علاوہ لاؤنج میں موجود ہر چیز پر اُن کی نظریں ایک عجیب سے خالی پن کے ساتھ بھٹک رہی تھیں۔ ان بے چین پتلیوں کے پیچھے بتیس سال پرانے منظروں کی اڑتی دھول تھی۔ لحظہ بہ لحظہ منظر دھندلا رہا تھا اور چنگھاڑتی ہوئی اسما جہانگیر کی آواز اس منظر کو بار، بار صاف کر دیتی تھی۔

''اماں......اماں بہت اچھی ہے وہ۔ بہت خوش اخلاق، ملنسار۔'' ایک بار پھر پیش منظر دھندلا اور پس منظر زندہ ہونے لگا۔

''اچھا! مجھے تو وہ اچھی اور ملنسار کے بجائے کچھ اور لگ رہی ہے۔'' اماں کی کاٹ دار اور طنزیہ باتوں سے تو ایک زمانہ عاجز تھا۔ وہ تو پھر عجز و انکسار کا مثالی نمونہ تھے۔

''اماں! کیوں کرتی ہیں ایسی باتیں۔'' بہت بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

''لو بس......جو گھر میں آئی نہیں اس کے قصیدے زبان پر پہلے چڑھ گئے اور اماں کی باتیں ابھی سے ایسی ویسی لگنے لگیں۔'' اماں کی پاٹ دار آواز ان کے لب کھلتے ہی آس پاس کے گھروں تک گونج جاتی تھی۔

''صاحب جی!'' ان کی ادھ کھلی آنکھوں میں مُردہ ہوتی بصارت ایک دم زندہ ہوگئی۔

''چائے ٹھنڈی ہوگئی دوسری لادوں؟'' سامنے کُل وقتی ملازمہ کھڑی تھی، وہ چند لمحے اسے دیکھتے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ شعور کی سطح کو کسی نے بتیس سال پہلے کی گرہوں سے باندھ رکھا تھا۔ مکمل حواس جاگنے میں ذرا دیر لگی۔

اسما جہانگیر کی آواز بند ہو چکی تھی۔ گھر میں بولتا سناٹا بڑا غیر معمولی اور تکلیف دہ حد تک چبھن آمیز تھا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر خود پر پڑی ماضی کی گرد جھاڑی۔ عابدہ ابھی تک انتظار میں کھڑی تھی۔

''نہیں بس رہنے دو، تم جاکر سوجاؤ اب۔''

انہوں نے ہاتھ میں پکڑی عینک سامنے گلاس ٹاپ ٹیبل پر رکھ دی اور وہیں پیر پھیلا کر نیم دراز ہوتے ہوئے ماضی کی بھول بھلیوں میں اتر گئے۔ اب جانے کب تک انہیں بھٹکنا تھا۔

☆☆☆

اسما کو شکایت تھی کہ گھر میں ان کا اس طرح استقبال نہیں کیا گیا جس طرح ایک نئی نویلی دلہن کا کیا جانا چاہیے تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ اس گھر کی پہلی اور بڑی بہو تھی۔ جہانگیر سمجھتے تھے لیکن کچھ بول نہیں سکے۔

''تم جانتی ہو، اماں اور نگین اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھیں۔ اب اتنی ناراضی تو دکھائیں گی ناں۔ چھوٹی بہنیں بھی ان کے کہنے میں ہیں تو......''

''تو آپ پہلے انہیں منا لیتے پھر شادی ہوجاتی۔'' اسما دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئیں کہ نئی نویلی دلہن کا حجاب مانع تھا۔ آنے والے دن ان کی زندگی میں تلخیوں کے کون سے نئے باب رقم کروانے والے تھے اس حقیقت سے بے خبر فی الحال انہیں جہانگیر کی محبت اور زندگی بھر کا ساتھ کسی نعمتِ خداوندی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

جہانگیر...سے شادی سے پہلے تین سال وہ اپنے ایک کزن سے منسوب اور اس کی محبت میں بری طرف گرفتار رہی تھیں خاندان میں چپقلش کی بنا پر منگنی ٹوٹی اور ساتھ ان کا دل بھی۔

جہانگیر اسے نوکری کے پہلے دن سے پسند کرتے تھے۔ منگنی ختم ہونے کی خبر کے ساتھ ہی انہوں نے اسما کو اپنانے کی پُرخلوص کوششیں شروع کردیں اور بالآخر کامیاب بھی ہوئے۔ اسما بھی شروع، شروع میں راضی نہیں تھیں مگر پھر جہانگیر کی محبت اور اصرار کے آگے مانتے ہی بنی۔

☆☆☆

اسما کی سسرال وہی روایتی سسرال تھی۔ تین بہنوں اور تین بھائیوں میں جہانگیر سب سے بڑے تھے سو خود بخود بھائیوں کی تعلیم اور بہنوں کی شادی کی ذمے داری بھی انہی کے سر پر آ گئی تھی۔ کچھ وہ زمانہ اتنا مہنگا بھی نہیں تھا اور کچھ تنخواہ اور نوکری معقول تھی اس لیے گزارہ چلتا رہا۔

گھر میں اماں اور ان کے بعد نگین کی حکومت چلتی تھی۔ اسما کے آنے کے بعد انہوں نے سب کام کاج پر سے ہاتھ اٹھالیا۔ اسما نے سب کا دل جیتنے کے لیے کچن کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔

اماں کو اس کی نوکری پر سخت اعتراض تھا۔ وہ صبح اس کے نکلتے وقت گھر سے بن ٹھن کر نکلنے والی عورتوں کے متعلق اخلاق سے گری ہوئی باتیں بہت جلدی کرنے لگیں۔ انہوں نے چند دن بھی اس کے دلہناپے کا بھرم نہیں رکھا تھا۔

اسما سے شروع میں سب سننا اور برداشت کرنا بہت مشکل ہوا۔ ایک دو بار اس نے کچھ بولنے کی کوشش بھی کی۔ اماں نے صبح صبح وہ طوفان اٹھایا کہ اللہ کی پناہ۔

''دیکھا، دیکھا...... کھل گئے خوش اخلاقی کے تالے۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ ان نوکری پیشہ عورتوں کی زبانیں دودھاری تلواریں ہوتی ہیں۔''

''اماں......!'' وہ حیرت سے انہیں تکنے لگی۔

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟''

''اسما!'' جہانگیر نے بڑھ کر اس کا ہاتھ دبایا۔ ''چلو دیر ہو رہی ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گھسٹتی چلی گئی۔

''میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ سب عورتیں برابر نہیں ہوتیں۔'' بائیک پر اس کے پیچھے وہ دلگرفتہ سی بیٹھی تھی۔ جہانگیر جانتا تھا۔ وہ زبان دراز ہے نہ بدتمیز مگر اپنی اماں کے آگے اس کی حمایت کر کے مزید طوفان کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

زندگی نے کسی تیز رفتار ٹرین کی طرح معمول کی رفتار پکڑی تھی۔ صبح سے شام آفس میں ہوتی پھر واپسی پر دن بھر کے گندے برتنوں کا ڈھیر اور اپنا پھیلا ہوا گھر اس کا منتظر ہوتا۔

اس کی تھکن کئی گنا بڑھ جاتی۔ گھر آتے ہی کھانے کی تیاری میں لگنا پڑتا۔ دو ٹائم کا کھانا ایک ہی وقت تیار کر کے وہ صبح ناشتے کے لیے انڈوں کا آمیزہ تک ریڈی کر دیتی۔ رات کو سب گھر والوں کو چائے اور اماں کو نیم گرم دودھ دے کر کمرے میں جاتی تو جسم کا جوڑ، جوڑ فریاد کرتا۔ ایسے میں جہانگیر کی قربت کی خواہش اس کی اپنی ہوتی یا جہانگیر کی...... نیند سے بوجھل جڑتی پلکوں اور تھکے ماندے دماغ کے آگے بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔

جہانگیر کبھی تو خود بھی جلدی نیند کی آغوش میں چلے جاتے کبھی بے بسی سے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ تکتے اس کے مدہوش وجود میں اپنی محبت کی باقیات تلاش کرتے اور اکثر ناکام رہتے۔

☆☆☆

''تم لوگ بچوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے اسما؟'' قدرے سکون کے دن تھے۔ نگین کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہوئے ابھی چند دن گزرے تھے۔

''کیا کریں گے سوچ کر بھی۔ اپنی تھکن میں اضافہ۔'' اس نے مایوسی سے کہتے ہوئے اپنی ہمدرد دوست کو دیکھا۔

''یہ کیا بات ہوئی، بچوں کی خواہش کس کو نہیں ہوتی اور بچے ہوں گے تو لائف میں بڑا چینج آئے گا یار۔''

''میری لائف میں کوئی بھی چینج منفی تو ہو سکتا ہے مثبت نہیں۔'' سوچیں بہت تیزی سے مایوسی کے رنگ میں رنگ رہی تھیں۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو اور کیوں کہہ رہی ہو؟'' نازش شاید اس سے بحث کے موڈ میں تھی۔ اس نے بیزاری سے آنکھیں موند لیں۔

اب وہ نازش کو کیا بتاتی۔ اس کی ساس نوکری کرنے پر جتنی مرضی تنقید کریں' اس کا نوکری چھوڑنا ہرگز برداشت نہیں کریں گی۔ ابھی انہیں دو بیٹیاں اور بیاہنی تھیں اور دو بیٹوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا تھا۔ جو دنیا میں پہلے سے موجود ہیں ان کے جھمیلوں سے نمٹنے کے لیے اسما کی جان کم پڑ رہی ہے۔ مزید کسی اور کو دنیا میں لانے کی ہمت وہ کہاں سے لائے۔

کبھی کبھی اسے لگتا قسمت نے اسے کسی کولہو سے جوڑ دیا ہے۔ اپنی آنکھوں پر اندھی پٹی چڑھائے اسے اس کے گرد گھومنا ہے زندگی بھر۔ صبح سے رات تک کی انتھک قیدِ بامشقت میں اولاد جیسی نرم و نازک احساسات سے جڑی خواہش کا وقت ہی کہاں نکلتا تھا لیکن قسمت کو شاید کچھ اور منظور تھا۔

☆☆☆

جہانگیر چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا اور وہ اس کے چہرے کے پل، پل بدلتے رنگ دیکھتی رہی۔ ان رنگوں میں کوئی رنگ خوشی کا نہ تھا۔

''کیا ہوا؟''

''تمہیں احتیاط کرنی چاہیے تھی۔'' بالآخر امیدوں پر جلتا پانی پڑا۔

''اب تو ......ہو گیا ناں۔'' دل میں خوشی کا احساس کسی ڈرے سہمے بچے کی طرح کسی کونے میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا اب تو......؟'' انہیں سخت اعتراض تھا۔ ''ایسے کہہ رہی ہو جیسے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''تو......آپ کیا کرنے کا سوچ رہے ہیں؟''

اس کی سرسراتی آواز میں آگہی کا کرب تھا۔ وہ جانتی تھی جہانگیر مجبور ہے مگر بعد میں اسے وہم گزرا شاید وہ بے حس بھی ہے۔

تین دن دو راتیں اسپتال کے خنک کمرے میں وہ اکیلی رہی بہن کے گلے لگ کر سسکیاں لیتی رہی۔ اماں صرف اسے لے جانے کے لیے آئیں اور راستے میں کئی بار سر سے بلا ٹل جانے پر شکر ادا کیا۔ بہ آواز بلند یوں آہیں بھرتی رہیں جیسے نادانستگی میں سب کچھ سرزد ہو گیا۔

''شکر تھا کہ میں نے جہانگیر کو بتانے میں دیر نہ کی ورنہ شاید جان سے جاتی۔'' دن رات۔ کے سلگتے پہروں میں اس نے سنگدلی کی انتہا کرتے ہوئے یہاں تک سوچ ڈالا اور کرتی بھی کیا۔

☆☆☆

نگین کے بیٹے کی ولادت اور مہرین کی شادی...... دو خرچے ایک ساتھ نکلے اور اس کی تین سال سے ڈالی گئی کمیٹی کی رقم پھر ہو گئی۔

''کب تک چلے گا اس طرح؟'' وہ زندگی میں پہلی بار جہانگیر سے لڑ پڑی۔

''خرچ تو زندگی کے ساتھ ہی چلتے ہیں اسمی۔'' جہانگیر کی آواز پست تھی۔

''تو میری بھی کوئی زندگی ہے۔ کوئی خواب، خواہش، ارمان ہے کہ نہیں۔ کیا، کیا نہیں سوچا تھا میں نے۔ میری بہن بن بیاہی کنواری بیٹھی ہے۔ اس کے لیے بھی مجھے ہی کرنا ہے۔ میرا تو کوئی بھائی بھی نہیں۔ آخر آپ کو نظر کیوں نہیں آتا اور اگر نظر آتا ہے تو بولتے کیوں نہیں؟'' اس نے پلٹ کر دیکھا جہانگیر نیند کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ بے بسی سی بے بسی تھی۔ اس نے سخت جھلا کر کانچ کے گلاس پر ہاتھ مارا چھناکے کی زوردار آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھے پھر معاملہ سمجھ کر اسے گھورا۔

''آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اور بھی بہت کچھ کہتے رہے وہ دیکھتی، سنتی رہی پھر ان کے کروٹ بدلنے پر پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی۔

☆☆☆

''زندگی سمجھوتوں سے عبارت ہے۔'' اس نے پوری زندگی میں، زندگی کا جتنا بھی فلسفہ سنا تھا صرف

اسی پر اعتبار آ گیا تھا......

''زندگی ایک سفر مسلسل ہے۔ جس کی منزل یا تو موت ہے یا لاحاصل تھکن۔'' اس نے اعصاب کو پُرسکون کرنے کے لیے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''ہر مہینے پابندی سے مساج لیا کریں۔ آپ کی اسکن بہت رف اور ڈل ہو رہی ہے۔''

''یہاں تو پوری حیاتی رف اور ڈل ہو گئی...... صرف اسکن ؟''

اعصاب پُرسکون کرنا اور ذہن کو سوچوں سے آزاد کرنا اتنا بھی آسان نہ تھا۔ باہر بائیک پر جہانگیر اس کے منتظر تھے۔ اس نے بیوٹی سیلون کے دروازے پر رک کر دور سے اسے دیکھا۔ سر جھکائے سوچوں میں گم ایک پژمردہ وجود، یہ وہ شخص نہیں تھا جس نے شادی سے پہلے اعتبار، اعتماد اور تحفظ بخشنے کے بلند و بانگ دعوے کیے تھے۔ یہ تو کوئی اور ہی وجود تھا۔ جس کی آنکھوں میں محبت کے نہیں بیزاری کے رنگ تھے اور جس کے اندر اپنے وعدے پورے کرنے کی سکت نہیں بچی تھی۔ جس کے دعوے منہ کے بل گر پڑے تھے۔

وہ چپ چاپ جا کر بائیک پر بیٹھ گئی۔ دائیں پہلو میں درد کی لہر اٹھی اور ذہن میں ایک دل دُکھاتا واقعہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ تازہ ہو گیا۔

''یہ روٹیاں ہیں تمہاری شکل کی طرح کالی۔ یہ...... یہ سالن بنایا ہے پھیکا سیٹھا نہ روغن نہ ذائقہ۔'' انہوں نے چینی کی بھاری رکابی اٹھا کر دور پھینکی اور باورچی خانے سے نکلتی اسما بچتے، بچتے بھی اس کی زد میں آ گئی۔

''سی...... ی۔'' صرف تصور سے ہی اس کی سسکاری نکل گئی۔

بائیک ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا گھر آ چکا تھا۔ ایک ایسا گھر جو خوشی، سکون اور تحفظ کے بجائے بے چینی، گھٹن اور دکھ کا مسکن تھا۔

ہاں اس دن اماں کے طعنے کا اثر ہوا تو صرف اتنا جہانگیر آفس سے اٹھا کر اسے فیشل کروانے اس پارلر لے آئے تھے۔ ماں کے کہنے پر ہی سہی شاید اسے احساس ہوا تھا کہ اسما کی کھلتی گندمی رنگت سنولا گئی ہے۔ مرے، مرے قدموں سے صحن پار کرتی اسما کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس احساس کے اچانک جاگ پڑنے پر روئے یا ہنسے۔

☆☆☆

ہمایوں کو نوکری ملی تو اس نے بھی اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنے کا شور مچا دیا۔

''میرا خیال تھا ہمایوں کی شادی میں اپنی عظمیٰ سے کروا دیتی۔'' اماں کے سامنے تو زبان کھولنے کی جرأت نہ تھی اور دکھ سکھ کہنے سننے والی اس کی مخلص دوست بیاہ کر دوسرے شہر جا چکی تھی۔ لے دے کر ایک جہانگیر بچے تھے حیران نظروں سے اسے تک رہے تھے۔

''دس سال اس گھر میں جھونک کر بھی تم اپنی بہن کو یہاں کھپانا چاہتی ہو؟''

''ہاں تو میں نے اس گھر کی اتنی خدمت کی ہے۔ آپ کے بہن بھائیوں کی، آپ کی ماں کی کتنی باتیں سنی ہیں۔ کڑوی کسیلی برداشت کی ہے اسی کے بدلے کی آس میں کہہ رہی ہوں اور میری بہن شکل صورت، تعلیم سگھڑاپا کسی چیز میں کسی سے کم تو نہیں۔''

مگر سب بیکار ہی گیا۔ جہانگیر جانتے تھے سمجھتے تھے۔ ہمایوں سے کچھ بھی کہنا بیکار ہو گا۔ اس کی زبان پر جہانگیر کی مثال تھی۔

''بھیا نے بھی تو کی تھی اپنی پسند کی شادی تو میں کیوں نہیں؟'' اسما سن کر چپ کر گئی۔ بول کر بات گنوانے سے خاموش رہنا بہتر ہوتا ہے۔ اس نے بھی ایک چپ والے مقولے پر عمل کیا۔

جہانگیر نے عظمیٰ کے لیے خود رشتہ ڈھونڈ کر اس کی شادی کروائی اور پوری زندگی میں یہ واحد چیز تھی جس کے لیے وہ صحیح معنوں میں ان کی شکر گزار تھی۔

تینوں نندیں اپنے گھر بار کی ہوئیں اور دیور ہاتھ بٹانے کے قابل ہوئے تب تک وقت بہت آگے نکل چکا تھا۔

''آئی ایم سوری۔'' اس کی آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔

ڈاکٹر کے لبوں سے نکلنے والا جملہ تیر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہوگیا۔ اسے یوں لگا بھری دنیا میں وہ تن تنہا کھڑی رہ گئی۔ کسی نے اسے سر سے چادر کھینچ کر دھوپ بھری تپتی دوپہر میں دھکیل دیا ہے۔

رپورٹس اٹھاتے ہوئے جہانگیر کے ہاتھ کانپ گئے اور زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ جب وہ ہمیشہ کی طرح کھوکھلی تسلی کے چند سکے اس کے خالی دامن میں ڈال رہے تھے تو اس نے اپنا دامن سمیٹ لیا۔

''یہ سب تمہارا اور تمہارے گھر والوں کا قصور ہے۔'' وہ اتنی زور سے چلائی کہ حلق میں خراشیں سی پڑ گئیں۔

''کیوں کی تھی تم نے مجھ سے شادی؟ اس لیے...... اس لیے مجھے برباد کرنے کے لیے...... بولو کیا ملا تمہیں میری زندگی سے کھیل کر...... بولو؟'' اس نے جہانگیر کا گریبان تھام لیا اور جہانگیر نے دھندلائی آنکھوں سے اس کا وحشت بھرا چہرہ دیکھا۔

وہ چہرہ کیسا تھا۔ کسی لٹے پٹے مسافر کا چہرہ۔ کسی رہزن کو رہنما سمجھ کر دھوکے میں آجانے والے کا چہرہ۔ خوش قسمتی کی دیوی کے گمان میں چھل پیری کے تعاقب میں چل پڑنے والے کا چہرہ۔ جھلتے ریگستان میں سراب کے پیچھے بھاگنے والے کا چہرہ جو تھک کر تپتی ریت پر گرا آخری سانسیں گن رہا تھا۔

''ارے برباد تو میرا بیٹا ہوا ہے اولاد کو ترس گیا۔'' اماں نے ہر بار کی طرح بات کے درمیان میں آنے کی کوشش کی۔ وہ ہمیشہ یونہی کسی قسم کی جواب طلبی پر جہانگیر کی ڈھال بننے کے لیے گولہ باری کرکے اسما کو چپ کروا دیا کرتی تھیں لیکن آج شاید یہ سورج کہیں اور سے طلوع ہوا تھا۔

''آپ ہمارے ذاتی معاملے میں مت بولیں۔''

''ارے واہ...... کیوں نہ بولوں؟'' وہ تنک گئیں۔

''کیونکہ آپ کو کوئی حق نہیں ہے ہمارے کسی بھی معاملے میں بولنے کا اور اگر آپ کو بولنا ہی تھا تو اس وقت آپ کیوں چپ رہیں جب آپ کا بیٹا اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد ختم کر رہا تھا۔ تب آپ کو اپنی اولاد کی فکر تھی تب آپ کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ دنیا میں آنے والا وجود بھی آپ کی اولاد، آپ کا خون ہوگا اور اب بھی...... آج بھی آپ کو اپنے بیٹے کی بے اولادی کا غم ہے اور ایک عورت کے درد کا کوئی احساس نہیں۔ جس کا وجود آپ کے گھر کے مسائل نمٹاتے، نمٹاتے ادھورا رہ گیا۔ آپ کو اب بھی میرا نہیں اپنے بیٹے کا احساس ہے...... اور آپ کا بیٹا...... وہ بے حس ہے...... ہاں وہ بے حس اپنی بیوی کا دکھ کیا بانٹے گا جو اسے سمجھنے والا دل ہی نہیں رکھتا۔'' وہ بری طرح ہانپ گئی۔ اماں کان دبا کر کمرے میں گھس گئیں۔

اس کی دیورانی نے ٹھنڈے پانی کا گلاس لاکر اس کے لبوں سے لگایا اور اس کا سر سینے سے لگا کر تھپکنے لگی۔ اس عورت کو گھر میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر وہ اپنی جیٹھانی کی بے قدری کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد شوہر کو لے کر الگ ہونے کے منصوبے بنا رہی تھی۔

اسما کو فی الحال وہی کندھا میسر تھا سو وہ رشتوں کی ساری نزاکتوں کو بالائے طاق رکھ کر دیر تک سسکتی رہی۔ یوں لگتا تھا اگر آج بھی نہ روئی تو شدتِ ضبط سے پتھرا جائے گی۔

☆☆☆

چھوٹے دیور کو شادی کے بعد ساتھ رکھنے کے لیے اوپری منزل تعمیر کروائی گئی۔ جہانگیر کو آفس سے لون لینا پڑا مگر اس نے بھی ساتھ رہنا گوارا نہ کیا۔

''آپ کرایے دار رکھ لیں جہانگیر بھائی اماں کا آپ کو پتا ہے زبان کی کتنی کڑوی ہیں اور ماہا کا

مزاج ایسا نہیں کہ وہ ان کو زیادہ برداشت کرے۔ ''بڑے بھائیوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس نے بھی اپنے جیون ساتھی کا انتخاب خود کیا تھا۔ بہنوں کو کبھی کبھی بڑا قلق ہوتا کہ پسند کی شادی کے لطف سے وہ لوگ کیوں بہرہ مند نہ ہو سکیں اور بھائیوں نے گھر، گھر جا کر لڑکیاں دیکھنے اور مسترد کرنے کا کھیل بھی انہیں نہ کھیلنے دیا۔

ہر ہفتے وہ لوگ گھر میں جمع ہوتیں۔ بھاوجوں کی ہنسی اڑائی جاتی۔ بیٹیاں بالکل اماں کا پرتو تھیں۔ اتنے برس کی اسما کی خدمتوں کا یہ صلہ تھا کہ آج بھی اس گھر میں اس کی حیثیت ایک چلتی مشین سے زیادہ نہ تھی۔ جس کو توجہ صرف اسی وقت عنایت کی جاتی جب کام چلنا بند ہو جاتا۔

اب بھی وہ دو دن سے بخار میں تپتی آفس جارہی تھی لیکن کسی کو خیال تک نہ آیا تھا لیکن آج آفس سے واپسی پر دیر ہوگئی تو سب کی زبانیں چل پڑیں۔

ہفتہ واری تعطیل پر نندیں جمع تھیں۔ کھانا پکانے کے لیے آج بھی اس کی محتاجی تھی۔ سوجی جان سے انتظار ہو رہا تھا لیکن دو گھنٹے گزر گئے اس کی آمد کے آثار نہ تھے۔ جہانگیر بھی ساتھ ہی آتے تھے آج وہ بھی غائب تھے۔ چاروناچار نگین اور مہرین کو کچن میں لگنا پڑا۔

جس وقت انہوں نے گھر میں قدم رکھا۔ کھانا کھانے کے بعد دسترخوان سمیٹا جارہا تھا جس گھر میں کبھی اس کے ہاتھ کے علاوہ کسی اور نے چولھا تک نہ جلایا تھا آج اسی گھر میں اس کا انتظار تو دور کی بات کسی نے فون کر کے خیریت تک نہ پوچھی۔ جہانگیر کو گھر کی چہل پہل چبھ سی گئی۔ جو خبر وہ ساتھ لائے تھے کسی کو بھلا یہاں اس کا انتظار بھی تھا؟

سب کو سلام کرتے وہ اسما کا ہاتھ پکڑ کر سیدھا کمرے میں لے گئے۔

''کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ نہ کل سے آفس جانے کی۔'' برسوں بعد اس کے لہجے میں وہی توجہ اور محبت بول رہی تھی جب اس کی منتظر سماعتیں بہری اور بصارتیں اندھی ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

جہانگیر نے خود شہر کی معروف اور جانی پہچانی گائناکولوجسٹ سے اس کا علاج کروایا تھا۔ اس کی چاہت اور خدا سے دعاؤں کا نتیجہ سامنے آ گیا تھا۔

ماں بننے کا عمل کتنا بھی تکلیف دہ سہی مگر وہ اکملیت عورت ذات کو عطا کر دیتا ہے۔ جس کی برابری اس جہان میں شاید دوسرا کوئی عمل نہ کر سکے۔ اس کے وجود میں بھی شانتی سی بھر گئی۔

جہانگیر اس کی نوکری کے خلاف تھے اور وہ جہانگیر کے اس فیصلے کے خلاف۔ وہ جان گئی تھی ریل کی پٹریاں اور سمندر کے کنارے کبھی نہ ملنے کے باوجود ساتھ چلتے ہیں اور اسی طرح اسے بھی چلنا تھا۔ ساری زندگی دوسروں کے لیے جان ماری تو اپنی اولاد کے لیے نہ کرتی؟

اس کے خواب زندہ ہو گئے تھے۔ خواہشیں جاگ گئیں۔ طنز و طعنے، تشنع، حیرت زدہ رویے اور اٹھی ہوئی انگلیاں ساس کی زبان اور نندوں کے رویے۔ بالکل کسی معجزے کے مانند اس کی زندگی میں آنے والے اس عطیۂ خداوندی نے پردہ تان دیا۔ ہر تکلیف دہ چیز اور ہر برا رویہ پس منظر میں چلا گیا یہاں تک کہ خود جہانگیر بھی۔

وہ اپنی دنیا میں مگن اپنے آنے والے بچے کو خوش آمدید کہنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ خدا تعالیٰ سے اس ادھورے پن اور اس مشکل زندگی پر کیے گئے شکووں کو پسِ پشت ڈال کر سجدۂ شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔

اس نے آفس سے چھ مہینے کی چھٹی لی اور جب دوبارہ سے آفس جانا شروع کیا تو ایک کل وقتی آیا کو بچے کی نگہداشت کے لیے رکھ لیا۔

اماں تو جیسے اعتراض کا سگنل تھیں۔ اس بات

پر بھی کافی لے دے ہوئی لیکن اسماب کسی کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھی۔

☆☆☆

''کم بخت ماری...... منحوس...... چل دفع ہو یہاں سے۔'' اماں نے دو سالہ ننھی صبوحی کے دو ہنٹر کمر پر جمائے اور بازو پکڑ کر کمرے سے باہر دھکیلا' دہلیز سے اندر آتی اسما کا دل یہ منظر دیکھ کر کٹ کر رہ گیا۔

''کتنی بار کہا ہے صبوحی کو ہر وقت نظروں کے سامنے رکھا کرو۔'' وہ ملازمہ پر برس پڑی۔ ملازمہ اب اس کے آگے منمنا رہی تھی مگر وہ اس سے بے خبر حال سے بے حال اپنی بیٹی کا جائزہ لے رہی تھی۔

مٹی دھول اور گرد میں اٹے رات والے کپڑے، چپچپاتا ہوا منہ اور گندے سندے ہاتھ اسے اپنی بیٹی اور کسی لاوارث یتیم بچی میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔

''کن کاموں میں لگی تھیں تم جو صبح سے اسے اس حال میں چھوڑ رکھا ہے؟''

''جی وہ بڑی اماں جی نے......'' عابدہ کو آج گلو خلاصی بہت مشکل لگ رہی تھی۔

''بھاڑ میں ڈال دو بڑی اماں جی کو۔'' اماں تک آواز بخوبی پہنچ چکی تھی۔ وہ اور اپنے کمرے سے کپڑے بدل کر جہانگیر ایک ساتھ باہر آئے۔

''یہ میرا گھر ہے کسی کی ہمت ہے جو مجھے نکالے۔'' اماں کی عمر نہیں تھی اب پہلے کی طرح ڈنکے کی چوٹ پر فساد کرنے کی مگر طرہ اور طنطنہ آج بھی ویسا ہی تھا۔

''میری...... میری ہمت ہے آپ کو یہاں سے نکالنے کی۔'' اسما پر ایک جنون سا طاری ہو گیا۔ وہ بالکل اسی طرح اپنی ساس کو بازو سے گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئی جیسے ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے اس کی بیٹی کو نکالا تھا۔ جہانگیر یہ منظر دیکھ کر ان کی طرف لپکے۔

''ہائیں، ارے چھوڑ مجھے۔'' اماں کہتی رہ گئیں اور جب تک جہانگیر اس کے سر پر پہنچے اس نے اماں کو صحن کے وسط میں لے جا کر تقریباً جھٹک دیا۔ اماں کا سارا جسم جھٹکا کھا کر رہ گیا۔

جہانگیر نے یہ منظر دیکھ کر ہاتھ اٹھایا اور زوردار آواز کے ساتھ اسما کے رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔ وہ پتھرا کر رہ گئی اور جہانگیر، اماں کو سنبھالتے اندر لے گئے۔

''ارے میرے اللہ! لے دیکھ لے جہانگیر تیری موجودگی میں تیری ماں کو گھر سے نکالنے کی دھمکیاں...... ارے میرے مولا! میں یہ وقت دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گئی۔'' اماں کے واویلے جاری تھے۔

جہانگیر ان کی کیفیت کو خوب سمجھتے تھے۔ افسوس یہ تھا کہ انہیں آج بھی ماں سے ہمدردی تھی۔ بیوی سے اگر تھی بھی تو اتنی ہمت نہ تھی کہ جتا سکتے۔ بیوی کی دلی و دماغی کیفیت کا اندازہ تھا بھی تو اس کا اظہار کرنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ دیر تک ماں کو تسلی دے کر باہر نکلے تو باہر اسما تھی نہ صبوحی۔

☆☆☆

پوری رات جیسے سلگتے انگاروں پر چلتے گزری۔ صبوحی اور اسما کا کہیں پتا نہ تھا۔ انہوں نے تمام دوستوں اور جاننے والوں سے آنے بہانے معلوم کر لیا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ بوکھلا کر اماں کو بتانے آئے تو پتا چلا وہ تو کب کی کھانے سے فارغ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر سو چکی ہیں۔

چند گھنٹے پہلے ان سے ہمدردی جتاتے بیٹے کو اب ان کی بے رخی اور اپنی بیوی کی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا پھر ہر گزرتے پل کے ساتھ یہ احساس دوچند ہوتا گیا۔ جلتی آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ دوسرے دن صبح آفس پہنچا مگر اسما نہیں آئی تھی۔ ہاں اس کی طرف سے چھٹی کی درخواست ضرور آ گئی تھی۔

وہ چور نگاہوں سے ایک، ایک کا چہرہ کھوجتا رہا مگر سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ بات ایسی تھی کہ

زیادہ دن چھپ نہ سکی اور پورے خاندان میں اسما کے چلے جانے کی خبر نشر ہوگئی۔ جس نے بھی سنا دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔ بہنیں تو جل کر خاک ہوگئیں اور بھائی کے سر ہوگئیں کہ فوراً طلاق کے دو حرف بھیج کر گلو خلاصی کرلو۔ نہ آگئی عقل ٹھکانے تو پھر کہنا لیکن اب جہانگیر کو عقل آچکی تھی۔

وہی بہنیں تھیں جو اسما کی موجودگی میں ہر ہفتے دس، پندرہ دن بعد رہنے آتیں، دعوتیں اڑاتیں۔ اسما کے بنائے کھانوں میں مین میخ نکالتیں ایک ہی ہفتہ گزرا تھا اور وہی بہنیں اپنے، اپنے گھروں کو بہانے بناتی لوٹ گئیں۔ دو دن سے زیادہ نہ ٹک سکیں۔ کام کی زیادتی سے گھبرا گئیں۔

دیورانیوں سے تو کوئی امید ہی نہ تھی۔ لے دے کر وہی ملازمہ جو صبوحی کی دیکھ بھال پر مامور تھی۔ اب گھر کی دیکھ ریکھ سنبھالنے لگی۔ اچھا بھلا چلتا ہوا گھر الٹ پلٹ ہوگیا اور جہانگیر کو سب کی اصلیت اور اسما کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا۔

وہ دیوانوں کی طرح جگہ، جگہ اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اسے ہر قیمت پر اسما کو واپس لانا تھا اس کے لیے وہ اس کے پیروں تک میں پڑنے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

آنسو ٹپاٹپ آنکھوں سے نکلتے گود میں رکھے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ باہر سے جہانگیر کے گڑگڑانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ اس کی کولیگ اور دوست فرزانہ کے آگے بیٹھا ہوا تھا۔

آج اسما چھٹیوں کے بعد پہلے دن آفس گئی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ جہانگیر سے بس اتنے ہی دن چھپ سکتی ہے۔ واپسی میں اس کے اندازے کے عین مطابق وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے فرزانہ اتنے دن اس سے جھوٹ بولتی رہی کہ اسے اسما کی موجودہ رہائش کا علم نہیں۔

''خدا کے لیے، دیکھیں آپ نہیں جانتیں، میں کتنی مشکل میں ہوں پلیز اسے بلائیں۔''

''میں جانتی ہوں بلکہ اچھی طرح آپ کی مشکل سمجھتی ہوں۔ گھر کی کل وقتی ملازمہ اچانک ملازمت چھوڑ جائے تو گھر والوں کو کپڑے، برتن اور کھانے کی مشکل ہوجاتی ہے۔'' فرزانہ تپی بیٹھی تھی۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں، دیکھیں پلیز میری ایک بار اس سے بات کروادیں۔ میں نہیں رہ سکتا یوں اس کے بغیر۔'' اس کے کانوں میں اس کی آواز آرہی تھی اس کی آہ نکل گئی۔

''وہ نہیں سمجھتی یہ بات کہ وہ میرے لیے کیا ہے لیکن میں جانتا ہوں میرے لیے تو زندگی کا تصور محال ہے۔ میں اس کے اور اپنی بیٹی کے بغیر نہیں جی سکتا۔ اگر وہ نہیں ملی مجھے تو میں کچھ کر بیٹھوں گا۔'' اس

کی آواز رندھ گئی۔

اسما کے کانوں میں کسی نے امرت جل ٹپکایا اور وہ پھر سے جی اٹھی۔ اس کی برداشت کی حد یہیں تک تھی۔ وہ بے اختیار اٹھ کر دروازے تک آئی۔

''میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن ایک شرط پر۔''

''اسما! تم..... کیسی ہو تم؟'' وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے منظور ہے تمہاری ہر شرط۔''

''میں آپ کی ماں کے ساتھ نہیں رہوں گی۔''

جہانگیر نے اس کی سرخ آنکھوں میں جھانک کر سر جھکا لیا۔

''ٹھیک ہے۔''

☆☆☆

زندگی کے باقی ماندہ سال اسما کی ہمراہی میں گزرے تو مگر ویسے نہیں جیسے انہوں نے سوچا تھا۔

اسما کے دل سے جہانگیر اتر چکے تھے۔ سالہا سال گزرنے اور اولاد کے جوان ہونے کے بعد بھی وہ اسما کے دل میں ویسی جگہ نہیں پا سکے۔ اماں جی اس دنیا سے چلی گئیں۔

دوسرا گھر لے کر اسما کو الگ رکھنے پر تمام بہن بھائیوں میں اماں کی رہائش کا جو مسئلہ کھڑا رہتا تھا وہ یوں اختتام پزیر ہوا کہ گھر بکا اور سب کو ان کا حصہ مل گیا۔ یوں اسما کا ایک طرح سے اس گھر اور گھر والوں سے ہر وقت کا تعلق اور سامنا ختم ہو گیا۔

اور یہ..... یہ گھر جہاں کا ذرہ ذرہ اسما اور خود جہانگیر کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا یہ گھر نارسائی، دوری کے کتنے ان گنت تنہا لمحوں کا امین تھا۔

اسما کے دل میں گھر کر لینے والے فاصلے اور لہجے میں بس جانے والی اجنبیت کو وہ چاہ کر بھی ختم نہیں کر سکے۔ اماں نے کسی لحاظ سے اسما کا دل دکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اسے اس کی شادی سے پہلے ٹوٹنے والی منگنی اور منگیتر کی یاد تک کا طعنہ بنا کر بنا کسی لاگ لپیٹ کے اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

سسرال میں گزارنے والی غلامانہ زندگی اور گھٹن زدہ ماحول نے اسما کے مزاج میں عجیب سی حاکمیت بھر دی تھی۔ انہوں نے صبوحی کی زندگی کا ہر فیصلہ خود کیا تھا اور جہانگیر سے صلاح مشورہ تو دور کی بات ان کے استفسار کے بغیر بتانے تک کی زحمت نہ کی تھی۔ صبوحی سمجھدار ہو چکی تھی۔ وہ ماں اور باپ کے درمیان موجود حد درجہ خاموشی کو صرف ذہنی ہم آہنگی کی کمی قرار دیتی تھی۔ پس پردہ محرکات کے بارے میں اسے دلچسپی تو تھی لیکن ماں باپ سے پوچھتے ڈر لگتا تھا۔

وہ کیا سمجھتی ہے کیا نہیں اسما کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا اور جہانگیر میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اسے ماضی کے بارے میں کچھ بتا سکیں گزرتے وقت نے جہاں جہانگیر کے اعصاب شکستہ کر دیے تھے وہیں گھر کے در و دیوار کو ایک سکون اور بھید بھری خاموشی بخشی تھی۔

آج یہ خاموشی بری طرح چکنا چور ہو گئی تھی۔ جہانگیر کی بہن نگین نے اپنے بیٹے کے لیے صبوحی کا ہاتھ مانگا تھا اور اسما کو کسی نے یہ بھنک دے دی تھی کہ جہانگیر اپنی بہن کو صبوحی کے رشتے کے لیے ہاں کر آئے ہیں۔

''اللہ اکبر!'' فضاؤں میں گونجتی صدائیں پُرنور بلاوا دے رہی تھیں۔ ''نماز نیند سے بہتر ہے۔'' بے شک نیند جو غفلت میں ڈال دیتی ہے اور نماز جو ہر مصیبت سے چھٹکارے کا حل ہے۔ ''آؤ فلاح کی طرف۔'' بلاوا مل رہا تھا۔

بلاؤں کو ٹالنے کا بلاوا، مصیبتوں سے چھٹکارے کا بلاوا، راز و نیاز کے لیے بہترین ہمراز کا بلاوا۔ وہ دونوں جہانوں کے مالک کا بلاوا۔

''آؤ میرے پاس آؤ۔ مجھ سے کہو، میں سننے والا ہوں، مجھ سے مانگو، میں دینے والا ہوں۔''

جہانگیر احمد اطراف سے بے نیاز سجدے میں زاروقطار رو رہے تھے۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر ملازمہ عابدہ مکینوں کی منتظر تھی لیکن فی الوقت کوئی بھی نہ جاگا تھا۔ بیگم اسما جہانگیر عرصہ ہوا نوکری چھوڑ چکی تھیں اور آج جہانگیر کا بھی آفس جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی نوکری سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ ریٹائرمنٹ سے ملنے والی رقم اور مکان کے حصے سے کاروبار کرلیا۔ کاروبار نے دھیرے، دھیرے کافی ترقی کرلی تھی۔ خدا نے اس سلسلے میں انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ گھر کے حالات میں بہتری آتے ہی انہوں نے اسما سے نوکری چھوڑ کر آرام کرنے کی استدعا کی تھی۔ حکم دینے کے قابل وہ خود کو نہیں سمجھتے تھے اور مشورے کے قابل اسما نے انہیں سمجھنا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ خود بھی گھر اور حالات کے گھن چکر میں ٹھیک ٹھاک پس چکی تھیں لہٰذا استعفیٰ دینا ہی مناسب سمجھا۔

''باجی ناشتا کمرے میں ہی کریں گی۔ ٹرے لگا دو میں لے جاؤں گا۔''

''جی!'' اس انوکھی بات پر عابدہ کا منہ کھل گیا مگر جہانگیر کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھتے ہوئے وہ کچھ نہیں بول سکی۔

اسما اٹھ چکی تھیں واش روم سے نکلتے ہوئے انہوں نے جہانگیر کو ناشتے کی ٹرے اٹھا کر کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹک سی گئیں۔

''اونہہ...... اب یہ ہتھکنڈے، گھسے پٹے مجھے منانے کے لیے استعمال کیے جائیں گے۔'' دل ہی دل میں سوچتی وہ ڈریسنگ کی طرف مڑ گئیں۔ بدگمانیوں کے جال میں ان کا دل جکڑا ہوا تھا اور جہانگیر کا معذرت خواہانہ رویہ اتنے برسوں میں اس جال کی ایک بھی گرہ کو کتر نہ سکا تھا۔

''تم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا اسی!

ادبی لطائف

جگر مراد آبادی

مشاعرے میں ایک مسلم الثبوت استاد نے ایک طرح مصرعہ دیا...... باغ سے آرہی ہے بوئے کباب

سبھی شاعروں نے طبع آزمائی کی لیکن کوئی گرہ نہ لگا سکا۔ ان میں سے ایک شاعر صاحب ہر صبح دریا کے کنارے نکل جاتے اور اونچی آواز سے الاپتے...... باغ سے آرہی ہے بوئے کباب......

ایک روز ادھر سے ایک کم سن لڑکا گزرا، جونہی شاعر نے یہ مصرعہ پڑھا، وہ لڑکا بول اٹھا۔

کسی بلبل کا دل جلا ہو گا

یہی لڑکا بڑا ہو کر جگر مراد آبادی کے نام سے مشہور ہوا۔

جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی پر پہنچے...... وہاں ملاقاتیوں کا ایک جم غفیر پہلے سے موجود تھا۔ کافی دیر تک انتظار کے بعد بھی جب ملاقات کے لیے جوش صاحب کی باری نہ آئی تو انہوں نے اکتا کر ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر چپراسی کے ہاتھ مولانا کی خدمت میں بھجوایا۔

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

مولانا شعر پڑھ کر مسکرائے اور فوراً جوش صاحب کو اندر بلا لیا۔

☆☆☆

عبدالحمید عدم کا کسی صاحب نے جوش سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''آپ عدم ہیں......''

عدم کافی تن و توش کے آدمی تھے۔ جوش نے ان کے ڈیل ڈول کو بغور دیکھا اور کہنے لگے ''عدم یہ ہے تو وجود کیا ہو گا؟''

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

پلیز ناشتا کرلو۔ تم جس بات پر ناراض ہو ویسا کچھ نہیں ہے۔ درحقیقت میں نگین کو انکار کہنے کے لیے گیا تھا کیونکہ مجھے اپنی بیٹی کے لیے بھانجے سے کہیں بہتر رشتہ مل سکتا ہے۔“

اسما کے ہاتھ ساکت ہوگئے انہوں نے بے ساختہ مڑ کرانہیں دیکھا۔

”ایک باپ ہونے کے ناتے میں نے کبھی صبوحی پراپنا حق نہیں جتایا لیکن اتنا تو میں کرہی سکتا ہوں ناں۔ مجھے امید ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

وہ اسما کی طرف پشت کر کے بیڈ پر بیٹھے تھے۔ بات کے اختتام پر ذرا کی ذرا مڑ کر اسما کو دیکھا تو وہ حیرت سے ان ہی کو دیکھ رہی تھی۔

”لیکن میری ایک بات کا جواب دے دو۔ میں مانتا ہوں کہ ساری زندگی میری ماں اور گھر والوں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی۔ تمہیں اس گھر میں نہ وہ جگہ ملی نہ عزت جو تمہارا حق تھی لیکن بدلے میں تم اتنے سالوں سے مجھے ذلت، تحقیر اور بے گانگی لوٹاتی رہی ہو۔ جو میرے گھر والوں نے تمہارے دامن میں ڈالی تھی۔ اماں پر میرا زور نہیں چل سکا لیکن میں نے اپنے طور پر کبھی حقیر نظروں سے تمہیں نہیں دیکھا۔ تمہارے کردار کی طرف انگلی نہیں اٹھائی۔ تمہارے ساتھ جو کچھ برا ہوا میرے گھر والوں کی طرف سے ہوا۔ ان سے ملنے والی ساری تلخی تم نے اپنے اور میرے رشتے میں گھول دی۔ تمہیں اولاد مل گئی، یہ گھر مل گیا اور کھوئی ہوئی عزت بھی جس کا ثبوت میری بہن کی طرف سے دیا جانے والا رشتہ ہے لیکن......“ گہری سانس بھر کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسما حیرت کی زیادتی سے گنگ سی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”سود و زیاں کے اس تمام حساب کتاب میں میرے حصے میں کیا آیا...... صرف طعنے تشنع اور الزامات...... ایک ہاں صرف ایک رشتہ بنانے اور نبھانے میں، میں نے پوری زندگی لگادی۔ مجھے اس رشتے نے کیا دیا؟ تمہیں اس کا جواب ملے تو مجھے ضرور دینا۔“ وہ پژمردہ قدموں سے بات مکمل کر کے باہر نکل گئے۔ اسما کے ہاتھ سے لوشن کی بوتل چھوٹ کر قالین پر جاگری۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی پھر بھی وہ جانتی تھیں کہ جہانگیر جاگ رہے ہوں گے۔ گوکہ بہت عرصہ ہوا انہوں نے بالخصوص رات کی نیند کے لیے بیڈروم میں آنا ترک کردیا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ... ٹی وی دیکھتے یا کوئی کتاب پڑھتے ہوئے، کبھی اسٹڈی روم یا کبھی ڈرائنگ روم میں ہی سو جاتے تھے۔

اسما نے کبھی اس بات کو درخورِ اعتنا نہ جانا تھا کہ جہانگیر کو اسما کی توجہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یا نہیں۔

”میرے نزدیک جذبات صرف میں رکھتی تھی۔ دل صرف میرا ٹوٹا تھا۔ ارمان صرف میرے خون ہوئے اور محبت اور توجہ کی ضرورت صرف مجھے تھی۔ میں نے جہانگیر کو از خود ہی ان تمام فطری تقاضوں سے مُبرّا کردیا۔“ جہانگیر نے گزرے ماہ و سال میں کبھی نہیں جتایا لیکن ان کا صرف ایک ہی بار سوال کرنا۔ اسما کو کٹہرے میں کھڑا کر گیا۔

”میری سوچیں، ارادے اور منصوبہ بندیاں ہم سے سکڑ کر میں کے دائرے میں سمٹ گئیں پھر میں نے خود ہی اپنی مرضی سے اپنی بیٹی کو اس حاشیے میں کھینچ لیا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ وہ صرف میری نہیں ہماری اولاد ہے۔ میری اور...... جہانگیر کی۔“

اعتراف اور خود احتسابی کے لمحے بہت کڑے تھے۔ وہ چند لمحوں میں پسینے میں بھیگ گئیں۔

”اوہ خدایا......“ کمرے میں ٹہلتے ان کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ انہوں نے تھک کر بستر پر گرتے ہوئے اپنی کنپٹیاں دونوں ہاتھوں سے سہلائیں۔

”شاید...... شاید مجھے جہانگیر سے معافی مانگنی

چاہیے۔" آنکھوں کے گوشوں سے دو قطرے نکل کر دائیں بائیں بہہ گئے اور انہوں نے دھیرے سے خود کلامی کی۔

"ہاں مجھے مانگنی ہی ہوگی معافی۔ آخر اتنے برسوں سے جہانگیر بھی تو مجھ سے معافیاں مانگتے رہے ہیں۔ کیا انہیں یہ زیب دیتا تھا؟ نہیں...... یقیناً نہیں۔" انہوں نے نم آنکھیں کھول کر چند لمحے چھت کو گھورا پھر دھیرے سے اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

مجھے بھی ترکیب سکھا کوئی یار جولاہے
اکثر تجھ کو دیکھا ہے تانا بنتے
جب بھی دھاگا ٹوٹ گیا یا ختم ہوا
پھر سے باندھ کے اور سرا کوئی جوڑ کے اس میں
آگے بُننے لگتے ہو
تیرے اس تانے میں لیکن
ایک بھی گانٹھ گرہ بُنت کی
کوئی دیکھ نہیں سکتا
میں نے تو ایک بار بُنا تھا ایک ہی رشتہ
لیکن اس کی ساری گرہیں صاف نظر آتی ہیں
میرے یار جولاہے!

سیاہ جلد والی ڈائری ان کی گود میں پڑی تھی اور وہ آنکھیں موندے کرسی پر بیٹھے تھے۔

ماضی کے اوراق الٹتے۔ اسما کے التفات، وقت اور حالات کے بے رحم لمحے گنتے سود و زیاں کے حاشیوں میں درج نت نئے گوشوارے ان کے ذہن کی سلیٹ پر بن اور بگڑ رہے تھے۔

یہ سچ تھا کہ وہ اسما کے خشک اور روکھے رویّے کو زندگی بھر کا حاصل سمجھتے اسے کبھی غلط نہیں گردانتے تھے لیکن کیا یہ ان کی فراخ دلی کا ثبوت نہ تھا کہ انہوں نے کبھی اسما سے جواب طلبی نہیں کی لیکن آج ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

"کیا اسما کو میرے اوپر اتنا بھی بھروسا نہیں...... کیا اسے لگتا ہے کہ مجھ سے رشتہ جُڑنے کی پاداش میں جس طرح اس کا ذہنی سکون اور جسمانی آرام خاک ہوا مجھے اس کا احساس نہیں ہوگا اور میں ایک بار پھر وہی کہانی دُہرانے کے لیے اپنی بیٹی کو ایسے ہی ایک اور جہنم میں جھونک دوں گا۔"

کوئی دکھ جیسا دکھ تھا جو دل کی گہرائیوں سے نوحے کی صورت نکل کر رگوں میں بہہ رہا تھا۔ جس نے ان کی آنکھوں کی دہلیز کو کب سے نم کر رکھا تھا۔

اچانک...... بالکل اچانک انہیں اپنے پیروں پر کسی کے ہاتھوں کا گداز محسوس ہوا۔ بے حد چونک کر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور جھٹکے سے اپنے پیر کھینچے۔

"اسما! تم؟" بے یقینی اور حیرت کی زیادتی سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسما ان کے قدموں میں بیٹھی تھیں۔ آنسو ان کا پورا چہرہ دھو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے آگے جوڑ دیے۔

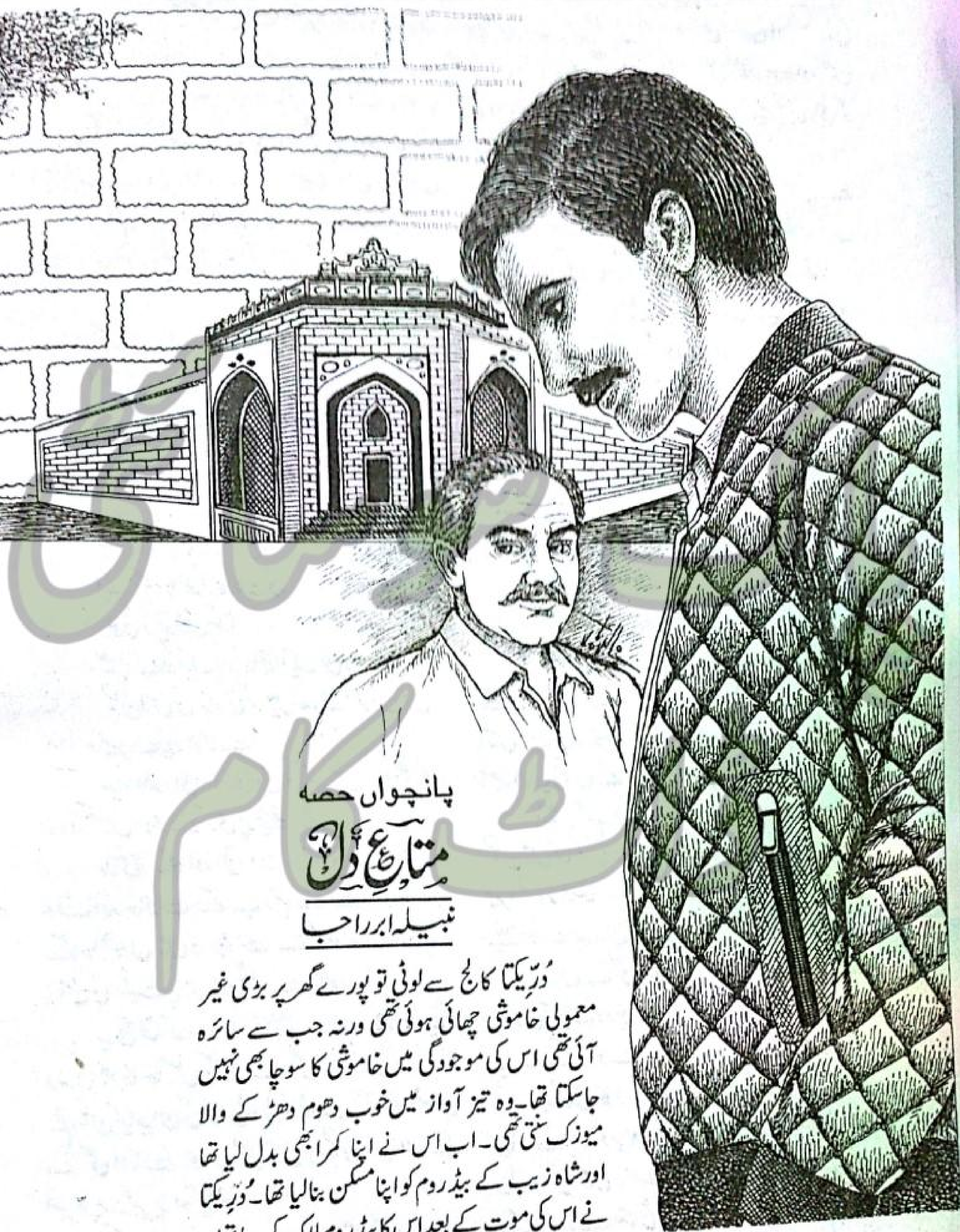
"نہیں...... نہیں۔" انہوں نے بے ساختہ جھک کر ان کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

دونوں میں سے کسی کو اپنے جذبات کے اظہار کے لیے زبان کی ضرورت نہ تھی۔ جہانگیر نے بے ساختہ انہیں سینے سے لگا لیا۔ اسما کی آنکھوں سے بہہ نکلنے والا ڈھیروں پانی ان کے گریبان میں جذب ہو گیا۔

"میں آپ کی گناہ گار ہوں، مجھے معاف کر دیں لیکن میں کیا کرتی جو زندگی بھر ملتا رہا وہی لوٹاتی رہی، میرا قصور نہ تھا...... جہانگیر۔" وہ بے ساختہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"میں نے بھی بھلا کب تمہیں قصور وار جانا ہے۔ یہ تو دل آج زیادہ ہی دُکھا تو بے ساختہ شکوہ نکل گیا۔" وہ پیار سے کہتے ہوئے ان کے بال سہلانے لگے۔

بدگمانی کا زرد موسم گزر چکا تھا۔ خوشیوں بھری بہار نے بہت دیر بعد اپنی بانہیں ان کے استقبال کے لیے وا کی تھیں۔ محبت اور اعتبار کے رشتے میں لگی، بدگمانی اور بے اعتنائی کی ساری گرہیں کھل چکی تھیں۔

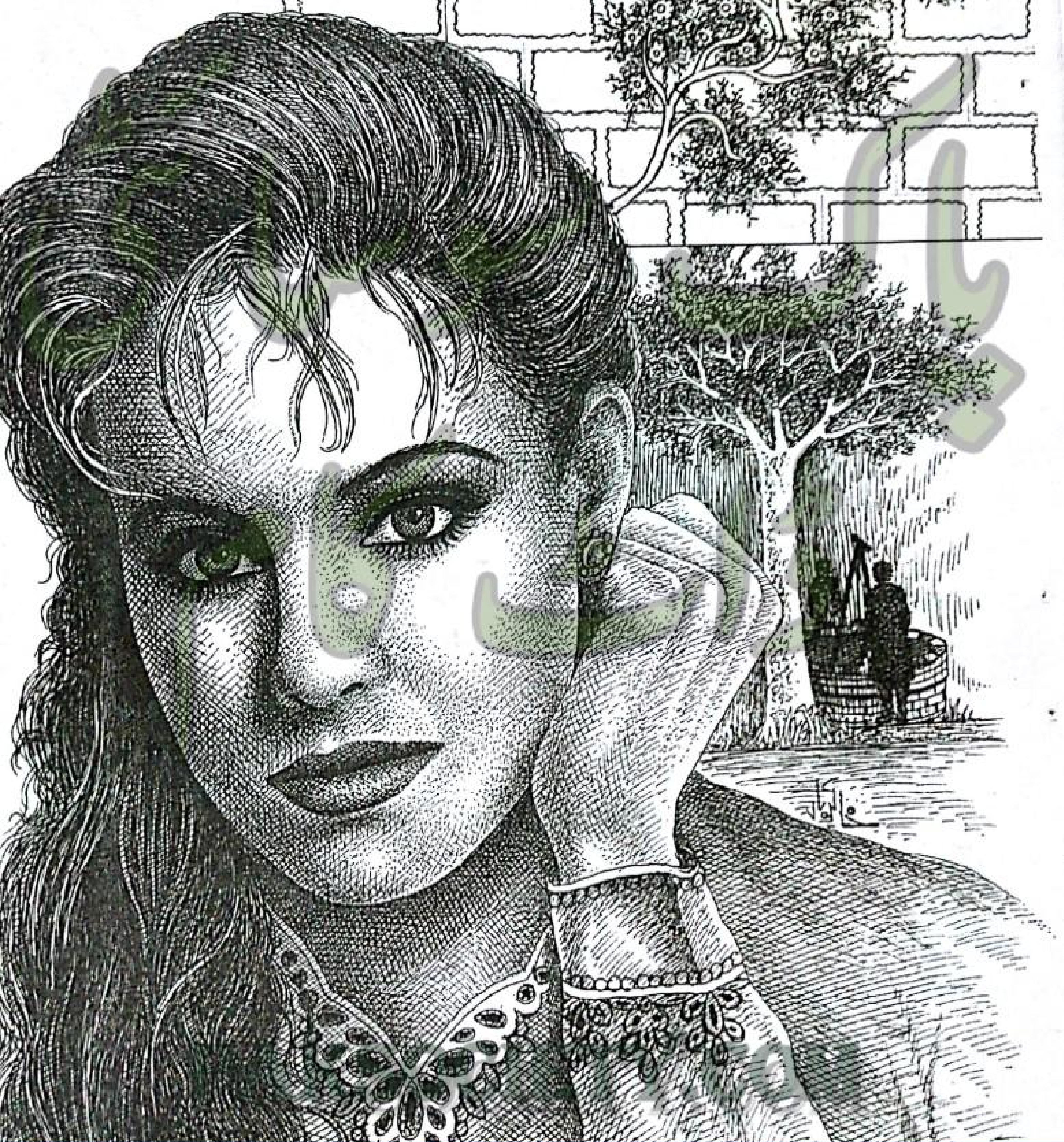


پانچواں حصہ

متاعِ دل

نبیلہ ابر راجا

دُرِیکتا کالج سے لوٹی تو پورے گھر پر بڑی غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی ورنہ جب سے سائرہ آئی تھی اس کی موجودگی میں خاموشی کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وہ تیز آواز میں خوب دھوم دھڑکے والا میوزک سنتی تھی۔ اب اس نے اپنا کمرا بھی بدل لیا تھا اور شاہ زیب کے بیڈ روم کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ دُرِیکتا نے اس کی موت کے بعد اس کا بیڈ روم لاک کردیا تھا۔ سائرہ نے ایک دن چابی مانگی تو اس نے دے دی۔



اس نے سوچا کہ ویسے ہی مانگی ہے۔ سائرہ نے اپنا مختصر سا سامان اُدھر ہی سیٹ کر دیا۔ دوسرے دن دُرِ یکتا نے شاہ زیب کے کمرے سے آتی تیز میوزک کی آواز سنی تو اندر چلی آئی جہاں سائرہ ایزی چیئر پر بیٹھی پاؤں ہلا رہی تھی۔ پاس ہی اس کے جوتے پڑے تھے اور سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر اس کا سامان سجا ہوا تھا۔ دُرِ یکتا کو غصہ آ گیا۔

''سائرہ یہ شاہ زیب بھائی کا کمرا ہے، میں نے خود لاک کیا تھا۔ اس کمرے میں ان کی یادیں بکھری پڑی تھیں۔ تمہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں۔'' سائرہ تو جیسے لڑنے کو تیار بیٹھی تھی فوراً شروع ہو گئی۔

''یہ کمرا میں نے لے لیا ہے، تمہارا بھائی تھا تو میرا بھی بہنوئی تھا۔ اور کن یادوں کی بات کرتی ہو تم...... شاہ زیب بھائی یہ دنیا چھوڑ چکے ہیں اور اپنی یادیں بھی ساتھ لے گئے ہیں۔ تم بھی حقیقت کی دنیا میں واپس آ جاؤ۔'' اس کی زوردار آواز پر شیریں اور مائرہ بھی اُدھر ہی آ گئیں۔

''کیوں شور کر رہی ہو سائرہ؟'' مائرہ بہن سے مخاطب تھی۔

''میں نے اس کمرے میں اپنا سامان رکھا ہے تو یہ شور کر رہی ہے کہ یہ میرے بھائی کا کمرا ہے اس کمرے میں ان کی یادیں ہیں، تم اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے جاؤ۔'' سائرہ نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ کی آمیزش کی تو مائرہ کو غصہ آ گیا۔

''اس گھر پر صرف تمہارا حق نہیں ہے میرا بھی ہے، سمجھیں تم...... سائرہ اِدھر ہی رہے گی۔ دیکھتی ہوں کس میں اتنی جرأت ہے جو تمہیں یہاں سے نکالے۔'' دُرِ یکتا خاموش کھڑی رہی، وہ تو بول کے پچھتا رہی تھی۔ مائرہ بھابی حق پہ آ گئی تھیں۔ حالانکہ اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ ان سب کی یہاں اپنے گھر میں آمد کے بعد وہ خود اپنے خول میں سمٹ گئی تھی۔ خود کو محدود کر لیا تھا۔ اتنے میں شیریں تائی آگے بڑھیں اور خاموش کھڑی دُرِ یکتا کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

''ارے کیا کرتی ہو، ٹھیک ہی تو کہتی ہے یہ کہ اس کمرے میں شاہ زیب کی یادیں ہیں۔ ایک بھائی کا درد بہن ہی سمجھ سکتی ہے۔ یہ اس کے بھائی کا کمرا ہے، وہ یہاں رہتا رہا تھا۔ اس کی چیزیں اس کی نشانیاں ہیں یہاں۔'' دُرِ یکتا کو گلے لگائے وہ ہولے، ہولے سسکنے لگیں تو دُرِ یکتا بھی رونے لگی۔ ''تم خوش قسمت بہن ہو کہ شاہ زیب تمہارے پاس ایک اور نشانی چھوڑ گیا ہے۔ مائرہ کچھ عرصے بعد شاہ زیب کے بچے کو جنم دینے والی ہے۔ تم اس کی پھپھو کہلاؤ گی، شاہ زیب کا خون...... شاہ زیب کی اولاد، ہاں بھائیوں کی اولادیں بہنوں کو بڑی پیاری ہوتی ہیں...... وہ تو سب کچھ وار دیتی ہیں ان پر...... پھر یہ سب شاہ زیب کے بچے کا ہوگا۔'' شیریں ہولے، ہولے اس کے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔ انہوں نے آنکھ کے اشارے سے سائرہ اور مائرہ کو یہاں سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ دُرِ یکتا، شاہ زیب کے ہونے والے بچے کے ذکر پر خوش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں خواب سجنے لگے۔ اپنے بھائی کے خون کے ساتھ اس کا رشتہ بھی کتنا پیارا تھا۔ جس نے لمحے بھر کے لیے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔

''تمہارے تایا بتا رہے تھے کہ شاہ زیب کا کاروبار تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ بنیادیں تو ہل ہی چکی تھیں۔ کیونکہ شاہ زیب کو اس کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا، اس لیے خسارہ ہی ہوتا رہا۔ تمہارے تایا اور عاشر نے بہت کوشش کی کسی نہ کسی طرح سنبھالا دینے کی، بینک سے لون لیا...... اپنی زمین گروی رکھ دی پر کچھ فائدہ نہیں ہوا زمین گروی رکھنے کا بھی...... بینک نے ہماری زمین ضبط کر لی ہے...... کیونکہ شاہ زیب وقت پہ ادائیگی نہیں کر سکا تھا۔ اس کا کاروبار تباہ ہوا سو ہوا ہماری زمین بھی گئی۔ اب اگر کوئی انویسٹ منٹ کرے تو بات بن سکتی ہے۔ ورنہ شاہ زیب کا قائم کیا ہوا کاروبار گیا سمجھو......'' شیریں جذباتی داؤ کھیل رہی تھیں۔ ان کی توقع کے عین مطابق دُرِ یکتا پریشان ہو گئی۔

''تائی آپ تایا سے کہیں ناں کہ انویسٹ منٹ کریں۔'' شیریں نے سر پر ہاتھ پھیر کر دہائی دی۔

''ارے میں اتنی دیر سے یہی تو بتا رہی ہوں کہ اپنی زمین تک تمہارے تایا نے گروی رکھ دی ہے۔ کہاں سے انویسٹ منٹ کریں گے۔ اچھا خاصا پیسہ ہو تو بات بن سکتی ہے۔ یہ ہزاروں لاکھوں کا کام نہیں......''

''تائی پھر کیا ہوسکتا ہے؟'' اب اس نے کام کی بات کی تھی۔ شیریں خوش ہوگئیں۔ شکار خود چل کے پھندے کی طرف آ رہا تھا۔

''ہاں اگر تم شاہ زیب کے کاروبار میں انویسٹ منٹ کرو تو اس کا کاروبار بچ سکتا ہے۔ کل جب اس کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوگا تو وہی وارث ہوگا ناں...... ہم تو نہیں ہوں گے ناں...... نہ ہمیں کوئی غرض ہے، اللہ کا دیا بہت کچھ ہے ہمارے پاس...... ہم نے کسی کے پیسے پر نظر ہی نہیں رکھی کبھی۔'' شیریں نے بڑی مہارت سے صفائی بھی پیش کردی اپنی...... دل میں چور تھا ناں اپنے...... حالانکہ دُرِیکتا کا ذہن اس طرف گیا بھی نہیں تھا جس طرح شیریں سوچ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے میں بھائی کے کاروبار میں انویسٹ منٹ کرتی ہوں۔ ابھی منیجر کو فون کرتی ہوں وہ گھر ہی آجائے گا میں اس سے پوچھتی ہوں۔''

''ارے نہ، نہ منیجر کو فون کر کے گھر بلانے کی کیا ضرورت ہے، تم صرف اپنے تایا سے بات کرلو۔ وہ خود ہی سب کچھ کرلیں گے۔'' شیریں اس کی حماقت پہ ایک دم گھبرا سی گئیں۔

''ٹھیک ہے تائی جب تایا گھر آجائیں تو میں ان سے بات کرلوں گی۔''

''جیتی رہو میری بچی...... تم ایسا کر کے شاہ زیب کے ہونے والے بچے پر احسان کرو گی جو یتیمی کا سرٹیفکیٹ ماں کے پیٹ سے ہی لے کر پیدا ہوگا۔'' شیریں نے ایک بار پھر دوپٹا آنکھوں پر رکھ لیا اور رونے لگیں۔ ان کا ساتھ دُرِیکتا بھی دے رہی تھی مگر دونوں کے رونے میں فرق تھا۔

رات کھانے کے بعد شیریں نے اصل بات چھیڑی، وہ اورنگزیب کو پہلے ہی سب سمجھا چکی تھیں۔

''بیٹی بہت پیسہ چاہیے اس کے لیے...... یہ کوئی لاکھوں کا کاروبار نہیں تھا۔ شاہ زیب نے اپنی بے وقوفی اور ناتجربے کاری سے اپنا سب سرمایہ اس میں جھونک دیا تھا۔ میں کیا بتاؤں تمہیں۔'' وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہوئے۔

''تایا جان پھر بھی کچھ بتائیں تو سہی......'' وہ منت آمیز لہجے میں بولی تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔

''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ اس کے لیے بہت پیسہ چاہیے ہوسکتا ہے کہ تمہارا سارا بینک بیلنس اس میں خرچ ہوجائے۔ اور کل کو تم مجھے یعنی اپنے سگے تایا کو الزام دو کہ میں نے تمہیں یہ مشورہ دیا تھا۔ نہ بابا نہ میں کل کلاں کو کوئی الزام اپنے سر نہیں لے سکتا۔ حالانکہ میں تو سب کی بھلائی کا ہی سوچ رہا ہوں مگر کبھی، کبھی اچھائی اپنے ہی گلے پڑ جاتی ہے۔'' اورنگزیب نے بڑی چالاکی سے بال اس کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔

''تایا جان آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، میں کیوں آپ کو الزام دوں گی؟ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی، بے شک سارا بینک بیلنس ختم ہوجائے مجھے پروا نہیں...... پپا کے بعد آپ ہی ہمارے بڑے ہیں اور یقیناً ہماری بھلائی کا ہی سوچیں گے۔'' وہ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

''پھر بھی بیٹی اچھی طرح سوچ لو۔ میں تو شاہ زیب کے اس بچے کے بارے میں پلان کر رہا ہوں جو دنیا میں آنکھ کھولے گا تو بیچارہ یتیم ہوگا۔ اگر شاہ زیب کا کاروبار بچ جاتا ہے تو اس کے بچے کے لیے بہت فائدہ مند ہوگا۔ ظاہر ہے تم بھی نہیں چاہو گی کہ وہ کسی کا ضرورت مند اور محتاج ہو۔ آخر کو تم اس کی پھپھو ہو اور دادا دولت و جائداد کے مالک ہیں کچھ اس کو بھی تو ملنا چاہیے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں......!'' اورنگزیب نے دُرِیکتا کے سر پر ہاتھ پھیرا جیسے اس سے تائید چاہ رہے ہوں۔

''تایا جان آپ بیٹھیں میں ابھی آئی۔'' وہ عجلت

میں اٹھ گئی۔ اورنگزیب نے فاتحانہ نگاہوں سے شیریں کی طرف دیکھا۔

''دیکھا تم نے آرام، آرام سے کام کرنے کا نتیجہ......'' وہ سارا کریڈٹ خود لینا چاہ رہے تھے۔ عمر زیب اگر اپنے ہوش میں ہوتے تو اپنے بھائی کی اس... کایا پلٹ پہ حد درجہ حیران اور دکھی ہوتے۔ وہ تو شیریں کی طرح اتنے خودغرض نہیں تھے۔ شیریں بھابی تھی پر وہ تو بھائی تھے۔ اپنا خون' ایک باپ کی اولاد...... وہ کیوں اتنے خودغرض ہوگئے تھے۔

دُرِّیکتا جلد ہی واپس آگئی۔ وہ اپنی الماری سے چیک بک نکال کر لائی تھی۔ وہ دونوں اس کے ہاتھوں کی طرف ہی دیکھ رہے تھے جس میں چیک بک اور بال پوائنٹ دبا ہوا تھا۔ دُرِّیکتا نے چیک بک پہ سائن کیے اور پھر صفحہ پھاڑ کے تایا کی طرف چیک بڑھایا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا کہ دریکتا نے کتنی رقم کا چیک لکھا ہے۔ ان کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یہ بلینک چیک تھا یعنی وہ اس میں اپنی مرضی سے جتنی رقم چاہے لکھ سکتے تھے۔ انہوں نے اندرونی خوشی کو سنجیدگی اور رعب کے پردے میں چھپالیا۔

''دُرِّیکتا تمہارا بہت، بہت شکریہ جو تم نے مجھ پر اتنا اعتبار کیا۔ میں اس اعتبار کو کبھی نہیں توڑوں گا۔ اب میں ان پیسوں سے شاہ زیب کی اولاد کے لیے کچھ کرسکتا ہوں۔''

''تایا جان اور پیسوں کی جب بھی ضرورت پڑے تو مجھے بتایئے گا، کسی قسم کی ہچکچاہٹ دل میں مت لایئے گا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے جو آپ نے مجھے شاہ زیب بھائی کے بزنس کے بارے میں اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ ورنہ مجھے کب پتا چلنا تھا۔'' وہ الٹا ان کی ممنون اور احسان مند ہورہی تھی۔

''ہاں بیٹی تمہیں ساتھ، ساتھ میں سب بتاتا... رہوں گا۔ بلکہ میں تمہیں شاہ زیب کے آفس بھی لے جاؤں گا تاکہ کسی بھی قسم کا شک وشبہ اگر تمہارے دل میں ہے تو ختم ہوجائے۔''

''ارے نہیں تایا جان ......میں کیوں شک کروں گی، میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔'' اس نے شرمندہ نگاہوں سے تایا کی طرف دیکھا تو انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کے دیے چیک کو حفاظت سے والٹ میں رکھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ کتنی رقم اکاؤنٹ سے نکلوائی جائے۔

☆☆☆

اورنگزیب، دُرِّیکتا کو شاہ زیب کا آفس دکھانے پر بضد تھے مگر وہ انکار کررہی تھی۔

''بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تم ایک بار دیکھ تو لو...... ساتھ فیکٹری پہ بھی نظر ڈال آنا جہاں مال تیار ہوتا ہے، میں نے تمہارا پیسہ کن، کن جگہوں پر خرچ کیا ہے تمہیں وہ سب حساب بھی چیک کروانا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کل کوئی بدخواہ میرے بارے میں تمہیں بدگمان کردے۔''

''تایا جان ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں آپ کے بارے میں کچھ برا سوچوں......آپ پریشان نہ ہوں، مجھے آپ پہ پورا یقین ہے۔'' دُرِّیکتا کا لہجہ اس کے اعتبار کا گواہ تھا۔ اورنگزیب پُرسکون ہوگئے۔ اس نے ان کی ایک اور پریشانی دور کردی تھی۔

☆☆☆

منیجر صاحب گھر تشریف لائے تھے۔ سائرہ نے فوراً جا کے شیریں کو اطلاع دی۔ شیریں مغرور قدموں سے چلتی اکڑی گردن کے ساتھ صوفے پر ان کے سامنے بیٹھی تھیں۔

''جی کیا کام ہے آپ کو جو اس طرح آپ کو گھر آنے کی زحمت کرنی پڑی۔'' وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولیں۔ منیجر صاحب کو ان کا یہ انداز ہضم نہیں ہوسکا۔ وہ عمر زیب کے منہ چڑھے تھے اور عمر اُن پر بے پناہ اعتماد کرتے تھے۔ وہ کوئی بھی کاروباری فیصلہ ان کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ جب انہوں نے اپنے کاروبار اور جائیداد کا نصف حصہ شاہ زیب کے حوالے کیا تو انہیں بتایا کہ وہ اپنا یہ بقیہ کاروبار دُرِّیکتا کے حوالے کریں گے اور وہی اس کی مالک ہوگی اور کچھ

عرصے بعد بڑی رازداری سے انہوں نے وہ کام کر بھی دیا تھا۔ پر اب حالات ویسے نہیں رہے تھے۔ عمر زیب بزنس کی دیکھ بھال سے خود معذور تھے۔ ایسے میں دُرِّیکتا کو بولڈ اسٹیپ لینا چاہیے تھا۔ پر وہ خاموش تھی۔ منیجر صاحب نے دبے لفظوں میں دو تین بار اسے کچھ بتانا چاہا تھا پر وہ نہیں سمجھ سکی۔ وہ کھل کے بول بھی نہیں سکتے تھے۔ کھل کے بولتے تو نوکری سے فارغ کر دیے جاتے۔ ویسے بھی وہ کیا کہتے...... وہ سب اس کے رشتے دار تھے۔ ان کے مقابلے میں وہ منیجر صاحب کی کہی کسی بھی بات کا کیسے اعتبار کرتی۔ پھر بھی آج منیجر صاحب سے رہا نہیں گیا تو وہ ان کے گھر آ گئے۔ آفس میں تو عمر زیب کے تینوں بھائیوں کا قبضہ تھا۔ وہ بیچارے کچھ کر ہی نہیں پا رہے تھے۔

''مجھے دُرِّیکتا صاحبہ سے کچھ فائلز سائن کروانی تھی اس لیے گھر آیا ہوں۔'' حتی الامکان انہوں نے اپنے لہجے کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔

''آپ اورنگزیب صاحب کے ہاتھ فائلز بھجوا دیتے۔'' شیریں تو جرح پر ہی اتر آئیں۔

''میڈم یہ میری ڈیوٹی ہے اور میں اسی کے پیسے لیتا ہوں۔ صاحب لوگوں سے میں نوکروں والے کام کیسے لے سکتا ہوں۔'' انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا تو شیریں کی تنی سی گردن کچھ ڈھیلی پڑ گئی۔

''ٹھیک ہے میں دُرِّیکتا کو بلواتی ہوں۔'' شیریں نے پاس سے گزرتی ہوئی نوکرانی کو آواز دے کر دریکتا کو بلانے کا کہا۔

اس کے آنے پر شیریں اِدھر ہی بیٹھی رہیں ایک پل کے لیے بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئیں۔ ان کی نگاہ منیجر اور دُرِّیکتا کی حرکات و سکنات اور گفتگو پر تھی۔ وہ کچھ آہستہ، آہستہ بول رہے تھے۔ شیریں نے کان اُدھر ہی لگا دیے۔

''آپ خود آفس کا چکر لگا لیا کریں کبھی کبھار......'' وہ دُرِّیکتا سے کہہ رہے تھے۔ شیریں کی آنکھیں رنگ بدلنے لگیں۔ انہیں منیجر پر بہت غصہ آیا۔

سائن کروانے آیا تھا اور ساتھ مشورے دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں کل تایا جان کے ساتھ آؤں گی خود۔'' دریکتا اس بار ان کا مشورہ رد نہیں کر پائی تھی۔

''ضرور آئیں' میں انتظار کروں گا۔'' منیجر صاحب کا لہجہ بہت مخلصانہ تھا۔ اس میں ان کی کوئی غرض نہیں تھی۔

''عمر صاحب کیسے ہیں اب؟''

''پپا کی حالت پہلے جیسی ہی ہے کوئی فرق نہیں پڑا۔'' دُرِّیکتا اداس ہو گئی تھی۔

''تو کون سے ڈاکٹر ان کا ٹریٹ منٹ کر رہے ہیں؟''

''کوئی بھی نہیں۔''

''کیا مطلب...... میں سمجھا نہیں؟''

''اصل میں ڈاکٹرز نے جو دوائیں پہلے تجویز کی تھیں وہی دے رہے ہیں پپا کو...... تایا جان لے کر گئے تھے پپا کو ڈاکٹر کے پاس...... انہوں نے بتایا ہے کہ پپا کی حالت ایسے ہی رہے گی۔ ان کی ذہنی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ باقی جو دوائیاں ہم انہیں استعمال کروا رہے ہیں وہ دورے کی شدت کم کرنے کے لیے ہیں۔ پہلے پپا کو دورہ جلدی، جلدی پڑتا تھا اب اس کے دورانیے میں کمی آگئی ہے۔ تایا جان بتا رہے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ پاپا کو مینٹل اسپتال یا کسی نفسیاتی علاج گاہ میں نہ داخل کروانا پڑ جائے کیونکہ اب ان کا رویہ گھر والوں کے ساتھ خطرناک اور جارحانہ ہوتا جا رہا ہے۔'' یہ سب تفصیل بتاتے ہوئے دُرِّیکتا کا لہجہ نم آلود سا ہو گیا تھا۔ بیچارے منیجر صاحب خود اداس ہو گئے۔

''کیا میں انہیں ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟''

''ہاں، ہاں آئیں میرے ساتھ۔'' دُرِّیکتا انہیں پپا کے کمرے کی طرف لے آئی۔ اس نے باہر سے کمرے کا لاک کھولا۔ وہ حیران، حیران سے اس کے پیچھے داخل ہوئے۔ عمر زیب...... گہری نیند میں تھے۔ شیریں بھی اٹھ کے ان کے پیچھے ہی آ گئی تھیں۔ منیجر صاحب تاسف سے سوئے ہوئے عمر زیب کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔ انہیں پس منظر

میں گڑ بڑ کا احساس ہوا مگر یہ گڑ بڑ کیا تھی؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ دُرِّیکتا کے چہرے پر معصومیت اور انجان پنے کی تحریر واضح تھی۔ وہ اس سے اور بھی کچھ پوچھنا چاہ ہی رہے تھے کہ شیریں کو دیکھ کے اپنے سوال کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ وہ بلی کی طرح دبے قدموں آئی تھیں...... شکر تھا کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا۔ منیجر صاحب اس کے بعد جلد ہی اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

''اس منیجر کی دُھلائی بہت ضروری ہے۔'' شیریں اس کے جانے کے بعد سوچ رہی تھیں۔ ابھی یہ فکران کے سر پر تھی کہ رات کو دُرِّیکتا نے تایا اورنگزیب سے کل آفس جانے کا کہہ دیا۔ اس نے منیجر کا ذکر گول کر دیا پر شیریں اس سے پہلے ہی یہ بات ان تک پہنچا چکی تھیں اورنگزیب پریشان سے ہو گئے۔

''ایسا ہے کہ میں کچھ دن کے لیے شہر سے باہر ایک ضروری کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں وہاں سے آؤں گا تو آفس جانا میرے ساتھ...... آخر کو وہ تمہارا ہی تو ہے۔ تم مالک ہو، تم باس ہو اور ہم ماتحت ہی تو ہیں تمہارے، کام کرنے والے، بھاگ دوڑ کرنے والے۔'' تایا اورنگزیب کا لہجہ جیسے بھرا سا گیا تھا۔ دُرِّیکتا تڑپ گئی۔

''تایا جان آپ سے کس نے کہا ہے کہ میرے ماتحت ہیں آپ، میں آپ کو پپا کی جگہ سمجھتی ہوں۔ خدانخواستہ ایسی سوچ کبھی میرے ذہن میں آئی ہی نہیں۔ آپ کبھی ایسا سوچیے گا بھی مت......'' بڑی دیر بعد دُرِّیکتا کے سمجھانے اور معذرتیں کرنے کے بعد وہ کچھ نارمل ہوئے تو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات خاص ان کے ذہن میں آئی۔ سر پر ہاتھ پھیر کے رہ گئے۔

''اوہو بات کیا کرنے لگا تھا تمہارے ساتھ ذہن سے نکل ہی گئی۔''

''کیا بات ہے تایا جان؟'' دُرِّیکتا ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''بیٹا یہ منیجر ہے ناں جسے عمر نے اپائنٹ کیا تھا، اس کی بہت ساری بے ایمانیاں اور گھپلے ان چند ماہ کے دوران میں نے پکڑ لیے ہیں، اب تو یہ ہمارے منہ کو آنے لگا ہے۔ نقصان پہنچا رہا ہے ہماری ساکھ کو۔ عمر بھائی نے بڑی محنت سے اپنے اس کاروبار کو ترقی دی ہے، میں اس میں کسی طرح کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا اس لیے میں نے اسے ڈس مس کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے سوچا تمہیں بتا دوں۔ پھر بھی اگر تم اسے بحال رکھنا چاہتی ہو تو میں اس کی راہ میں آڑ نہیں بنوں گا۔''

''تایا جان آپ جو مناسب سمجھیں کریں، میں کچھ نہیں کہتی۔'' کہنے کو تو اس نے یہ بول دیا تھا مگر دل ہی دل میں منیجر صاحب کے ساتھ ہونے والی کچھ گھنٹے پہلے کی باتیں یاد کر کے اسے پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ بظاہر ایسے لگتے تو نہیں تھے۔ پھر پپا بھی ان کی تعریف ہی کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے تایا جان سچ کہہ رہے ہوں۔ ان کا تجربہ اور مشاہدہ زیادہ ہے۔ انہیں انسانوں کی پرکھ بھی زیادہ ہوگی ورنہ وہ منیجر صاحب کو ڈس مس کرنے کا فیصلہ نہ کرتے۔ اس آخری سوچ نے اسے عارضی طور پر مطمئن کر دیا تھا۔ پر دل رہ، رہ کر یہی گواہی دے رہا تھا کہ منیجر صاحب مخلص انسان ہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

دن بڑے بے کیف اور بے رنگ سے تھے۔ مائرہ ....کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تھی۔ ہاتھ پاؤں سوجنے لگے تھے اور چہرے پر بھی ورم تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کچھ تکالیف لاحق ہو گئی تھیں۔ شیریں اس کی حالت اور تکلیف دیکھ، دیکھ کر کڑھتیں۔ اورنگزیب ان کے مجازی خدا نے گاؤں واپسی کا حکم سنایا تھا۔ سائرہ کا واپسی کا ذرا بھی دل نہیں تھا پر شیریں نے کسی نہ کسی طرح اسے بہلا کے واپسی پر آمادہ کر ہی لیا۔

''ہم بہت جلد پھر واپس آ جائیں گے۔ تم ابھی معاملے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''کیا صرف ہم ہی واپس جائیں گے؟'' وہ ضدی ہو رہی تھی۔

''نہیں، صرف ہم ہی نہیں جائیں گے۔''

''پھر کون، کون جائے گا۔''

''تم ذرا اِدھر آؤ۔'' شیریں نے اشارہ کیا تو وہ قریب کھسک آئی۔ وہ آہستہ، آہستہ سرگوشیوں میں کچھ بتانے لگیں۔ سائرہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''پھر ہم سب کب تک جائیں گے...... پر میرے کالج کا کیا ہوگا؟'' اسے یہ فکر بھی لاحق تھی۔

''جہاں مائرہ پڑھتی تھی تمہارا داخلہ بھی وہیں ہوگا فکر مت کرو، تمہارا سال ضائع نہیں ہوگا۔ جیسے ہی حالات بہتر ہوئے ہم دوبارہ اِدھر آجائیں گے۔''

''ٹھیک ہے آپ کہتی ہیں تو مان لیتی ہوں پر دل ذرا بھی نہیں کر رہا ہے گاؤں جانے کو...... یہاں اتنا مزہ آتا ہے ناں......''

شیریں نے اسے گاؤں میں رہنے کے فوائد گنوانے شروع کیے تو اس کے سارے اعتراضات ختم ہوگئے۔

☆☆☆

تایا جو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے لوٹ آئے تھے۔ سب کے ساتھ بیٹھے اپنی مصروفیات کے بارے میں بتا رہے تھے پھر وہ بطورِ خاص دُر یکتا کی طرف متوجہ ہوئے جو وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں لگ رہی تھی۔ وہ پپا کے بارے میں سوچ رہی تھی اس لیے اس کا دھیان ان کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔

''بیٹا میں اسلام آباد میں اپنے ایک جان پہچان والے ڈاکٹر سے ملا تھا۔ عمر زیب کی ساری رپورٹس اسے دکھائیں۔ سارا مسئلہ بھی ڈسکس کیا تو اس نے ایک مشورہ دیا ہے تم اگر سننا چاہو تو......؟''

''جی تایا جان آپ بتائیں انہوں نے کیا کہا؟''

وہ چونک کر اپنے خیالات سے باہر آئی۔

''میرا یہ دوست مشہور سرجن ہے اور دماغی امراض کا ماہر بھی۔ اس نے کہا ہے کہ اگر ہم عمر زیب کا ماحول بدل دیں اسے کسی اور جگہ لے جائیں تو ماحول اور مقام کی تبدیلی بہت فائدہ مند ہوگی اس طرح عمر کی صحت یابی کے امکانات جو بالکل معدوم ہوگئے ہیں پھر

سے روشن ہو جائیں گے۔''

''سچ تایا جان...... ! ایسا ممکن ہے؟'' وہ خوش ہوگئی۔

''ہاں بالکل سچ...... اب تم بتاؤ راضی ہو کہ نہیں۔'' وہ قدرے مطمئن ہو گئے۔

''تایا جان کس بات سے راضی ؟ میں کچھ بھی نہیں......'' وہ الجھی نگاہوں سے انہیں تکنے لگی۔

''یہی کہ ماحول اور مقام کی تبدیلی والی بات ...... جو ڈاکٹر نے کہی ہے۔''

''جی تایا جان میں بالکل راضی ہوں، مجھے کوئی اعتراض نہیں...... بلکہ میں تو خوش ہوں گی کہ اس طرح میرے پپا ٹھیک تو ہو جائیں گے ناں......''

''شاباش، تم نے واقعی ثابت کر دیا ہے کہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتی ہو پھر تیاری کرو۔''

''کہاں کی تیاری تایا ابو؟''

''گاؤں چلنے کی تیاری...... عمر کو وہیں تو لے کے جانا ہے۔ اپنوں کے درمیان رہے گا، اپنوں کی بھرپور محبت ملے گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے تایا ابو مجھے منظور ہے۔''

''ہاں بیٹا وہاں تمہارا بھی دل لگا رہے گا۔''

''ہوں'' وہ سر ہلا کے رہ گئی۔

پپا کے اور اپنے کپڑے اور ضرورت کی دیگر چیزیں دُرِ یکتا نے ایک بڑے بیگ میں رکھ لی تھیں۔ فارغ ہونے کے بعد سونے کے لیے لیٹی تو طرح، طرح کی سوچوں نے ذہن کو گھیر لیا۔ خاصی دیر کے بعد نیند نے پلکوں پر بسیرا کیا۔

☆☆☆

وہ تایا کی فیملی کے ساتھ گاؤں کی حویلی پہنچ چکی تھی۔ تایا اورنگزیب، عمر زیب کو اندر ایک کمرے میں لا چکے تھے۔ دُرِ یکتا نے تکیہ ٹھیک کر کے انہیں بستر پر بٹھایا۔ یہی وہ کمرا تھا جہاں گاؤں آمد پر انہیں ٹھہرایا جاتا تھا۔ اورنگزیب چلے گئے اب دُرِ یکتا، عمر زیب کے پاس اکیلی تھی۔

وہ پاؤں اوپر کر کے لیٹ گئے۔ ان کی بند پلکیں ہولے، ہولے لرز رہی تھیں۔ وہ خود کلامی کر رہے تھے۔ دُرِ یکتا نے پاس آ کے سننے کی کوشش کی پر صرف ان کے ہلتے ہونٹ ہی نظر آ رہے تھے کوشش کے باوجود کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ عمر زیب کے سر اور داڑھی کے بال کافی بڑھ چکے تھے۔ انہیں تراش خراش کی ضرورت تھی۔ اس کے خوش لباس، خوش پوش ہنس مکھ پپا کی کیا حالت ہوگئی تھی۔ وہ پہچانے ہی نہیں جا رہے تھے۔ وہ بیڈ پر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ عمر زیب اب بھی کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ اس نے ڈرتے، ڈرتے پپا کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو ایک دم سے انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے پپا کو پھر سے دورہ پڑنے لگا ہو۔ پر انہوں نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

''شاہ زیب نے کہا تھا کہ میں رات کو کال کروں گا، میں کب سے انتظار کر رہا ہوں اس نے کال ہی نہیں کی۔ میں پریشان ہو رہا ہوں۔'' وہ ہوش مندوں کی طرح صاف لہجے میں خود سے بول رہے تھے۔ دُرِ یکتا نے سماعتیں ان کی طرف متوجہ کر دیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ پپا سے کیا کہے۔ وہ عجیب بے بسی محسوس کر رہی تھی کہ اگر وہ کچھ کہے تو پپا کیا پتا سمجھ پائیں گے یا نہیں۔ کون سا وہ ایک نارمل انسان کی طرح ہیں۔ تھوڑی دیر بعد تایا واپس آ گئے۔ ان کے پاس عمر زیب کے لیے ڈھیروں دوائیں تھیں جو ڈاکٹرز مختلف اوقات میں تجویز کرتے رہے تھے۔ ان میں وہ انجیکشن اور گولیاں بھی تھیں جو عمر زیب کو آج کل استعمال کروائی جا رہی تھیں۔

اورنگزیب نے پانی کے ساتھ عمر زیب کو دو گولیاں دیں جو انہوں نے آرام سے کھا لیں۔ تھوڑی دیر بعد عمر زیب نے بڑبڑانا بند کر دیا۔ ان کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں، وہ کھولنا چاہ رہے تھے پر ان پر منوں بوجھ آ پڑا تھا۔ ان کا ذہن مدہوشی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اندھیرے کا ایک پردہ تھا جو اُن کے دماغ اور آنکھوں کے درمیان حائل ہو رہا تھا۔

''میں نے عمر کو دوا دے دی ہے اب یہ کچھ گھنٹے سکون سے رہے گا۔ تم چاہو تو اپنے لیے دوسرا کمرا دیکھ لو میں سیٹ کروا دوں گا۔''

''نہیں تایا جان! میرا خیال ہے کہ میں اِدھر ہی ٹھیک ہوں۔'' اس نے انکار کر دیا۔''

''پر میں عمر کے دورے کی گارنٹی نہیں دے سکتا۔ اور دورے کی حالت میں تمہیں پتا ہی ہے کہ یہ کتنا خطرناک ہو جاتا ہے۔'' انہوں نے وارننگ دی تو دُرِ یکتا کچھ سوچنے لگی۔ آج اس نے بہت قریب سے اور غور سے پپا کو دیکھا تھا۔ وہاں اپنے گھر میں انہیں بیڈروم میں لاک رکھا جاتا تھا۔ اورنگزیب تب ہی دروازہ کھولتے جب انہیں میڈیسن یا کھانا دینا ہوتا یا پھر نوکروں نے ان کے کپڑے بدلنے ہوتے۔ انہوں نے دُرِ یکتا کو بھی عمر زیب کے دوروں کا بتا کر خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس نے توجہ سے پپا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ پپا کو اس کی دیکھ بھال، محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ وہ انہیں نوکروں کی خدمت کے سہارے نہیں چھوڑ سکتی۔ ان کے سر اور داڑھی کے بال کتنے دنوں کے بڑھے ہوئے تھے۔ کسی کو خیال نہیں آیا تھا کہ انہیں بھی تراش خراش کی ضرورت ہے۔ وہ ان کے پاس اِدھر ہی رہے گی اور ان کی چھوٹی، موٹی ضروریات کا خود خیال رکھے گی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا۔

اورنگزیب نے اس کے چہرے کے تاثرت سے شاید اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگایا تھا تب ہی پھر دوسرے کمرے میں رہنے پر اصرار نہیں کیا۔ اورنگزیب جا ہی رہے تھے کہ اس نے پیچھے سے پکارا۔

''تایا جان اگر یہاں کوئی بال کاٹنے والا ہے تو پلیز بلوا دیں۔ پپا کے سر اور داڑھی کے بال بہت بڑھ گئے ہیں انہیں سیٹ کروانا ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے، ابھی تھوڑی دیر میں نائی یہاں پہنچ جائے گا اپنا کام کر دے گا۔ تم ان چھوٹی، چھوٹی باتوں پر پریشان مت ہو۔'' تایا نے اس کے سر کو.... بڑی اپنائیت سے سہلایا تو وہ مسکرا دی۔ تایا کتنے اچھے ہیں۔ اس کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ پپا سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اگر تایا نہ ہوتے تو جانے اس کا اور پپا کا کیا ہوتا اس سے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکی۔ دل ڈر سا گیا تھا۔

☆☆☆

''امی اور سب کھانے پر انتظار کر رہے ہیں آ جاؤ۔'' دوپہر کے کھانے کے لیے اسے سائرہ بلانے آئی۔

''میں پہلے پپا کو کھلا دوں پھر خود کھاؤں گی۔ پپا کے لیے کھانا بھجوا دو۔'' دُرِ یکتا کو جھجک سی ہو رہی تھی۔ حالانکہ شیریں تائی، سائرہ، عاشر سب ان کے گھر میں بے تکلفی سے رہتے رہے تھے۔ بغیر اجازت چیزوں کا استعمال، کھانا، پینا، پکوانا پر اسے یہاں اپنے تایا کے گھر میں خود سے کوئی چیز لیتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی کہ جانے یہ لوگ کیا سوچیں گے۔

''ٹھیک ہے، میں امی سے کہتی ہوں آ جانا پھر......'' سائرہ وہیں سے پلٹ گئی۔ کچھ دیر بعد نوکر کے ہاتھ ٹرے میں کھانا بھجوایا گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے پپا کو اٹھایا اور سو، سو منتیں کر کے جتن کر کے انہیں تھوڑا کھانا کھلایا۔ انہوں نے رات کو کھانا کھایا تھا اور اب دوپہر ہو چلی تھی۔ پھر بھی بڑی مشکل سے تھوڑا سا کھانا کھلایا تھا دُرِ یکتا نے۔ اورنگزیب نے کھانے کے بعد میڈیسن دینے کو کہا تھا۔ اس نے ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے پپا کو مشکل سے دوا بھی کھلا دی۔ تھوڑی دیر بعد ان کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔ تب وہ آہستگی سے دوراازہ بند کر کے تائی شیریں اور دیگر لوگوں کی طرف آ گئی۔ وہ سب کھانا کھا چکے تھے۔ تائی شیریں نے اسے دیکھتے ہی حویلی میں کام کرنے والی زبین سے کھانا لانے کو کہا جو یقیناً دُرِ یکتا کے لیے منگوایا جا رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے منع کر دیا۔

''تائی مجھے بھوک نہیں ہے ذرا بھی......'' اسے اکیلے کھانے کا سوچ کر شرم سی آ گئی۔ باقی سب کھا کے

فارغ بھی ہو چکے تھے وہ اکیلی بیٹھ کے کیا کھاتی۔ بھوکے رہنا بہتر تھا۔ تائی نے بھی ایک دفعہ رسمی سا اصرار کیا اور اس کے انکار پر پھر دوبارہ نہیں کہا۔

ماہ رہ اور سائرہ کی اپنی مصروفیات تھیں، وہ نظر نہیں آرہی تھیں۔ تائی شیریں، فوزیہ اور فرح چچی کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ اکیلی قدرے دور بیٹھی ان تینوں کو دیکھ رہی تھی۔ فرح چچی نے شاید اس کی بوریت محسوس کرلی تھی۔ اسے اشارے سے اپنی طرف آنے کو کہا۔ وہ بے دلی سے ان کے پاس بیٹھ گئی۔

''اب تم اِدھر آگئی ہو تو دل لگانے کی کوشش کرو۔ جہاں زندگی گزارنی پڑتی ہے وہاں دل لگانا پڑتا ہے۔ یہ دنیا کا دستور ہے۔ جو اس سے انحراف کرتا ہے اسے پچھتانا پڑتا ہے۔'' چچی نے بڑے ناصحانہ انداز میں اسے کوئی انجیکشن پاور کرانے کی کوشش کی تھی۔ جو دُرِیکتا کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

''ارے دل کیوں نہیں لگائے گی۔ اس کی ماں نے یہاں ہمارے رنگ ڈھنگ اپنا کے زندگی گزاری۔'' شیریں نے مسکراتے ہوئے بازو دراز کر کے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ دُرِیکتا کو ان کی باتیں سمجھ نہیں آرہی تھیں۔ بس سر ہلائے جا رہی تھی۔

☆☆☆

شام کو مسکین صورت ایک آدمی آیا اور عمر زیب کے سر کے بال کاٹے داڑھی سیٹ کی۔ دو ملازموں نے ان کے کپڑے تبدیل کیے وہ آج بہت زیادہ شور کر رہے تھے۔ لیمپ اٹھا کے ایک ملازم کے سر پر مارنے کی کوشش کی تو وہ خوفزدہ ہو کے بھاگ نکلا...... دوسرے نے اپنا حوصلہ قائم رکھا۔ عمر زیب جارحانہ موڈ میں تھے۔ کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دے رہے تھے۔

''میرے کپڑے دے دو، میرے کپڑے دے دو۔ یہ شاہ زیب کے ہیں، مجھے دے دو۔'' دُرِیکتا نے ان کے پہننے کے لیے جو سوٹ نکالا تھا وہ اسے ملازم کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ شور سن کے اورنگزیب بھی آگئے۔ ہارون اور نوید بھی نکل آئے۔

کسی نہ کسی طرح کپڑے تبدیل کروانے کا مرحلہ ختم ہوا تو دُرِیکتا ان کے پاس آئی۔ نوید چچا، پپا کو انجیکشن لگا رہے تھے۔ دریکتا کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اسے یہاں آکے ایک پل بھی سکون کا احساس نہیں ہوا تھا۔

''ٹھیک ہو جائے گا عمر...... تم مت پریشان ہو۔'' تایا اورنگزیب جانے کیا سمجھے تھے۔ اس کے پاس آکے اسے تسلی دی۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔

انجیکشن لگائے جانے کے بعد عمر زیب پُرسکون ہو رہے تھے۔ ان کی جارحیت اور مدافعت رفتہ رفتہ دم توڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سو چکے تھے۔ اورنگزیب، نوید اور ہارون تینوں بھائی ان کے پاس سے اٹھ کے قدرے الگ تھلگ سی جگہ پر آگئے۔

''عمر کی حالت روز بروز پہلے سے خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ٹرنکولائزر، سلیپنگ پلز اور انجیکشن اس کا علاج نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد وہ ان کا عادی ہو جائے گا تو یہ گولیاں اور انجیکشن اس کے لیے بیکار ثابت ہوں گے۔'' یہ ہارون زیب تھے۔

''پھر کون اتنا فارغ ہے جو دن رات اس کے پاس بیٹھ کے حفاظت کرے اس کی دیکھ بھال کرے۔'' اورنگزیب پُرخیال لہجے میں بولے۔

''دُرِیکتا ہے تو سہی پر اس کا علاج ضروری ہے ورنہ اس کے اعصاب رفتہ رفتہ بالکل کمزور ہو کے تباہ ہو جائیں گے۔'' نوید نے مشورہ دیا تو اورنگزیب نے اسے غصے سے دیکھا۔

''دوائیں دے تو رہے ہیں عمر کو...... اور اس کی دیکھ بھال میں کون سی کمی چھوڑی ہے ہم نے...... ڈاکٹر کے پاس بھی لے گئے تھے جو دوائیں ہم..... اسے استعمال کرا رہے ہیں۔ ڈاکٹر کی ہی تجویز کردہ ہیں۔''

''مگر یہ کوئی مستقل حل یا علاج نہیں ہے۔'' ہارون زیب کی دلیل کافی مضبوط تھی۔

''اب ہم اسے یہاں لے آئے ہیں حویلی میں اپنوں کے پاس رہے گا، سب کو دیکھے گا تو اس کے ذہن پر اچھا اثر ہی پڑے گا۔ وہاں شہر میں کون تھا اس

کا...... یہاں ہم اس کے بھائی ہیں، ہماری اولادیں ہیں، بیویاں ہیں۔ سب اس کی دیکھ بھال کریں گے۔ رفتہ، رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اورنگزیب کا انداز دوٹوک تھا۔ ہارون اور نوید بھی خاموش ہو گئے اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں چھڑ گئیں۔ سب کو عمر کا خیال اور اس کی دیکھ بھال بھول گئی۔ وہ اب بھی آنکھیں موندیں دوائیوں کے زیرِ اثر گہری نیند میں تھے۔ ان کے لیے یہ گہری نیند ہی بہتر تھی۔ بیدار ہوتے تو شاہ زیب کو ڈھونڈتے، اس کی فون کال کا انتظار کرتے۔ اسے دیوانہ وار آوازیں دیتے...... کبھی مائرہ کو پکارتے اس سے خود ہی پوچھتے شاہ زیب کا اور پھر خود کو خود ہی جواب دیتے۔ ان کا ذہن ایک مخصوص ثانیے کی گرفت میں قید ہو گیا تھا۔ جب شاہ زیب سے ان کی آخری بار بات چیت ہوئی تھی اور شاہ زیب نے اس وعدے کے ساتھ فون بند کیا تھا کہ میں کل اسی وقت آپ کو پھر کال کروں گا...... پھر نہ تو وہ دن آیا اور نہ اس کی کال آئی۔ نہ عمر کی شاہ زیب سے بات ہوئی...... پر عمر انتظار کے اسی لمحے کے قیدی بن چکے تھے۔

جب سے عمر زیب کی ذہنی حالت ابتر ہوئی تھی، مائرہ ایک بار بھی ان کا حال دیکھنے اور پوچھنے ان کے پاس نہیں آئی تھی۔ اب تو وہ حویلی میں تھے تب بھی اس نے یہ زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ عمر چچا کو ایک نظر دیکھ ہی لے۔ بے شک وہ نیم پاگل تھے سب ان کے پاس جاتے ڈرتے پر اکثر اوقات وہ دوائیوں کے زیرِ اثر سوئے رہتے۔ نیند کے عالم میں تو وہ بالکل بے ضرر تھے۔ تب بھی اس نے دلچسپی نہیں لی۔ کبھی دُرِّ یکتا سے بھی یہ نہیں پوچھا کہ عمر چچا کیسے ہیں...... ان کی حالت اب کیسی ہے۔ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں، وہ اپنی دنیا میں مگن تھی۔ زیادہ تر کمرے تک ہی محدود رہتی۔ شریفاں دائی وقتاً فوقتاً گھر آ کے معائنہ کر جاتی۔ اس کے ساتھ، ساتھ شیریں پاس کے شہر سے لیڈی ڈاکٹر کو بلوا کے بھی معائنہ کرواتی۔ مائرہ کے معاملے میں وہ بہت حساس ہو رہی تھیں۔ ساتھ وہ پہلی بار ماں بن رہی تھی بہت احتیاط اور دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ لاکھ وہ مائرہ کی دلجوئی کریں، خیال رکھتیں مگر اس کی تکلیف میں حصے دار نہیں بن سکتی تھیں۔ مائرہ کو اکیلے ہی سب برداشت کرنا تھا۔

اس کی زندگی پہ تو جیسے خزاں کا پہرا تھا ہر چیز زرد اداسی میں لپٹی نظر آتی...... اسے اپنے وجود میں سانس لیتی زندگی اور اس زندگی کو دنیا میں لانے سے ذرہ بھر بھی دلچسپی نہیں تھی۔ بحالتِ مجبوری وہ اس بوجھ کو برداشت کر رہی تھی۔ جس نے اس کی ساری اسمارٹ نیس کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ اس کے پُرکشش جسم کو بھدا اور بے ڈول بنا ڈالا تھا۔

وہ ایک، ایک دن گن کر گزار رہی تھی مگر...... دُرِّ یکتا کو اس کی بڑی فکر تھی۔ صبح شام پوچھنے چلی آتی۔

''بھابی آپ ٹھیک ہیں ناں، اپنا خیال رکھا کریں، کھانا ڈٹ کر کھائیں...... خوش رہیں۔'' وہ روز اسی طرح کے جملے بولتی، مائرہ کے لبوں پر اک زہر خند پھیل جاتی۔ دل ہی دل میں جھنجلاتی پر زبان سے نہ بولتی، شیریں نے ان دونوں بہنوں کو سختی سے ہدایت دی تھی کہ دُرِّ یکتا کے ساتھ اپنا رویہ لب و لہجہ ٹھیک رکھو۔ مارے باندھے مائرہ اس کے سوالوں کے جواب دیتی...... پر سائرہ اسے زیادہ لفٹ نہیں کراتی تھی۔ دُرِّ یکتا سے سامنا ہوتے ہی چھم سے اشعر لغاری اس کی نگاہوں کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ اتنا شاندار نوجوان دُرِّ یکتا کا شوہر...... ایسا اس کا بھی تو ہونا چاہیے بلکہ وہ اسی کا ہوسکتا ہے۔ اس میں آخر کیا کمی ہے۔ اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے، خوب صورت ہے اسمارٹ ہے، بااخلاق ہے اور کیا چاہیے بھلا کسی کو...... اشعر لغاری دیکھنے میں کافی میچور اور دُرِّ یکتا سے بڑا تھا۔ سائرہ کے خیال میں یہ اس کی خوبی تھی۔ دُرِّ یکتا اسی کی ہم عمر ہی تھی تقریباً سو اس کی جگہ وہ بھی تو ہوسکتی ہے۔ سائرہ کے دماغ میں آج کل ایسی ہی سوچیں پل رہی تھیں۔ جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ اسے اشعر لغاری کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو تھی کہ وہ...... اس سے بات کر پائے مگر گاؤں میں یہ کہاں ممکن تھا۔ ایسے ہی سب اسے یہاں لے آئے تھے۔ وہاں

رہتی تو اشعر سے ملنے کی امید تو تھی۔ وہ انکل کا پوچھنے یا دُرِّ یکتا سے ملنے تو آتا ہی...... وہ بھی اسی بہانے اسے مل لیتی اور چند باتیں کر لیتی ہو سکتا ہے فلموں اور کہانیوں کی طرح اس کی زندگی میں بھی کوئی انہونی ہو جاتی اور وہ اسے پسند کر لیتا۔ دُرِّ یکتا سے علیحدگی اختیار کر لیتا اور ساری دنیا سے لڑ کر اسے اپنا لیتا۔ وہ کھلی آنکھوں سے یہ خواب دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری آج صبح سے ہی کچھ پریشان سے تھے۔ جانے کیوں رہ رہ کر دھیان کی رو عمر زیب اور دُرِّ یکتا کی طرف بہہ رہی تھی۔ ان کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ آخری بار اورنگزیب سے السلٹ کروانے کے بعد ان کا جی چاہا ہی نہیں کہ پھر وہاں جایا جائے۔ بس دل مسوس کر رہ جاتے۔ اشعر وہاں گیا اور اس نے بھی دُرِّ یکتا کے رویے کی شکایت کی۔ رشتوں میں ایک ان دیکھی سی دراڑ آ گئی تھی۔ تعلق جامد سے محسوس ہو رہے تھے۔ گمان، یقین میں بدل رہے تھے۔ وہ خود وہاں جا کے دیکھنا چاہ رہے تھے کہ اس نظر نہ آنے والی دوری اور دراڑ کی وجوہات کہاں تک ہیں۔ ان کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جی تو نہیں چاہ رہا تھا پر اب وہاں جانا ناگزیر تھا۔ اشعر کی منکوحہ اور اپنے دوست کی اس گھر میں موجودگی سے وہاں سے ان کا بڑے مضبوط تعلق کا حوالہ موجود تھا۔ اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی وہ اپنے آپ میں توانائی محسوس کرنے لگے۔ اشعر گھر آیا تو وہ تیار بیٹھے تھے...... عمر زیب کی طرف جانے کے لیے اسے بھی فوری تیاری کا حکم ملا تو وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا ان کے کہے کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ کچھ منٹ میں ہی یونیفارم تبدیل کر کے ان کے ساتھ ہو لیا۔

☆☆☆

عمر زیب کے پُر شکوہ گھر کے داخلی گیٹ پر چوکیدار کی صورت میں بالکل اجنبی صورت متعین تھی۔ اشعر نے گیٹ پر پہنچ کے ہارن دیا تو چھوٹا گیٹ کھول کے وہ اجنبی صورت چوکیدار باہر نکلا...... اشعر کی گاڑی، شاندار شخصیت اور ساتھ موجود پُر وقار سے طاہر لغاری کو دیکھ کر وہ خاصا متاثر نظر آنے لگا اور جھٹ ہاتھ ماتھے تک لے جا کے سلام کیا...... اشعر نے سلام کا جواب دے کر گھر کے مالکان کا پوچھا اس نے دانستہ طور پر عمر زیب کا نام نہیں لیا تھا۔

''صاحب اندر ہیں، آپ جائیں۔'' اس نے گیٹ کے دونوں پٹ کھول دیے اور انہیں اندر داخل ہونے کا موقع دے کر خود کونے میں ہو گیا۔

اندر موجود ایک اور اجنبی صورت ملازم نے ان کی آمد کی اطلاع کر دی تھی۔ اورنگزیب ان کے استقبال کے لیے خود موجود تھے۔

''السلام علیکم طاہر صاحب! آج کیسے راستہ بھول پڑے ہیں آپ......'' انہوں نے باری، باری دونوں سے زوردار قسم کا مصافحہ کیا اور ڈرائنگ روم کی طرف پیش قدمی کی مگر ہاتھ کی گرفت کے برعکس اس میں خلوص ناپید تھا۔ طاہر لغاری کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی جس سے طاہر اپنے آپ میں بے چینی محسوس کرنے لگے۔

''تشریف رکھیے......'' انہوں نے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔ جب وہ بیٹھ گئے تو وہی اجنبی ملازم جسے طاہر نے پہلے کبھی یہاں عمر کے گھر میں نہیں دیکھا تھا اورنگزیب کے پاس آ کے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اسے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لانے کو کہا اور دوبارہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ہاں جی اب بتائیں کیسے آنا ہوا؟'' ان کے لبوں پر بڑے خوش اخلاق قسم کے میزبان والی مسکراہٹ بجی ہوئی تھی۔

''ہم عمر زیب کو دیکھنے اور اس کا حال دریافت کرنے آئے ہیں۔ ساتھ میں اپنی بہو سے بھی ملنا چاہ رہا تھا اس لیے سوچا کہ آج چکر لگا ہی لیا جائے۔'' طاہر لغاری کو ایسے محسوس ہوا جیسے اورنگزیب اور ملازموں کے سوا گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔ عورتوں والی

مخصوص گہما گہمی بھی ناپید لگ رہی تھی۔

''اوہو آپ کو بتانا یاد ہی نہیں رہا۔'' اورنگزیب سر پر ہاتھ مار کے بولے تو طاہر لغاری کو لگا جیسے کوئی خاص بات ہو۔ وہ اضطراری انداز میں ان کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اشعر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ جیسے یہاں موجود ہی نہیں ہو۔ ''عمر زیب تو ملک سے باہر ہے، میں نے ڈاکٹروں کے مشورے کے بعد اسے امریکا بھجوا دیا ہے۔ جہاں اس کا علاج ہو رہا ہے۔ دُرِ یکتا بھی ساتھ ہے عمر کے.....'' اورنگزیب ان کی سماعتوں پر بم گرا کے بالکل مطمئن تھے۔

''کب گئے وہ دونوں...... مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' طاہر لغاری صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ بیٹھیں، میں سب بتاتا ہوں۔ اصل میں عمر کی حالت کچھ زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے جلدی، جلدی میں سب کچھ ہوا۔ کسی کو بھی بتانے یا اطلاع کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں اس پر معذرت خواہ ہوں۔'' اورنگزیب کے چہرے پر مصنوعی شرمندگی کا تاثر تھا۔

اس خبر نے اشعر کو بھی حیران کر دیا تھا۔ وہ بھی توجہ دینے پر مجبور ہو گیا۔ طاہر لغاری خود کو تھکا، تھکا سا محسوس کر رہے تھے۔

''اچھا مجھے دُرِ یکتا کا کوئی نمبر دے دیں تاکہ میں اس سے رابطہ کر کے پوچھ تو سکوں۔'' امید کی ایک کرن نظر آئی تھی۔

''اس کے لیے میں معذرت چاہوں گا۔ دُرِ یکتا کا آج صبح فون آیا تھا کہ اسپتال میں اس کا موبائل فون کہیں گر گیا ہے۔ وہ جیسے ہی کوئی اور فون لے گی مجھے بتا دے گی۔ اس نے جب مجھے بتایا میں فوراً آپ کو نمبر دے دوں گا، آپ رابطہ کر لیجیے گا۔'' طاہر لغاری نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ اشعر انہیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''ٹیک اٹ ایزی پپا......'' وہ انہیں تسلی دینے لگا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر پھیکے انداز میں مسکرائے اور اٹھنے کا اشارہ کیا۔

اورنگزیب نے بہت زور مارا کہ کچھ دیر وہ اور بیٹھیں پر وہ نہیں مانے۔ گیٹ سے باہر آ کے انہوں نے چند لمبی، لمبی سانسیں لیں جیسے ان کے وجود میں سخت گھٹن ہو اور وہ اسے نکالنا چاہ رہے ہوں۔

''پپا آپ کو ایک دم سے کیا ہو گیا ہے؟'' اشعر نے پوچھا۔

''بیٹا مجھے کوئی بات بہت ہی بری طرح سے کھٹک رہی ہے۔ عمر زیب، دُرِ یکتا کے ساتھ باہر بھی چلا گیا اور ہمیں کوئی اطلاع دینا بھی گوارا نہیں کیا گیا۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے یہ سب جھوٹ ہے۔''

''پپا آپ چھوٹی، چھوٹی باتوں کو ذہن پر سوار کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے عمر انکل واقعی ملک سے باہر ہی ہوں۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ وہ اس وقت ان کے ذہن کو سوچوں اور ٹینشن سے آزاد دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اس لیے دانستہ طور پر ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا...... پر طاہر چڑ سے گئے۔

''ہاں تمہیں کیوں فکر ہونے لگی۔ وہاں جا کے اجنبیوں کی طرح بیٹھے رہے کوئی بات تک نہیں کی۔ تمہیں کوئی فکر نہیں ہے۔ عمر کے ساتھ تمہاری منکوحہ بھی تو ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں تمہیں کوئی احساس ہی نہیں۔''

انہوں نے اس کی کلاس لے ڈالی، اشعر مسکرانے لگا۔ طاہر کافی بے چین تھے۔

''کمال ہے، عمر میرا جگری دوست امریکا پہنچ گیا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔''

''آپ کے دوست کے ساتھ میری منکوحہ بھی تو ہے آپ بھول رہے ہیں۔'' اشعر نے شرارتی انداز میں یاد دہانی کروائی تو وہ اسے گھورنے لگے۔ اشعر نے ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر اس خاموشی کو طاہر نے ہی توڑا۔

''گھر کے ملازم بھی نئے ہیں، یہ بھی قابلِ غور بات ہے۔''

''پپا آپ مت فکر کریں، عام سی باتوں کو خواہ مخواہ

ذہن پر سوار کر رہے ہیں، اہمیت دے رہے ہیں۔ ان کی مرضی، گھر کے مالک ہیں جس کو چاہیں رکھیں جس کو چاہیں نکالیں۔ یہ میرے اور آپ کے سوچنے کی بات نہیں ہے یہ ان کے گھر کا مسئلہ ہے۔ ہوسکتا ہے وہ نوکروں کی کارکردگی سے مطمئن نہ ہوں یا انہیں اور اچھے نوکر مل گئے ہوں اور انہوں نے پرانے نوکروں کو نکال دیا ہو اور رہی بات عمر انکل کو علاج کی خاطر ملک سے باہر بھجوانے کی تو اس میں پریشانی والی بات ہے اور نہ حیرانی والی...... کیونکہ اورنگزیب انکل اور ان کی وائف نے پہلے ہی کہا تھا کہ ہم عمر کو علاج کی خاطر ملک سے باہر بھی بھجوائیں گے اگر وہ یہاں سے ٹھیک نہ ہوئے تو...... اور یہ ذہنی بیماریاں اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہوتیں، آپ کو پتا ہی ہوگا۔ امریکا میں دماغی امراض کے بہترین معالج موجود ہیں۔ سو عمر انکل کی فیملی نے ان کو وہاں بھجوادیا ہوگا اور بات رہ جاتی ہے ہمیں نہ بتانے کی یا اطلاع نہ کرنے کی تو...... اس کی وجہ ان کی گھریلو پریشانیاں بھی تو ہوسکتی ہیں۔ عمر انکل کے ساتھ جو حادثہ ہوا یہ اتنی جلدی بھولنے والا نہیں ہے۔ گھر کا ہر فرد پریشانی کا شکار ہوگا اس پر ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی ہوگی کہ ہمیں بھی اطلاع کروائی جائے۔'' اس نے اپنی طرف سے انہیں مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی...... پر ان کی سوئی ایک نقطے پر اٹک گئی۔

''اچھا دُرِ یکتا تو مجھے بتاسکتی تھی یا فون ہی کرسکتی تھی۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہمارا نمبر ان کے پاس موجود ہی نہیں ہو۔'' اشعر کے پاس ہر بات کا ریڈی میڈ جواب تیار تھا۔ طاہر لغاری خاموش ہی ہوگئے۔

☆☆☆

اورنگزیب سر پکڑ کے بیٹھے تھے۔ اس بات کا اندازہ انہیں پہلے سے تھا کہ کیا، کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ اس کے حل بھی انہوں نے کچھ نہ کچھ تیار کرلیے تھے۔ پر یہ پریشانیاں اور مشکلات اتنی جلدی سامنے آجائیں گی اس کا انہیں بہرحال پتا نہیں تھا۔ کسی نہ کسی سے مشورہ کرنا ضروری تھا اور یہ مشورہ شیریں سے بڑھ کر کون دے سکتا تھا۔

اتنی جلدی طاہر لغاری اپنے بیٹے کے ساتھ پوچھنے چلا آئے گا یہ ان کی سوچ میں بھی نہیں تھا۔ دُرِ یکتا کے نمبر کا آج انہوں نے بہانہ کرکے ٹال دیا تھا مگر آئندہ کے لیے یہ بہانہ نہیں چل سکتا تھا۔

اس کا حل بھی موجود تھا۔ آئندہ کسی پریشانی کی صورت میں انہیں کیا کرنا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا۔

☆☆☆

اورنگزیب، ہارون اور عاشر کے سپرد آفس کی ذمے داری چھوڑ کے خود ہنگامی طور پر گاؤں آئے تھے۔ شیریں کو کچھ چیزوں اور واقعات کے بارے میں بتانا ضروری تھا۔ نوید بھی گاؤں میں تھا، اسے دفتری معاملات سے الجھن سی ہونے لگی تھی...... وہ اکتا گیا تھا، اتنا لمبا انتظار اس کے بس سے باہر تھا۔ اورنگزیب کی پلاننگ اس کی عقل سے بعید تھی۔ وہ گاؤں میں اپنی چودھراہٹ اور ٹور (شان) میں خوش تھا۔ ہارون...... فی الحال کسی امید میں اورنگزیب بھائی کے ساتھ ہی تھا۔

☆☆☆

گاؤں آئے ہوئے تین ہفتے سے زائد ہوگئے تھے۔ عمر زیب کی حالت میں کوئی بہتری دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ دُرِ یکتا کی تعلیم کا حرج ہورہا تھا۔ اس کی اسے اتنی فکر نہیں تھی جتنی پپا کی تھی۔ اورنگزیب تایا تو اپنے ڈاکٹر دوست کے بلند و بالا دعوؤں کے ہمراہ عمر زیب کو گاؤں لے کر آئے تھے کہ یہاں کے ماحول میں رہ کر اس کی ذہنی حالت رفتہ رفتہ سنبھل جائے گی اور اس کا واحد علاج ہی یہی ہے۔ ان کی ذہنی حالت کیا سنبھلنی تھی، چوبیس گھنٹے ایک کمرے میں بند اکثر اوقات مدہوشی کی حالت میں رہتے۔ کھانا بھی مشکل سے کھاتے۔ کوئی آکے دیکھتا تک نہیں تھا۔ ہاں نوید چچا کھڑے کھڑے پوچھتے کہ کیسی طبیعت ہے اب عمر بھائی کی۔ باقی کسی کے پاس شاید اتنا وقت نہیں تھا۔ شیریں تائی بھی اِدھر کا رخ نہیں کرتی تھیں۔ ہاں دُرِ یکتا پر نظر پڑتی تو انہیں دھیان آتا کہ عمر زیب کا بھی پوچھ لینا

چاہیے۔ مائرہ، سائرہ یا باقی دونوں چچا کی اولادوں کو اپنے عمر چچا سے ایسی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے بھی ایک بیمار نیم پاگل شخص کی ان کے نزدیک ایسی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی جو دن رات ان کی پٹی سے لگے بیٹھے رہتے۔ لے دے کے دُرِیکتا ہی تھی جو باپ کو دیکھ، دیکھ کر جلتی تڑپتی۔ اس کا سیل فون پُراسرار طور پر اس کے بیگ سے غائب ہوگیا تھا۔ اس نے بھی زیادہ دھیان نہیں دیا مگر اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ایک نیا موبائل فون ضرور خرید اجائے۔ کبھی کبھی اسے کسی ہمدرد کی سخت ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنے دکھوں اور آنسوؤں کو اندر سمونے کا ہنر جانتی تھی سو کبھی دوستوں سے بھی کھل کے بات نہیں کرتی تھی۔ یہ عادت اب پختہ ہو چکی تھی لیکن اب اسے احساسِ تنہائی ہو رہا تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی اسے طاہر انکل یاد آ گئے۔ وہ پپا کے مخلص اور قریبی دوست تھے۔ دُرِیکتا کو ان کے آنے سے پپا کی خیر خبر لینے سے بڑی ڈھارس ملتی تھی لیکن انہوں نے بھی اچانک آنا جانا ختم کر دیا تھا پھر ایک دن وہ مغرور سا بیٹا آیا اور اسے کچھ عجیب سی باتیں سنا کر چلا گیا پھر ایک لمبی خاموشی تھی۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ وہ طاہر انکل سے دل ہی دل میں شکوہ کناں تھی۔ انہیں خبر تو لینی چاہیے تھی۔ بے شک پپا اپنے حواس میں نہیں تھے پر وہ تو ٹھیک تھی تندرست تھی۔ ان کے گاؤں آنے سے پہلے بھی پپا کا پوچھنے نہیں آئے۔ اب تو گاؤں آئے ہوئے بھی اتنے دن ہو گئے تھے۔ ان کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ نہ ہی تایا نے کوئی ذکر کیا تھا۔ دُرِیکتا کے دل میں تھا کہ ہو سکتا ہے ان کی غیر موجودگی میں طاہر انکل پوچھنے آئے ہوں اگر یہ بات ہوتی تو تایا ضرور اسے بتاتے۔ اسے رونا آنے لگا۔ پپا نے کتنے چاؤ سے طاہر انکل کے بیٹے کے ساتھ اس کا نکاح کیا تھا۔ اس شخص نے اسے ایک بار بھی نہیں پوچھا تھا۔ اس کی زندگی کتنی مشکلات اور پریشانیوں کا شکار تھی۔ وہ اکیلی ہی سب کچھ سہہ رہی تھی، صبر کر رہی تھی۔ کیا فائدہ تھا اس نام نہاد بندھن کا جب اس شخص نے اس کے اور اپنے مابین رشتے کی نزاکت کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ ٹھیک ہے رخصتی نہیں ہوئی تھی ابھی پر وہ اس کی منکوحہ تو تھی۔ اس کی ان حالات میں خبر گیری کرنا اشعر کا فرض بنتا تھا اور وہ شخص اپنے اس فرض سے ہی غافل تھا۔ دُرِیکتا کو اس کے ساتھ اپنا وہ تصادم یاد آیا تو ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر دم توڑ گئی۔

☆☆☆

اورنگزیب، شیریں کو آہستہ، آہستہ کچھ بتا رہے تھے، جب دُرِیکتا ان کے پاس آئی۔ نوکرانی کی زبانی اسے تایا کی آمد کا پتا چلا تھا اور وہ چلی آئی تھی۔ دُرِیکتا کو دیکھتے ہی انہوں نے شیریں سے بات چیت کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا اور اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جو مضطرب سے لگ رہی تھی۔ وہ سلام کر کے بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے پریشان لگ رہی ہو؟'' اورنگزیب اس کی اندرونی کیفیت تاڑ گئے تھے۔

''نہیں تایا جان، پریشان تو نہیں ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے تردید کی۔

''پھر کیا بات ہے...... تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ کسی کش مکش میں ہو؟'' وہ چہرہ پڑھنے کے فن سے آشنا تھے۔ اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔

''تایا جان مجھے ایک سیل فون کی ضرورت ہے۔'' اسے یاد آ گیا کہ اس کا سیل فون کہیں گم ہو گیا ہے۔

''یہ لو میرا لے لو، میں اور خرید لوں گا بلکہ میرے پاس ایک اور فون موجود ہے۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل فون اس کی طرف بڑھایا۔

''نہیں تایا جان، یہ آپ خود استعمال کریں کیونکہ میرے پاس سم بھی نہیں ہے کیونکہ میرا فون پتا نہیں کیسے غائب ہو گیا ہے۔''

''اچھا چلو تمہیں صبح ہی نیا فون اور سم مل جائے گی۔'' وہ شاہانہ انداز میں بولے۔ دُرِیکتا، طاہر انکل کے بارے میں معلوم کرتے ہوئے جھجک سی گئی۔

''تایا جان ہمارے گاؤں آنے کے بعد طاہر انکل یا ان کے گھر سے کوئی پپا کو پوچھنے تو نہیں آیا؟''

اس نے تایا اور نگزیب سے نظریں ملانے سے گریز کیا تھا۔ شیریں نے آنکھوں، آنکھوں میں اورنگزیب کو اشارہ کیا۔

''کوئی بھی نہیں آیا۔ میں خود اتنا حیران ہوں کہ عمر کا یہ دوست بڑے دعوے کرتا تھا...... عمر کے ساتھ دوستی کا دم بھرتا تھا اور جب سے عمر کا یہ حال ہوا...... ایک آدھ بار کے علاوہ اسے پوچھنے بھی نہیں آیا۔ چند دن پہلے دفتری سلسلے میں ایک تقریب ہوئی وہاں ''تمہارے پپا'' کا یہ دوست طاہر لغاری بھی آیا ہوا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو رخ موڑ لیا۔ میں خود اٹھ کے قریب گیا سلام دعا کی تو بڑے روکھے پھیکے انداز میں سلام کا جواب دیا۔ میں نے خود ہی عمر کے بارے میں بتایا۔ آگے سے وہ کچھ نہیں بولا بلکہ عمر کو گاؤں لانے سے پہلے میں نے گھر جا کے بتایا تھا کہ ہم اسے گاؤں لے کے جارہے ہیں تب بھی اس نے نہیں پوچھا۔'' وہ بڑے جذب سے من گھڑت کہانی اسے سنا رہے تھے۔

''سچ پوچھو تو بیٹا طاہر لغاری اور اس کے بیٹے اشعر کے رویّے سے مجھے بھی بہت دکھ پہنچا۔ عمر کو بہت جلدی تھی ان لوگوں سے رشتہ جوڑنے کی۔ میں بہت حیران ہوں کہ اتنی جلدی یہ لوگ بدل گئے ہیں...... ابھی تو صرف عمر نے نکاح کیا تھا بیٹی کا اگر رخصتی کر دیتا تو جانے کیا ہوتا...... خیر میں جاؤں گا طاہر کے گھر اور اس سے پوچھوں گا اس کی بیگانگی اور سرد مہری کا سبب...... ہم نے بیٹی دی ہوئی ہے کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ کم از کم اس رشتے کا تو احساس کرنا چاہیے۔''

''ایک لحاظ سے وہ بھی تو اپنی جگہ ٹھیک ہے۔'' شیریں بلا کے سنجیدہ لہجے میں بولیں۔

دُرِیکتا کے ساتھ، ساتھ اورنگزیب بھی چونک گئے۔

''تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ طاہر لغاری اپنی جگہ ٹھیک ہے؟'' اورنگزیب نے پوچھا۔

''عمر بھائی کا یہ دوست دراصل اکڑ رہا ہے کیونکہ یہ بات آپ کے علم میں ہے ناں کہ عمر بھائی نے خود منتیں کر کے طاہر لغاری سے نکاح کے لیے کہا تھا، مارے باندھے منگنی تو کر لی تھی انہوں نے...... عمر بھائی نے جب دُرِیکتا سے نکاح کے لیے خود سے اصرار کیا تو طاہر بھائی نے بیٹے سے کہا۔ دُرِیکتا کے مستقبل کے ساتھ انہیں بہت ساری جائداد اور فوائد بھی تو نظر آرہے تھے سو اشعر نے بھی نکاح کر لیا۔'' سچ ہے جو جیسا خود ہوتا ہے ویسا ہی دوسروں کے بارے میں سوچتا ہے۔ دریکتا ہراساں نگاہوں سے کبھی شیریں تائی اور کبھی تایا اورنگزیب کو دیکھ رہی تھی۔ ان انکشافات نے اس کے پاؤں تلے سے زمین ہی سرکا دی تھی کہ یہ نکاح پپا کے منتیں کرنے سے، واسطے ترلے کرنے سے ہوا ہے۔ اسے مجبوری کے عالم میں گلے میں طوق بنا کے ڈالا گیا ہے۔ کیا وہ اتنی ہی گئی گزری تھی کہ پپا کو اس کے رشتے کی خاطر طاہر انکل کی منت کرنی پڑی۔ کیا وہ شکل صورت میں کم تھی یا اس کے کیریکٹر میں کوئی خرابی تھی جو پپا کو ان لوگوں کی منتیں کرنا پڑیں کہ خدارا میری بیٹی کو اپنا لو...... کیوں؟ کیا اس کے لیے کوئی رشتوں کی کمی تھی؟ اس کے نسوانی پندار کا بُت بری طرح چکنا چور ہوا تھا۔ سارا نسوانی غرور قدموں تلے روندا گیا تھا۔ عورت کا غرور ہی اس بات میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ وہ من چاہی ہے، اسے اپنایا گیا ہے نہ کہ بھیک اور خیرات کی طرح قبول کیا گیا ہے۔ اس کا یہ غرور، ہی ٹوٹ گیا تھا۔ کاش کہ شیریں تائی یہ منحوس بات اسے نہ بتاتیں۔ اپنے دل میں، ہی رکھتیں۔ کم سے کم وہ اتنا دکھی تو نہ ہوتی۔ اتنی توہین اور کم مائیگی کا احساس تو نہ ہوتا...... کاش وہ پپا سے جواب طلب کر سکتی۔ ان سے پوچھ سکتی کہ پپا آپ نے خیرات کی طرح کیوں مجھے ان کی جھولی میں ڈالا۔ کیا میں بوجھ تھی آپ پر...... کیوں زبردستی طاہر انکل کے بیٹے کے سر مجھے منڈھ دیا؟

اس کے کانوں میں شیریں تائی کی تکلیف دہ آواز ابھی تک آرہی تھی۔ ''طاہر لغاری خود اب کہتا ہوگا کہ عمر نے مجھے زبردستی گھر بلا کے اپنی بیٹی دی ہے۔ ارے ہم نے بھی مائرہ کا رشتہ دیا تھا عمر کو...... مگر اچھی

طرح غور کرنے کے بعد حالانکہ شاہ زیب کوئی غیر نہیں تھا...... اور ایک عمر بھائی ہیں خود اپنے منہ سے بول کے بیٹی دی۔ اس طرح خود اپنے منہ سے بیٹی کے رشتے کے لیے کہا جائے تو سامنے والا بندہ بھی سوچتا ہے کہ بیٹی میں کوئی عیب ہوگا جب ہی سر سے بوجھ کی طرح اتاری ہے۔ اسی وجہ سے تو طاہر اکڑ رہا ہے۔'' دُرِّیکتا کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے اٹھ کے بھاگ جائے۔

''ہاں نیک بخت تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ سامنے کی بات مجھے نظر ہی نہیں آئی۔ اسی وجہ سے طاہر کا رویہ تکلیف دہ حد تک اجنبیوں والا ہے۔ پر تم نے دُرِّیکتا کے سامنے یہ ذکر چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اب دیکھو یہ کتنی پریشان ہوگئی ہے۔'' اورنگزیب نے شیریں کو گھورا تو اس نے جھٹ دُرِّیکتا کو سینے سے لگالیا۔

''ٹھیک ہی تو کہتی ہوں، میرے دل میں کتنی آرزو تھی کہ اسے اپنے عاشر کی دلہن بناؤں۔ عمر بھائی کی کتنی منتیں کیں پر نہیں مانے۔'' دُرِّیکتا نے ذرا سی ہمدردی پا کے رونا شروع کردیا۔ کتنے دن کے رکے ہوئے آنسو تھے، وہ دل کے زہر کو آنکھوں کے راستے بہا رہی تھی۔ شیریں ہولے، ہولے اسے سہلا رہی تھیں۔ چپ کروا رہی تھیں...... پر یہ ملال دُرِّیکتا کے دل سے ختم ہونے والا نہیں تھا کہ پاپا نے خود سے بول کے طاہر انکل کو رشتے کے لیے کہا اور پھر نکاح کے لیے بھی منتیں کیں۔ اسی وجہ سے افراتفری میں اتنی جلدی اس کا نکاح ہوا تھا۔ ایک، ایک کر کے وہ باتیں پوری جزئیات کے ساتھ یاد آرہی تھیں۔

''خیر بیٹا دل چھوٹا نہ کرو، میں طاہر کے گھر جاؤں گا۔ اس سے پوچھوں گا۔ ہم کوئی ایسے بھی گئے گزرے نہیں جو وہ اتنی بیگانگی اور اکڑ دکھا رہا ہے۔ اس کا رویہ ظاہر تو یہی کر رہا ہے جیسے وہ اس رشتے کو قائم رکھنا نہ چاہ رہا ہو۔'' تایا اورنگزیب نے حوصلہ دیا اور ساتھ ہی ایک نئے امکان کی طرف بھی اشارہ کیا۔

''ارے نہیں قائم رکھنا چاہتا تو نہ رکھے...... ہماری بیٹی کے لیے رشتوں کی کمی تو نہیں ہے۔ میں تو اپنے عاشر کی دلہن بناؤں گی اسے۔'' وہ پیار بھری نگاہوں سے نثار ہونے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ دُرِّیکتا بھی اب ہولے، ہولے رو رہی تھی۔ وہ اپنے زیاں پہ ماتم کناں تھی۔ تائی شیریں کے ارادوں پر دھیان نہیں دے پائی تھی۔ نہ اس وقت اسے اتنا ہوش تھا۔ وہ بات بھی ذہن سے نکل گئی تھی جس کی خاطر وہ تایا کے پاس آئی تھی۔ وہ ان سے یہ کہنے آئی تھی کہ وہ پاپا کو لے کر شہر اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ اس کی تعلیم کا حرج ہو رہا ہے۔ پر حالات ایسے ہوئے کہ یہ بات اسے بھول ہی گئی۔ وہ جہاں سے چلی تھی وہیں کی وہیں کھڑی تھی۔

☆☆☆

''کیا یہ سب ممکن ہوگا جو آپ سوچ رہے ہیں؟'' شیریں نے کسی گہری سوچ میں ڈوبے اورنگزیب سے پوچھا تو وہ چونک گئے۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں...... اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ میں پہلے سیدھے طریقے سے جا کے بات کروں گا خود طاہر لغاری کے گھر...... اور کہہ دوں گا کہ دُرِّیکتا اس رشتے کو برقرار نہیں رکھنا چاہتی۔ میرا نہیں خیال کہ اس بات کے بعد وہ انکار کریں گے۔''

''پھر بھی اگر وہ نہ مانے تو...... آپ کیا کریں گے؟''

''ایک اور حل بھی ہے...... میرے پاس۔'' وہ چٹکی بجا کے بولے۔

''وہ کون سا حل ہے مجھے بھی تو بتائیں۔'' شیریں کے چہرے پر دبا، دبا تجسس تھا۔

''اس کام کے لیے عدالت ہے ناں۔ میں دُرِّیکتا کی طرف سے خلع کا مقدمہ کردوں گا۔ طاہر لغاری بہت عزت دار خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنی عزت بچانے کی خاطر خلع دے، دے گا۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ عدالت میں جانے کی نوبت آئے...... کیونکہ عزت داروں کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے۔ جب گھر کی باتیں عدالتوں میں اچھالی جائیں۔ طاہر لغاری کو عدالت کی دھمکی ہی کافی ہوگی۔ معاملہ عدالت کے باہر ہی نمٹ جائے

گا۔'' اورنگزیب انسانی نفسیات کی کمزوریوں سے خوب واقف تھے۔ انہیں اتفاقاً ہی ایک ذریعے سے یہ بات پتا چلی تھی کہ عمر زیب نے طاہر لغاری سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا پھر اس کے ذہن نے دو اور دو چار کے فلسفے پر بہت کچھ خود تیار کرلیا تھا۔

''اچھا طاہر لغاری مان جائے گا پر اشعر لغاری کا کیا ہوگا؟ وہ دیکھنے میں ہی کسی اور طرح کا نظر آتا ہے۔''

''تم دیکھتی جاؤ، طاہر لغاری بیٹے کو خود راضی کرلے گا خلع کے لیے۔'' اورنگزیب کو بڑی امید تھی اور اس کی امید بے جا بھی نہیں تھی۔

''میں پھر اپنے عاشر سے دُرِ یکتا کا بیاہ کروں گی جب ساری مشکلات اور رکاوٹیں دور ہوجائیں گی۔''

''ارے آہستہ بولو کسی اور نے سن لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔'' اورنگزیب نے شیریں کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''میں کسی سے ڈرتی ہوں، کسی نے سنتا ہے تو سن لے......''

''کیوں بے وقوفی کی باتیں کررہی ہو تم۔'' اورنگزیب نے غصے سے کہا تو شیریں خاموش ہوگئیں۔

☆☆☆

عمر زیب حسبِ معمول دواؤں کے زیرِ اثر سو رہے تھے۔ یہاں دریکتا کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا وہ گھٹ گھٹ کے رو رہی تھی کہ آواز کمرے سے باہر نہ جائے۔ عمر کے سوئے ہوئے بے خبر چہرے کی طرف تکتے، تکتے اس نے کتنے شکوے کر ڈالے تھے۔ وہ ٹھیک ہوتے تو وہ اپنے سوالوں کے جواب حاصل کر کے رہتی۔ جو حقیقت نے اس کے دماغ میں پیدا کردیے تھے۔ بڑی دیر بعد خود بہ خود ہی آنسو تھم گئے۔ بظاہر اتنے مخلص اور مہربان نظر آنے والے طاہر انکل کی سرد مہری کی وجہ پپا کا فیصلہ تھا۔ اس سوچ نے اس کے اندر خود سے نفرت اور بیزاری پیدا کردی تھی۔

☆☆☆

شیریں کا رویہ کافی حد تک بدل چکا تھا۔ وہ پہلے والی بے پروائی انہوں نے اپنے وجود سے الگ کردی تھی۔ دریکتا خوش تھی۔

''تائی میں شہرا اپنے گھر جانا چاہتی ہوں...... پپا کے ساتھ۔ میری تعلیم کا حرج ہورہا ہے۔'' شیریں تائی اس کے کمرے میں اس کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔ دُرِ یکتا نے آخر کار بول ہی دیا۔ وہ چند ثانیے بالکل خاموشی سے زمین کی طرف دیکھتی رہیں جیسے اس کش مکش میں ہو کہ کیا بولیں کیا نہ بولیں۔

''میں ...... تمہیں بتانا تو نہیں چاہتی تھی کہ تم پریشان ہوجاؤ گی مگر تمہاری ضد سے مجبور ہو کر بتا رہی ہوں......'' وہ اس کے بعد خاموش ہوگئیں۔

''کیا بات ہے تائی۔ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟'' دُرِ یکتا نے بے تابی سے پوچھا۔

''بیٹا ڈرتی ہوں کہ نہ جانے تم میں سننے کا حوصلہ ہے بھی کہ نہیں......'' وہ پھر کہتے، کہتے رک گئیں تو دُرِ یکتا بے قرار ہوگئی۔

''پلیز تائی مجھے بتائیں کیا بات ہے؟''

''تو سنو طاہر لغاری کے بیٹے اشعر لغاری نے شہر میں تمہارے گھر پر فائرنگ کروائی ہے۔ تمہارے تایا ان کے گھر گئے تھے کہ آپ لوگ بھول ہی گئے ہیں رشتوں کی نزاکت کو وہاں تھوڑی تو، تو میں، میں ہوگئی۔ جس کے بعد انتقامی طور پر اس نے فائرنگ کروائی۔ شکر ہے کہ گھر میں ملازموں کے سوا کوئی نہیں تھا ورنہ میرے سہاگ کو کچھ ہوجاتا تو میں کیا کرتی......'' وہ مصنوعی بول رہی تھیں۔

''خیر اس کے بعد بھی اگر تم اپنے گھر جانا چاہتی ہو تو جاؤ، میں خود تمہیں اور عمر بھائی کو بھجوادوں گی اورنگزیب وقتاً فوقتاً تمہاری خبر گیری کرتے رہیں گے۔ پھر تم خود ہی سنبھالنا سب کچھ کیونکہ مجھے اپنے بیٹے اور سہاگ کی سلامتی پہلے عزیز ہے۔ میں انہیں اس آگ میں کودنے کی اجازت نہیں دوں گی جو عمر بھائی کی بے وقوفی کی وجہ سے لگی ہے۔'' شیریں غصے میں تھیں۔ دُرِ یکتا وہیں سن سی ہوگئی۔

''اُف یہ کیا کچھ ہورہا تھا۔ تو کیا شہرا سے پپا کے

ساتھ نوکروں کے رحم و کرم پر اکیلا رہنا پڑے گا جو تائی خبر گیری کی بات کر رہی تھیں۔

''میں تمہیں یہ سب بتا کے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پر تم شہرا اپنے گھر جانے کی ضد کر رہی ہو تو تمہیں بتایا ہے۔ میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گی جب کہو گی۔''

''نہیں تائی...... اس کی ضرورت نہیں ہے......''
اس نے تیزی سے حوصلوں کی گرتی دیوار کو تھامنے کی آخری کوشش کی۔ شیریں کا چہرہ ایک دم پُرسکون ہوگیا۔ وہ دُرِ یکتا کے سوچ میں ڈوبے چہرے کو دیکھتے ہوئے کوئی حساب لگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

☆☆☆

طاہر لغاری نے اپنے طور پر عمر کے حلقۂ احباب سے پتا لگانے کی کوشش کی کہ وہ کب امریکا گئے...... انہیں اس وقت سخت حیرت ہوئی کہ ان کی طرح باقی لوگ بھی عمر زیب کی امریکا روانگی سے لاعلم تھے۔ آخر عمر کو اتنے راز دارانہ طریقے سے امریکا بجھوانے کی کیا وجہ تھی؟ طاہر لغاری کی توجہ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی طرف تھی۔ ان کے ذہن میں سیدھی، سیدھی ایک ہی بات آرہی تھی کہ عمر اور دُرِ یکتا کسی سازش کا شکار ہوگئے ہیں۔ اس سے آگے وہ کوئی بھی منفی خیال دل میں نہیں لانا چاہتے تھے۔ جانے طاہر لغاری کے جی میں کیا سمائی کہ اشعر کے آفس پہنچ گئے۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ انہیں یہاں اپنے آفس میں دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی کیونکہ اس سے پہلے تو وہ یہاں ایک بار بھی نہیں آئے تھے۔ وہ اپنی سیٹ پر سے کھڑا ہوگیا۔

''خیریت پپا آپ اور یہاں ......؟'' طاہر لغاری کوئی اور وقت ہوتا تو اس کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے پر ابھی ہلکے سے مسکرا دیے۔ پھیکی بے جان مسکراہٹ......

''ہاں خیریت ہی ہے۔ بس آج میں نے عمر کے ملنے جلنے والوں سے پوچھا کہ وہ کب امریکا گیا ہے تو سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں اس وجہ سے تمہارے پاس آیا ہوں۔''

''میرے پاس اس وجہ سے کیا مطلب......؟''

''کہ تم اس کا پتا چلاؤ۔'' وہ جھنجلا سے گئے تو اشعر انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ عمر زیب اور دُرِ یکتا کے بارے میں ہم سے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ کچھ چھپایا جا رہا ہے، سازش ہے یہ عمر کے بھائیوں کی۔ وہ مجھے بتاتا رہتا تھا اپنے خاندان اور بھائیوں کے بارے میں۔ عمر اور اس کی اولاد سے زیادہ اس کے بھائیوں کو عمر کی جائداد اور بینک بیلنس میں دلچسپی ہے۔ شاہ زیب کی شادی اور الگ گھر میں شفٹ ہونے کے بعد اورنگزیب اور اس کے بیٹے نے شاہ زیب کے کاروبار میں مداخلت شروع کردی تھی اور چند ماہ میں ہی سب کچھ ختم کر کے رکھ دیا۔ کاروبار کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ اب ان کی نگاہیں عمر کے کاروبار کی طرف لگی ہوں گی۔ عمر ایک نیم پاگل انسان اپنے بیٹے کے غم میں دیوانہ اسے کیا پتا کہ اس کے گرد کیا ہو رہا ہے اورنگزیب اور اس کے دونوں بھائی عمر کی فیکٹری اور آفس میں ہی ہوتے ہیں۔ باقی رہ گئی دُرِ یکتا وہ ٹھہری ایک کمزور اور نازک سی لڑکی...... دنیا کی چالبازیوں اور مکاریوں کا اسے کیا پتا...... سو عمر کے رشتے داروں کی بن آئی ہے۔ اپنے فائدے کے لیے ان باپ بیٹی کو غائب کروا دیا ہے۔'' بولتے، بولتے طاہر ہانپنے لگے تو اشعر نے شانے پر دباؤ ڈال کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''اشعر تم کچھ کرو...... عمر زیب میرا عزیز دوست ہے۔ اس کی مدد کرنا میرا فرض بنتا ہے۔'' وہ لجاجت سے بولے۔ اشعر کچھ سوچ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے آپ گھر جائیں، میں کرتا ہوں کچھ...... آپ زیادہ پریشان مت ہوں۔'' اس نے باپ کو گھر بھجوا دیا اور خود اپنے ماتحتوں کو بتا کے عمر زیب کے آفس پہنچ گیا۔

وہ پہلی بار یہاں آیا تھا۔ بڑا شاندار ویل ڈیکوریٹڈ

غزل

میری آنکھوں کے دریا کی روانی کیوں نہیں دِکھتی
اسے اجڑی ہوئی میری جوانی کیوں نہیں دِکھتی
کہ جس پر دل کی دنیا بھی لٹائی جا چکی میری
میرے دل پر اسی کی حکمرانی کیوں نہیں دکھتی
میری آنکھیں سلگتے دشت کی صورت ہوئیں آخر
کسی کے پیار کی کوئی نشانی کیوں نہیں دکھتی
زمانہ جانتا ہے میں اسی سے پیار کرتی ہوں
اسے میری محبت کی جولانی کیوں نہیں دکھتی
جہاں بھر سے وہ کرتا ہے، بہت ہی پیار کی باتیں
اسے اپنی یہ تمثیلہ بھی رانی کیوں نہیں دکھتی

شاعرہ: تمثیلہ لطیف، جودھالہ

یادِ ماضی

شرجیل نے اپنے دوست شعیب کو ہمیشہ کی طرح خیالوں میں کھویا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

''یار شعیب! ہر وقت تم کن خیالوں میں کھوئے رہتے ہو؟ زندگی عیش و آرام سے گزارنا ہے تو ماضی کی یاد سے پیچھا چھڑا لو۔'' شرجیل نے مشورہ دیا۔

''یار شرجیل کیسے چھڑا لوں۔'' شعیب نے اداس لہجے میں کہا ''ماضی کی وہ یاد تو اب گھر آ گئی ہے۔''

از: ارم کمال، فیصل آباد

اعتماد

چھتری بارش کو نہیں روک سکتی لیکن اس کی وجہ سے ہم بارش میں بغیر بھیگے کھڑے ہونے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس طرح اعتماد ہمیں کامیابی نہیں دلاتا لیکن ہمیں وہ قوت دیتا ہے جس کے ذریعے ہم مشکلات کا سامنا کر سکتے ہیں۔

از: منور شہزادی، گجرات

...آفس تھا۔ دل ہی دل میں اس نے سراہا......اورنگزیب اور ہارون زیب دونوں بھائی اِدھر ہی بیٹھے تھے اورنگزیب کے دماغ میں اشعر کو دیکھتے ہی خطرے کی گھنٹی بجی......اس نے اندرونی خوف پر بڑی تیزی سے قابو پایا اور اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

''آیئے سر کیسے آنا ہوا؟'' لہجہ اس کا طنزیہ ہی تھا۔ اشعر نے نظرانداز کر دیا۔ اس نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بجائے ڈائریکٹ دُرِیکتا کے بارے میں پوچھا۔

''مجھے اپنی منکوحہ سے بات کرنی ہے مجھے ان کا کانٹیکٹ نمبر چاہیے۔''

''اوہ، ضرور بات کریں۔ لیں ابھی بات کریں۔'' اورنگزیب نے اسے نمبر بتانے کے بجائے اپنا سیل فون نکال کر کوئی نمبر ملانا شروع کر دیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔

''دُرِیکتا بیٹا میں ہوں اورنگزیب تایا......ہاں خیریت ہی ہے۔ یہ اپنے اشعر لغاری صاحب تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ انہیں شاید کوئی شک ہے ہم پر......تم انہیں بتا دو اپنے بارے میں کہ تم اور عمر بالکل خیریت سے ہو۔'' اورنگزیب نے فون کا اسپیکر آن کیا ہوا تھا۔ ایک، ایک لفظ اشعر کی سماعتوں نے صاف طور پر سنا تھا۔

''مجھے ان سے کوئی بات نہیں کرنی، انہیں بتا دیں، میں اس وقت پپا کے پاس ہوں۔'' اورنگزیب نے فاتحانہ نگاہوں سے اشعر کی طرف دیکھا۔ جس نے اپنا غصہ چھپا لیا تھا۔

''یہ بات تم خود کہہ دو آفیسر سے۔'' اورنگزیب نے طنزیہ انداز میں سیل فون اشعر کی طرف بڑھایا۔ اس نے کان سے لگایا اور اس سے پہلے اسپیکر آف کیا۔

''دُرِیکتا میں اشعر لغاری بات کر رہا ہوں۔ پپا کچھ پریشان سے ہیں سو اس......'' اس سے پہلے کہ وہ بات پوری کرتا......دُرِیکتا نے بولنا شروع کیا۔

''مجھے آپ سے یا انکل سے کوئی بات نہیں کرنی۔ آئندہ مجھے کال کرنے کی زحمت مت کیجیے

گا۔ مہربانی ہوگی آپ کی اور انکل کو شکریہ کہہ دیجیے گا کہ وہ ہماری خاطر اتنا پریشان ہوئے۔'' اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی۔ اشعر کا جی چاہ رہا تھا کہ فون دیوار پر دے مارے۔ اتنی انسلٹ جیسے وہ کوئی گرا پڑا انسان ہو۔ اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ پپا خواہ مخواہ ان کی خاطر اتنا پریشان ہو رہے تھے جبکہ ان محترمہ کو کوئی پرواہی نہیں تھی۔ کسی کی پریشانی کی فکر ہی نہیں تھی۔ اشعر اسے بے پروا اور عام سی لڑکی تصور کرتا آیا تھا۔ پر یہ تو کچھ اور ہی نکلی تھی۔

''خیر دیکھ لیں گے محترمہ دریکتا صاحبہ آپ کو بھی۔'' وہ دل میں بولا تھا۔ ساتھ ہی سیل فون واپس اورنگزیب کی طرف بڑھایا۔

''نمبر نوٹ کرلیں دُرِیکتا کا...... وہ پاکستان آئی ہوئی ہے عمر کے ساتھ۔ ہوسکتا ہے تھوڑے دن تک پھر واپس جائے۔'' انہوں نے اس بار بڑے نارمل طریقے سے یہ جملے ادا کیے تھے۔

''نہیں مجھے نمبر کی ضرورت نہیں ہے پھر کبھی...... خیر چلتا ہوں۔'' اشعر آفس سے باہر آگیا۔ اپنے آفس روانگی سے پہلے اس نے وہیں کھڑے، کھڑے طاہر لغاری کو کال کی اور دُرِیکتا سے ہونے والی گفتگو کا احوال بتایا۔ مگر اصل باتیں گول کر گیا۔ بس اتنا کہا کہ عمر انکل اور دُرِیکتا بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ یہ بات بھی چھپا گیا کہ دُرِیکتا اور عمر انکل پاکستان آگئے ہیں۔ طاہر اب خوش اور مطمئن تھے اور اپنے بے جا خدشات پر مسکرا رہے تھے۔

طاہر خوش تھے پر اشعر ایک اَن دیکھی سی آگ میں سلگ رہا تھا۔ پپا کو اصل بات بتا کر وہ پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خود ہی سب کچھ دیکھنا معلوم کرنا تھا۔ دُرِیکتا نے آئندہ کال کرنے سے منع کر دیا تھا پر اب اس پر ضد سوار ہوگئی تھی انا پرستی ہاتھ باندھ کے سر جھکا کے کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ اس بات کو آرام سے پی جانے والا نہیں تھا۔ طاہر لغاری نے عمر زیب کی مجبوریوں اور ان کی رشتے داریوں کو سوال بنا کے اسے یعنی اپنے بیٹے کو بلیک میل کیا جذباتی طور پر...... اپنے بیٹے کو دوست کی مجبوریوں پر قربان کر دیا۔ دوست کی مجبوریوں کی اہمیت بیٹے سے زیادہ تھی۔ مارے باندھے اسے عمر انکل کی صاحبزادی سے نکاح کرنا پڑا۔ گویا پوری زندگی کا معاہدہ کرنا پڑا۔ اِدھر طاہر لغاری دوست اور اس کی بیٹی کے غم میں ادھ موئے ہوئے جا رہے تھے۔ انہیں اپنے دوست، ان کی بیٹی اور پھر اس سے وابستہ ہر رشتے کا کتنا احساس تھا۔ پریشان ہوتے رہے اور ان محترمہ کو کوئی پرواہی نہیں تھی۔

عجیب روکھے سرد انداز میں بات کی اور پھر حکم بھی صادر کر دیا کہ آئندہ مجھے کال کرنے کی زحمت مت کیجیے گا۔ ایک لڑکی وہ بھی نازک اور کمزور سی لڑکی بقول طاہر لغاری کے...... اسے حکم دے رہی تھی۔ یعنی اشعر لغاری کی سراسر توہین کر رہی تھی۔ وہ اسے بتائے گا اور بتا کے رہے گا کہ وہ کوئی گلی یا سڑک سے گزرنے والا، عام سا نوجوان نہیں اس کا قانونی شوہر ہے۔ جملہ حقوق محفوظ ہیں دُرِیکتا کے اس کے نام .... وہ اتنی اکڑ کس بات کی دکھا رہی ہے۔ کس بات کا زعم ہے اسے مجھے اس سے بات کرنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے یہ سب میں اسے بتا کر رہوں گا۔ اشعر نے بڑے غصے میں گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی تھی۔ دو بار تو گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھتے، چڑھتے بچی تھی۔

☆☆☆

دُرِیکتا نے فون بند کر کے صوفے پر اچھال دیا۔ جیسے وہ فون نہ ہو کوئی سانپ ہو اور اسے ڈس لے گا۔ تایا نے اچانک غیر متوقع طور پر کال کی تھی کہ لو اشعر لغاری سے بات کرو اور اپنی خیریت سے آگاہ کردو۔ دُرِیکتا نے فون پر کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ اس وقت اس میں بے پناہ طاقت آگئی تھی اپنی بات کہنے کے لیے اور اس نے بڑے واضح انداز میں کہہ دیا کہ مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔ اس نے اشعر لغاری کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ کوئی اور خوش ہو نہ ہو اورنگزیب بہت مسرور تھے۔ دُرِیکتا نے تو کمال کر دیا تھا۔ اشعر لغاری کی طبیعت صاف کر دی تھی۔ اس کی اکڑفوں ہی نکال

کے رکھ دی تھی۔ اب آئندہ کے لیے گراؤنڈ ہموار اور صاف تھا۔ اشعر اور طاہر لغاری کے دل میں دُرِیکتا کے اس تلخ انداز سے بال تو آ ہی گیا ہوگا۔ اب اورنگزیب نے اسی کا فائدہ اٹھانا تھا۔ جب دُرِیکتا رشتہ توڑنا چاہ رہی تھی تو اشعر لغاری کون تھا رشتہ جوڑ کے رکھنے والا۔ بہت جلد اورنگزیب نے طاہر لغاری اور اشعر سے ملنا تھا تاکہ جلد از جلد یہ بوجھ بھی سر سے اترے۔

☆☆☆

سائرہ اور دُرِیکتا کا ایڈمشن ایک ساتھ ہوا تھا۔ دو ماہ فارغ رہنے کے بعد اس نے پھر سے کتابیں کھولی تھیں۔ یہ وہی کالج تھا جہاں مائرہ نے شاہ زیب سے رشتہ طے ہونے اور ان کے گھر سے واپسی پہ داخلہ لیا تھا۔ اس میں بڑے کالجز والی بات نہیں تھی پھر بھی دُرِیکتا نے کمپرومائز کر لیا تھا کہ اسے اب گاؤں میں رہ کر اسی کالج میں تعلیم حاصل کرنی ہے۔ سائرہ شور کرتی تھی احتجاج کرتی تھی، کہ اسے یہاں نہیں پڑھنا پر اس کے احتجاج کو کوئی خاطر میں لانے والا نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ اپنی قسمت پر صابر و شاکر ہو گئی تھی۔ شاہ زیب کی موت کے بعد تمام تر حالات اس نے قسمت کے کھاتے میں ڈال دیے تھے۔ اس کا پپا کے ساتھ یہاں آنا، یہ انکشاف کہ پپا نے خود زبردستی اس کا رشتہ طاہر انکل کے بیٹے کو دیا، ان لوگوں کی سرد مہری، بے رخی پھر ان کے گھر پر اشعر لغاری کی فائرنگ، دُرِیکتا نے سب کو قسمت کا لکھا تصور کر لیا تھا۔ وہ شہر اپنے گھر واپس جانے کا اب سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جہاں اشعر جیسے بے حس، بے ضمیر شخص نے اس کے پیار کے خوابوں کے محل کو تاراج کرنے کی کوشش کی...... اسے اپنی زندگی عزیز تھی۔ کیا خبر وہ اگر پپا کے ساتھ وہاں چلی جاتی تو اشعر لغاری پھر سے اپنے مذموم عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتا۔ پہلی بار وہ وہاں نہیں تھی تو بچ گئی لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ دوسری بار بھی بچ جاتی۔ اسے خود سے بھی زیادہ پپا کی سلامتی اور زندگی عزیز تھی۔ بے شک وہ پاگل تھے پر زندہ تو تھے ناں...... لہو تو ان کی رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ وہ سانس لے رہے تھے۔ دریکتا کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ اس لیے گاؤں سے قریبی اس چھوٹے سے شہر کے کالج میں داخلہ لیتے ہوئے اس نے کوئی چوں چرا نہیں کی تھی۔

☆☆☆

اورنگزیب نے سرکاری اسپتال میں مائرہ کا نام لکھوایا تھا۔ وہیں اس کا باقاعدگی سے چیک اپ ہو رہا تھا۔ اسپتال تھا تو سرکاری پر مائرہ کے لیے وی آئی پی علاج میسر تھا۔

بالآخر وہ وقت آ گیا جب مائرہ کو تخلیق کے مرحلے سے گزرنا تھا۔ شیریں نے اس مرحلے پر دُرِیکتا کو بھی ساتھ لے لیا تھا کہ آخر وہ بچے کی پھوپی تھی حالانکہ کنواری لڑکیوں کا کیا کام...... وہ بھی تائی کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کیے رہتی تھی۔ سو شیریں تائی، فوزیہ چچی، ایک ملازمہ اور وہ خود مائرہ کے ہمراہ اسپتال پہنچ چکی تھیں۔ مائرہ کو لیبر روم میں لے جا چکے تھے۔ مائرہ کے نام کا وی آئی پی روم الاٹ ہو چکا تھا انہوں نے جو تھوڑا بہت سامان تھا وہاں رکھا اور خود لیبر روم کے باہر ٹہلنے لگیں۔ دریکتا بھی ویٹنگ ایریا میں بیٹھی درود شریف کا ورد کر رہی تھی کہ فوزیہ چچی نے اسے مائرہ کے روم سے بچے کی چیزوں والا بیگ لانے کو کہا جو پہلی منزل پر تھا۔ وہ اکیلی جاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی مگر پھر چچی اور تائی کے کہنے پر بیگ لانے چل دی جلدی سے اوپر جا کر اس نے کمرے کا نمبر تلاش کر کے اندر جا کر سامنے رکھا بیگ اٹھایا۔ ابھی وہ اپنی دھن میں سیڑھیاں...... اُتر رہی تھی جب کسی سے اس کی زوردار ٹکر ہوئی۔ اور بیگ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسے ناک پر شدید تکلیف ہو رہی تھی اور آنکھوں میں نمی سی آ گئی تھی۔ غلطی اس کی اپنی ہی تھی۔ اپنے خیالوں میں مگن اِدھر اُدھر دیکھے بغیر تیزی سے سیڑھیاں اُترتی جا رہی تھی۔

اشعر اسے یہاں دیکھ کر حیران تھا۔ وہ اپنے ایک کولیگ کی عیادت کرنے آیا ہوا تھا اور اب اسے دیکھنے کے بعد واپس جا رہا تھا جب دریکتا اس سے ٹکرائی۔ وہ بھی

اسے پہچان چکی تھی اور اپنی تکلیف پہ قابو بھی پالیا تھا۔ بیگ اٹھا کر وہ سائڈ سے نکلنا چاہ رہی تھی جب اشعر نے اس کا بازو تھام لیا۔ اس کی گرفت میں جارحانہ پن تھا، غصہ تھا، تختی تھی۔ وہ ڈر گئی۔

”چھوڑیں میرا بازو۔ تائی میرا انتظار کر رہی ہیں۔ مائرہ بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ دُرِیکتا اپنا بازو پکڑے جانے پر روہانسی ہو رہی تھی۔ اشعر کو آس پاس سے گزرنے والوں کی جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

”کہاں بیٹھی ہو چھپ کے تم.....؟ اس کا پتا میں بہت جلد چلالوں گا۔“ وہ دانت پیستے ہوئے اس کے کان میں جیسے غرایا اور بازو چھوڑ کر تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ دُرِیکتا سے کتنی دیر ہلا ہی نہیں گیا جیسے وہ اسے پتا تاثر کر گیا ہو۔

☆☆☆

فوزیہ نے اسے بیگ سمیت آتے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا..... پر اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

”کیا ہوا ہے؟“

”وہ، وہ اسپتال میں، میں نے اشعر لغاری کو دیکھا ہے۔ سیڑھیاں اُتر کے اِدھر آپ کی طرف آرہی تھی کہ وہ نظر آ گیا.....“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی شیریں تائی کاریڈور کراس کرتی ان کی طرف آ گئیں تو باقی بات دُرِیکتا کے منہ میں ہی رہ گئی۔

”کیا ہوا بھابی کچھ پتا چلا؟“ فوزیہ نے بے تابی سے پوچھا تو شیریں نے نفی میں سر ہلایا۔

”میری بچی کے لیے دعا کرو اس کی مشکل جلد آسان ہو جائے۔“ شیریں تائی کی آنکھیں بھیگی بھیگی سی لگ رہی تھیں جیسے رو تی رہی ہوں۔

”ارے بھابی ہماری دعائیں مائرہ کے ساتھ ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔“ دُرِیکتا ان سے قدرے ہٹ کے بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی۔

☆☆☆

اشعر تپا تپا سرخ چہرہ لیے گھر میں داخل ہوا تو طاہر لغاری دیکھتے ہی چونک گئے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ اشعر انہیں سلام کر کے سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ حالانکہ پہلے آفس سے آ کر وہ ان کے پاس بیٹھا کرتا......دن بھر کا احوال سناتا۔ اس نے آج صبح ڈیوٹی پر جانے سے پہلے انہیں بتایا تھا کہ وہ آفس سے اٹھ کے اپنے ایک کولیگ کی عیادت کو اسپتال جائے گا۔

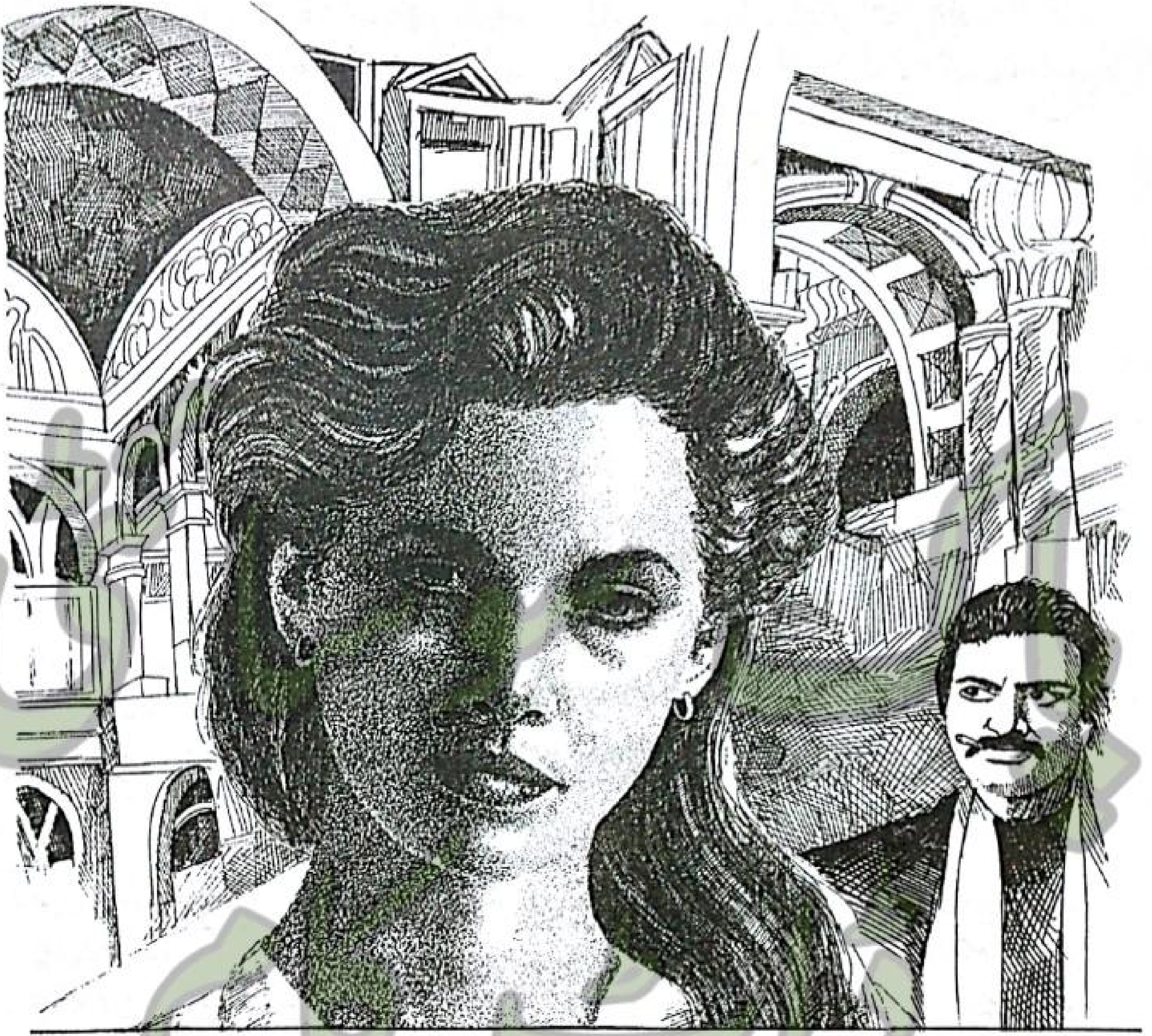
طاہر لغاری خیریت پوچھنے اس کے کمرے میں چلے آئے۔ وہ چینج کر کے بیٹھا تھا اسی وقت......

”آئیں پپا!“ اس نے مسکراہٹ ہونٹوں پر سجالی تھی۔

”تم ٹھیک تو ہو ناں...... آندھی طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئے اور سیدھے اِدھر چلے آئے۔ میرے پاس بیٹھے بھی نہیں۔“

”پپا میں ٹھیک ہوں۔ بس میرے کولیگ کی حالت ٹھیک نہیں...... اس وجہ سے میں کچھ پریشان تھا۔ خیر کوئی بات نہیں سب چلتا ہے۔“ تھوڑی دیر میں ہی وہ نارمل ہو کے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ طاہر لغاری کو اس نے دُرِیکتا سے ہونے والے تصادم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ ذرا، ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتے تھے۔ اگر انہیں یہ پتا چل جاتا کہ دُرِیکتا ان کی ہونے والی بہو اور عمر انکل پاکستان میں ہی موجود ہیں تو انہوں نے اسی وقت ضد پکڑ لینی تھی کہ مجھے ابھی لے کے جاؤ اور محترمہ دُرِیکتا جو فون پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی بھلا ملنے کے لیے کیسے راضی ہوتی اور یہ جان کر طاہر لغاری کو جو شاک لگنا تھا وہ ان کو اس شاک سے بچانا چاہتا تھا۔ پہلے تو خود اسے دُرِیکتا سے ایک بھرپور ملاقات کر کے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ اس سے کیوں بات نہیں کرنا چاہتی۔ اس جواب کے بعد اور ساری تفصیلات معلوم کرنے کے بعد وہ طاہر لغاری کو سب کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ وہ پہلے انہیں سب کچھ بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

(باقی آئندہ)



قفس

سویرا فلک

دروازہ بہت بے تابی سے پیٹا جا رہا تھا۔ وہ نمازِ ظہر ادا کر رہی تھی جو اَب ختم پر تھی۔ دونوں بچے سو رہے تھے۔ بار، بار دستک سے اسے نماز میں توجہ کا تسلسل قائم رکھنے میں شدید دشواری ہو رہی تھی اور دروازہ بجانے والے کی کوششوں سے لگ رہا تھا کہ اگر چند لمحے اور نہ کھلا تو شاید دروازہ ٹوٹ ہی جائے گا۔ سلام پھیر کر جائے نماز کا کونہ موڑ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی اور

بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی کنڈی کھول کر باہر جھانکا تو چونک پڑی۔ رمیز کا آفس کولیگ باقر ایک عورت کے ساتھ دھوپ سے بچنے کی کوشش میں ہاتھوں کا چھجا بنائے بدحواس کھڑا تھا۔

''آپ......اس وقت؟'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا تو خود کو عبایا میں پلیٹے باقر کے ساتھ کھڑی عورت جلدی سے بولی۔

''بھابی، میں ان کی مسز ہوں فاخرہ۔ کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟'' اس نے چہرے پر آئے پسینے کو ٹشو کی مدد سے خشک کرتے ہوئے کہا تو وہ شرمندہ ہو کر کونے میں ہوگئی۔

''جی جی، آئیں ناں، دراصل پہلی بار آپ کو دیکھا تو......آپ لوگ بیٹھیں، میں پانی لے کر آتی ہوں۔'' اس نے دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور جلدی سے ٹھنڈے پانی میں شربت گھول کر لائی۔

دونوں نے غٹاغٹ گلاس خالی کر دیے۔ فاخرہ اٹھ کر اس کے برابر میں آ بیٹھی اور اس کے ہاتھ تھام کر گہری سانس لے کر بولی۔

''بھابی، آپ پلیز ذرا حوصلے اور صبر سے میری بات سنیے گا۔ چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے اور بچوں کو صرف ماں ہی سنبھال سکتی ہے اور ویسے بھی جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ہے۔ اب ہمیں اس صورتِ حال کو پورے ہوش وحواس کے ساتھ فیس کرنا ہوگا۔'' فاخرہ تمہید باندھ کر لمحے بھر کو رکی تو اس کو لگا کہ اس کی سانس بھی رکنے لگی ہے۔ اس نے باقر کی طرف دیکھا۔

''مریم بھابی، اصل میں آفس جاتے ہوئے رمیز کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ اس کی گاڑی کو کسی نے سائڈ ماری تو وہ فٹ پاتھ سے ایسے ٹکرائی کہ سامنے کا حصہ بری طرح تباہ ہوگیا اور ظاہر ہے ایسے حادثوں میں لگنے والی چوٹیں شدید ہوتی ہیں۔ ہمارا ایک کولیگ بھی اسی راستے سے بائیک پر جارہا تھا تو اس نے ہی رمیز کو اسپتال پہنچا کر سب کو اطلاع دی۔'' باقر نے دھیمے لہجے میں تفصیل بتائی۔

''بھابی، اس وقت وہ آئی سی یو میں ہیں۔ ان کے سر کی سرجری ہو چکی ہے۔ ٹریٹمنٹ چل رہا ہے تاہم وہ ہوش میں ابھی نہیں آئے۔ آپ تسلی رکھیے، اگلے اڑتالیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی۔ مگر تمام صورتِ حال سے آگاہ کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹرز ان کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں ہیں مگر اللہ سب سے بڑا ہے۔ ہم سب کی دعائیں اور مکمل تعاون آپ کے ساتھ ہے۔ خود کو قطعاً اکیلا نہیں سمجھیے گا۔ بس بچوں کی خاطر خود کو سنبھالے رکھیں اور دعا کرتی رہیں۔ دعا میں بڑا اثر ہوتا ہے۔'' مریم کو تسلی دیتے، دیتے فاخرہ کی آواز بھی بھرانے لگی۔

یہ سب سن کر وہ جیسے ساکت ہوگئی۔ دل ودماغ کی تمام حسیں اس طرح منجمد ہوگئیں کہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ ان گنت سوالات جیسے اس کے حلق میں اٹک سے گئے۔ وہ خالی، خالی نظروں سے فاخرہ کو تکنے لگی۔

''فاخرہ تم بھابی کو پانی پلاؤ۔ انہیں اس حالت سے باہر نکالو۔ ان سے باتیں کرو اور دیکھو ان کے بچے کہاں ہیں، میں ان کے لیے دوا اور بچوں کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔'' باقر یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

فاخرہ نے مریم کو ٹیک لگوا کر کشن کا سہارا دیا اور پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا مگر پانی اس کے حلق کو تر کرنے کے بجائے اس کی گردن کو تر کرتا ہوا قمیص کے گریبان میں جذب ہوگیا تو فاخرہ کی آنکھیں بھی جل تھل ہوگئیں اور مریم یونہی پوری آنکھیں کھولے اسے عجیب نظروں سے دیکھتی چلی گئی۔

☆☆☆

ساڑھے چار بج رہے تھے اور آہستہ، آہستہ دیگر عزیز واقارب گھر پر جمع ہورہے تھے۔ کچھ لوگ

پہلے اسپتال کی طرف چلے گئے تھے۔ باقر نے سارے قریبی رشتے داروں کو اطلاع کردی تھی۔ رمیز کا موبائل اسی کے پاس تھا۔ وہ رمیز کے قریبی دوستوں اور پرانے کولیگز میں سے تھا۔ فاخرہ نے مریم کے بچوں کو اٹھنے پر انہیں کھلا پلا کر پڑوس میں بھیج دیا تھا بلکہ پڑوس والی آنٹی خود ہی لے گئی تھیں تاکہ وہ اس صورتِ حال کو محسوس کر کے گھبرا نہ جائیں۔ مریم کو اس نے بیڈروم میں لٹا دیا تھا۔ مریم کا میکے کے نام پر کوئی بڑا خاندان نہ تھا چھوٹی بہن لائبہ اور پاپا بھی پہلے اسپتال ہی پہنچے۔ مریم کی اماں تو تین سال قبل خالقِ حقیقی سے جاملی تھیں۔ میکے کی طرح سسرال بھی مختصر سی تھی۔ صرف ایک جیٹھ، جیٹھانی جو دوسرے شہر میں تھے۔ ساس سسر اس کی شادی سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ لوگ آکر مریم کو تسلی دے رہے تھے۔ گلے لگا کر تسلی کے بول، بول رہے تھے۔ وہ بظاہر سب سن رہی تھی۔ دیکھ رہی تھی مگر اس کا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں سفر کر رہا تھا۔ رمیز کے ساتھ گزرا وقت ماضی کا حصہ بنتا نظر آرہا تھا۔

☆☆☆

مریم کے ابا جان، صابر امین ایک پرائیویٹ بینک میں منیجر تھے جبکہ رمیز اسی بینک میں کیشئر تھا۔ صابر صاحب کو سادہ طبیعت لیکن خوش گفتار، خوش لباس اور ایمان دار رمیز بطور ورکر بہت بھاتا ہی تھا۔ تاہم اس کی ہمدردانہ طبیعت سب سے زیادہ بھلی لگتی تھی۔ صابر صاحب کو اکثر مائیگرین کا درد اٹھتا تو رمیز ہی ہمیشہ ان کے ساتھ گھر تک آتا کیونکہ بقول رمیز اسے اپنے افسر سے خصوصی لگاؤ تھا...... کیوں؟ اس بات کا علم انہیں بہت تاخیر سے ہوا کیونکہ حقیقت اکثر دیر سے ہی عیاں ہوتی ہے۔ وہ گھر میں اکثر و بیشتر رمیز کا ذکر کرتے۔ وہ رمیز کے عمدہ اوصاف اور بہترین تربیت کے دلدادہ تھے۔ رمیز کے والد کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ اس کی والدہ نے پرائیویٹ اسکول میں جاب کر کے اپنے دونوں بچوں رمیز اور اسرار کو پالا پوسا۔

''میرے والدین کا سایہ نہیں سر پر مگر آپ کی پُرشفیق ہستی نے یہ کمی پوری کردی۔'' رمیز اکثر صابر صاحب سے کہتا۔

رمیز دوسرے ورکرز کی طرح ایم بی اے وغیرہ جیسی ڈگری تو نہیں رکھتا تھا تاہم وہ اپنے آپ کو بہت محنتی ورکر کے طور پر پیش، پیش رکھتا۔ اس نے بینکنگ سے متعلق کئی امتحان بھی دیے تھے۔ بقول اس کے اس کی خوش قسمتی تھی کہ یہ جاب اسے مل گئی اور ساتھ میں بونس کے طور پر صابر امین جیسے افسر بھی۔

صابر امین کی دو ہی بیٹیاں تھیں بڑی مریم اور چھوٹی لائبہ۔ لائبہ کو اس کے ماموں نے گود لیا تھا کیونکہ وہ بے اولاد تھے گوکہ بڑے ہونے کے بعد انہوں نے لائبہ کو آگاہ کردیا تھا تاہم لائبہ، ماموں، ممانی کی بے تحاشا محبت اور ان کے گھر میں ہر نعمت پاکر بہت خوش اور مطمئن تھی۔

صابر امین کے نزدیک بیٹیاں ہی ان کی متاعِ حیات تھیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جب رمیز تو اتر سے آتا رہا تو انہوں نے قطعاً اس کا برا نہ منایا بلکہ وہ چھٹی والے دن خصوصی طور پر رمیز کو ساتھ چائے پینے اور شطرنج کی بازی کھیلنے کی دعوت دیتے۔ نام تو چائے کا ہوتا مگر ابا جان، مریم سے کہہ کر خاص طور پر اس کے لیے اہتمام کرواتے۔ ٹی کیک، سموسے، شامی کباب اور نگٹس سے ٹرالی بھر جانے کے باوجود ان کی تسلی نہ ہوتی۔

مریم ان دنوں بی بی اے کی اسٹوڈنٹ تھی اور اکثر اپنے اسائنمنٹ تیار کرنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس دن بھی وہ کمپیوٹر پر اپنا کوئی اہم پروجیکٹ تیار کرنے میں مصروف تھی کہ جانے کمپیوٹر میں کیسا ایرر آیا کہ آن کرتے ہی شٹ ڈاؤن ہوا جارہا تھا تو اس نے رمیز کے ساتھ ٹاک شو دیکھنے میں مگن صابر

صاحب کو مخاطب کیا۔

''ابا جان، فوری طور پر کسی کمپیوٹر والے کو بلا کر فالٹ دور کروائیں۔ مجھے بہت اہم پروجیکٹ تیار کرنا ہے۔ کل فائنل ڈیٹ ہے۔ جمع کروانے کی۔''

''مگر بیٹا آج تو اتوار ہے۔ دیکھ لو کسی سہیلی کی طرف چلی جاؤ۔ میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں۔ چھوڑ آئے گا۔'' انہوں نے مریم کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''مگر ابا جان میرا سارا ڈیٹا تو میرے اپنے کمپیوٹر میں سیو ہے۔''

''اچھا...... یہ تو پھر واقعی مسئلہ ہے۔'' پھر وہ رمیز سے مخاطب ہوئے ۔

''میاں کمپیوٹر نامی بلا سے نمٹ سکتے ہو، بتاؤ کوئی حل، نکالو کوئی ترکیب۔'' ابا جان کی بات پر وہ انہیں دیکھنے لگی۔

''آپ ایسا کریں کہ ایک بار کمپیوٹر دکھا دیجیے پھر دیکھتے ہیں کیا ہو سکتا ہے۔'' اب کے رمیز نے مریم کی طرف دیکھ کر کہا تو مریم نے اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ رمیز پہلی بار ڈرائنگ روم سے نکل کر گھر کے کسی اور کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''آپ کا اسٹڈی روم تو بہت نفاست سے ڈیکوریٹ ہوا ہے۔'' رمیز نے کمپیوٹر آن کرتے ہوئے کہا تو مریم مسکرا دی۔

''جی ابا جان اور میں دونوں ہی مطالعے کے شوقین ہیں اور مجھے ماحول کے پُرسکون اور نفیس ہونے سے بہت سکون ملتا ہے۔''

''گڈ۔'' رمیز نے مختصراً کہا اور کمپیوٹر کی جانب توجہ مرکوز کر لی۔

اس دن پہلی بار مریم نے رمیز کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ اپنے کام میں منہمک تھا اور مریم اسے دیکھنے میں مشغول...... وہ درمیانے قد کاٹھ کا گندمی رنگت والا نوجوان تھا۔ عمر شاید اس کی تیس کے قریب تھی۔ تیکھے نقوش اور گہری سیاہ بادامی آنکھیں اس کی شخصیت کو خاصا جاذبِ نظر بنا رہی تھیں۔ رمیز کو شاید مریم کی تکتی نظروں کا احساس ہو گیا تھا تب ہی اس نے زیرِ لب مسکرا کر نظر بھر کر مریم کو دیکھا تو اس نے ہچکچا کر نظریں چرا لیں۔

جانے رمیز اس کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا؟

پھر اسے اس سوال کا جواب بھی بنا کسی تردد کے جلد ہی مل گیا۔ جب وہ بھائی، بھابی کے ہمراہ اس کا پروپوزل لے کر صابر امین کے سامنے حاضر ہوا۔ وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھے تھے۔ اس لیے انہوں نے مریم سے پوچھنے کے بجائے محض اسے بتانے پر ہی اکتفا کیا۔

''مریم بیٹی، رمیز کو میں کئی سالوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اس کا ظاہر اور باطن ایک ہے۔ محنتی ہے، وفادار ہے، ہاں آمدنی کچھ کم ہے مگر اس میں کچھ کر دکھانے اور اپنے خواب پورا کرنے کی جو لگن ہے اس سے جلد حالات بہتر ہو جائیں گے اور پھر پیسہ تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کے اوصاف ہی اس کی اصل دولت ہوتے ہیں۔ ایک بیٹی کے باپ کو ایسے ہی داماد کی تلاش ہوتی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم بھی اسے ویسا ہی مخلص پاؤ گی جیسا میں نے پایا۔''

اور مریم نے ایک تابعدار بیٹی کی طرح سر جھکا لیا۔ ویسے بھی باوجود اس کے کہ لائبہ کی غیر موجودگی کے باعث اس کی پرورش اکلوتی اولاد کی طرح ناز و نعم میں کی گئی تھی۔ وہ اپنے آپے سے باہر نہ تھی اور نہ ہی اس کے اونچے، اونچے خواب تھے۔ جن کے پورا ہونے کے انتظار میں وہ ہجر کے دن رات کاٹتی مگر اسے بعد میں پتا چلا کہ رمیز کے کچھ خواب تھے جنہیں پورا کرنے کے لیے اس نے دن رات ایک کر دیا۔ اپنی زندگی کے پانچ سال اس نے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں گزار دیے لیکن مریم ہرگز بھی اس کے خوابوں کا حصہ نہیں تھی بلکہ وہ اس کے خوابوں کی تکمیل کا ذریعہ تھی۔ بقول رمیز... کیونکہ مریم

اس کی جیون ساتھی ہے اس لیے اسے ہر حال میں اس کا ساتھ نبھانا چاہیے۔ مریم ایک تابعدار بیوی کی طرح اس کی اس بات سے سو فی صد متفق تھی مگر جب رمیز نے عملی طور پر مریم سے اپنی مرضی منوانا چاہی تو اس نے انکار کر دیا لیکن یہ انکار اسے بہت بھاری پڑا کیونکہ رمیز کا ماننا تھا کہ اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے اور رمیز نے بالکل ایسا ہی کیا بلکہ اس نے تو اپنا پنجہ ہی ٹیڑھا کر دیا جس میں مریم کی گردن دبوچی ہوئی تھی۔

''ابھی تو تمہارے ابا جان کے پاس بہت کچھ ہے دینے کو...... قبر میں لے کر جائے گا کیا بڈھا؟''

''بکواس مت کرو ذلیل آدمی۔'' مریم نے چیختے ہوئے رمیز کی آہنی گرفت سے نجات حاصل کرنا چاہی۔

''مجھے گالی دے گی۔ ٹھہر میں تیرے حواس بحال کرتا ہوں خبیث عورت۔'' اور پھر رمیز نے ہمیشہ کی طرح اس پر بے تحاشا تشدد شروع کر دیا۔ جسمانی اور ذہنی تشدد...... وہ تشدد جس کے بارے میں مریم نے اخباروں میں پڑھا تھا۔ ٹی وی پر خبریں دیکھی تھیں۔ خبر کو پڑھنے اور سننے میں اور خبر کا حصہ بننے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ اب عملی طور پر لفظ تشدد کی معنویت سے آشنا ہو رہی تھی۔ اس سے قبل ..... وہ ایسی عورتوں کے بارے میں ایسے، ایسے دلائل دیتی۔

''ارے یہ خود عورتوں کی ڈھیل ہوتی ہے۔ خوب ڈٹ کر اپنے حق کے لیے لڑیں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوں، عدالت سے انصاف مانگیں، کمزوری بالکل نہ دکھائیں تو کوئی مائی کا لعل انہیں چھو بھی نہیں سکتا۔''

اور اب یہ حال تھا کہ بند کمرے میں رمیز کے ہاتھوں تشدد کا نشانہ بنتے، بنتے اسے اپنا وجود ان عورتوں سے بھی ارزاں لگنے لگا جو سرِ عام تشدد کا نشانہ بنتی ہیں یا جن پر ڈھایا جانے والا ظلم بالآخر ان کی یا دوسروں کی زبانی منظرِ عام پر آ ہی جاتا ہے کیونکہ زہر کا

لاجواب

ایک بچہ پارک میں بینچ پر بیٹھا ایک کے بعد ایک ٹافی کھا رہا تھا۔

اس کے قریب ہی بیٹھی ایک عورت نے کہا۔ ''جو زیادہ میٹھا کھاتے ہیں، وہ بیمار ہو کر جلدی مرجاتے ہیں۔''

بچے نے جواب دیا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے، میری دادی کی عمر ایک سو چھ سال تھی۔''

عورت نے کہا۔ ''یقیناً وہ میٹھا کم کھاتی ہوں گی؟''

جی نہیں...... بس وہ اپنے کام سے کام رکھتی تھیں۔'' بچے نے جواب دیا۔

از: یاسمین اقبال، لاہور

آؤ کچھ دیر بیٹھو

بات کرو
کچھ میری سنو، کچھ اپنی کہو
میں پیاسی دھرتی
تم رم جھم برستا ساون
میں خشک ویراں جزیرہ
تم ہو برسات کا موسم
آؤ میرے من کو سیراب کرو
کچھ دیر بیٹھو، بات کرو
بس جاؤ میری سانسوں میں خوشبو بن کے
گردش کرو میرے جسم میں لہو بن کے
یونہی میرے تن من میں بسو
آؤ کچھ دیر بیٹھو بات کرو
شبِ ہجراں اور لرزتی تنہائی
پکارے تجھ کو ہر پل یہ دل سودائی
میری تنہائیوں کو آباد کرو
آؤ کچھ دیر بیٹھو بات کرو

شاعرہ: حیا ترمذی، کاغان

پیالہ گھونٹ، گھونٹ پینا آسان تو نہیں ہوتا جبکہ آپ کو پتا بھی ہو کہ پیالے میں امرت نہیں زہر ہی ہے۔

وہ بھی گئی دوسری عورتوں کی طرح مجبور تھی۔

اماں ہارٹ پیشنٹ تھیں۔ اباجان کے کندھے اس کے اَن کہے دکھ کو محسوس کر کے جھکے جا رہے تھے مگر وہ عزت کی بھاری پگڑی جو اُن کے سر پر رکھی تھی اس کے یک دم گر جانے سے ہراساں نظر آتے تھے۔

وہ مریم کے جسم پر استری اور سگریٹ سے جلے ہوئے نشان تو نہیں دیکھ پاتے تھے مگر آئے دن نم آنکھوں سے دامن پھیلاتی مریم کے چہرے پر پھیلی اذیت ان کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔ کاش ماں باپ اپنی اولاد کی طرح، اولاد کی زندگیوں میں آنے والے شریکِ حیات کا چہرہ بھی پڑھ سکتے۔

ماں باپ نظریں چرانے پر مجبور تھے مگر یک دم ماموں، ممانی کے جان لیوا ایکسیڈنٹ کی خبر نے اماں کو ایسا شاک دیا کہ وہ سب کو روتا دھوتا چھوڑ کر چلی گئیں۔ لائبہ اب تنہا نہیں رہ سکتی تھی اس لیے واپس ان کے گھر آ گئی۔ مریم کو بھی آسرا ہو گیا کہ باپ کو دیکھنے والا کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔ اماں کے سوئم کے فوراً بعد ہی رمیز نے ایک نئی فرمائشی لسٹ مریم کو تھما دی تو وہ بھڑک اٹھی۔

''خدا کا خوف کرو رمیز...... میری ماں چلی گئی اس دنیا سے...تمہیں بھی ساری عمر اس دنیا میں نہیں رہنا۔ اتنا مت بھاگو کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑو۔''

''بات سن، میرے سامنے زیادہ فلسفے مت بگھارا کر۔ میرے پاس تیری ان اولادوں کو کھلانے کے لیے مفت کا مال نہیں۔ جا، نہیں تو بیچ دوں گا ان کو۔'' رمیز نے مریم کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا اور وہ لوگوں کی چبھتی نظروں سے بچنے کے لیے پھر باپ کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئی تو ان کی برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے مریم کو لائبہ کے ساتھ گھر پر ہی رکنے کے لیے کہا اور خود اس کے لاکھ روکنے پر رمیز کی عقل ٹھکانے لگانے چلے گئے مگر دو گھنٹے بعد جب وہ واپس آئے تو ان کے کندھے مزید جھک چکے تھے۔ انہوں نے مریم کے سامنے ہاتھ جوڑے اور فوری طور پر بنا کچھ کہے سنے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ لاک کر لیا۔

گھنٹے بھر کی خاموشی کے بعد جب مریم نے ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی توقع کے برعکس انہوں نے بار، بار کی دستک کے بعد دروازہ کھول دیا۔ مریم نے جوس اور سینڈوچ کی ٹرے ان کے سامنے رکھی اور انہیں جوس کے گھونٹ پلانا شروع کر دیے۔ اس کی ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ اس کی زبان بھی حرکت کر رہی تھی۔

''اباجان...... میں نے سنا تھا کہ ماں باپ اپنی اولاد کے لیے جو دعا بھی مانگتے ہیں وہ قبول ہوتی ہے مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ ماں باپ کی دعاؤں سے اولادوں کے مقدر میں چھائے اندھیرے نہیں گھٹتے۔ شاید اسی کو امرِ ربی کہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں رمیز نے آپ کی ڈانٹ ڈپٹ سے ڈرنے کے بجائے آپ کے ساتھ گستاخی کی ہوگی۔ بدتمیزی کی ہوگی۔ مجھے طلاق دینے کا کہا ہوگا۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''اس کی یہ حرکتیں...... یہ دھمکیاں کوئی نئی تو نہیں ہیں ناں اباجان۔ آپ فکر نہ کریں میں خود ہی چلی جاؤں گی۔''

''مگر یہ دھمکی نئی ہے۔'' انہوں نے سرخ آنکھوں سے مریم کو دیکھا۔

''مطلب...... میں سمجھی نہیں اباجان؟'' مریم نے ٹھنڈی ہوتی ہوئی ہتھیلیاں مسلیں۔

''اس مردود نے کہا ہے کہ اگر اب اس کی راہ میں کسی نے بھی رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی تو وہ لائبہ کے کالج آنے جانے والے ہر راستے سے آگاہ ہے اور اگر میں اسے گھر بھی بٹھا لوں تب بھی اس کے ایک اشارے پر اس کے خبیث فطرت دوست لائبہ

کو گھر سے اٹھا کر لے جائیں گے۔''

اور مریم کو لگا کہ اس کی رگوں میں خون جمنا شروع ہوگیا ہے۔ کچھ لوگوں کو ہم تاعمر نہیں جان پاتے یہی مریم کے ساتھ ہوا تھا۔

آخر کار مریم، ابا جان سے ایک اور چیک لے کر گھر واپس آگئی مگر پھر بھی رمیز کو خوش نہ کر سکی۔ مریم نے چیک رمیز کے آگے رکھا تو رمیز نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ اس کی پیشانی کی رگیں ابھر آئیں لیکن ہمیشہ کی طرح مریم کی چیخوں کی قطعاً پروا نہ کرتے ہوئے سلگتا ہوا سگریٹ اس کی کلائی پر جابجا رکھنا شروع کر دیا۔ مریم کے حلق سے بلند ہوتی چیخیں کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آگئیں۔ کمرے میں تیز آواز سے بجتا ہوا میوزک اس کی آوازوں کی فرار کی کوششوں کو ناکام بنا رہا تھا۔ اس لیے رمیز ہمیشہ کی طرح بلاخوف و خطر اپنی کارروائی جاری رکھے ہوئے تھا۔

لڑکھڑاتی زبان سے مغلظات بکتے ہوئے اب وہ مریم کی کمر پر اپنی بیلٹ برسا رہا تھا۔

''اچھا تو اب تیری زبان بھی چلنے لگی ہے۔ بھڑکاتی ہے اپنے باپ کو میرے خلاف اور وہ خبیث ذلیل بڈھا...... میری ایف آئی آر کٹوائے گا...... آیا بڑا۔'' اس نے ایک موٹی سی گالی دے کر اپنا جملہ مکمل کیا تو مریم اپنے باپ کی بے عزتی سہہ نہ سکی اور اس کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیا تو وہ شیطان سے بھی بدتر بن گیا۔

''نیچ عورت تُو میرے اوپر ہاتھ اٹھائے گی۔ بڑی غیرت والی بنتی ہے۔ دیکھتا ہوں تیری کیا عزت ہے۔'' وہ اس پر گھونسے برسا رہا تھا۔

☆☆☆

فجر کی اذان نے مریم کو چونکا دیا...... سو تو وہ نہیں سکی تھی مگر شاید درد سے بے حال ہو کر غنودگی میں چلی گئی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح خود کو خود ہی سہارا دیا اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ غسل کر کے اس نے

پُرخلوص دعا

اے رب کائنات!

میں تیرے پاک نام سے دن کی ابتدا کرتی ہوں یارب۔

میری اور میرے چاہنے والوں کی دین و دنیا بہتر فرما اور اپنے لامحدود خزانوں سے رزقِ حلال، صحت، طویل عمری، خوشیاں اور کامیابیاں دین کی سمجھ بوجھ کے ساتھ عطا کر۔ الٰہی آمین۔

دعا گو! صدف آصف، کراچی

نماز ادا کی اور دیر تک اپنے رب کے حضور سر بسجود رہی۔

نماز ادا کر کے حسبِ معمول کاموں میں جت گئی۔ بچوں کو اٹھا کر ناشتا کروایا اور اسکول کے لیے تیار کیا۔ بچے ماں کے چہرے پر نیل کے نشان دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔

''مما آپ کو چوٹ لگی ہے کیا...... آپ رات میں بیڈ سے گر گئی تھیں؟'' مونس نے چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے ڈرتے، ڈرتے اس کے چہرے کو چھوا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''جی جانو۔'' اس نے بہ مشکل اپنی ہچکیوں کو کنٹرول کیا۔

''اوہ مما...... آپ کو درد ہو رہا ہے آپ روئیں نہیں۔ میں آپ کو دوائی لگا دوں۔ بس فائیو منٹس میں آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' حنا نے ننھی ہتھیلیوں سے اس کے آنسو خشک کیے تو اسے لگا کہ کسی نے واقعی مرہم رکھ دیا اس نے بے اختیار دونوں بچوں کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔

''مما کی جان، بس آپ نے چھو لیا۔ مما ٹھیک ہوگئی۔ اب درد نہیں ہو رہا۔ چلو اب جلدی سے ناشتا کرو۔ نہیں تو وین نکل جائے گی۔''

بچوں کو جلدی، جلدی ناشتا کروا کے اس نے اسکول روانہ کیا اور رمیز کے لیے ناشتا بنانے کچن میں آگئی۔ اس نے چولہا جلا کر توا رکھا اور پیڑا بنانے

گی۔ لاؤنج سے آتی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ رمیز اٹھ گیا ہے اس نے جلدی، جلدی ہاتھ چلا کر اس کے لیے ناشتا تیار کیا اور ٹرے میں رکھ کر لاؤنج میں لے آئی۔ جہاں وہ روز کی طرح نہا دھو کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ رمیز نے چونک کر پہلے اسے پھر وال کلاک کی جانب دیکھا۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے تک ناشتا کرتا پھر نو بجے آفس کے لیے نکلتا تھا۔

آج رمیز کے آگے ٹرے رکھ کر وہ واشنگ مشین لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ جو لاؤنج سے باہر گیلری میں رکھی تھی۔ رمیز ناشتا کرتے ہوئے گاہے بگاہے اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ آج اس کے معمولات کچھ الگ لگ رہے تھے۔ روزانہ رمیز کو ناشتا دینے کے بعد وہ ٹیرس میں رکھے آسٹریلین طوطوں کے پنجرے کے پاس بیٹھ جاتی اور انہیں باجرہ ڈالتی مگر آج وہ کپڑے دھو رہی تھی۔ رمیز ناشتا کر کے فریج پر رکھی گاڑی کی چابیاں اٹھا کر اس پر ایک نظر ڈال کر گھر سے باہر چلا گیا۔ مریم ہنوز اپنے کام میں مشغول تھی۔ کپڑوں کی دھلائی سے فارغ ہو کر اس نے گھر کی صفائی کی اور پھر سالن چڑھا کر ٹی وی کے آگے بیٹھ گئی۔ ظہر کی اذان ہوئی تو اس نے ٹی وی بند کر دیا تھا۔ دو بجے بچے واپس آ گئے تو اس نے نہلا دھلا کر کھانا کھلا کر انہیں سلا دیا تھا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو تین بج رہے تھے۔ آج اس نے نماز پڑھنے میں دیر کر دی۔ روز تو وہ بچوں کے آنے سے پہلے ہی اس فرض سے سبکدوش ہو جاتی تھی۔ جا نماز بچھا کر نیت باندھ لی۔

بے شک نیتوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔

وہی ہے جو روح کے اندر تک جھانک لیتا ہے اسی لیے تو بن مانگے بھی عطا کر دیتا ہے۔ وہ نماز پڑھ ہی رہی تھی کہ دروازہ اس بری طرح بجا کہ وہ دہل گئی۔ دروازے پر غیر متوقع طور پر باقر کو پا کر اس کا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو ہی گیا تھا مگر جب اس کی آمد کا سبب کھل کر سامنے آیا تو اسے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا مشکل لگنے لگا۔

اس نے چہرے پر چادر کا پلو ڈال کر ماتھے کے جس نشان کو چھپایا تھا۔ رات سے لے کر اب تک اٹھتی جسم کی جن ٹیسوں کو پین کلرز کھا کھا کر دبایا تھا وہ گویا پھر سے تمام حسیات سمیت بیدار ہو گئی تھیں۔ باقر کی وائف نے اسے اپنے تئیں سکون دینے کی غرض سے سکون آور دوا دے کر لٹا دیا تھا مگر دماغ میں چلتے سوچوں کے مسلسل جھکڑ نے اسے سکون نہیں لینے دیا تھا۔ لوگ آ کر اسے تسلی دیتے تو وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ مغرب کے قریب ابا جان اور لائبہ بھی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے مریم کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ جیسے سکتے سے باہر آ گئی اور ان کے سینے سے سر ٹکا دیا۔

''دعا کرو بیٹا۔'' وہ بھی لوگوں کی طرح ایک ہی جملہ دُہرا رہے تھے۔ لائبہ بچوں کو لے کر قریبی پارک چلی گئی تھی تاکہ وہ کچھ دیر کو بہل جائیں۔ اتنے میں مغرب کی اذان کی آواز آئی تو صابر امین اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میں مغرب کی نماز پڑھ آؤں تو پھر میں اور تم اسپتال چلیں گے۔ لائبہ بچوں کو دیکھ لے گی تم بھی نماز پڑھ کر دعا کرو۔'' وہ سر پر ٹوپی جما کر باہر کی طرف چلے گئے تو وہ کسی خیال کے تحت چونک گئی۔

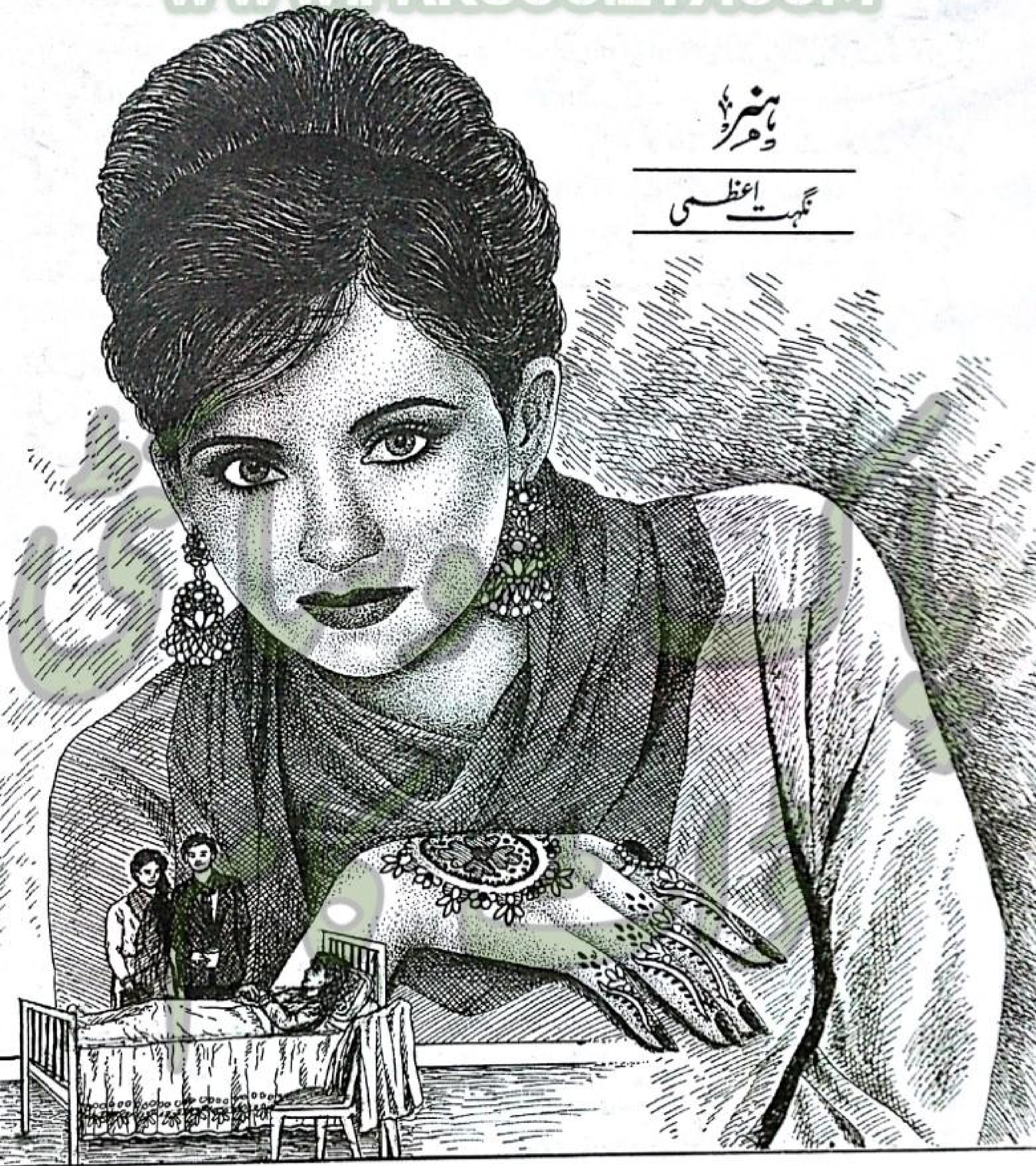
''اوہ تو عصر قضا ہو گئی۔'' وہ جلدی سے اٹھی اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ سلام پھیر کر اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو اس کے رخسار تیزی سے تر ہوتے چلے گئے۔ اس کی سسکیوں سے اس کا پورا وجود لرز گیا۔ تب ہی کسی کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔

''اناللہ وانا الیہ راجعون۔''

اس کی ہچکیاں یک دم تھم گئیں۔ اسے لگا وہ کسی قفس سے آزاد ہوئی ہے۔ اس نے اپنے رخسار صاف کیے اور سجدے میں گر گئی۔ ضروری تو نہیں کہ تمام لذتیں وصالِ یار میں ہوں کبھی، کبھی ہجر کی ساعتیں بھی سعادتیں لے کر آ جاتی ہیں۔

ہنر

نگہت اعظمی



اسے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے اندر کپکپی سی محسوس ہوئی۔ وہ شاید لڑکھڑائی بھی تھی۔ ساتھ چلتے ہوئے اس کے بیٹے نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اسے سہارا دیا۔ کل ہی اماں کا فون آیا تھا۔ وہ اس سے اور بچوں سے ملنا چاہتی تھیں اور اب پورے دس سال بعد وہ اپنے بیٹے کا ہاتھ تھامے ان سے ملنے جا رہی تھی۔ سردی کا موسم نہیں تھا پھر بھی اسے سردی سی محسوس ہو رہی تھی۔

پتا نہیں اس سے ملنے کے بعد ان کا ردِعمل کیا ہوگا؟ نہ جانے وہ اس سے کیوں ملنا چاہ رہی ہیں؟ کیا وہ اب بھی ویسی ہی ہوں گی؟ کیا ان کے چہرے پر اب بھی ویسی ہی تمکنت اور وقار ہوگا؟ کیا اب بھی ان کے رعب کی وجہ سے اس کی زبان گنگ ہو جائے گی؟ اور نہ جانے کیا...... کیا؟ کتنے بے شمار سوالات تھے جو کھنکھجوروں کی طرح ذہن کے ادھ کھلے دروازے کے آس پاس رینگ رہے تھے۔

''امی آپ اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں؟'' وہ دونوں اب فلیٹ کے دروازے پر پہنچ چکے تھے اور بیل بجانے سے پہلے اس کے بیٹے نے اس کی زرد رنگت دیکھ کر سوال کیا۔

''نہیں...... نہیں...... میں گھبرا تو نہیں رہی ہوں......'' اس نے تھوک نگل کر بہ مشکل یہ جملہ کہا۔

''اگر آپ ان کا سامنا نہیں کر سکتیں تو ہم واپس چلتے ہیں۔'' اس کے بیٹے نے اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر کے نرم لہجے میں کہا۔

''نہیں...... میں واپس نہیں جاؤں گی...... میں ان سے ملنا چاہتی ہوں......'' اس نے اپنے منتشر حواسوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔

''پھر ان کے سامنے سر اٹھا کر بات کیجیے گا...... سر جھکا کر نہیں۔''

اس نے سر اٹھا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا...... چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد...... کسرتی جسم، سرخی مائل گندمی رنگت، سیاہ ذہین آنکھیں...... چہرے پر ہلکی، ہلکی ڈاڑھی...... برانڈڈ ہلکی گرے دھاری دار شرٹ...... سیاہ پینٹ میں ملبوس ہاتھ میں نئے ماڈل کی کرولا کی چابی لیے ہوئے وہ اسی کا بیٹا تھا۔ وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھا اور ایک انٹر نیشنل فرم سے منسلک تھا۔ اس کے ہر، ہر انداز سے اس کی تعلیم، اس کی ذہانت، اس کی شخصیت کی گرومنگ ظاہر ہو رہی تھی۔

اس کے دل کے آس پاس مہکتے ہوئے گلاب کے پودوں سے خوف کا ناگ آہستگی سے کہیں روپوش ہو گیا اور اس کے چاروں طرف گلابوں کی خوشبو پھیل گئی۔

''اللہ کو عاجزی سے جھکے ہوئے سر پسند ہیں۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا۔

''ہاں مگر صرف اللہ کے سامنے......'' وہ اپنی ماں سے کہیں زیادہ ذہین تھا۔

''تم بیل بجاؤ...... مگر اپنے وعدے پر قائم رہنا۔''

''میں کچھ نہیں بولوں گا لیکن اگر کسی نے آپ کی انسلٹ کرنے کی کوشش کی تو پھر......'' اس نے آگے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ماں کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''اب ایسا نہیں ہوگا۔'' اس کے لہجے کی مضبوطی اور اعتماد سے اسے بے اندازہ خوشی ہوئی اور فوراً ہی اس نے بیل پر انگلی رکھ دی۔

☆☆☆

کیسی انہونی تھی کہ اسے اماں نے خود فون کیا تھا۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے دس سال انہوں نے ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں رکھا اور نہ ہی ملنے کی کوشش کی شاید اب بھی وہ نہ ملتی اگر چند دن پہلے میلاد میں اس کی ملاقات عالیہ آنٹی سے نہ ہوئی ہوتی۔

اس کے بیٹے نے ایک ماہ پہلے ہی یہ گھر خریدا تھا۔ گھر کو سیٹ کرنے کے بعد آس پاس کے لوگوں سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی تو ایک دن وہ پڑوس میں چلی گئی۔ صبح کا وقت تھا۔ گھر میں ایک بزرگ خاتون اور ان کی بہو تھی۔ دونوں ساس، بہو بڑے تپاک سے ملیں۔ پتا چلا ایک بہو اور بھی ہے وہ جاب کرتی ہے۔ ایک بیٹا، بہو امریکا میں رہتے ہیں۔ دو بیٹیاں شادی شدہ ہیں۔ وہ بھی باہر ہیں۔ اسے بھی ان لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کی بھی دو

بیٹیاں تھیں اور دونوں باہر تھیں۔ ایک اکلوتا بیٹا تھا جس کے لیے وہ لڑکی کی تلاش کر رہی تھی۔ اس کے بیٹے کی شرط تھی کہ پہلے وہ اپنا گھر خریدے گا پھر شادی کرے گا......اور جب وہ اپنا گھر خرید چکا تو اب اس کے دل میں بھولانے کی تمنا شدت سے زور پکڑ چکی تھی۔ وہ کافی دیر ان خواتین کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرتی رہی جب اٹھنے لگی تو گھر والوں نے اسے اپنے گھر میلاد کا بلاوا بھی دے دیا۔ جو دو دن بعد ہونا تھا۔ اور پھر دو دن بعد جب وہ ان کے گھر میلاد میں گئی تو وہاں اس کی ملاقات عالیہ آنٹی سے ہوئی۔

عالیہ آنٹی اماں کے پڑوس میں رہتی تھیں اور اماں سے ان کے بہنوں جیسے تعلقات تھے۔ پرانے زمانے کی بہنوں جیسے......جس میں ایک دوسرے کے لیے صرف محبت ہوتی تھی۔ جلن اور حسد نہیں...... عالیہ آنٹی، اماں کی ہی ہم عمر تھیں جو اب خاصی ضعیف ہوگئی تھیں لیکن جب اس نے قریب جا کر اپنا تعارف کرایا تو وہ فوراً پہچان گئیں۔

''ارے ہانیہ...... کہاں تھیں تم......تم تو ایسی گئیں کہ کوئی پتا نشان بھی نہیں چھوڑا......'' عالیہ آنٹی نے اسے بے اختیار گلے سے لگالیا۔

''ہاں......بس......آپ کو تو پتا ہی ہوگا......'' وہ اتنے سالوں بعد بھی ان کو اصل بات بتاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

''ہاں مجھے کیا نہیں پتا......تمہاری ساس کس قدر نیک اور پرہیز گار تھیں۔ بیٹے کے مرنے کے بعد انہوں نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو کس طرح کلیجے سے لگا کر رکھا تھا۔'' عالیہ آنٹی کے ان جملوں پر وہ حیران رہ گئی۔ واقعی یہی دنیا ہے جو صرف ظاہر کو دیکھتی ہے اور وہی کہتی ہے جو وہ سنتی ہے۔ حقیقت کو سمجھنا آسان نہیں ہے اور نہ ہی دنیا والے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''تم نے اچھا نہیں کیا......'' اسے لگا جیسے وہ آج سارے پرانے سبق دُہرانے کے لیے اسے ملی ہوں۔

''میں نے...... اچھا......نہیں کیا؟'' وہ ہونق سی عالیہ آنٹی کا منہ تکنے لگی۔

''کیا چچا، تایا کو حق نہیں کہ بچوں کو غلط بات پر ٹوک سکیں، اتنی سی بات پر بھی بھلا کوئی گھر چھوڑ دیتا ہے......'' عالیہ آنٹی نے غلط نہیں کہا تھا۔ بظاہر تو بہت چھوٹی بات تھی لیکن اس چھوٹی سی بات کی تہ میں کیسی، کیسی اذیتیں پوشیدہ تھیں وہ کوئی بھی نہیں جان سکتا تھا۔

''اماں کیسی ہیں؟'' اسے خود نہیں پتا چلا کہ اس نے یہ سوال کیوں پوچھا۔

''تم لوگوں کو بہت یاد کرتی تھی......'' وہ لفظ تھی پر چونک گئی۔

''کیا......کیا اماں اب اس دنیا میں نہیں؟'' اس نے بڑی مشکل سے اٹک، اٹک کر یہ جملہ ادا کیا۔

''نہیں...... اللہ نہ کرے...... ابھی وہ زندہ ہیں...... اصل میں اب وہ لوگ وہاں سے شفٹ ہوگئے ہیں...... پھر ان کا فلیٹ بھی بہت دور ہے اور تیسری منزل پر ہے۔ اب میرے گھٹنوں میں اتنی طاقت نہیں کہ اتنی سیڑھیاں چڑھ سکوں اس لیے میرا تو اب ان سے ملنا برائے نام ہی ہوتا ہے۔'' عالیہ آنٹی روانی میں جو کچھ کہہ رہی تھیں اس کا ایک، ایک لفظ اس پر حیرتوں کے بے شمار دروازے کھول رہا تھا۔

''کیا وہ لوگ اس گھر سے کہیں اور شفٹ ہوگئے؟'' حیرت کے سمندر سے ڈوب کر وہ ابھری تو اس نے سوال کیا۔

''تمہیں نہیں معلوم......؟'' انہوں نے غور سے ہانیہ کی صورت دیکھی......جیسے انہیں اس کی بات پر یقین نہیں آیا ہو۔

''واقعی مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہ لوگ اب بھی اسی گھر میں رہتے ہیں۔''

''وہ گھر تو کافی عرصہ ہوا بک گیا۔ ان پیسوں

سے تو کامران اپنی بیوی اور بیٹے کو لے کر امریکا چلے گئے وہاں ان کے بیٹے نے کسی نیگرو لڑکی سے شادی کرلی۔ اب سر پکڑ کر روتے ہیں۔"

"اوہ......اور عمران؟"

"وہ یہیں پاکستان میں ہیں۔ انہوں نے کوئی اور کاروبار شروع کیا تھا۔ اس میں انہیں بڑا نقصان ہوا......"

"ان کے بچے......؟"

"ان کی ایک بیٹی کی شادی ہوئی تھی۔ اس کی طلاق ہوگئی...... بیٹا گانے بجانے میں پڑ گیا۔"

"اور اماں......؟"

"وہ عمران کے ساتھ رہتی ہیں۔"

"آپ کے پاس ان کا نمبر ہے؟"

"ہاں اسی موبائل میں ہے، عائزہ سے کہو وہ نکال کردے گی۔ مجھے تو نمبر نظر ہی مشکل سے آتے ہیں۔" انہوں نے اپنی پوتی کا نام لیا۔

عائزہ نے موبائل سے اماں کا نمبر اسے لکھوادیا۔ عالیہ آنٹی نے ہانیہ کا نام اور نمبر بھی اپنے موبائل میں سیو کروالیا۔

وہ میلاد سے گھر آئی تو اسے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا محسوس ہورہا تھا۔ برسوں کی چھائی ہوئی گھٹن ختم ہوگئی تھی اور تازہ ہوا کے جھونکے اسے اپنے آس پاس محسوس ہورہے تھے۔ ذہن کی ادھ کھلی کھڑکیوں سے کیسے کیسے مناظر اپنی جھلک دکھلا رہے تھے۔

☆☆☆

گھر میں سہ پہر سے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اماں کو شبہ تھا کہ کاشان نے ان کے سرہانے سے پیسے نکالے ہیں اور ان کو صرف شبہ نہیں بلکہ سو فیصد یقین تھا کہ یہ ساری کارروائی کاشان کی ہے جو اُن کے سب سے چھوٹے بیٹے ذیشان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کے اس یقین کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرنے لیٹی تھیں تو صرف کاشان ہی ان کے کمرے میں آیا تھا اور انہوں نے اپنے بٹوے میں گن کر تین ہزار روپے رکھے تھے اور جب وہ عصر کی نماز کے لیے اٹھیں اور انہوں نے احتیاطاً بٹوا کھول کر رقم گنی تو اس میں سے ہزار کا ایک نوٹ غائب تھا۔ اماں کا تو یہ حال تھا کہ اگر ان کا دس روپے کا نوٹ بھی غائب ہوجاتا تو ان کی راتوں کی نیندیں اڑ جاتیں کجا یہ کہ دن دیہاڑے ہزار روپے کا نوٹ غائب ہوجائے۔ وہ ایسی بے قرار اور بے کل ہوئیں جیسے بلی اپنے نوزائیدہ بچوں کے کھوجانے پر ہوتی ہے۔

رات کو جب ان کے تینوں بیٹے گھر میں داخل ہوئے تو اماں کے کمرے میں باقاعدہ عدالت لگائی گئی سارے لڑکوں کو بلایا گیا۔ گھر میں تین ہی تو لڑکے تھے جن میں سب سے بڑا فاران تھا جو اماں کے سب سے بڑے بیٹے کامران کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور اماں کا بے حد چہیتا بھی......اس لیے اس کی ماں، اماں کی سب سے چہیتی بہو تھیں کیونکہ وہ ان کی بھانجی بھی تھیں اور بہت دولت مند بھی......اور وہ اماں کا خیال بھی بہت رکھتی تھیں۔ دوسرا لڑکا ان کے منجھلے بیٹے عمران کا بیٹا تھا۔ وہ تین بیٹیوں کے بعد اس دنیا میں آیا تھا اس لیے اس کے لاڈ پیار کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ عمران کی بیوی بھی اماں کی بھتیجی تھی۔ اسے ٹی وی دیکھنے اور شاپنگ کرنے سے فرصت نہیں تھی لیکن چونکہ اس کے میاں کا بزنس خوب اچھا چل رہا تھا اور عمران ہر مہینے اماں کو اچھی خاصی رقم مہینے کے خرچے کے لیے دیتا تھا پھر اس کی بیوی بھی جب بازار جاتی اماں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آتی......اس لیے اماں اس سے بھی بہت خوش رہتی تھیں۔ تیسرا لڑکا کاشان تھا جو اُن کے سب سے چھوٹے بیٹے ذیشان کا بڑا بیٹا تھا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس کے باپ نے اپنی پسند سے شادی کرلی تھی اور جس لڑکی سے شادی کی تھی وہ بہت معمولی خاندان کی عام سی شکل صورت کی تھی اور چونکہ اماں کو اپنے خاندان کی

دولت اور قابلیت پر بڑا ناز تھا اس لیے ان کے دل میں نہ ذیشان کی بیوی کے لیے انسیت یا اپنائیت پیدا ہو سکی اور نہ اس کے بچوں کے لیے وہ محبت پیدا ہوئی جو باقی پوتے اور پوتیوں کے لیے تھی۔ انہیں بہت دکھ تھا کہ ذیشان کے تینوں بچے اپنی ننھیال پر گئے ہیں۔ انہی لوگوں کی طرح سانولے اور دبلے پتلے......ذیشان نے ہانیہ کی ذہانت سے متاثر ہو کر شادی تو کرلی تھی لیکن چند سالوں بعد ہی وہ اس کی ذہانت سے چڑنے لگا۔ ہانیہ نے بھی سسرال میں قدم جمانے کے لیے اپنی ذہانت کو ذہن کے ایک گوشے میں دفن کردیا تھا۔ اب وہ بھی ان میں گھلنے ملنے کے لیے انہی کی طرح گفتگو کرتی، انہی کی طرح کھانے پکاتی، انہی کی طرح ٹی وی ڈراموں پر تبصرے کرتی اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اس کی ایم ایس سی میں فرسٹ پوزیشن تھی اور وہ بہت اچھی مقررہ بھی تھی اور اخباروں میں مضامین بھی لکھتی تھی۔ اس کی پسند کی شادی اس کے لیے سزا بن گئی تھی۔ اس نے یہی سوچا کہ اب اس کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اپنی قابلیت اور ذہانت کو اپنی ڈگریوں کی طرح پلاسٹک کوٹنگ کرا کے ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ کرلے اور جب بھی ذہن میں ہلچل مچے تو تنہائی میں سب سے چھپ کر ان لمحوں کو آواز دے کر تھوڑی دیر کے لیے ملاقات کرلے...... وہ اماں سے بہت مرعوب رہتی تھی اس لیے کہ جب وہ بیاہ کر سسرال آئی تو اماں کی پورے گھر پر بلا شرکت غیرے حکمرانی تھی۔ ان کے تینوں بیٹے ان کے تابعدار تھے۔ کسی بیٹے بہو کی یہ مجال نہیں تھی کہ اماں کے سامنے سر اٹھا کر بات کرسکیں۔ ان کا شہر کے پوش علاقے میں چھ سو گز کا ڈبل اسٹوری گھر تھا۔ جسے ان کے شوہر مرنے سے پہلے ان کے نام کر گئے تھے۔ اس گھر کے نیچے والے حصے میں ڈرائنگ اور ڈائننگ روم، ٹی وی لاؤنج اور دو کمرے تھے۔ جبکہ اوپر والے حصے میں چار کمرے، ٹی وی لاؤنج اور ٹیرس تھا۔ بڑا سا سرسبز لان بھی تھا۔ کار پورچ تھا جس میں دو گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ بڑے دونوں بیٹے کامران اور عمران اوپر والے حصے میں رہتے تھے۔ جبکہ ذیشان اور اس کی بیوی کو نیچے کا کمرا ملا تھا۔

کامران اور عمران کے حصے میں دو، دو کمرے آئے اور ذیشان کے حصے میں ایک کمرا...... پھر ہانیہ کے حصے میں کام کی ذمے داری بھی زیادہ تھی۔ دن کا کھانا، اماں کی دیکھ بھال، مہمانوں کی خاطر مدارات سب ہانیہ کو کرنا پڑتا......اس لیے کہ اماں کا ملنا جلنا بہت تھا۔ وہ بہت ملنسار تھیں۔ آئے دن مہمانوں کی آمدورفت لگی رہتی۔ بڑی دونوں بہوئیں مزے سے اوپر رہتیں۔ بڑی بھابی کے ذمے رات کا کھانا اور عمران کی بیوی کے ذمے صبح کا ناشتا تھا۔ دونوں اپنے، اپنے کام نمٹا کر اوپر چلی جاتیں۔ کوئی مہمان آتا تو خوب سج سنور کر نیچے آتیں اور بہت اخلاق کا مظاہرہ کرتیں۔ جبکہ ہانیہ ان کے لیے چائے، شربت کے بندوبست میں لگی رہتی۔

روزانہ رات کے کھانے کے وقت جب سب جمع ہوتے اس وقت بڑی دونوں بہوؤں کی بھاگ دوڑ اور تابعداریاں دیکھنے کے قابل ہوتیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ انڈین ڈراموں کی بہوؤں کی طرح پہلے شوہروں کو کھانا کھلائیں پھر بچا کھچا خود کھائیں جبکہ ہانیہ کو یہ دکھاوے نہیں آتے تھے۔ وہ اماں کی ہدایت پر صبح ہی دونوں وقت کا کھانا پکا لیتی تھی۔ رات کو صرف دال چاول پکتے تھے۔ وہ بڑی بھابی پکا لیتی تھیں ان کو روٹی پکانی نہیں آتی تھی۔ اس لیے رات کو روٹی بھی وہی پکاتی تھی کیونکہ سب کو اس کے ہاتھ کی پکائی ہوئی چپاتیاں بہت پسند تھیں اور چونکہ وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس لیے اسے کام کرنے کی عادت تھی۔

ان سب خدمتوں کے باوجود اماں کی کوشش یہ ہوتی کہ وہ خاندان کی تقریبات میں ان کے ساتھ نہ

جائے اور اکثر ایسا ہی ہوتا تھا کہ وہ بڑے بیٹے اور بہو کی گاڑی میں چلی جاتی تھیں۔ جبکہ ذیشان اور ہانیہ اکثر عمران کے ساتھ جاتے اور اگر عمران کو کہیں اور جانا ہوتا تو وہ دونوں ٹیکسی یا رکشا کر کے جاتے۔

ذیشان ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ بھی کم تھی۔ اور فی الحال وہ گاڑی خریدنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ہانیہ اپنے میکے کی کم مائیگی کی وجہ سے احساسِ کمتری میں مبتلا رہتی تھی۔ اس کے بچوں کی شخصیتیں بھی اسی کی طرح دبی، دبی تھیں۔ جبکہ کاشان بہت ذہین تھا اور ہر کلاس میں فرسٹ یا سیکنڈ آتا۔ لیکن چونکہ فاران اور حسان کی پوزیشن اچھی نہیں آتی تھی لہٰذا اس کارکردگی کا بھی ذکر نہیں ہوتا کہ کہیں ان دونوں بچوں کو احساس نہ ہو۔ پتا نہیں اماں کو ہر وقت یہ دھڑکا کیوں لگا رہتا کہ کہیں کاشان بگڑ نہ جائے۔ وہ ہر وقت اس پر کڑی نظر رکھتیں۔

”تم نے غور کیا ہے کاشان اسکول سے آنے کے بعد سوتا نہیں ہے۔ سب سو رہے ہوتے ہیں اور یہ سب کے کمروں میں جھانکتا رہتا ہے۔“ اماں موقع ملتے ہی اپنی بڑی بہو عنبر سے سرگوشیوں میں اپنے خدشوں کا اظہار کرتیں۔

”آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں...... اکثر میں نے بھی نوٹ کیا ہے۔“ عنبر نے پہلے دن سے ہی یہ پالیسی اختیار کرلی تھی کہ وہ ہر بات میں ان کی ہاں میں ہاں ملائے گی۔

”اس پر شروع ہی سے نظر رکھنے کی ضرورت ہے مجھے تو ڈر ہی لگا رہتا ہے کہ کہیں ماموں کی طرح چور اچکا نہ بن جائے۔“ اماں عنبر کی گواہی پر اور دلیر ہوجاتیں۔

ہانیہ کے بھائی بینک میں تھے کسی نے ان کے جعلی دستخط بنا کر رقم نکلوالی تھی جس کے نتیجے میں مقدمہ بھی چلا اور مقدمے میں فیصلہ ہونے تک وہ حوالات میں رہے بعد میں فیصلہ ان کے حق میں ہوگیا تھا اور عدالت میں وہ بے قصور بھی ثابت ہوگئے تھے لیکن اماں کے دل سے یہ شبہ دور نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے غبن نہیں کیا تھا۔ وہ موقع بہ موقع اس بات کا حوالہ دینے سے بھی نہیں چوکتی تھیں۔

”ذیشان نے بھی حد کردی...... پسند کی شادی کرنی تھی تو کسی اچھے اپنے ہم پلہ خاندان کی لڑکی سے کرتا...... کیسے فقیروں میں رشتہ جوڑا ہے کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔“ عنبر ہزاروں دفعہ کے دُہرائے ہوئے جملوں کو دوبارہ سے دُہرا کر عجیب کمینی سی لذت محسوس کرتی۔ ویسی ہی لذت جیسی گدھ کو مردار جانور کا گوشت کھا کر محسوس ہوتی ہے۔

”بس جب عقل پر پردہ پڑ جائے تو یہی انجام ہوتا ہے، اب سوچو ذرا کل کلاں بچے جوان ہوں گے، شادی بیاہ کا وقت آئے گا اس وقت لوگ پوچھیں گے نہیں کہ اتنے بڑے خاندان کے لڑکے نے ایسے خاندان میں شادی کیوں کی؟“ اماں سرد آہ بھر کر کہتیں۔

”اور جب لوگوں کو یہ پتا چلے گا کہ دونوں کی لو میرج تھی تو رشتہ کرنے والے اور بھی محتاط ہوجائیں گے۔“ عنبر بات کو اور بڑھاتیں۔

”خدا خیر کرے یہی تو ذیشان کو سمجھاتی تھی کہ اتنا اندھا نہ بن کل جب بچے جوان ہوں گے تو اپنی حماقت پر سر پکڑ کر روؤ گے۔“

”رو تو بیچارہ اب بھی رہا ہے، دیکھتی نہیں ہانیہ سے کیسے بات کرتا ہے۔“

”کیا بات کرے...... ایک تو رنگ روپ ڈھلتی چھاؤں...... پھر نہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ نہ رہنے سہنے کا ڈھنگ...... ذیشان نے ہمیشہ مجھے اور تمہیں دیکھا اس کی نظروں میں وہ سوکھی مریل کیا سمائے گی۔“

ان دونوں ساس، بہو کی پوری صبح اسی قسم کی باتیں کرتے، کرتے گزرا کرتی۔ عمران کی بیوی کو ان باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا زیادہ وقت ڈرامے، فلمیں دیکھتے یا شاپنگ کرتے

گزرتا...... اگر کبھی وہ بھی اس محفل میں شامل ہوتی تو وہ بھی اماں ہی کا ساتھ دیتی۔ اور ہانیہ سسرال میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے صبح سے شام تک منہ بند کیے اپنے کام میں مصروف رہتی۔ اماں اس پر طنز کرتیں، اس کے بچوں پر جا بے جا تنقید کرتیں......

جبکہ اس کی دونوں بچیاں عمران کی بچیوں کے مقابلے میں خاصی سمجھدار اور تابعدار تھیں لیکن کاشان تھوڑا خودسر اور ضدی تھا۔ اسی لیے اماں کو اس سے کچھ ذاتی پرخاش سی ہوگئی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتا ہے جس سے وہ مشتعل ہوں اور ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ جب اماں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ ان کے کمرے میں چھوٹا سا بیڈ روم فریج تھا جو عمران نے انہیں لا کر دیا تھا۔ وہ دوپہر میں سو رہی تھیں کہ کھٹکے سے ان کی آنکھ کھل گئی انہوں نے دیکھا کاشان فریج سے مٹھائی کا ڈبا نکالے مزے سے مٹھائی کھا رہا ہے۔

''تم نے چوری کی ہے......؟'' انہوں نے کاشان کے ہاتھوں سے مٹھائی کا ڈبا چھین لیا۔

''میں نے کوئی چوری نہیں کی...... میں تو مٹھائی کھا رہا ہوں۔'' وہ خوفزدہ ہوگیا۔

''کسی کی اجازت کے بغیر ایک نوالہ کھانا بھی چوری ہوتی ہے۔'' ان کا لہجہ بے حد کرخت تھا۔

''لیکن......'' وہ گھبرا بھی رہا تھا اور کنفیوز بھی تھا کیونکہ ایک دن پہلے ہی اس نے دیکھا کہ فاران نے اماں کے فریج سے کسٹرڈ نکال کر کھایا تھا اور جب اماں کو پتا چلا تو اماں نے فاران کو ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا بلکہ عنبر کی مصنوعی سرزنش پر وہ دھیمے، دھیمے مسکراتی رہی اور ساتھ میں یہ بھی کہا تھا۔

''بچوں کو کھانے پر نہیں ٹوکا کرو...... یہ چیزیں بچوں ہی کے کھانے کے لیے ہیں۔'' اور اب جب اس نے مٹھائی کھائی تھی تو وہ چراغ پا ہوگئیں۔

''اپنی ماں کو بلاؤ......'' انہوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہانیہ کو بلوالیا اور پھر پوری دوپہر اسے لعن طعن کرتی رہیں۔ جس کے نتیجے میں ہانیہ نے کاشان کو خوب مارا اور ساتھ، ساتھ خود بھی روئی اور اسے سمجھایا کہ آئندہ کچھ بھی ہوجائے وہ دوپہر کو دادی کے کمرے میں نہیں جائے گا۔

اس دن بھی عدالت لگی تھی اور ذیشان کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تھا۔ سب سمجھ رہے تھے اماں غلط کہہ رہی ہیں مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اماں کی بات کی مخالفت کرسکتا۔

اس واقعے کے بعد سے ہانیہ بہت محتاط ہوگئی تھی اور ہر وقت کاشان پر نظر رکھتی۔ اسے ان کے کمرے میں نہیں جانے دیتی، وہ اسکول سے آتا تو زیادہ تر اپنے کمرے میں رکھتی لیکن پھر بھی گھر سے کوئی چیز غائب ہوتی یا کوئی اپنی چیز خود ہی رکھ کر بھول جاتا تو سب کی نظریں کاشان کی طرف اٹھتیں اور ہانیہ اپنی ہی نظروں میں چور بن جاتی۔

☆☆☆

''سچ، سچ بتاؤ، تم میں سے کس نے اماں کے پیسے چرائے ہیں۔'' بڑے بیٹے کامران نے شدید غصے میں تینوں لڑکوں سے پوچھا۔

''پاپا مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں چوری کروں۔ مجھے جب بھی ضرورت ہوتی ہے میں دادی سے مانگ لیتا ہوں۔'' فاران نے بے خوفی سے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ ہمیشہ پیسے مانگ کر لیتا ہے۔'' انہوں نے ایک لمحے میں فاران کو بری کردیا۔

''حسان کا تو آپ کو پتا ہی ہے وہ اسکول سے آکر ایسا غافل سوتا ہے کہ شام کو بھی بڑی مشکل سے اٹھتا ہے۔'' عمران کی بیوی شازیہ نے فوراً اپنے بیٹے کا بچاؤ کیا۔

''ہاں حسان تو کبھی دوپہر کو میرے کمرے میں

نہیں آتا۔“

”تم بتاؤ......“ کامران نے غصے سے کاشان کی طرف رخ کیا۔

”میں...... میں تو......“ وہ کامران تایا سے بہت ڈرتا تھا۔ ان کے سوال کرنے پر بری طرح ہکلانے لگا۔

”مجھے سو فی صد یقین ہے کہ پیسے اسی نے نکالے ہیں......“ اماں نے فیصلہ صادر کر دیا تھا۔

”بتاؤ...... اماں صحیح کہہ رہی ہیں کیا؟“ ذیشان نے اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے کاشان کے گال پر تھپڑ مارا۔

”نہ...... نہ...... نہیں...... میں نے ...... پیسے نہیں لیے......“ وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔

”تم نے نہیں لیے تو پھر کس نے لیے ہیں۔ اس کا نام بتاؤ......“ ذیشان دہاڑا۔

”مجھے نہیں معلوم......“

”یہ جھوٹ بول رہا ہے اسی نے لیے ہیں......“ اماں نے حتمی فیصلہ کر دیا تھا اور اماں کے اس طرح کہنے پر ذیشان پر جیسے جنون طاری ہو گیا۔ اس نے اپنی ساری محرومیوں کا بدلہ اس سے لینا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔

”تُو نے پیسے چرائے ہیں...... تو چور ہے، ڈاکو ہے، تو گھر میں چوری کرتا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ اسے مار رہا تھا اور وہ خاموشی سے مار کھا رہا تھا۔ لیکن اس کے اندر نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

”بس کرو...... کیا اسے جان سے مار دو گے۔“ کامران نے آگے بڑھ کر بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اچھا ہے اب اسے عقل آ گئی ہو گی۔ اب یہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔“ اماں اپنی دانست میں اپنے بچوں کو بچوں کی تربیت کرنا سکھا رہی تھیں۔ اس رات کاشان کے ساتھ ہانیہ اور ذیشان بھی ساری رات روتے رہے۔ ان کے بیڈ روم میں ساری رات سسکیاں گونجتی رہیں، تینوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا لیکن تینوں ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے۔

☆☆☆

دو دن بعد اماں کو یاد آ گیا کہ انہوں نے ہزار کا نوٹ اپنے پرس سے نکال کر کھانسی کے شربت کے ڈبے میں رکھ دیا تھا کہ انہیں اس سے اپنی دوائیں منگوانی تھیں۔ اماں دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوئیں انہوں نے اللہ سے رو، رو کر معافی بھی مانگ لی تھی لیکن گھر میں کسی سے ذکر نہیں کیا انہیں یہ خطرہ تھا کہ اگر انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تو شاید گھر میں ان کی پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔ وہ بڑی سمجھدار خاتون تھیں۔ اپنے گھر اور اپنے خاندان میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کی کوششوں میں ہر وقت مصروف رہتیں۔ ویسے اماں تھیں بھی بڑی نیک، ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتی رہتیں۔ وقتاً فوقتاً ان کی زبان پر یہ جملے ہوتے۔ ”اللہ کا بڑا کرم ہے اس نے بڑا نوازا ہے۔“ اور جب ہانیہ یہ جملے سنتی تو سوچتی رہ جاتی۔

”واقعی اللہ نے ان کو بہت نوازا ہے...... لیکن آخر...... کیوں......؟ شاید اماں کی نیکیوں کی فہرست بہت طویل ہے اور کیسی کیسی نیکیاں ہیں، کل ہی انہوں نے ماسی کو پچاس روپے دیے تھے اور ماسی نے منہ بنا کر پیسے تو لے لیے لیکن اماں سارا دن اس نیکی سے سرشار رہیں۔ اور بار، بار اسے یاد کر کے اللہ کا شکر ادا کرتی رہیں۔ جس نے انہیں اتنی بڑی نیکی کرنے کی توفیق عطا کی۔“

اماں کے دل میں غریبوں کے لیے دکھ درد کا احساس کوٹ، کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اور خاص طور پر ہانیہ کے میکے والوں کی غربت اور کم مائیگی سے ان کا دل بہت کڑھتا تھا اور وہ حتی الامکان ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتیں۔ یہ اور بات تھی کہ ہانیہ کے میکے والے بہت غیرت مند اور خود دار تھے۔ اماں

جتنا ان کے ساتھ کرتیں وہ دُگنا کر کے لوٹا دیتے پھر بھی اماں کو ان کی غربت کا احساس مارے ڈالتا۔ وہ اس کے گھر کسی کی عیادت کے لیے جاتیں تو بہت زیادہ پھل لے کر جاتیں اور جب گھر آتیں تو اس نیکی میں سر سے پاؤں تک غرق ہوتیں۔

''بیچارے ایک سو بیس گز کے گھر میں رہتے ہیں۔ پتا نہیں ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کا خرچہ کیسے پورا کرتے ہوں گے اور پھر آج کل پھلوں کی قیمتیں بھی تو آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ غریبوں کو تو بیماری میں بھی پھل کھانا نصیب نہیں ہوتے۔ میں تو یہی سوچ کر پانچ سو کے پھل لے گئی تھی کہ بیچارے چند دن کو سیر ہو کر پھل کھالیں۔''

اماں ایسی ہرگز نہیں تھیں کہ وہ یہ باتیں ہانیہ کے سامنے کہتی ہوں لیکن ہانیہ اسی گھر میں رہتی تھی۔ آتے جاتے، کام کرتے ہوئے یہ باتیں اس کے کانوں میں پڑ ہی جاتی تھیں۔ اور یہ باتیں سن کر وہ ہمیشہ ہی جبر کا کڑوا گھونٹ پی لیتی۔

☆☆☆

قدرت کیسے، کیسے رنگ دکھاتی ہے اور کس، کس طرح امتحان لیتی ہیں۔ کبھی پرچہ بہت آسان ہوتا ہے فوراً حل ہو جاتا ہے اور کبھی اتنا مشکل کہ دل و دماغ گُنگ ہو کر رہ جاتے ہیں کہ ایسا تو تصور میں بھی نہیں تھا۔ اس کی تو کوئی تیاری ہی نہیں کی تھی۔ اس کو کیسے حل کیا جائے۔ وہ زندگی کے چھوٹے موٹے امتحانات سے گزر رہی تھی کہ ایک دم ہی ایسا پرچہ سامنے آیا کہ وہ پچھلے سارے پرچے بھول گئی اور اسے ہی حل کرنے کی تگ ودو کرنے لگی۔

ہر صبح کی طرح وہ صبح بھی اندھیروں کے پردوں کی چیرتی نور کا لباس پہنے جگمگاتی ہوئی نمودار ہوئی تھی۔

دن کا آغاز روزمرہ کے معمولات سے ہوا تھا۔ گھر میں اوپر سے لے کر نیچے تک مختلف آوازیں گونج رہی تھیں۔ بچوں کی نیند میں ڈوبی ہوئی آوازیں، باتھ روم سے پانی گرنے کی آوازیں، عنبر اور شازیہ کی بچوں کو جگانے کی آوازیں کچن سے برتنوں کی آوازیں اماں کے کمرے سے قرآن پاک کی تلاوت کی آواز اور ایک دم ہی سے ان آوازوں میں ہانیہ کی چیخوں کی آوازیں بھی شامل ہوگئیں۔ وہ کچن میں چائے کا پانی رکھ کر کاشان اور بچیوں کو جگانے کمرے میں آئی تو اسے ذیشان کا سونا کچھ عجیب سا لگا۔ روزانہ جب وہ کاشان کو جگاتی تھی تو ذیشان کروٹ بدل کر جھنجلا کر کہتا تھا۔

''کیا مشکل ہے صبح، صبح ہی چیخ و پکار شروع کر دیتی ہو......''

''پھر کیا کروں، بچوں کو اسکول نہ بھیجوں......؟'' وہ تنک کر کہتی۔

''اتنی منتوں اور خوشامدوں سے جگاؤ گی تو یہ اسی طرح سوتے رہیں گے۔ ذرا زور سے آواز دو۔''

وہ ہر روز یہی کہتا تھا اور پھر خود ہی کاشان اور بچیوں کو جگاتا۔ ''کاشان، فاطمہ، زہرا...... فوراً اٹھ جاؤ......'' اور باپ کی آواز پر تینوں بچے فوراً اٹھ کر کھڑے ہوتے اور وہ فخریہ کہتا۔

''دیکھا بچوں کو ایسے جگایا جاتا ہے۔'' وہ بچوں کو آواز دیتے ہوئے ذیشان کی جھنجلاہٹ بھری آواز کی منتظر رہی لیکن وہ اس دن بالکل خاموش تھا۔ اس نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ اس کے قریب آئی۔ اس کا بیڈ سے لٹکا ہوا ہاتھ اٹھایا اور پھر بری طرح چیخنے لگی۔ لمحے بھر میں پورا گھر اس کے بیڈ روم میں جمع ہوگیا۔ کامران اور عمران نے اسے گود میں اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور تیزی سے اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ رات ہی تو اماں کے کمرے میں تینوں بھائیوں اور اماں کی بڑی طویل میٹنگ ہوئی تھی۔ دونوں بھائیوں کا یہی کہنا تھا کہ اب چونکہ اخراجات

بڑھتے جارہے ہیں لہٰذا ذیشان کو بھی ان پیسوں میں اضافہ کرنا چاہیے جو وہ ہر ماہ اماں کو دیتا ہے۔ ورنہ وہ کہیں اور شفٹ ہوجائے اور نیچے کا پورشن کرایے پر اٹھادیا جائے۔ جبکہ ذیشان کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ آدھی تنخواہ اماں کو دینے کے بعد وہ جس طرح اپنے بچوں کے اخراجات پورے کرتا تھا۔ وہ وہی جانتا تھا۔ بچوں کی اسکول کی فیس، وین کا خرچہ، یونیفارم، جوتے، کپڑے، اس کی ساری تنخواہ ایسے ختم ہوتی کہ مہینے کے آخر میں بائیک میں پٹرول کے پیسے بھی نہیں بچتے...... پورا، پورا سیزن گزر جاتا اور ہانیہ اپنے لیے ایک جوڑا بھی نہ بنا پاتی جبکہ عنبر اور شازیہ آئے دن برانڈڈ سوٹ خرید کر لاتیں اسی طرح اماں کا کوئی جوڑا چار، پانچ ہزار سے کم کا نہیں ہوتا اور وہ ہر سیزن میں کم از کم چھ سات جوڑے تو ضرور بناتی تھیں۔ یہی حال بچوں کا تھا۔

کامران اور عمران کے بچے بہترین کپڑے پہنتے تھے اور ہانیہ بچوں کے لیے عام دکانوں سے سستے سے کپڑے خرید کر لاتی۔ ان دونوں کے بیڈ روم فریج پھلوں سے بھرے رہتے لیکن گھر کا مین ریفریجریٹر خالی رہتا حالانکہ سب کو پتا تھا کہ ذیشان کے بیڈروم میں ریفریجریٹر نہیں ہے۔ کامران اور عمران اکثر آفس سے واپسی پر پھل لے کر آتے جو عنبر اور شازیہ فوراً اپنے، اپنے کمروں میں لے جاتیں۔ کبھی کبھار ترس کھا کر کچھ پھل ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیے جاتے۔ اس پر بھی کڑی نظر ہوتی کہ کس نے کھائے اور کتنے کھائے۔

یہ تو حقیقت تھی کہ کامران اور عمران کے مقابلے میں ذیشان اماں کو جو پیسے دیتا تھا وہ واقعی آٹے میں نمک کے برابر تھے مگر وہ کیا کرتا۔ اس کی آمدنی ہی اتنی تھی۔ وہ خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سنتا رہا پھر اس نے بڑی آس سے اماں کی طرف دیکھا۔

”کہہ تو یہ دونوں ٹھیک ہی رہے ہیں۔ اب تم خود دیکھو مہنگائی کتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ان کا بھی بال بچوں کا ساتھ ہے۔ میرا خیال ہے یہ مناسب ہوگا کہ نیچے والے حصے کو کرایے پر اٹھا دیا جائے۔“ اماں نے یہ کہہ کر گویا اسے اس گھر سے بے دخل کرنے کا نوٹس دے دیا تھا۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں آگیا۔ ہانیہ اپنے کاموں میں مصروف تھی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ ذیشان کتنا بڑا بوجھ دل پر لے کر ماں کے کمرے سے آیا تھا۔ اماں نے اسے گھر چھوڑنے کے لیے کہا تھا۔ وہ ایسا غیرت مند نکلا کہ اس نے دنیا ہی چھوڑ دی۔

اماں، عنبر، شازیہ، ہانیہ اور بچے ایک خوف اور گومگو کی کیفیت میں گھر میں بیٹھے تھے۔ کسی کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ موت کا فرشتہ اتنی خاموشی اور آسانی سے گھر میں داخل ہوا تھا اور ذیشان جیسے صحت مند انسان کو دبوچ کر جاچکا تھا۔ سب ہاتھ ملتے رہ گئے اور ذیشان ان کے درمیان سے ایسے چلا گیا جیسے کبھی ان کے درمیان تھا ہی نہیں۔

دوپہر تک اس کی ڈیڈ باڈی بھی آگئی۔ شام کو تدفین ہوگئی۔ ایک کہانی ختم ہوگئی، وہ سب ایک شاک کی کیفیت میں تھے۔ اماں کی آنکھوں سے آنسو خشک ہوچکے تھے۔ وہ رونا چاہ رہی تھیں لیکن رو نہیں پارہی تھیں۔ ذہن کے پردے پر بے شمار مناظر گڈمڈ ہوگئے تھے۔

پورا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا لیکن تنہائی سی تنہائی تھی۔ لوگوں کے چہرے ان کی آوازیں سب ایک خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ اور ہانیہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں نہیں ہے۔ کسی اور دنیا میں سفر کررہی ہے۔

☆☆☆

وقت گزرنے لگا کہ اسے گزرنا ہی تھا۔ اسے

کیا غرض کہ کون مرا، کون جیا اور کون جیتے جی مرگیا۔ ذیشان کی زندگی میں تو سسرال میں اس کی کچھ اہمیت بھی تھی لیکن اس کے مرنے کے چند ماہ بعد تو وہ سب کی خدمتوں کے لیے وقف ہو کر رہ گئی۔ عدت تک سب نے اس کی آؤ بھگت کی، اس کے ساتھ آنسو بہائے...... اس پر دل کھول کر ترس کھایا۔ اس کے ساتھ ذیشان کو یاد کیا۔ لیکن عدت کے بعد...... وہی معمولاتِ زندگی شروع ہو گئے اور اب تو کاشان پر اماں کی نظریں کچھ اور کڑی ہو گئی تھیں۔ انہیں ہر وقت اس کی تربیت کی فکر لاحق رہتی۔ ہر آئے گئے کے سامنے وہ یہ جملہ دُہراتیں۔

''مجھے تو اس فکر میں نیند ہی نہیں آئی کہ ذیشان کے بچوں کا کیا ہوگا......؟ باپ سر پر نہ ہو تو لڑکے بہت جلد بگڑ جاتے ہیں۔'' اور یہ جملے سن کر ہانیہ اور زیادہ خوفزدہ ہو جاتی اور سب دیکھ بھی رہے تھے کہ باپ کے مرنے کے بعد کاشان بہت ضدی اور خودسر ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''یہ کیا......؟'' اماں نے حیرانی سے نوٹوں کو گنا......اور عمران کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ تو جانتی ہیں آج کل ملک کے کیا حالات ہیں......؟ کاروبار بالکل ٹھپ ہو گیا ہے۔ ہر طرف سے قرضوں میں جکڑا ہوا ہوں اس دفعہ میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔'' عمران نے پچاس ہزار کی جگہ تیس ہزار اماں کو دیتے ہوئے نظریں چرا کر کہا۔

''اتنا بڑا گھر...... گیس، بجلی، پانی کے بل، مہینے کا راشن، نوکروں کی تنخواہیں...... اتنے کم پیسوں میں کیسے ہوگا؟'' اماں کی پیشانی پر فکروں کی بے شمار لکیریں نمودار ہو گئیں۔

''آپ بھائی جان سے کہیے اس مہینے وہ زیادہ دے دیں۔ میں کوشش کروں گا کہ اگلے مہینے میں زیادہ دے دوں۔'' عمران نے قدرے جھنجلا کر کہا۔

بچوں کے نفسیاتی مسئلے تعریف بہت زود اثر دوا ہے

بچے کے اچھے کاموں پر تعریف کرنا شروع کریں۔ اگر آپ پہلے ہی ایسا کر رہے ہیں تو تعریف کرنے کی مقدار بڑھا دیں۔ یعنی اور زیادہ تعریف شروع کریں تاہم اس سلسلے میں آپ بچے کی تعریف کرنے کے بجائے اس کے اچھے کام کی تعریف کریں تو زیادہ اچھی بات ہے۔ مثلاً آپ نے بچے سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں پڑا تکیہ لا دے اور اس نے ایسا کر دیا ہے تو آپ اس سے یہ نہ کہیں کہ تم بڑے اچھے بچے ہو، بڑے بہادر ہو بلکہ اسے کہیں یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ کہنا فٹافٹ مانتے ہو، بہت بہت شکریہ تکیہ لا کر دینے کا۔'' اسی طرح مہمان آنے پر وہ گلی کی دکان سے بوتلیں لے کر آتا ہے تو اس کا شکریہ ادا کریں اور کہیں آپ بڑوں کا کہنا مانتے ہو، ضرورت میں ان کی مدد کرتے ہو بڑی اچھی بات ہے، شاباش ویل ڈن بھئی ویل ڈن......'' واضح رہے کہ اچھے کاموں پر آپ جتنی زیادہ بچے کی تعریف کریں گے بچے کو اتنی ہی زیادہ توجہ ملے گی چنانچہ وہ غلط کاموں کے ذریعے توجہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

گپ شپ بہت سے نفسیاتی مسائل کا علاج ہے

والدین بچے سے روزانہ علیحدہ علیحدہ کچھ وقت اس کی پسند کے موضوعات پر گپ شپ لگائیں خواہ چند منٹ ہی سہی۔ اس دوران تنقید، مشوروں اور ڈانٹ ڈپٹ سے پرہیز کریں اگر کوئی بات سمجھانی ہی ہو تو بعد میں سمجھائیں۔ اس دوران خود کم سے کم بولیں اور بچے کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دیں۔ کیا، کیوں، کیسے، کہاں، کب والے سوال کریں مثلاً اگر بچے کو کرکٹ کا شوق ہے تو کام سے واپسی پر والد صاحب پوچھ سکتے ہیں۔ ''آج کرکٹ کا کہاں میچ ہو رہا ہے، کیا بنا، کس کس نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا، کون جیتے گا اور کیوں، آئندہ میچ کب متوقع ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

از: نگہت زیدی، بہارہ کہو

”وہ کیسے دے سکتا ہے۔ اس کی تو لگی بندھی تنخواہ ہے۔“

”اور لگی بندھی تنخواہ بھی دو لاکھ ہے......“ عمران نے اس سے پہلے کبھی اس انداز میں بات نہیں کی تھی اس لیے اماں کو بہت دکھ ہوا۔

”ان کے خرچے تو تم جانتے ہی ہو۔ ان کی تو اتنی تنخواہ بھی پوری نہیں پڑتی۔“ اماں نے الجھ کر کہا۔

”سمجھ میں نہیں آتا ان کے پیسے جاتے کہاں ہیں...... ایک ہی بیٹا ہے، میرے تو چار بچے ہیں......“ عمران کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”مجھے کیا پتا...... ؟ انہی باتوں سے تنگ آ کر میں نے سوچا تھا کہ ذیشان کو الگ کر دوں اور نیچے والا حصہ کرایے پر اٹھا دوں...... پر اب کیا کروں...... اب اس کے بیوی بچوں کو تو گھر سے نہیں نکال سکتی۔“ اماں کا دل عمران کی باتوں سے اتنا دکھ رہا تھا کہ ذیشان کا ذکر کرتے ہی ان کی آنکھوں سے بے شمار بہہ نکلے۔

”اللہ تعالیٰ کی مرضی...... کوئی کیا کر سکتا ہے۔“ عمران کا دل اماں کے آنسوؤں سے پانی، پانی ہو گیا...... اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

”ویسے ہانیہ کے والدین تو موجود ہیں...... اگر ہانیہ ...... بچوں کو لے کر ان کے پاس چلی جائے۔“ تھوڑی دیر بعد جب ماحول کی افسردگی کا سایہ خود غرضی کی دھوپ کے سامنے سے ہٹنے لگا تو عمران نے اٹکتے ہوئے یہ تجویز پیش کی جسے زبان پر لانے کے لیے وہ بہت دنوں سے محنت کر رہا تھا۔

”جا تو سکتی ہے اگر جانا چاہے تو......“ اماں بھی شاید یہی سوچ رہی تھیں۔

”آپ ہانیہ سے بات کیجیے......“ عمران کے لہجے میں اماں کو آمادہ دیکھ کر توانائی آ گئی۔

”بات تو کرلوں اور شاید وہ راضی بھی ہو جائے...... لیکن......“ اماں کچھ کہتے، کہتے رک گئیں۔

”لیکن...... کیا......؟“ عمران کے لہجے کی بیتابی پر اماں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں...... ویسے ہی سوچ رہی تھی کہیں...... اللہ کو برا نہ لگے۔“

”اللہ کو کیوں برا لگے گا۔ ہم ان کو گھر سے تو نہیں نکال رہے۔ انہیں تو ان کے والدین کے گھر جانے کے لیے کہہ رہے ہیں اور پھر والدین سے زیادہ ان کا خیال کون رکھ سکتا ہے۔“ عمران نے ان کے دل میں پیدا ہونے والی خوفِ خدا کے چراغ کی مدہم سی لو کو بالکل ہی بجھا دیا۔

”کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو۔“ اماں یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ شاید اب وہ اپنے دل کو سمجھا رہی تھیں۔

☆☆☆

اماں، ہانیہ سے ڈرتی تو نہیں تھیں لیکن اس سے یہ سب کہنے کی انہیں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر انہیں یہ بھی خوف تھا کہ ہانیہ کے جانے کے بعد گھر کے کام کون کرے گا۔ ہانیہ نے ذیشان کے مرنے کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی تھی۔ اس کے باوجود اماں کا زیادہ تر کام وہی کرتی تھی۔ پھر رات کی روٹی اسی کی ذمے داری تھی۔ ہفتے، اتوار کو اس کی چھٹی ہوتی تھی۔ ان دو دنوں میں کھانا پکانا اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ لیکن سارے خاندان میں اماں کی تعریفوں کے گُن گائے جاتے کہ انہوں نے کس طرح بیوہ، بہو اور پوتے پوتیوں کو کلیجے سے لگا کر رکھا ہے۔ کاشان، باپ کے مرنے کے بعد پڑھائی سے بالکل لاتعلق ہو گیا تھا۔ پھر وہ بھی اپنی جاب اور گھر کے کاموں کی وجہ سے اسے توجہ نہیں دے پاتی تھی۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ جب کامران نے اسے محلے کے خراب لڑکوں کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ کامران نے گھر میں آ کر ہنگامہ مچا دیا۔ اماں سے شکایت کی، ہانیہ کو باتیں سنائیں کہ وہ جاب کی وجہ سے بچوں کی تربیت سے بالکل غافل ہو گئی ہے۔

کاشان شام کو گھر آیا اس سے پوچھا گیا اور اس نے انتہائی بے خوفی سے اقرار کرلیا کہ وہ سب اس کے دوست ہیں۔

''تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم ان اوباش لڑکوں میں اٹھتے بیٹھتے ہو اور انہیں اپنا دوست بھی کہتے ہو۔'' کامران غصے سے کانپنے لگے۔

''تم آئندہ ان سے نہیں ملو گے۔'' عمران نے اپنا حکم سنا دیا۔

''وہ میرے دوست ہیں اور وہ خراب لڑکے نہیں ہیں......'' وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔

''بکواس بند کرو......اب آگے ایک جملہ بھی نہ کہنا......'' کامران کا ہاتھ اٹھتے، اٹھتے رہ گیا۔

''کیوں نہ کہوں...... آپ نے فاران بھائی کے دوستوں کو دیکھا ہے، ایک سے بڑھ کر ایک چور ہے۔'' اس کے خون میں ابال آگیا تھا۔

''اماں آپ دیکھ رہی ہیں...... اگر یہ اس گھر میں رہا تو ہم بھی ذیشان کی طرح ایک دن خاموشی سے اس دنیا سے چلے جائیں گے اور آپ روتی رہ جائیں گی۔'' عمران کو موقع مل گیا تھا۔ اس نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔

''یہی انجام ہوتا ہے نیچ خاندان میں شادی کرنے کا......خون اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔'' اماں نے بڑبڑاتے ہوئے یہ جملے کہے تو کاشان پر جیسے جنون طاری ہوگیا۔

''ہم نیچ خاندان کے ہیں، گھٹیا خاندان کے ہیں اور آپ لوگ کیا ہیں......؟ بڑے نیک اور پارسا بنتے ہیں۔ آپ نے سوچا ہے کبھی کہ اس گھر میں ایک بیوہ اور یتیم بچوں کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے؟''

''کیسا سلوک ہو رہا ہے؟ کیا تمہیں کھانے کو نہیں مل رہا...... کیا تم سڑکوں پر جا کر بھیک مانگ رہے ہو؟'' کامران نے اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر اپنے لہجے کو دھیما کرلیا۔

''جس طرح ہمیں کھانا مل رہا ہے اس سے تو بہتر تھا کہ ہم بھیک مانگ کر کھاتے...... بابا کے انتقال کے بعد آپ نے کبھی ہم سے محبت سے بات کی......؟ کبھی ہم سے پوچھا۔ ہمیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں کبھی عید بقرعید پر بھی ہمارے کپڑے بنوائے؟ ہمیشہ سب کے سامنے ہمیں ذلیل کرتے رہتے ہیں۔'' کاشان سچ بول رہا تھا لیکن یہ سچ کسی سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

''ہانیہ......اسے سمجھاؤ اگر اس گھر میں اس پر ظلم ہو رہا ہے تو یہ شوق سے اس گھر سے چلا جائے...... جب ہمارا بھائی نہیں رہا تو ہم کیوں اپنے خون پسینے کی کمائی اس پر خرچ کریں......کیا اسی لیے ہم اسے پال رہے ہیں کہ یہ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم ہی پر الزام تراشی کرے۔'' کاشان کے سچ کی کڑواہٹ نے عمران کی زبان کو نیم کی نبولی بنا دیا۔

''آپ فکر نہ کریں، میں اسے سمجھاؤں گی۔ آئندہ یہ ایسا نہیں کرے گا۔'' ہانیہ نے خوف سے کانپتے ہوئے بڑی مشکل سے یہ جملے ادا کیے اور کاشان کا ہاتھ تھام کر کمرے سے نکل گئی لیکن کمرے سے نکلتے، نکلتے اس کے کانوں میں اماں کے جملے نے دھواں سا بھر دیا۔

''اصل میں ساری ڈھیل ماں کی ہے۔ باپ سر پر نہیں رہا اور ماں نے بے لگام چھوڑ دیا تو اس کا یہی انجام ہوگا ناں......''

☆☆☆

ہمیشہ کی طرح صبح کے وقت وہی شور شرابا اور ہنگامہ تھا۔ جو زندگی کا احساس جگاتا ہے۔ سب ناشتے میں مصروف تھے، حسان بہت خوش تھا۔ کل ہی باپ کے ساتھ جا کر وہ نیا بیگ لے کر آیا تھا کیونکہ پچھلے ہفتے فاران کے ماموں امریکا سے آئے تھے اور اس کے لیے بیگ لائے تھے۔ اس کو دیکھ کر حسان نے

ضد پکڑلی تھی کہ اسے بھی ایسا ہی بیگ چاہیے۔ اب دونوں ایک دوسرے سے اپنے، اپنے بیگ کی خوبیاں بیان کررہے تھے۔ کاشان سر جھکائے ناشتا کررہا تھا اس کا بیگ بھی پرانا ہوچکا تھا۔ ہانیہ نے سوچا تھا کہ اس مہینے وہ اسے نیا بیگ دلادے گی لیکن اس مہینے خاندان میں دو شادیاں آگئی تھیں اور وہ بھی سسرال میں جس کی وجہ سے وہ پیسے جو بیگ کے لیے رکھے تھے خرچ ہوگئے۔ اس نے کاشان کو سمجھا بھی دیا تھا۔ اس نے ضد بھی نہیں کی تھی لیکن اس وقت کاشان کا سر جھکائے ناشتا کرنا اسے سخت تکلیف پہنچارہا تھا۔

''جلدی ناشتا ختم کرو، دیر ہورہی ہے۔'' کامران نے ٹیبل سے اٹھتے ہوئے حکم جاری کیا۔ فاران، باپ کی آواز پر فوراً بیگ اٹھا کر کھڑا ہوگیا لیکن جیسے ہی وہ کاشان کے پاس سے گزرا کاشان نے اپنا پیر آگے کردیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ اسے کوئی خاص چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن گرنے کی شرمندگی ایسی تھی کہ اس نے چیخ، چیخ کر ہنگامہ برپا کردیا۔

کامران کا غصہ ویسے ہی بہت تیز تھا اور پھر یہ تو اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس نے کسی کا لحاظ کیے بغیر ایک تھپڑ کاشان کے گال پر جڑ دیا۔ وہ کچھ نہ بولا بس شعلہ برساتی نظروں سے تایا کو دیکھنے لگا۔ ہانیہ اسی وقت کچن میں گئی تھی۔ اسے بھی کامران، بچوں کے ساتھ اسکول ڈراپ کردیتے تھے۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا..... وہ گھبرائی ہوئی سب کو دیکھنے لگی۔

''اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اسے پاگل خانے جاکر داخل کراؤ.....'' عنبر نے نفرت سے کاشان کی طرف دیکھ کر ہانیہ کو مخاطب کیا..... عنبر ویسے تو زبان کی بہت میٹھی تھی لیکن اگر فاران کو ذرا سی تکلیف پہنچتی تو اس کی کایا پلٹ ہوجاتی اور کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، یہ رات کو بہت دیر تک جاگتا رہا ہے.....'' ہانیہ نے آگے بڑھ کر اس کی طرف سے صفائی پیش کی۔

''اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔ یہ بری صحبت میں پڑگیا ہے، اسے سمجھاؤ کہ اگر اسے اس گھر میں رہنا ہے تو شریفوں کی طرح رہے ورنہ اگر اس کی یہی حرکتیں رہیں تو میں ایک دن اسے کھڑے، کھڑے گھر سے نکال دوں گا۔'' کامران نے وہی پرانا راگ الاپنا شروع کردیا۔

''آپ کون ہوتے ہیں جو مجھے نکالیں، میں خود اس گھر میں رہنا نہیں چاہتا۔ یہ گھر نہیں ہے جیل ہے، آپ انتہائی برے لوگ ہیں.....'' اس نے بھی چلّانا شروع کردیا۔

ہانیہ اسے کھینچتی ہوئی کمرے میں لے گئی وہ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

''بیٹا ایسا نہیں کرتے..... وہ تمہارے تایا ہیں جو کچھ کہتے ہیں تمہارے فائدے کے لیے کہتے ہیں.....'' اس نے بیٹے کو سمجھایا۔

''کیسا فائدہ.....؟ یہ ہمارے فائدے کے لیے نہیں سوچتے، یہ چاہتے ہیں ہم اس گھر سے چلے جائیں..... یہ سب لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں..... یہ بہت برے لوگ ہیں.....'' اس کی زبان شعلے اگل رہی تھی۔

''تمہیں یہ باتیں کس نے سکھائی ہیں، بھائی جان صحیح کہتے ہیں، پتا نہیں تم کن لڑکوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو.....'' اسے کاشان کی باتوں سے خوف آنے لگا تھا۔

''ہاں..... میں برے لڑکوں کے ساتھ رہتا ہوں اس لیے کہ میں بہت برا ہوں..... بہت بدتمیز ہوں، بہت نالائق ہوں..... میرے ٹیچر بھی یہی کہتے ہیں، میں بہت نکما ہوں، میں کچھ نہیں کرسکتا۔'' اس کی آواز غم اور دکھ سے پھٹنے لگی۔ ہانیہ کا دل غم سے

پانی، پانی ہوگیا۔ اسے لگا جیسے ذیشان آج ہی اس دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ اس کی زندگی پر چھائی ہوئی تاریکی کی چادر کچھ اور سیاہ ہوگئی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ سر کو دونوں گھٹنوں پر رکھ کر رونے لگی۔

''امی آپ...... کیوں رو رہی ہیں......؟'' وہ لاکھ خودسر اور بدتمیز سہی لیکن ماں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور گھٹنوں میں منہ چھپائے روتی رہی...... پھر اس دن وہ دونوں اسکول نہیں گئے اور ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے۔

☆☆☆

چند دن بعد ہی میٹرک کا رزلٹ آگیا تھا۔ فاران اور حسان بی گریڈ میں پاس ہوگئے اور وہ تین پیپرز میں فیل ہوگیا۔ اماں کو تو موقع مل گیا۔ وہ کاشان کے پردے میں اسے اور اس کے خاندان کو باتیں سناتی رہیں۔ ہمیشہ کی طرح عنبر اُن کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی اور شازیہ نے خاموشی اختیار کرلی۔ کامران نے دل بھر کر لعن طعن کی...... اور عمران نے بظاہر سمجھاتے ہوئے بے شمار تیر اس پر برسائے۔ وہ سارے گھر والوں کے رویوں سے سر سے پاؤں تک پور، پور زخمی ہوچکی تھی۔

☆☆☆

''امی میں نے اس گھر میں نہیں رہنا......'' وہ رات کے کھانے کے بعد کچن صاف کر کے کمرے میں آئی تو کاشان نے فوراً ہی یہ جملہ داغ دیا۔

''اب کیا ہوگیا ہے......؟'' وہ بھی اب کاشان کی حرکتوں کی وجہ سے سخت ناراض رہنے لگی تھی۔

''میں نے ماموں سے بات کرلی ہے۔ ہم اب نانو کے گھر میں رہیں گے۔'' اس نے کاشان کے اس جملے پر حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ جانتی تھی اس کے بھائی اس علاقے سے دور تین کمروں کے گھر میں رہتے ہیں۔ ان کے اپنے دو بچے ہیں، ماں، باپ ہیں پھر ان کے گھر میں اس کی اور اس کے تین بچوں کی گنجائش نکلنا کیسے ممکن تھا اور پھر یہ بچے اتنے بڑے گھر اور اتنے عیش سے رہنے کے عادی ہوگئے تھے۔ وہ کیسے تنگی کے ساتھ گزارہ کرسکتے تھے۔

''تم شوق سے جا کر رہو...... میں تو یہ گھر چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' سسرال والوں کی تمام تر زیادتیوں کے باوجود وہ اس گھر اور ان گھر والوں کی اتنی عادی ہوگئی تھی کہ اسے انہیں چھوڑنے کے خیال سے ہی وحشت ہو رہی تھی پھر اسے یہ بھی خوف تھا کہ اگر وہ انہیں چھوڑ کر چلی جائے گی تو سب اسی کو الزام دیں گے کہ وہ شوہر کے بعد سسرال میں نہ رہ سکی اور اپنے بچوں کو لے کر الگ ہوگئی۔

''یہ کیسے ممکن ہے، آپ کو میرے ساتھ جانا ہوگا۔'' اس کا لہجہ حد درجہ جارحانہ تھا۔

''اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو بھائی جان بھی تمہیں برداشت نہیں کریں گے۔'' وہ شدید غصے سے بولی۔

''ٹھیک ہے اگر ماموں نے بھی ان لوگوں کی طرح ذلیل کیا تو میں وہاں بھی نہیں رہوں گا۔'' کاشان کے تیور بہت خطرناک تھے اور وہ جو اپنے زمانے کی بہترین مقررہ تھی جس نے ایم ایس سی میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ اپنے بیٹے کے سامنے ایک لفظ بھی نہیں بول سکی۔ کاشان نے ساری پلاننگ کرلی تھی اور اگلے دن جب کاشان نے اماں کو اپنے ارادوں سے آگاہ کیا تو ایک لمحے کو وہ گنگ ہو کر رہ گئیں اور پھر جو بولیں تو ایسا بولیں کہ اس کا دل چاہا کہ وہ اپنے اور اپنے تینوں بچوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگالے۔

''میں تو پہلے ہی جانتی تھی یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ پہلے میرے بچے کو ورغلایا، اب میرے پوتے کو مجھ سے متنفر کردیا۔ اصل میں نالی کا کیڑا نالی میں ہی رہ سکتا ہے۔ اسے صاف شفاف ماحول راس نہیں آتا۔

جھونپڑیوں میں رہنے والے محلوں میں نہیں رہ سکتے۔ جاؤ شوق سے جاؤ شکر ہے خدا کا...... ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی...... بیٹے کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ اور یتیم بچوں کو کلیجے سے لگا کر رکھا کسی چیز میں کمی نہیں ہونے دی۔ اپنے منہ کا نوالہ ان کو کھلایا ان کی ہر خوشی کو اپنی خوشی پر مقدم جانا اور انہوں نے اس کا یہ بدلہ دیا......" اماں کی چیخ پکار سن کر کامران، عمران اپنی بیویوں کے ہمراہ اماں کے کمرے میں آ گئے اور جب انہیں اصل حقیقت کا علم ہوا تو وہ بھی اماں کے ہم نوا ہو گئے۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے اور دل میں غم کا بوجھ اٹھائے سب کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ کوئی تو کاشان کو سمجھائے، کوئی تو کاشان کے سر پر ہاتھ رکھے، کوئی تو کاشان کو ڈانٹ کر کہے کہ وہ ایسا فضول خیال دل سے نکال دے۔ کوئی تو اس سے کہے کہ وہ نہ جائے۔ اس نے حسرت سے سب کی طرف دیکھا...... کامران، عمران، عنبر، شازیہ، سب کی نظروں میں اس کے لیے اجنبیت تھی جیسے وہ کبھی ان کے درمیان رہی ہی نہیں تھی پھر اس کی نظریں اماں کی طرف اٹھیں۔ اماں کی نظروں میں ایسی بے گانگی، ایسی سرد مہری، ایسی خود غرضی، ایسی بے نیازی تھی کہ اسے لگا جیسے کاشان کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ کسی نے ایک بار بھی اسے رکنے کے لیے نہیں کہا۔ جیسے وہ سب یہی چاہ رہے تھے اسے اندازہ ہو گیا کہ کاشان بہت ذہین ہے۔

☆☆☆

فجر کی نماز پڑھ کر اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری ہو گئی۔ انسان بھی کتنا نافہم ہے، ساری دنیا پر بھروسا کرتا ہے اور اس ایک ذات پر بھروسا نہیں کرتا...... جو ہر گھڑی، ہر لحظہ، ہر آن اس کے ساتھ ہے۔ اس کی مددگار ہے۔ وہ جو ڈری، سہمی، دھتکاری ہوئی دل میں ہزاروں اندیشے لیے، اپنے رب سے بدگمان کاشان اور دونوں بیٹیوں کے ساتھ بے سروسامانی کے عالم میں اپنے باپ کے گھر آئی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ شاید اس گھر میں آ کر اسے سسرال سے زیادہ ذلتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شاید دنیا والے طعنے دے کر اسے جینے نہیں دیں گے۔ لیکن اب وہ کتنی عزت کے ساتھ سر اٹھا کر جی رہی تھی۔ سب نے کھلے دل سے اس کا اور اس کے بچوں کا استقبال کیا تھا گھر چھوٹا تھا لیکن دل بڑے تھے۔ امی اور ابا برآمدے میں شفٹ ہو گئے اور اسے اور اس کے بچوں کو اپنا کمرا دے دیا۔ بچے نانی کے گھر آ کر بہت خوش تھے۔ ابا نے کاشان کو خود پڑھانا شروع کیا۔ پرانا علاقہ چھوڑنے کی وجہ سے اس کے پرانے دوست بھی چھوٹ گئے۔ ابا نے کہہ سن کر گھر کے قریب سرکاری اسکول میں اس کا داخلہ کرا دیا اور سال بھر بعد جب اس نے میٹرک کا امتحان دیا تو بہت اچھے گریڈ تو نہیں لیے لیکن مجموعی طور پر سی گریڈ لے کر پاس ہو گیا۔

وہ سسرال میں جتنا کام کرتی تھی اس سے آدھا کام یہاں کرتی پھر بھی امی اور بھابی اسے سراہتی کچھ عرصے بعد اس نے امی کے گھر کے قریب ہی دو کمروں کا گھر کرایے پر لے لیا اور اس میں شفٹ ہو گئی۔

کاشان میں میٹرک کے بعد ایسی حیرت انگیز تبدیلی آئی کہ وہ حیران رہ گئی۔ کالج میں آنے کے بعد اس نے پڑھنے کے ساتھ، ساتھ ایک سرکاری ادارے میں.... نوکری بھی کر لی۔ سرکاری اداروں میں کام کم ہوتا ہے۔ اس لیے نوکری کے ساتھ، ساتھ اس نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور بغیر فیل ہوئے بالآخر بی اے کر لیا۔ اسے بی اے کے دوران ہی ایک بہت اچھی نوکری بھی مل گئی جس سے اس کے تعلیم کے اخراجات بھی پورے ہوتے رہے اور وہ تھوڑے بہت پیسے گھر میں دیتا رہا۔ اب وہ دو کمروں کے گھر کو چھوڑ کر چار سو گز کے گھر میں آ گئے۔ کاشان کی

شخصیت ایسی بدلی کہ وہ اسے دیکھتے گھبرانے لگی کہیں اسے اس کی نظر نہ لگ جائے۔ سسرال سے نکلنے کے بعد کاشان نے کبھی ان لوگوں کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

''بیٹا قطع رحمی بہت بڑا گناہ ہے جو ہُوا اسے بھول جاؤ۔'' وہ اسے سمجھاتی تھی تو اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

''کیا بھول جاؤں......؟ اپنی ذلت بھول جاؤں......؟ ان لوگوں کی زیادتیاں بھول .... جاؤں؟ آپ بھول سکتی ہیں، میں نہیں بھول سکتا......'' بات تو درست تھی ان لوگوں نے بھی کبھی رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی ...... حتیٰ کہ ان کی اولادوں کی شادیاں بھی ہونے لگیں۔

☆☆☆

وہ عالیہ آنٹی سے اماں کا نمبر لے کر آ گئی تھی لیکن اسے انہیں فون کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی وہ تو ہمیشہ ان سے خوفزدہ رہتی تھی اب اتنے سالوں بعد ان سے بات کرنا...... اس کے لیے جوئے شیر نکالنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ کتنی دفعہ اس نے نمبر ملایا۔ بیل بجتی رہی اور بیل کے ساتھ، ساتھ وہ اپنے دل کی دھڑکنیں بھی سنتی رہی...... لیکن جیسے ہی دوسری طرف سے کوئی فون اٹھاتا وہ فوراً فون بند کر دیتی۔ وہ ان سے کیا بات کرے گی...... کیا کہے گی ...... کس طرح اپنا تعارف کرائے گی۔ کس طرح بات کا آغاز کرے گی۔ بار، بار وہ جملوں کو ترتیب دیتی، دل میں دُہراتی پھر خود ہی رد کر دیتی۔ گھر میں دن کے وقت وہ اکیلی ہی ہوتی تھی۔ دونوں بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ وہ اپنی سسرالوں میں بہت خوش تھیں۔ گھر میں صرف کاشان ہوتا تھا وہ صبح کا نکلا رات گئے گھر آتا تھا۔

سارا دن گزر گیا...... وہ بے چین پورے گھر میں جلے پاؤں کی بلی کی طرح پھرتی رہی۔ وہ اماں سے بات کرنے سے پہلے کسی سے بات کرنا نہیں چاہ رہی تھی کہ مبادا کوئی اسے منع کر دے...... وہ پورا دن اسی بے چینی میں گزرا...... دوسرے دن اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آج ضرور ان سے بات کرے گی لیکن معجزہ ہو گیا کہ اس کے فون کرنے سے پہلے اماں کا فون آ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اماں اسے خود فون کریں گی۔

''کون بات کر رہا ہے......؟'' اماں کی آواز اسی طرح رعب دار تھی۔

''جی...... میں...... ہانیہ......'' اسے خود محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی آواز کپکپا رہی ہو۔

''تم کیسی ہو بیٹی......؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''میں ٹھیک ہوں......'' اس نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

''بچے کیسے ہیں؟''

''وہ بھی ٹھیک...... ہیں۔''

''بچوں کو لے کر کب آؤ گی، میں تم لوگوں سے ملنا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے گویا حکم جاری کیا۔

''میں...... جلد ہی...... آؤں گی۔''

''جلدی آ جاؤ...... ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تم آؤ تو میں مٹی میں مل کر مٹی ہو چکی ہوں۔'' اماں کا یہ جملہ سن کر وہ حواس باختہ ہو گئی وہ ایسی باتیں کیسے کر سکتی ہیں...... اس کا دل کانپ کر رہ گیا۔

''ایسی باتیں نہ کریں......''

''اس عمر میں انسان ایسی ہی باتیں کرتا ہے، بس تم جلدی آ جاؤ، میں تم لوگوں کو دیکھنے کے لیے زندہ ہوں۔'' اماں نے یہ جملہ کیا کہا اسے لگا جیسے کسی نے اس کے اندر زندگی کا امرت انڈیل دیا ہو۔

☆☆☆

اماں سے ملنے جانے کے لیے کاشان کو راضی کرنا اتنا مشکل ہوگا...... اس نے سوچا تو تھا لیکن اسے کاشان کے اتنے شدید ردِعمل کا اندازہ نہیں تھا۔

"میں نیچے گاڑی میں بیٹھا رہوں گا...... آپ ان سے مل کر آجایئے گا......" اس کے بہت رونے دھونے اور منتوں سماجتوں کے بعد وہ اس بات پر راضی ہوگیا...... لیکن جب وہ فلیٹ میں جانے کے لیے گاڑی سے نکل رہی تھی اور اتنی گھبرائی ہوئی تھی تو کاشان کو شاید اس پر ترس آگیا یا اس کے دل میں دادی سے ملنے کی خواہش بیدار ہوئی کہ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا آیا۔

پہلی ہی بیل پر شازیہ نے دروازہ کھولا۔ کاشان کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر پیچھے ہوگئی۔ پھر کاشان کے عقب میں اس نے ہانیہ کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ چمک گیا۔

"ہانیہ...... تم......؟" اس نے پُرجوش انداز میں اس کا استقبال کیا۔

ہانیہ، شازیہ سے گلے مل کر آنسو بہانے لگی۔

"مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا کہ تم ہمارے گھر آئی ہو۔" شازیہ میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ پہلی جیسی بے پروا سی شازیہ نہیں رہی تھی بلکہ بہت سمجھدار اور میچور ڈ لگ رہی تھی۔

"میرا تو آپ لوگوں سے ملنے کو بہت دل چاہتا تھا مگر آپ لوگوں نے کبھی خود سے ملنے کی کوشش ہی نہیں کی۔" اس نے بے اختیار شکوہ کردیا۔

"تم تو جانتی ہو، اماں کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت ہی نہیں تھی۔ انہی کا حکم تھا کہ کوئی تم لوگوں سے نہ ملے۔" شازیہ کے اس جملے پر اس نے کاشان کی طرف دیکھا جو صوفے پر بیٹھا اپنے موبائل کی طرف متوجہ تھا لیکن شاید اس نے یہ جملہ سن لیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔

"اماں کہاں ہیں؟" اس نے جلدی سے سوال کیا تاکہ شازیہ مزید کچھ نہ کہہ سکے۔

"اماں اپنے کمرے میں ہیں...... بہت کمزور ہوگئی ہیں، بڑی مشکل سے واش روم تک جاتی ہیں۔" شازیہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"کیا کروگی مل کر پھر وہی پرانے قصے، کہانیاں شروع ہوجائیں گی......" وہ سمجھ گئی شازیہ نہیں چاہ رہی تھی کہ وہ اماں سے ملے۔

"اماں نے مجھے بلوایا ہے، وہ مجھ سے اور بچوں سے ملنا چاہتی ہیں۔ دونوں بچیوں کی شادیاں ہوگئی ہیں، ان کی سسرال کے سو جھمیلے وہ تو نہ آسکیں، میں اور کاشان آگئے۔ انہیں بھی کسی دن لے کر آؤں گی......" اس نے جلدی سے اپنے آنے کی وجہ بیان کردی۔

"اچھا...... تو انہوں نے تمہیں خود بلوایا ہے؟ کمال ہوگیا مجھے خبر ہی نہیں...... تم بیٹھو میں انہیں یہیں لے کر آتی ہوں۔" شازیہ جلدی سے اٹھی۔

"نہیں، میں ان کے کمرے میں ہی ان سے مل لوں گی۔" وہ بھی شازیہ کے پیچھے، پیچھے چل دی اور جب وہ اماں کے کمرے میں پہنچی تو سمجھ گئی کہ شازیہ کیوں نہیں چاہ رہی تھی کہ وہ اماں سے ملے۔

اماں کا کمرا بہت گندا ہو رہا تھا۔ اسے بہت دکھ ہوا۔ اماں کی نفاست پسندی کا پورے خاندان میں شہرہ تھا۔ وہ جب تک ان کے پاس رہی ہر دوسرے دن ان کے بستر کی چادر بدلتی تھی۔ ان کے بیڈ پر ہمیشہ سفید یا ہلکے کلر کی چادریں بچھتی تھیں۔ ان کا کمرا اتنا صاف رہتا تھا کہ ہر چیز آئینے کی طرح جگر، جگر کرتی...... ذرا سی کوئی چیز گندی یا میلی ہوتی تو وہ سخت غصہ ہوتیں۔ انہوں نے کمرے میں سفید جالی کے پردے لگوائے تھے جن پر ہلکے پیازی رنگ کے چھوٹے، چھوٹے پھول بنے تھے۔ کمرے میں ٹائلز بھی پیازی رنگ کے تھے اور درمیان میں بہت خوب صورت سا پرنٹڈ کارپٹ ڈالا تھا۔ سارا فرنیچر سفید رنگ کا تھا۔ وہ کمرے کے لیے بہترین قسم کا... ائرفریشنر منگواتی تھیں۔ اور دن میں کئی، کئی دفعہ اسپرے کرواتی تھیں۔ اسی لیے ہر وقت ان کا کمرا

مہکتا رہتا...... خود بھی بہت قیمتی اور نفیس کپڑے پہنتی اور بہترین طرز کے پرفیوم استعمال کرتیں اور اب ان کے کمرے کا حشر دیکھ کر وہ لرز گئی۔ بیڈ پر ڈارک براؤن کلر کا بیڈ کور تھا۔ سائڈ ٹیبل پر دواؤں کا انبار تھا۔ ہر چیز گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ سوئچ بورڈ میل سے کالے ہو رہے تھے۔ اسے یاد آیا۔ وہ اس سے ہر روز سوئچ بورڈ صاف کرواتی تھیں۔ ان پر ذرا سا میل آجائے تو انہیں سخت الجھن ہوتی تھی۔ اس نے شازیہ کی طرف دیکھا اسے ان باتوں کا احساس ہی نہیں تھا۔ اسے کبھی کام کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ جب ان لوگوں کے ساتھ رہتی تھی۔ تب بھی شازیہ نے اپنے کمرے کی صفائی کے لیے ایک لڑکی رکھی تھی جو سارا دن اس کے کمرے کی چیزیں سمیٹتی رہتی تھی۔ اگر کبھی اس کے پاس ملازمہ نہ ہوتی تو اس کا کمرا گودام بن جاتا تھا۔ وہ اور کاشان اماں کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ وہ واقعی بہت کمزور ہوگئی تھیں۔ انہوں نے کاشان کو گلے سے لگایا اور بہت دیر تک روتی رہیں۔ اس سے بچیوں کے بارے میں پوچھا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بہت دعائیں دیں۔ اس دوران شازیہ نے نمکو اور جوس لا کر ان دونوں کے سامنے رکھ دیے۔

"حسان کیا کر رہا ہے؟" اسے گھر کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس گھر کی معاشی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔

"اسی نے تو اس گھر کی لٹیا ڈبو دی ہے، پتا نہیں کن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ عجیب ہونق سے لڑکوں کو دوست بنا لیا ہے...... سارا دن گانے بجانے میں لگا رہتا ہے۔" رسی جل گئی تھی پر بل نہیں گیا۔ اماں فوراً شروع ہوگئیں۔ شازیہ نے غصے سے اماں کی طرف دیکھا اور پھر بہانہ بنا کر کمرے سے نکلی تو اماں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"یہ سب ماں کا کیا دھرا ہے، تم نے دیکھا تھا۔ سوائے فلمیں دیکھنے کے کوئی کام نہیں تھا اسے۔ اسی کا یہ انجام ہوا...... لڑکیوں کو کوئی کام کاج نہیں سکھایا۔ اسریٰ کی شادی ہوئی، سال بھر بعد لڑ جھگڑ کر گھر آگئی۔ بجائے اس کے کہ ماں، باپ سمجھا، بجھا کر گھر بھیجتے گھر میں بٹھا لیا۔ اس کے میاں نے بھی چند ماہ بعد طلاق بھجوا دی۔ دونوں چھوٹی بھی ماں کے نقشِ قدم پر چل رہی ہیں۔ ہر وقت گانا، بجانا، فیشن اور کوئی کام نہیں ...... میری حالت دیکھو...... کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، دونوں وقت کھانا ایسے دیا جاتا ہے جیسے کوئی نوکر کو کھانا دیتا ہے۔ اللہ رحم کرے اس گھر پر......"

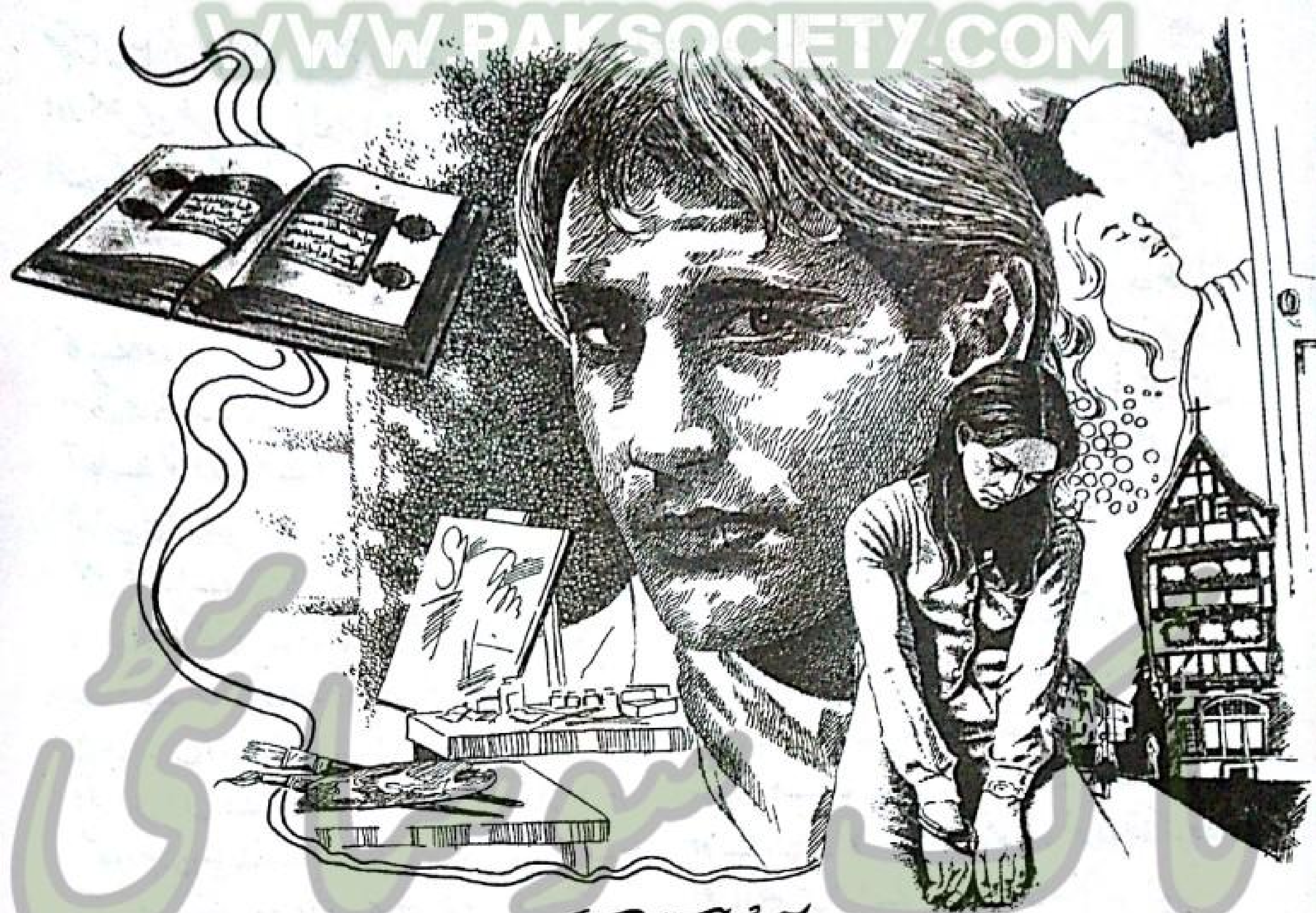
شازیہ جب دوبارہ کمرے میں آئی تو اماں کے دل کا غبار نکل چکا تھا۔ اب وہ ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھیں۔ اتنا بولنے کے بعد وہ خاصی تھک گئی تھیں۔ وہ دونوں جب جانے کے لیے اٹھے تو خدا حافظ کہتے ہوئے ان کی نگاہوں میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ بے اختیار نظریں چرانے پر مجبور ہوگئی۔

فلیٹ سے باہر نکلتے ہی اس نے کاشان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت رقم تھی۔

"ظلم کی حکومت کبھی باقی نہیں رہتی...... چاہے وہ گھر میں ہو یا ملک میں......" اس نے ماں کی طرف دیکھ کر یہ جملہ کہا اور پھر قدرے رکا۔" اور...... ظلم سہنے والا بھی ظالم کا ساتھی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ظلم سہہ کر ظالم کو طاقتور بناتا ہے...... اگر ہم اسی گھر میں رہ رہے ہوتے...... تو......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"واقعی اگر کاشان اس گھر سے نہ نکلتا تو......"

اس کی نظروں میں کاشان کی تصویر پھرنے لگی۔ سر جھکائے سب کی لعن طعن سنتا ہوا...... اور اس کا چہرہ ذلت اور شرم سے عرق آلود ہو رہا تھا۔ اس نے کانپ کر جھرجھری لی اور فخر سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جس نے اسے دنیا میں سر اٹھا کر زندہ رہنے کا ہنر سکھا دیا تھا۔



آخری امید

قیصرہ حیات

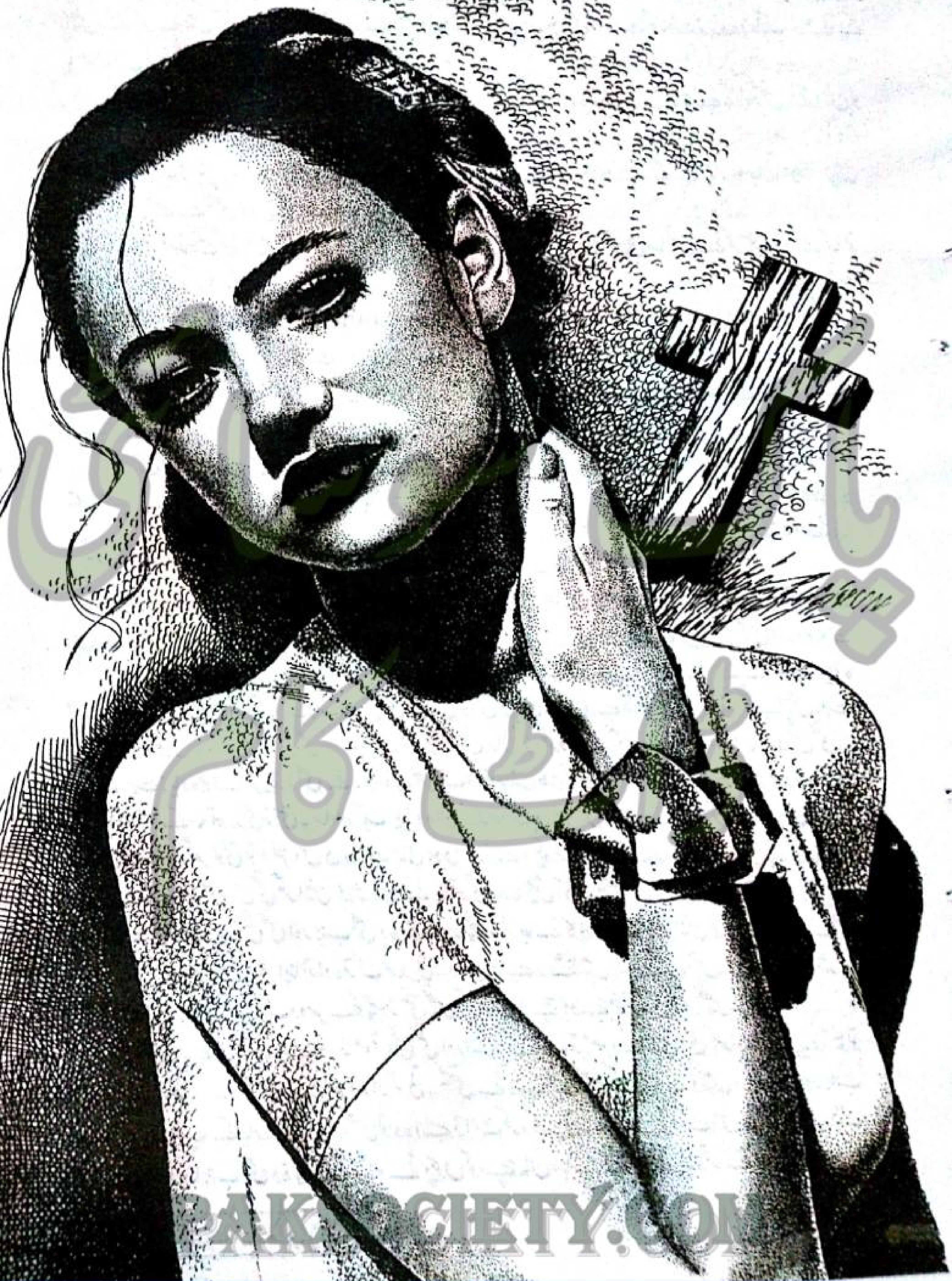
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

ایک ایسی لڑکی کی کہانی... جو حق کی جستجو میں اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے اور اس ابدی، لافانی حقیقت کو پالینے کے اس سفر میں اسے جن مسائل، جن شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہماری مصنفہ نے اپنے ماہرانہ قلم سے اسے بہت خوب صورت اور پُر اثر انداز میں اُجاگر کیا ہے۔

اس کہانی کی اشاعت نوجوان نسل کی اسلام کے بارے میں معلومات مطالعے اور علم کو مزید وسعت دے گی۔

مایہ ناز مصنفہ کے منفرد انداز بیاں کا

ایک اور شاہکار



سنڈے مارننگ تھی، کیتھی صبح صبح تیار ہو کر اور اسکارف سر پر باندھ کر ٹراؤزر کے ساتھ لانگ شرٹ پہن کر ایلن کے کمرے میں آئی جو بیڈ پر قدرے بے ہنگم انداز میں لیٹی سو رہی تھی۔ رات کو بہت زیادہ ڈرنک کرنے کے باعث اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔

''مام، پلیز جلدی اٹھیں' کیا آپ بھول گئیں کہ آج سنڈے ہے اور ہمیں چرچ جانا ہے۔'' کیتھی نے ایلن کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''ڈونٹ ڈسٹرب می، مجھے کہیں نہیں جانا اور تم کیوں ہر سنڈے کو چرچ جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہو؟'' ایلن نے انتہائی غصے سے کیتھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مام، سنڈے کو تو ہمیں گاڈ کی prayer کرنی چاہیے۔'' کیتھی نے گہری سانس لے کر سنجیدگی سے کہا تو ایلن غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"there's no God in church.....understand!" ایلن انتہائی غصے میں آنکھیں نکالتے ہوئے بولی تو کیتھی انتہائی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مام، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آئی تھنک آپ نے پارٹی میں رات کو بہت زیادہ ڈرنک کر لی تھی۔ اسی لیے آپ ایسی باتیں کر رہی ہو۔'' کیتھی نے آہ بھر کر کہا۔

''میں اپنے سینس میں ہوں اور کیا میں آج تک تمہارے ساتھ کبھی چرچ گئی ہوں جو تم مجھے ہر بار کہتی ہو اور میں اب تمہیں بھی اکیلے چرچ جانے کی اجازت نہیں دوں گی۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔ اگر تمہارا prayer کو زیادہ دل کر رہا ہے تو جا کر بائبل پڑھ لو اور میرے پاس دوبارہ مت آنا۔'' ایلن نے اسے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا تو کیتھی نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

غصے سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر بیڈ پر گرتے ہوئے وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ ایلن بچپن سے اس کے ساتھ یہی کرتی آئی تھی۔ وہ جب بھی چرچ جانے کا نام لیتی تو ایلن کبھی کوئی بہانہ بنا دیتی کبھی کوئی اور وہ بہت کم اس کے ساتھ چرچ گئی تھی۔ وہ بھی کبھی کرسمس یا ایسٹر پر...... ورنہ کبھی نہیں' کیتھی کو جیسز کرائسٹ سے بہت زیادہ محبت تھی اور وہ ان کی بھرپور عبادت کرنا چاہتی تھی مگر ایلن کو اس کی ان باتوں سے سخت الجھن ہوتی تھی۔ ایلن بہت کیئر فری اور لبرل لائف گزار رہی تھی گو کہ اس کی عمر پینتالیس سال تھی مگر وہ اب بھی بہت ینگ اور اسمارٹ لگتی تھی۔ اس کے بہت زیادہ بوائے فرینڈز بھی تھے۔ وہ دن بھر ایک اسٹور میں کام کرتی اور شام کو بلکہ رات گئے تک وہ اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ بزی رہتی۔ سارا ویک اینڈ وہ ان کے ساتھ پارٹیز میں گزارتی۔ رات کو بہت دیر سے جب نشے میں دھت وہ گھر لوٹتی تو اکثر اس کی حالت ایسی ہوتی کہ اسے دیکھ کر کیتھی کو بہت رونا آتا۔ وہ کئی بار ماں سے اس بارے میں جھگڑ بھی چکی تھی مگر ایلن ہمیشہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آتی۔ کیتھی کو ماں کی ان حرکتوں کی وجہ سے اس سے سخت نفرت ہونے لگی تھی اور جب بھی وہ کبھی اسے چھوڑ کر جانے کا ارادہ کرتی تو ایلن بری طرح رونے لگتی اور اس کے آنسو دیکھ کر کیتھی پھر اپنا ارادہ ترک کر دیتی۔ دونوں ایسے رشتے میں بندھی تھیں جس میں محبت بھی شدید تھی اور نفرت بھی۔ دونوں نہ ایک دوسرے کو چھوڑ سکتی تھیں مگر ساتھ رہتے ہوئے خوش بھی نہیں تھیں۔

کیتھی بچپن سے ہی بہت چپ اور خاموش طبع تھی اور ایلن بھی زیادہ تر مصروف رہتی کبھی کبھار اس پر پیار آتا تو اسے خوب پیار کرتی ورنہ اکثر ہی اسے نظرانداز کرتی۔ کیتھی نے جب سے آنکھ کھولی باپ کو نہیں دیکھا تھا اور جب بھی وہ ماں سے باپ کے بارے میں پوچھتی تو وہ اسے ڈانٹ کر رکھ دیتی۔ باپ کی کمی سے اس کے اندر ہر وقت ایک اضطراب سا رہتا جب بھی وہ چھوٹے، چھوٹے بچوں کو اپنے ماں، باپ کے ساتھ پیار کرتے دیکھتی تو اس کی

آنکھوں میں آنسو آنے لگتے۔ اس نے ماں سے باپ کے بارے میں پوچھنا ہی چھوڑ دیا تھا لیکن اس کے اندر باپ کی جگہ جیسز کی محبت نے لے لی تھی۔ اس نے اپنے کمرے میں جیسز کے کتنے زیادہ مجسمے رکھے تھے اور وہ اپنی تنہائی میں ان سے باتیں کرتی تھیں۔ ایلن جب اس سے ناراض ہوتی تو وہ اس کی شکایتیں جیسز کو لگاتی اور جب کسی بات پر بہت خوش ہوتی تو سب سے پہلے جیسز کو بتاتی۔ وہ اپنا ہر دکھ سکھ جیسز کے ساتھ شیئر کرتی اور اسے یوں لگتا کہ اس کی زندگی میں جیسز سب سے اہم ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ ان سے انتہائی شدت سے ٹوٹ کر محبت کرنے لگی تھی۔ ان کے لیے prayer کرنا چاہتی تھی مگر ایلین اس پر بہت پابندیاں لگاتی اور اسے اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس کی ماں کرسچین ہونے کے باوجود بھی کرائسٹ سے ویسی محبت کیوں نہیں کرتی جیسی وہ کرتی ہے۔

اس کی عمر تیرہ سال ہوگئی تھی مگر اس کی ماں کے رویے میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ کیتھی جب بھی فارغ ہوتی تو مدر میری اور جیسز کو آپس میں پیار کرتے ہوئے ان کی ڈرائنگ بناتی اور ان سے اپنی محبت کا اظہار کرتی۔ کیتھی کو ڈرائنگ اور اسکیچ بنانے کا بہت شوق تھا۔ اکثر فارغ وقت میں وہ چھوٹی، چھوٹی شارٹ اسٹوریز بھی لکھتی۔ جس میں وہ اپنے اندر کا اضطراب اور ڈپریشن کہانی کی صورت میں بیان کرتی اس کی تحریر میں دکھ کا عنصر بہت نمایاں ہوتا تھا۔ دس سال کی عمر میں اس کی ایک شارٹ اسٹوری بچوں کے ایک میگزین میں شائع ہوئی تو وہ بہت زیادہ خوش تھی اور سارا دن ماں کا انتظار کرتی رہی۔ جب شام کو تھکی ہوئی ایلن گھر لوٹی تو کیتھی بھاگتی ہوئی اس کے پاس آ گئی اور اسے میگزین دکھایا۔ ایلن نے ایک نظر اسے دیکھا اور منہ بنا کر سائڈ پر رکھ دیا اور جمائی لیتے ہوئے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ اس کے بعد کیتھی نے اسے نہ کبھی اپنی کوئی ڈرائنگ دکھائی اور نہ ہی شارٹ اسٹوری پڑھنے کو دی۔ کیتھی کے اندر بے چینی کا خلا روز بروز بہت زیادہ بڑھنے لگا تھا۔

☆☆☆

مقبول انگریزی اخبار کی ایڈیٹر پیرن اپنے آفس میں بیٹھی ایک آرٹیکل پڑھنے میں مصروف تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بار، بار ٹشو سے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ اچانک اس کا کولیگ جم دروازہ کھول کر آفس میں داخل ہوا اور پیرن کو یوں روتے دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گیا۔

''آر یو او کے...... اتنا کیوں رو رہی ہو؟'' جم نے حیرت سے پوچھا جواب میں پیرن نے وہ آرٹیکل اس کی طرف بڑھا دیا۔ جم آرٹیکل ہاتھ میں پکڑ کر بڑبڑانے لگا۔

"to be without a Dad....by Kethy chri...st"

جم کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں اور پڑھتے ہوئے اس کی بھی آنکھیں نم ہونے لگیں اور چہرے پر دکھ کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ آرٹیکل پڑھ کر اس نے پیرن کی طرف بڑھایا۔

"so pathetic & touchy" جم آہ بھر کر بولا۔

''جب سے مجھے یہ آرٹیکل ملا ہے میں اس کو پڑھ، پڑھ کر رو رہی ہوں۔ بچی نے کتنے دکھی انداز میں باپ کا کیریکٹر پورٹرے کیا ہے کہ اسے باپ کا کچھ پتا ہی نہیں اور خود وہ جیسز کرائسٹ کو ہی اپنا باپ سمجھتی ہے اور ان کا نام ہی اپنے نام کے ساتھ لکھتی ہے۔ اس آرٹیکل کو پڑھ کر نہ جانے کیوں مجھے بہت احساس ہونے لگا ہے کہ شاید میرا بیٹا جوائے بھی ایسا ہی فیل کرتا ہوگا۔ اس نے بھی تو کبھی اپنے باپ کو نہیں دیکھا مگر یقیناً اس کے دل میں بھی کچھ ایسی ہی فیلنگز ہوں گی۔'' اچانک پیرن کے منہ سے نکلا تو جم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا جوائے نے تم سے کبھی اپنے باپ کے بارے میں نہیں پوچھا؟'' جم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں، بچپن میں ایک دو بار اس نے پوچھا تو میں نے روتے ہوئے اس کو یہی بتایا کہ اس کے باپ کا مرڈر ہو چکا ہے پھر اس کے بعد اس نے مجھ سے کبھی سوال نہیں کیا۔'' پیرن نے آہ بھر کر بتایا۔

''اور کیا تم اس کے نام کے ساتھ اس کے فادر کا نام نہیں لکھتیں؟'' جم نے پھر پوچھا۔

''نہیں، سرنیم آئی مین میں اپنے فادر کا نام لکھتی ہوں۔'' پیرن نے اسے بتایا۔

''تو کیا اس نے تم سے کبھی اپنے religion کے بارے میں بھی نہیں پوچھا؟'' جم نے سوال کیا۔

''جوائے کو religion میں کوئی انٹرسٹ نہیں، میں نے ایک دو بار اسے اپنے religion کے بارے میں بتانے کی کوشش کی مگر اس نے کوئی زیادہ انٹرسٹ شو نہیں کیا۔ شاید ابھی اس کی عمر ایسی نہیں کہ وہ religion کو سمجھ سکے اسے تو بس آرٹ اور میوزک میں جنون کی حد تک شوق ہے۔ پینٹنگ کرتے ہوئے وہ کھانا، کھانا بھی بھول جاتا ہے اور اکثر ساری، ساری رات پینٹنگ کرنے میں مصروف رہتا ہے تو اس کے لیے religion کیا میٹر کرے گا اور ویسے بھی ہمیں گاڈ کی ضرورت تب محسوس ہوتی ہے جب ہم زیادہ دکھی اور ڈپریسڈ ہوتے ہیں اور جوائے کی ہر ضرورت ٹائم پر پوری ہو جاتی ہے تو شاید اسے گاڈ کی ضرورت ابھی اتنی محسوس نہیں ہوتی۔'' پیرن نے سانس لیتے ہوئے کہا۔

''یس یو آر رائٹ۔'' جم نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''اور یہ لڑکی کیتھی...... کیتھی کرائسٹ اسی لیے خداوند کے بارے میں زیادہ کونشس ہو رہی ہے کیونکہ وہ ڈپریسڈ بھی ہے اور دکھی بھی۔''

''نہ جانے کیوں میرا اس لڑکی سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔'' پیرن نے آہ بھر کر کہا۔

''ہاں تو تم اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔'' جم نے کہا۔

''یہی تو پرابلم ہے کہ اس نے اپنا کوئی ایڈریس اور فون نمبر نہیں لکھا۔'' پیرن نے افسردگی سے کہا تو جم سوچ میں پڑ گیا۔

''تو تم ایسا کرو کہ جب اس کا آرٹیکل شائع کرو گی تو اس کے ساتھ لکھ دینا کہ وہ تم سے کانٹیکٹ کرے۔'' جم نے رائے دی۔

''ہاں...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں جلد ہی اس آرٹیکل کو میگزین میں لگاتی ہوں۔'' پیرن نے اسے فائل میں رکھتے ہوئے کہا اور دونوں باتیں کرنے لگے۔

☆☆☆

کیتھی بہت افسردہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی چھت کو گھور رہی تھی۔ رات بہت گہری ہو چکی تھی اور باہر شدید برف باری اور ٹھنڈ تھی۔ آج ویک اینڈ تھا اور اس کی ماں ابھی تک گھر نہیں لوٹی تھی۔

کیتھی نے آج دن بھر کچھ نہیں کھایا تھا اور اسے بھوک سے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چکر لگانے لگی اور کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں اسے باہر، ہر طرف برف ہی برف دکھائی دی تو اسے عجیب سا خوف آنے لگا۔ وہ جلدی سے پردے کھڑکی کے آگے کر کے قدرے خوف زدہ ہو کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور سائڈ پر رکھے کرائسٹ کے مجسمے کو ہاتھ میں پکڑ کر بری طرح سسکنے لگی۔

''فادر...... آئی ایم آل آلون hungry and scared۔'' وہ مجسمے کو اپنے ساتھ لگا کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''مام بھی ابھی تک نہیں آئی۔ اسے میرا کوئی خیال نہیں اور آپ کو بھی مجھ سے کوئی محبت نہیں۔ میں آپ سے کتنی

محبت کرتی ہوں مگر آپ نے مجھے کبھی ڈیڈ کی طرح پیار نہیں کیا۔ فادر میں اپنی فیلنگز کس کو بتاؤں...... کوئی بھی میری بات سننے والا نہیں۔'' پھر وہ ایک دم قدرے ہائپر ہو کر رونے چلانے لگی اس کی آواز اتنے سناٹے میں ہر طرف زور، زور سے گونجنے لگی اور وہ وہیں روتے چلاتے اور شکوے کرتے ہوئے سو گئی۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ کرائسٹ اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھ رہے ہیں اور اس نے روتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو کرائسٹ نے اس کی آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور محبت سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔

"I am your father and I am always with you" کرائسٹ نے محبت سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تو ایک دم کیتھی کی آنکھ کھل گئی وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کرائسٹ اس کے پاس نہیں تھے مگر اس کے چہرے پر انتہائی خوشی کے تاثرات تھے اور وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی کہ جیسز خود اس کے خواب میں آئے تھے اور اسے یہ یقین دلایا تھا کہ وہی اس کے فادر ہیں۔ اس کا دل انتہائی خوشی سے جھومنے لگا اور اس کا دل چاہا کہ کوئی اس کے پاس ہو تو وہ اسے اپنے اس خواب کے بارے میں بتائے۔ باہر دروازہ زور، زور سے بجنے لگا۔

''شاید مام آ گئی ہے۔'' وہ قدرے بھاگتی ہوئی دروازہ کھولنے گئی۔ ایلن نشے میں دھت اندر داخل ہوئی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لپ اسٹک پھیلی ہوئی تھی اور چہرے پر عجیب وغریب نشانات تھے' وہ لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو کیتھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر انتہائی خوشی سے بتانا چاہا۔

''مام، آج مجھے جیسز کرائسٹ خواب میں ملے ہیں اور......'' ایلن نے بہ مشکل آنکھیں کھولتے ہوئے انتہائی غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

''اوہ...... شٹ اپ۔'' ایلن نے اسے زور سے دھکا دیا تو وہ فرش پر گر گئی۔ ایلن منہ بناتی ہوئی اور جیسز، جیسز بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ کیتھی بری طرح رونے اور سسکنے لگی اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

صبح جب وہ بیدار ہوئی تو ایلن ابھی تک اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ آج پھر سنڈے مارننگ تھی اور کیتھی کا دل پہلے سے بھی زیادہ شدت سے چاہنے لگا کہ وہ چرچ جائے اور جیسز کرائسٹ سے بہت باتیں کرے اور ان کی عبادت کرے لیکن اسے ایلن کے غصے سے خوف آتا تھا۔ جو اسے اکیلے چرچ جانے نہیں دیتی تھی۔ اگر وہ چلی گئی تو ایلن پھر ناراض ہو گی۔

''مام، اگر چرچ نہیں جاتی تو کیا میں بھی نہیں جاؤں گی...... نہیں، مجھے ضرور جانا چاہیے۔'' کیتھی نے سوچا اور اچھا ڈریس پہن کر اور اسکارف سر پر باندھ کر ایلن کے کمرے میں آئی تو وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے ایک ٹک ایلن کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

چرچ میں سروسز کے دوران وہ بہت محو ہو کر آنکھیں بند کیے ہاتھ جوڑے جیسز کرائسٹ کے بہت بڑے مجسمے کے سامنے کھڑی ہو کر فادر کے ساتھ Prayer میں مصروف تھی۔ وہ ایک عجیب سی خوشی اور سرشاری اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔ کرسمس کے بعد وہ اب چرچ میں آئی تھی۔ اس نے اچانک آنکھیں کھول کر مجسمے کی طرف دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے جیسز اسے مسکرا کر دیکھ رہے ہیں۔

''چرچ میں آنا کتنی اچھی بات ہے۔ گاڈ سے تعلق کتنا مضبوط محسوس ہوتا ہے۔ آئی ڈونٹ نو، ماما مجھے یہاں آنے سے کیوں روکتی ہیں اور خود بھی نہیں آتی۔'' سب سے آگے کھڑی وہ سب سے نمایاں لگ رہی تھی۔ بھرا بھرا گول چہرہ، پتلی ناک اور بڑی، بڑی بھوری آنکھیں اس نے اسکارف کو اپنے چہرے کے گرد یوں باندھ رکھا تھا کہ اس میں صرف اس کا گول چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر انتہا کی معصومیت پر آنکھوں میں گہرا دکھ دکھائی دے

رہا تھا۔ سروسز کے بعد جب سب لوگ چلے گئے تو وہ آہ بھر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کا دل چرچ سے جانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک درمیانی عمر کے فادر نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے قریب آ کر حیرت سے پوچھنے لگا۔

''آر یو اوکے...... کیا کوئی پرابلم ہے؟ تم ابھی تک یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' فادر نے پوچھا تو وہ ایک دم ہڑبڑا گئی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی اور گھبرا کر واپس جانے کے لیے مڑی تو فادر نے انتہائی حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اسے پیچھے سے آواز دی۔

''سنو۔'' کیتھی نے مڑ کر فادر کی طرف دیکھا اور ان کے قریب آئی تو وہ اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگے۔

''تم کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو۔ کیا پرابلم ہے، تم مجھے اپنی بات بتا سکتی ہو۔ آئی ایم لائک یور فادر۔'' فادر نے نرمی سے کہا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

''فادر۔'' وہ سسکی بھر کر بڑبڑائی۔

''ہاں...... کہو۔'' فادر نے متجسس ہو کر پوچھا۔ کیتھی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فادر کو کیا کچھ بتائے۔

''فادر میں نے رات کو جیسز کرائسٹ کو اپنے خواب میں دیکھا ہے اور انہوں نے مجھے بہت پیار کیا۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''اوہ...... رئیلی۔ دیٹس ویری گڈ کہ تم نے کرائسٹ کو خواب میں دیکھا ہے۔ یو آر ویری لکی اینڈ وِل بی بلیسڈ۔'' فادر نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھا تو اسی وقت کلاک بجنے لگا تو اس نے گھبرا کر کلاک کی طرف دیکھا اور جلدی سے واپس جانے کے لیے مڑی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

''اوہ، مجھے واپس جانا ہے مام انتظار کر رہی ہوں گی۔'' اور قدرے بھاگتے ہوئے وہاں سے چلی گئی فادر حیرت سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ جب وہ گھر پہنچی تو ایلن لاؤنج میں بیٹھی ناشتا کرنے میں مصروف تھی۔ کیتھی نے گھبرا کر ماں کی طرف دیکھا۔

''کیا تم چرچ گئی تھیں؟'' ایلن اس کے قریب آ کر غصے سے پوچھنے لگی تو کیتھی نے خاموشی سے سر جھکا دیا اور ہونٹ کاٹنے لگی۔

''کیا میں نے تمہیں چرچ اکیلے جانے سے منع نہیں کیا تھا۔ تمہیں میری بات سمجھ کیوں نہیں آتی؟'' ایلن نے غصے سے اس کا بازو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

اس نے نم آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

''بتاؤ، تم مجھے بتائے بغیر کیوں گئی تھیں؟'' ایلن نے پھر غصے سے پوچھا۔

''مام، آپ سو رہی تھیں اور میں چرچ ضرور جانا چاہتی تھی۔'' کیتھی نے آہ بھر کر آہستہ آواز میں کہا۔

''کیوں؟'' ایلن نے خفگی سے پوچھا۔

''جیسز مجھے رات کو خواب میں ملے تھے۔'' کیتھی نے کچھ بتانا چاہا تو ایلن نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا۔

''شٹ اپ، وہاٹ نان سینس۔ تمہیں تو کوئی خبط ہو گیا ہے۔ ہر وقت الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہو۔ جیسز بھلا تمہیں کیوں خواب میں آ کر ملیں گے۔'' ایلن نے غصے سے کہا۔

''مام...... I swear to God۔'' کیتھی نے آہ بھر کر کہا۔

''کیتھی فضول باتیں مت کرو اور آئندہ تم چرچ میری اجازت کے بغیر کبھی نہیں جاؤ گی، سمجھیں تم؟'' ایلن نے آنکھیں نکالتے ہوئے اسے کہا۔

''کیوں مام؟'' کیتھی نے خفگی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں کہہ رہی ہوں اور میں تمہاری مدر ہوں۔ تمہارے لیے کچھ برا نہیں سوچ سکتی۔'' ایلن نے ایک دم آہ بھر کر نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو کیتھی اسے دیکھ کر چونک گئی اور بغیر کچھ کہے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔ ایلن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

سنڈے نائٹ کو پیرن ہمیشہ پُرتکلف کھانا بنایا کرتی تھی۔ تب جم، جوائے اور وہ کھانے کی ٹیبل پر خوب باتیں کرتے اور بہت ہی انجوائے کیا کرتے۔ حسب معمول آج بھی پیرن ٹیبل پر کھانا لگا کر جم اور جوائے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دونوں مارکیٹ کچھ شاپنگ کرنے گئے ہوئے تھے۔ آج سنڈے میگزین میں کیتھی کی اسٹوری شائع ہوئی تھی اس لیے پیرن کو بے شمار ٹیلی فون کالز آرہی تھیں۔ لوگوں نے اس کی اسٹوری کو بہت پسند کیا تھا اور کئی لوگوں نے تو کیتھی کے بارے میں باقاعدہ روتے ہوئے سوال بھی کیے تھے مگر پیرن اس کے بارے میں خود ہی کچھ نہیں جانتی تھی تو انہیں کیا بتاتی۔ پیرن کو انتظار تھا کہ شاید کیتھی بھی اسے کال کرے گی مگر کیتھی نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس نے ایک کال سن کر موبائل آف کیا اور کافی افسردہ موڈ میں صوفے پر بیٹھی تھی کہ جب جم اور جوائے شاپنگ بیگز اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ دونوں نے اس کی طرف چونک کر دیکھا مگر پیرن نے جلدی سے اپنے موڈ کو نارمل کیا کیونکہ وہ جوائے کے سامنے اس آرٹیکل کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ کہیں جوائے اس سے بھی اپنے باپ کے بارے میں سوالات نہ کرنے لگے۔

اس نے جلدی سے شاپنگ بیگز اٹھائے اور کچن میں چلی گئی لیکن جم اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کے اندر کی پریشانی کا اندازہ لگا رہا تھا۔ جوائے اپنا ڈریس اور شوز چینج کرنے اپنے کمرے میں گیا تو جم، پیرن کے پاس کچن میں آگیا اور اس کی اداسی کی وجہ پوچھنے لگا۔

''آج کیتھی کا آرٹیکل شائع ہوا ہے اور لوگوں نے اس کے بارے میں مختلف سوالات کر کے مجھے بہت اپ سیٹ کر دیا ہے۔'' پیرن نے آہ بھر کر کہا۔

''پلیز پیرن...... بی بریو اینڈ اسٹرانگ۔'' جم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ جوائے وسلنگ کرتا ہوا کمرے سے نکل کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا اور انہیں آوازیں دینے لگا۔ پیرن اور جم جلدی سے کچن سے نکل کر اس کے پاس لاؤنج میں چلے گئے اور تینوں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ پیرن بہت چپ، چپ تھی جم چونکہ اس کی خاموشی کی وجہ جانتا تھا اس لیے اس نے کوئی نوٹس نہ لیا اور چپ چاپ کھانا کھانے لگا جبکہ جوائے کھانا کھاتے ہوئے بار، بار ماں کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پیرن خاموشی سے آہستہ، آہستہ کھانا کھا رہی تھی اور اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔

''مام، کیا آپ ٹھیک ہیں؟'' جوائے نے بغور اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا تو پیرن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں...... میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔'' پیرن نے آہستہ سے جواب دیا اور اٹھ کر وہاں سے جانے لگی۔ ''میں اپنے کمرے میں آرام کرنے جا رہی ہوں۔'' پیرن کہہ کر وہاں سے چلی گئی تو جوائے حیرت سے جم کی طرف دیکھنے لگا۔

''مام، کو کیا ہوا ہے؟ وہ کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہیں؟'' جوائے نے پوچھا تو جم نے اس کی طرف بغور دیکھا پر خاموش رہا۔

''جم انکل، کیا کوئی سیریس بات ہے؟ آئی تھنک آپ جانتے ہیں کہ مام کیوں اپ سیٹ ہیں؟'' جوائے نے اس کی طرف دیکھ کر اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

''تھنگ اسپیشل۔'' جم نے آہ بھر کر کہا اور ٹشو پیپر سے اپنا منہ صاف کرنے لگا۔

''مگر مام پہلے تو کبھی اتنی اپ سیٹ نہیں ہوئیں۔ اب کیوں؟ پلیز جو بھی بات ہے مجھے صاف، صاف بتائیں۔ مجھے بہت ٹینشن ہو رہی ہے۔'' جوائے نے جھنجلا کر کہا تو جم نے اِک نظر اس کی طرف دیکھا۔

''اوکے، پر اس ہی جو باتیں میں تم سے کہوں گا وہ تم کسی سے بھی.... ڈسکس نہیں کرو گے۔ اپنی مام سے بھی نہیں۔'' جم نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں اپنا ہاتھ اس.... سامنے پھیلاتے ہوئے کہا تو جوائے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اوکے...... پرامس۔'' جوائے نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری مام تمہارے ڈیڈ کی وجہ سے پریشان ہے۔'' جم نے آہستہ آواز میں کہا۔

''میرے ڈیڈ کی وجہ سے مگر ان کا تو مرڈر ہو چکا ہے۔ وہ اب کیوں پریشان ہیں؟'' جوائے نے حیرت سے پوچھا۔

''اس وجہ سے نہیں بلکہ تمہارے ڈیڈ نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا وہ اس کی وجہ سے آج اپ سیٹ ہے۔ اس کی باتیں آج اسے یاد آرہی ہیں۔'' جم نے معنی خیز انداز میں آنکھیں گھماتے ہوئے کہا تو جوائے نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ک...... کیا...... مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟'' جوائے نے چونک کر پوچھا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ تمہارا باپ کون تھا؟'' جم نے پوچھا۔

''نہیں۔'' جوائے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''he was a muslim اور مسلمز پورے ورلڈ میں اپنے دھوکے، ظلم اور بری باتوں کی وجہ سے بدنام ہیں۔ وہ اس دنیا کے سب سے worst لوگ ہیں جبکہ تمہاری ماں پارسی ہے۔ calm & cool people۔'' جم نے انتہائی نفرت اور مکاری سے نتھنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

''کیا وہ واقعی اتنے برے لوگ ہیں؟'' جوائے نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''یس۔'' اور وہ اپنی ہرزہ سرائی کرنے لگا۔

''اگر وہ اتنے برے ہیں تو مما نے اس سے شادی کیوں کی؟'' جوائے نے حیرت سے پوچھا۔

''دھوکے سے he was a treacherous تمہاری مام بہت سمپل تھی اور تمہارا ڈیڈ بہت ظالم انسان تھا۔ اس نے تمہاری مام کو بہت دھوکے دیے۔ اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا۔ وہ تمہیں بھی اس سے چھیننا چاہتا تھا مگر اس کی ڈیتھ ہو گئی۔ اگر تمہاری مام تمہیں جرمنی لے کر نہ آتی تو نہ جانے تمہارے گرینڈ پیرنٹس تمہارا کیا حال کرتے۔ تھینکس گاڈ یو آر سیوڈ۔'' جم نے نادیدہ اندیشے سے کہا اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تو جوائے کے چہرے پر نفرت اور غصے کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''جوائے، تم شکر کرو کہ تم مسلم نہیں ہو ورنہ یہاں بھی سب لوگ تم سے بہت نفرت کرتے۔ ساری دنیا میں لوگ مسلمز سے بہت نفرت کرتے ہیں۔'' جم نے نفرت بھرے انداز میں کہا تو جوائے کی آنکھوں میں بھی حیرت اور نفرت کے تاثرات دکھائی دینے لگے۔

''مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ مام کو اتنے ظالم انسان کا پہلے کیوں نہ پتا چلا۔ مام نے کیوں شادی کی کیا وہ اس سے محبت کرتی تھیں؟'' جوائے نے غصے سے پوچھا۔

''ہاں...... اور محبت کے نام پر اس نے تمہاری مام کو ایکسپلائٹ کیا۔ بہت بڑا دھوکا دیا' اس کی ساری زندگی برباد کر دی۔'' جم نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اس قدر افسردگی سے کہا کہ جوائے کو غصہ آنے لگا۔

''کاش...... وہ شخص زندہ ہوتا تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے مار دیتا۔'' جوائے نے غصے سے اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر دانت کچکچا کر کہا تو جم کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

''اس سے کیا ہوتا، وہ مر جاتا وہ تو پہلے ہی مر چکا ہے۔ گاڈ نے تمہارا انتقام تو اس سے پہلے ہی لے لیا۔ جو لوگ دوسروں کے ساتھ برا کرتے ہیں گاڈ ان سے ایسے ہی بدلے لیتا ہے۔'' جم نے شدید نفرت سے کہا۔

''گاڈ نے میرا بدلہ لیا ہے؟'' جوائے نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، تمہاری مام معصوم تھی اور تم بھی چھوٹے بچے تھے۔ تمہارے باپ نے تم دونوں کے ساتھ بہت ظلم کیا۔ اس لیے گاڈ نے اس کا مرڈر کرا دیا۔'' جم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو جوائے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا مگر اس کی رگوں میں خون بری طرح کھول رہا تھا۔ اس کے چہرے کی سفید رنگت انتہائی سرخ ہو کر اس کے اندر لگی آگ کا پتا دے رہی تھی۔ جم اس کے اندر کی صورتِ حال کا اچھی طرح اندازہ کر رہا تھا۔

''رات بہت گہری ہو رہی ہے۔ صبح مجھے آفس بھی جانا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ گڈ نائٹ مائی سن۔'' جم نے کھڑے ہو کر اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا اور جوائے کو وہیں پریشان چھوڑ کر چلا گیا۔ جوائے انتہائی پریشان پیرن کے کمرے میں گیا اور دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی مگر اس کے چہرے پر دکھ کے تاثرات نمایاں تھے۔ اسے دیکھ کر جوائے کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور وہ دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں واپس لوٹ آیا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی وہ بیڈ پر لیٹا مگر کروٹیں بدلتا ہوا اٹھ گیا۔ اس کے کانوں میں جم کے الفاظ بار بار گونج رہے تھے۔

"Muslims are killer, brute and terrorist"۔ اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ وہ ایک مسلم کا بیٹا ہے۔ وہ مسلمانوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ کبھی کبھار اسکول میں کسی اسٹوڈنٹ کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ مسلم ہے تو وہ کوئی خاص توجہ نہ دیتا کیونکہ اسے ان سے کوئی سروکار نہیں تھا اور اب یہ جان کر کہ مسلمز بہت ظالم ہوتے ہیں اور اس کا باپ بھی ایسا ہی تھا تو اسے اپنے آپ پر اور پیرن پر غصہ آنے لگا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چکر لگانے لگا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے نیٹ آن کیا تو پیج پر نیوز میں پوری دنیا میں ہونے والے مظاہروں کے بارے میں خبریں تھیں خاص طور پر پاکستان میں جتنا تشدد ہوا تھا اور ہنگاموں میں کتنے لوگ زخمی اور شہید ہوئے تھے ان کے بارے میں خبریں پڑھ کر اس کے چہرے پر حیرت اور غصے کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''اس کا مطلب ہے جم انکل نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک کہا ہے۔ they are violent people۔ میرا بس چلے تو ان سب کو شوٹ کر دوں۔'' جوائے نے غصے سے سوچا اور نیٹ آف کر دیا اور پھر بیڈ پر لیٹ گیا۔

''اب میں سوائے پریشان اور افسردہ ہونے کے اور کیا کر سکتا ہوں۔'' جوائے نے چھت کی طرف گھورتے ہوئے سوچا۔

''کاش...... میں مسلمز کو برباد کرنے کے لیے کچھ کر سکوں تاکہ میں اپنی ماں کا بدلہ ان سے لے سکوں۔'' اس نے انتہائی نفرت سے انتقامی انداز میں سوچا اور آنکھیں بند کر لیں مگر اس کا ذہن پوری طرح متحرک تھا اور پلاننگ کرنے میں مصروف تھا۔

☆☆☆

کیتھی اسکول سے گھر لوٹی تو سارے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئی تو اسے ایلین کے کمرے سے اس کے زور، زور سے کھانسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر حیرت سے اس کے کمرے کی طرف دیکھا اور بیگ وہیں چھوڑ کر جلدی سے اس کے کمرے میں چلی گئی۔ ایلین کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی اور وہ کھانستے ہوئے بیڈ پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

''مام...... مام آپ کو کیا ہوا ہے؟'' کیتھی نے گھبرا کر ماں کو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔
''میری طبیعت آج صبح سے بہت خراب ہے بیٹا۔ معلوم نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے؟'' ایلن نے آنکھیں بند کر کے کراہتے ہوئے کہا تو کیتھی اس کی حالت دیکھ کر رونے لگی۔
''مام، پلیز اسپتال چلتے ہیں۔'' کیتھی نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔
''نہیں...... میں کہیں نہیں جا سکتی۔ کیتھی میری الماری میں ایک ڈائری رکھی ہے اس میں تمہیں، تمہارے سب سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ اب میں زندہ نہیں رہوں گی۔'' ایلن نے اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے انتہائی شدید درد سے کراہتے ہوئے کہا تو کیتھی بری طرح رونے لگی۔
''پلیز مام ایسا مت کہیں...... میں آپ کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی؟ پلیز مام چلیں اسپتال میرے ساتھ۔'' کیتھی بری طرح رو رہی تھی۔
''نہیں، میری بیماری کا علاج کسی اسپتال میں نہیں۔'' پھر ایک دم اس نے ہچکی بھری اور خون کی الٹی کر دی۔ کیتھی ہکا بکا اسے دیکھنے لگی اور الٹی کرتے ہی ایلن کی حالت مزید بگڑنے لگی، بیڈ پر تڑپتے ہوئے اس نے کیتھی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑا اور اسے اپنی آنکھوں کے ساتھ لگا کر روتے ہوئے اسے چومنے لگی۔
''I love you too much مائی ڈیر۔'' ایلن نے انتہائی محبت سے روتے ہوئے کہا اور ایک دم اس کی سانس جیسے رکنے لگی۔ کیتھی گھبرا کر ماں کو دیکھنے لگی اور زور، زور سے اسے ہلاتے ہوئے مام، مام پکارنے لگی مگر ایلن ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔ کیتھی اس کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اس نے تو ماں کے علاوہ دنیا میں کوئی اور رشتہ دیکھا ہی نہیں تھا وہ ماں سے جب بھی جھگڑتی تو پھر خود بخود اس کے ساتھ لپٹ کر اسے منا لیتی۔ وہ کبھی ماں کے ساتھ زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتی تھی اور وہ اپنی اس کمزوری سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے ماں سے بہت محرومیاں بھی ملی تھیں اور وہ تنہائی میں اکثر اس کے ساتھ بہت گلے شکوے بھی کرتی مگر جب بھی وہ سامنے آتی تو اس سے ساری ناراضی بھول جاتی۔ ایلن بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی مگر جوں، جوں وہ بڑی ہو رہی تھی تو ایلن کے اندر بہت تلخی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جب بھی کوئی نیا ڈریس پہن کر آتی اور خوب صورت لگتی تو ایلن اس کی تعریف کرنے کے بجائے اس پر غصہ کرنے لگتی۔ کیتھی کو ماں کے اس رویے کی سمجھ نہیں آتی تھی اور وہ دل ہی دل میں سوچتی کہ شاید اس کی خوب صورتی دیکھ کر اس کی ماں اس سے جیلس ہونے لگتی ہے مگر وہ خود بھی تو بہت خوب صورت تھی تو پھر بھلا وہ اس سے کیوں جیلس ہوتی۔ اکثر اسے اپنی ماں کی باتوں اور رویے کی سمجھ نہیں آتی تھی اور اس کے ذہن میں بہت سارے سوالات اٹھتے تھے جن کو وہ ایلن سے پوچھنے کی کوشش کرتی تو ایلن اسے بری طرح جھڑک دیتی اور پھر کیتھی کبھی اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش نہ کرتی۔ کیتھی بہت اپنے آپ میں مگن رہنے والی بچی تھی۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتی۔ اس نے اپنی دنیا ایسی بنا رکھی تھی جس میں وہ زیادہ تر خوش رہتی تھی اس کی فینٹسی ورلڈ باہر کی دنیا سے میچ نہیں کرتی تھی۔ وہ جو کچھ سوچتی اسے اپنی پینٹنگز اور اسٹوریز کی شکل میں لکھ دیتی۔ وہ بہت نازک اور حساس تھی۔ وہ محبت میں ذرا سی بھی دل آزاری ہونے سے بہت ٹوٹ پھوٹ جاتی تھی۔

☆☆☆

ایلن کی burial (تدفین) کے بعد وہ اس کے کمرے میں الماری کے پاس کھڑی ہو کر اس ڈائری کو تلاش کرنے لگی جس کے بارے میں اس کی ماں نے بتایا تھا بہت تلاش کے بعد اسے کپڑوں کے نیچے ایک ڈبا دکھائی دیا تو اس نے اسے حیرت سے کھولا اس میں ایک ڈائری اور ایک اخبار کی کٹنگ تھی جس میں ایک پادری کی کرسمس کے موقع پر مبہم سی تصویر تھی۔ وہ کٹنگ دیکھ کر حیرت سے چونک گئی اور بار، بار اس تصویر کو دیکھنے لگی اس نے اس پادری کو

پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
''مام نے یہ پکچر کیوں رکھی ہے؟'' اس نے حیرت سے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر ڈائری کھول کر پڑھنے لگی۔ ڈائری میں مختلف ڈیٹس ڈال کر باتیں لکھی گئی تھیں مگر اس نے ڈائری کو سب سے آخر سے پڑھنا شروع کیا۔
''ڈیئر کیتھی!

میرے پاس زندگی کے دن بہت کم رہ گئے ہیں کیونکہ مجھے lungs کینسر ہے اور میں نے تم سے یہ بات چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی کیونکہ میں جانتی تھی کہ جب بھی تمہیں یہ بات پتا چلے گی تو تم رونا شروع کر دو گی اور میں تمہیں کبھی روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں مگر میں نے تمہیں جان بوجھ کر کبھی اپنی شدید محبت کا احساس نہیں دلایا۔ یہ سوچ کر کہ اب ساری زندگی تمہیں میرے بغیر ہی زندہ رہنا ہے۔ میں چاہوں گی کہ تمہاری زندگی میری زندگی سے بہت اچھی گزرے، میں نے جس دلدل میں زندگی گزاری ہے اس نے مجھے کبھی پُرسکون نہیں رہنے دیا اور مجھے اس دلدل میں دھکیلنے والا فادر فریڈرک ہنری ہے، میں اسی لیے تمہیں چرچ جانے سے منع کرتی تھی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہارے ساتھ بھی کوئی ایسا برا حادثہ پیش آئے جو تمہاری زندگی کو برباد کر دے۔ کبھی میں بھی تمہاری طرح بہت religious ہوا کرتی تھی اور جیسز کرائسٹ سے بہت محبت کیا کرتی تھی۔ ہر سنڈے کو چرچ جانا اور گاڈ کی prayer کرنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہیں میری ملاقات جارج سے ہوئی۔ جارج وہاں clergy man تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ میں اتنی خوب صورت تھی کہ جس کی طرف بھی دیکھتی تھی وہ میری محبت میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ وہیں چرچ میں فادر ہنری اور جارج سے میری اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ فادر ہنری سے کبھی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ میں صرف جارج کے پاس بیٹھ کر بائبل سنا کرتی تھی۔ جارج کا بات کرنے کا انداز بہت اچھا تھا۔ خاص طور پر جب وہ سالمز (psalms) پڑھتا تو وہ مجھے بہت اچھا لگتا اس کے پاس بیٹھ کر مجھے عجیب سی روحانی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ فادر ہنری جب بھی گزرتے ہوئے ہم دونوں کو بیٹھے دیکھتے تو ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نمایاں ہونے لگتے وہ مجھے معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے خاموشی سے وہاں سے چلے جاتے۔ میں نے کبھی ان کی ان حرکات کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ میں تو بس جارج کے ساتھ بزی رہتی، اس کی کمپنی سے خوش ہوتی، اس کی باتوں کو انجوائے کرتی، رفتہ رفتہ مجھے اس سے شدید محبت ہونے لگی۔ میں ہر روز چرچ صرف اس سے ملنے جایا کرتی۔ ایک روز جب بہت زیادہ سردی تھی اور باہر برف باری ہو رہی تھی تو میں چرچ چلی گئی۔ جس جگہ مجھے جارج ملا کرتا تھا وہ جگہ خالی تھی۔ میں پریشان ہو کر جارج کو تلاش کرتی ہوئی اِدھر اُدھر گھومنے لگی کہ اچانک فادر ہنری میرے سامنے آ گئے میں ایک دم بری طرح گھبرا گئی اور قدرے ہکلا کر جارج کے بارے میں پوچھا تو فادر نے چونک کر معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا مگر میں کچھ سمجھی نہیں۔
''جارج کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اسے بہت شدید ٹھنڈ لگ گئی ہے اور وہ اپنے روم میں ہے۔'' فادر نے کہا تو میں بری طرح گھبرا گئی اور انتہائی تیزی سے بھاگتی ہوئی چرچ سے ملحقہ اس عمارت میں چلی گئی جہاں فادر ہنری کے علاوہ دوسرے لوگ بھی رہتے تھے۔ مجھے کچھ خاص علم نہیں تھا۔ ساری عمارت سنسان پڑی تھی میں کاریڈور سے ہو کر واپس جانے کے لیے مڑی تو فادر نے اچانک پیچھے سے جھپٹ کر مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور اپنے کمرے میں لے گئے۔ میں رونے اور چلانے لگی اور سامنے پڑے کرائسٹ کے مجسمے کی طرف دیکھ کر فادر کو پیچھے دھکیلتی رہی مگر فادر اس وقت devil بن چکا تھا۔ اس نے میری ایک نہ سنی اور مجھے برباد کر دیا۔ میں بہت بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ جب گھر واپس لوٹی تو مجھے یوں لگا کہ میری دنیا بالکل ختم ہو چکی ہے۔ فادر میرے ساتھ ایسا کریں گے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے بعد پھر میں کبھی فرینکفرٹ چرچ نہیں گئی، میں برلن آ گئی پھر اچانک مجھے پتا چلا

کہ تمہارا وجود میرے اندر پنپ رہا ہے تو میں نے تمہیں ختم کروانے کی اس لیے کوشش نہ کی کہ میری ٹوٹی پھوٹی زندگی میں تم امید کی کرن بن کر آرہی تھیں۔ جو مجھے زندہ رکھے گی لیکن جب میں اپنے آپ کی طرف دیکھتی تو تمہیں فوراً ختم کرانے کا سوچتی...... میں کبھی تمہیں زندہ رکھنا چاہتی اور کبھی مارنا چاہتی اسی کشمکش میں بہت وقت گزر گیا مگر مجھ میں کبھی یہ حوصلہ نہ پیدا ہوسکا کہ تمہیں ختم کروادوں اور پھر جب تم پیدا ہوئیں تو میں تمہیں اسی چرچ کے فادر کے پاس لے گئی۔ فادر جیسز کے مجسمے کے پاس بیٹھے بائبل پڑھ رہے تھے۔ میں نے تمہیں جیسز کے قدموں میں رکھا اور فادر کی طرف دیکھنے لگی۔ فادر نے مجھے اچھی طرح پہچان لیا تھا مگر یوں نظر انداز کیا جیسے وہ مجھے جانتے ہی نہ ہوں۔

''یہ آپ کی بیٹی ہے۔ جسے میں نے جنم دیا ہے اور اس کے باپ آپ ہیں۔'' میں نے فادر سے کہا تو فادر کے چہرے پر ایک دم شدید غصہ آگیا وہ بائبل بند کر کے مجھ پر بری طرح چلانے لگے۔

''شٹ اپ، کیا تم جانتی ہو کہ تم کس پر اتنا بڑا الزام لگا رہی ہو تم ایک (فحش گالی) ہو نہ جانے کس کا گناہ میرے سر تھوپ رہی ہو، تمہیں یہ بات کرتے ہوئے بھی شرم آنی چاہیے۔'' میں غصے سے رونے اور چلانے لگی تو میری آواز سن کر چرچ کے کچھ اور لوگ جن میں جارج بھی تھا وہاں آگئے، میں جارج کو دیکھ کر ایک دم حیران رہ گئی اور روتے ہوئے جارج کو فادر کے بارے میں بتانے لگی۔

''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ جارج جب سے تم اٹلی گئے تھے میں نے اسے کبھی یہاں نہیں دیکھا۔ یہ مجھ پر الزام لگا رہی ہے اور جارج کیا تم مجھے نہیں جانتے میں اس چرچ میں جوان اور بوڑھا ہوا ہوں۔ آج تک مجھ پر کسی نے ایسا الزام نہیں لگایا جو یہ لگا رہی ہے۔'' فادر نے اپنی آنکھوں کو نم کرتے ہوئے کہا تو جارج نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

''ایلین تم اس حد تک بھی گر سکتی ہو مجھے یقین نہیں آرہا۔ تمہیں فادر کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ اٹھاؤ اپنے اس گناہ کو اور لے جاؤ یہاں سے۔'' جارج نے انتہائی غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے مجھے کہا تو میں رونا شروع ہوگئی۔

''جارج...... کیا تمہیں مجھ پر ٹرسٹ نہیں؟'' میں نے اس سے روتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' جارج نے انتہائی رکھائی سے جواب دیا اور وہاں پر موجود لوگوں نے...... تمہیں میری گود میں دے کر مجھے دھکے دے کر چرچ سے باہر نکال دیا۔ میں وہ شہر چھوڑ کر تمہیں لے کر یہاں آگئی اور اسٹور پر کام کرنے کے ساتھ، ساتھ میں نے ایک بے راہ روی کی زندگی گزاری کیونکہ میرا اب زندگی سے اعتبار اٹھ چکا تھا۔ میری زندگی میں نہ مذہب کی کوئی اہمیت رہی نہ جیسز کی اور نہ ہی چرچ کی۔ فادر نے جیسز کے سامنے یہ سب کیا اور وہ خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اس دن میرا ان پر سے ایمان، یقین اور اعتبار اٹھ گیا اور پھر جب میں نے تمہیں ان کے قدموں میں رکھا تو یہی سوچ کر کہ فادر جیسز کے سامنے جھوٹ نہیں بولیں گے اور تمہیں ضرور اپنا لیں گے مگر وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتے چلے گئے مگر تب بھی انہیں جیسز نے کچھ نہ کہا اور میں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار اور مجرم ٹھہرادی گئی۔

کیتھی، جس گاڈ کی تلاش میں تم چرچ میں جاتی ہو وہ وہاں نہیں۔ جو گاڈ اپنے معصوم بندوں کو نہیں بچا سکتا وہ کیسا گاڈ ہے؟ تم اس پر یقین کر سکتی ہو مگر میں کبھی نہیں۔ میری زندگی سے گاڈ کا لفظ مٹ چکا ہے۔ میں نے ایک بہت گندی زندگی گزاری ہے اور یہ گندگی مجھ پر کہاں سے ملی گئی اب تمہیں اچھی طرح سمجھ آچکی ہوگی۔ میں نے اس ڈائری کے ساتھ فادر ہنری کی پکچر رکھی ہے جو کہ میں نے ایک نیوز پیپر سے کاٹی تھی تاکہ جب کبھی تم بہت اصرار کرو تو میں یہ تمہیں دکھا سکوں کہ یہی ہے تمہارا باپ۔ اتنا نیک اور پاک انسان ہے۔ جو دوسروں کو نیکی اور بھلائی کی ہدایت کرتا ہے، وہ خود اخلاقیات کی کس طرح دھجیاں اڑاتا ہے پھر میں دوبارہ کبھی فرینکفرٹ نہیں گئی اور زندگی کے اتنے سال میں نے انتہائی اذیت میں گزارے ہیں۔''

کیتھی ڈائری پڑھ کر بری طرح سسکنے لگی اور اپنے ساتھ ڈائری لگا کر روتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی اور جیسز کرائسٹ کے مجسمے کو دیکھتے ہوئے روتے ہوئے چلّانے لگی۔

''کرائسٹ، آپ نے میری مام کے ساتھ ایسا کیوں ہونے دیا؟ آپ سب کچھ خاموشی سے کیوں دیکھتے رہے پھر آپ میرے خواب میں آکر مجھ سے کیوں پیار کرتے ہیں۔ کیا آپ میری مام کے ساتھ پیار نہیں کرتے تھے؟'' وہ مجسمے کو پکڑ بری طرح جھنجوڑنے لگی اور ایک دم مجسمہ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا، مجسمے کا سر دھڑ سے علیحدہ ہوگیا تو وہ انتہائی حیرت سے مجسمے کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں ایک دم پتھرا سی گئیں۔

''کرائسٹ نے اپنے مجسمے کو بھی ٹوٹنے سے نہیں بچایا تو پھر وہ میری مام کو کیسے ٹوٹنے سے بچاتے۔ جو گاڈ اپنے ٹوٹے ہوئے اور روتے ہوئے انسانوں کی مدد نہیں کر سکتا تو وہ کیسے گاڈ ہو سکتا ہے؟'' اس نے ٹوٹے ہوئے مجسمے کے ٹکڑے اٹھائے اور انہیں ٹیبل پر رکھ کر انتہائی بے یقینی سے دیکھنے لگی اس کے ذہن میں جیسز کرائسٹ کا جو امیج تھا وہ بری طرح گڈمڈ ہونے لگا اور وہ انتہائی پریشان ہو کر فرش پر بیٹھ گئی اسے ایک دم دو دھچکے لگے تھے۔ ایک ماں کی موت اور اس کی اذیت بھری زندگی کا اور دوسرا کرائسٹ کے امیج کا...... اس نے جب سے آنکھ کھولی تھی۔ دونوں کو ہی اپنے انتہائی قریب پایا تھا۔ وہ ماں کو دیکھ کر اس سے محبت کرتی تھی اور کرائسٹ کو دیکھ کر وہ گاڈ سے محبت کرتی تھی اور اب نہ ماں زندہ رہی تھی اور نہ ہی گاڈ کا concept۔ وہ بالکل خالی ہاتھ ہوگئی تھی اور اس کا دل اس قدر لہولہان اور کرچی، کرچی ہو رہا تھا کہ اس کے لیے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ماں کے کمرے میں جاتی تو اس کی چیزوں کو دیکھ کر اور اس کی باتوں کو یاد کر کے شدت سے روتی اور جب اپنے کمرے میں آتی تو کرائسٹ کے ٹوٹے ہوئے مجسمے کو دیکھ کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگتی۔ کئی روز اسی اذیت اور ڈپریشن میں گزر گئے۔ پڑوس میں مسز جیکسن اور ان کی فیملی تھی جو اس کا بہت خیال رکھنے لگے تھے اور اکثر اسے کھانے پینے کی چیزیں بھیج دیتے۔ مسز جیکسن خود اسے اپنے گھر لے جانے کے لیے آئی تھیں اور اسے دو دن اپنے پاس رکھا۔ کیتھی وہاں بہت خاموش اور چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ مسٹر جیکسن کی بک شاپ تھی اور وہ اکثر میگزین اور کتابیں گھر لاتے تھے۔ انہوں نے کچھ میگزین نکال کر کیتھی کے سامنے رکھے کہ وہ اپنے فارغ وقت میں ان کو اسٹڈی کر لے تاکہ اس کا ڈپریشن دور ہو۔ کیتھی کو پہلے ہی لکھنے پڑھنے میں بہت دلچسپی تھی۔ وہ میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی تو ایک میگزین میں اسے اپنا آرٹیکل لکھا ہوا دکھائی دیا تو وہ ایک دم حیران ہوگئی۔ آرٹیکل کے نیچے پیرن نے اسے کانٹیکٹ کرنے کو کہا تھا۔ وہ ایک دم چونک گئی اور جلدی سے مسٹر جیکسن کو بتایا۔ وہ بھی خوش ہو کر اس کا آرٹیکل پڑھنے لگے اور اس کی بہت تعریف کی وہ جس قدر افسردہ اور ٹوٹی ہوئی تھی مسٹر جیکسن کی حوصلہ افزائی اور میگزین میں اپنے آرٹیکل کو دیکھ کر وہ ایک دم خوش ہوگئی۔

''تمہیں فوراً ہی اس ایڈیٹر سے ملنا چاہیے، آئی ایم شیور وہ تمہیں appreciate کرنا چاہتی ہیں بلکہ میں تمہیں خود اس کے آفس لے جاؤں گا۔'' مسٹر جیکسن نے کہا تو وہ ایک انتہائی خوش ہوگئی۔

''ریئلی...... مسٹر جیکسن؟'' کیتھی نے خوش ہو کر کہا۔

''یس مائی ڈیر، اینڈ آئی ایم ناٹ مسٹر جیکسن۔ آئی ایم یور انکل جیکسن۔'' جیکسن نے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھیں ایک دم نم ہونے لگیں۔ اس کی ماں نے بھی اتنا appreciate نہیں کیا تھا جتنا کہ مسٹر جیکسن کر رہے تھے لیکن اب اسے اپنی ماں سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ مسز جیکسن کچن سے اس کے لیے سینڈوچز لے کر آئیں تو جیکسن نے اسے بھی بتایا۔ تو وہ بھی بہت خوش ہوئی اور اسے پیار کرنے لگی۔ کیتھی کو افسوس ہونے لگا کہ وہ اپنی ماں کی زندگی میں بہت کم ان لوگوں سے ملتی تھی کیونکہ اس کی ماں کسی سے بھی اس کا میل جول پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ کتنے اچھے لوگ تھے اور اس مشکل وقت میں اس کا کتنا ساتھ دے رہے تھے۔ اسے یہ جان

کر بہت اطمینان اور خوشی ہونے لگی۔ اگلے روز مسٹر جیکسن اسے پیرن کے آفس لے کر گئے اور اس کا تعارف کروایا تو پیرن اس سے مل کر انتہائی خوش ہوئی، محبت سے اسے چوم کر پیار کرنے لگی اور اسے بغور دیکھ کر پیرن کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''تم بہت کیوٹ ہو اور جانتی ہو تمہارا آرٹیکل to be without a Dad بہت پسند کیا گیا ہے۔ مجھے کتنے لیٹرز، فون کالز اور ای میلز آئی ہیں اور لوگوں نے اسے بہت پسند کیا ہے اور تمہارے ڈیڈ کے بارے میں بہت سوالات پوچھے گئے ہیں۔'' پیرن نے کہا تو کیتھی نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

''تم نے کرائسٹ کو اپنا فادر کہہ کر لوگوں کو بہت ایموشنل کر دیا ہے۔'' پیرن نے کہا۔

"but he is not my father now" اس نے رک، رک کر اپنے الفاظ چباتے ہوئے کہا تو پیرن نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وہاٹ ڈو یو مین؟'' پیرن نے حیرت سے پوچھا۔

''christ cant be a father'' اس نے آہ بھر کر کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

''او کے......take it easy dear تم بہت اچھا لکھتی ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ہمارے میگزین میں باقاعدہ لکھنا شروع کر دو۔ تمہیں اس کی اچھی پیمنٹ بھی ملے گی۔'' پیرن نے مسکرا کر کہا۔

''آئی ڈونٹ نو کہ مجھے ابھی کیا کرنا چاہیے۔ ایکچوئیلی آئی ایم سو اپ سیٹ۔'' کیتھی نے ڈرتے ہوئے کہا تو پیرن نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیوں؟'' پیرن نے پوچھا۔

''مام کی ڈیتھ کے بعد ابھی میں نے لائف کے بارے میں کچھ ڈی سائڈ نہیں کیا۔'' کیتھی نے آہ بھر کر کہا تو پیرن نے چونک کر اسے دیکھا۔

''اوہ نو...... کیا تمہاری مام کی بھی ڈیتھ ہوگئی ہے؟'' پیرن نے افسردگی سے پوچھا۔

''ہاں کچھ روز پہلے...... مام کو لنگز کینسر تھا اینڈ now I am all alone in the world'' کیتھی نے رنجیدہ لہجے میں کہا تو پیرن ایک دم افسردہ ہوگئی اور اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

''ڈونٹ وری، یہی زندگی ہے۔ کبھی ہم تنہا رہ جاتے ہیں اور کبھی دوسرے ہمیں تنہا کر جاتے ہیں۔'' پیرن نے قدرے دکھی لہجے میں کہا تو جیکسن اور کیتھی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اس نے جلدی سے اپنی نم آنکھوں کو ٹشو پیپر سے صاف کیا اور زبردستی مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہمیں زندگی کی طرف پُر امید ہو کر دیکھنا چاہیے۔ کبھی، کبھی زندگی لمحوں میں بدل جاتی ہے اور کبھی، کبھی انسان کو بھی اتنا بدل دیتی ہے کہ وہ خود حیران رہ جاتا ہے۔ اس لیے زندگی میں ان لمحات کو تلاش کرنے کی کوشش کرو جو یا تو تمہیں بدل دیں یا تمہاری زندگی کو۔'' پیرن نے محبت بھرے انداز میں اس سے کہا تو کیتھی کے مایوس اور افسردہ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

''اب بتاؤ تم اپنا نیکسٹ آرٹیکل مجھے کب بھیج رہی ہو اینڈ پلیز بی بریو اینڈ اسٹرانگ۔'' پیرن نے آرٹیکل کی فرمائش کرتے ہوئے اسے تسلی بھی دی۔

''ویری سُون۔'' کیتھی نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ مسٹر جیکسن خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ کیتھی کو موڈ بدل کر مسکراتے دیکھ کر وہ بھی خوش ہوگئے اور پیرن کا شکریہ ادا کرنے لگے۔

☆☆☆

کیتھی کی طبیعت قدرے نارمل ہوئی تو وہ فادر ہنری کی اخبار والی کٹنگ کو نکال کر بغور دیکھنے لگی اور جلدی سے اس کا پنسل اسکیچ بنا ڈالا۔ اسکیچ کو بغور دیکھتے ہوئے اس کے اندر لاوا ابل رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اس شخص تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اس نے اسکیچ بیگ میں رکھا اور جیسز کے مجسمے کو ہاتھ میں پکڑ کر سوچنے لگی۔ مسٹر جیکسن نے نیا مجسمہ اسے لا کر دے دیا تھا۔

''جیسز...... آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں۔ میں یہ آخری بار دیکھنے جا رہی ہوں۔ آپ نے میری مام کے ٹرسٹ اور یقین کو شیک کیا اب میرے ٹرسٹ کی باری ہے۔ اگر آج میرا یقین ٹوٹ گیا تو پھر میں کبھی آپ سے محبت نہیں کروں گی۔'' کیتھی نے مجسمے کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر روتے ہوئے کہا اور کچھ دیر آنکھیں بند کر کے دعا کرتی رہی اور پھر بیگ کندھے پر ڈال کر وہ گھر سے باہر چلی گئی۔ وہ جس مہم پر جا رہی تھی اس کے بارے میں وہ کتنے دنوں سے پلان کرتی رہی تھی۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

وہ سیدھی فرینکفرٹ پہنچی اور مختلف چرچز میں جا کر فادر ہنری کو ڈھونڈتی رہی مگر وہ اسے کہیں بھی نہ ملے۔ اس نے ایک چرچ میں ایک بوڑھے پادری کو فادر ہنری کی پکچر دکھا کر ان کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ دیر سوچ میں پڑ گئے۔

''تم ان سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟'' بوڑھے پادری نے پوچھا تو وہ بوکھلا سی گئی۔

''کیا...... کسی کنفیشن (اعترافِ گناہ) کے لیے؟'' پادری نے خود ہی دوبارہ سوال کیا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔
''فادر ہنری ہیمبرگ کے چرچ میں ہیں اور گناہ گاروں سے کنفیشن لیتے ہیں۔'' بوڑھے پادری نے کہا۔
''پلیز...... آپ مجھے اس چرچ کا نام لکھ دیں۔'' کیتھی نے جلدی سے کہا تو پادری نے اسے ایک پیپر پر نام لکھ دیا۔ وہ بہت شکریہ ادا کر کے باہر نکل آئی۔ وہ بہت خوش تھی کہ اسے فادر ہنری کے بارے میں کچھ سراغ تو ملا۔ اس کی اگلی منزل ہیمبرگ تھی۔

جب وہ چرچ پہنچی تو اسے سامنے ہی فادر ہنری دکھائی دیے۔ چرچ سروسز جاری تھیں۔ لوگ کافی تعداد میں ان کے سامنے بیٹھے بہت توجہ سے بائبل سن رہے تھے۔ وہ راستہ تلاش کرتی ہوئی قدرے آگے چلی گئی۔ اس کی آنکھیں فادر ہنری کے چہرے پر تھیں۔ وہ کافی بوڑھے دکھائی دے رہے تھے مگر چہرے پر کافی سختی کے تاثرات تھے۔ ان کو دیکھتے ہی اسے اپنی ماں کی اذیت ناک حالت یاد آنے لگی۔ جب وہ اکثر نائٹس اسپنڈ کر کے شراب کے نشے میں دھت، لڑکھڑاتی ہوئی گھر پہنچتی اور اسے اس حالت میں دیکھ کر کیتھی کے دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہوتے تھے مگر آج اسے اپنی ماں کے لیے اتنی نفرت محسوس نہیں ہو رہی تھی جتنی کہ فادر ہنری کے لیے محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی ماں بے گناہ تھی اور اس کی زندگی کو اذیت ناک بنانے والا فادر ہنری تھا۔ اس کی ماں نے ایک گندی زندگی گزاری تھی اور اس کی گندی زندگی کا ذمے دار صرف فادر ہنری تھا۔ اس کی آنکھوں میں ان کے لیے انتہائی شدید نفرت پیدا ہونے لگی۔ چرچ سروسز ختم ہوئیں تو صرف وہی لوگ رہ گئے جنہیں کنفیشن باکس میں جا کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا تھا اور فادر ہنری ان کے گناہ سن کر ان کو کنفیشن دے رہے تھے۔ کیتھی ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھی انہیں دیکھتی رہی۔

''جو شخص خود اتنا بڑا گناہ گار ہو وہ کیسے دوسروں کو کنفیشن دے سکتا ہے۔ کیا فادر کو اپنے اس گناہ کا کوئی احساس نہیں جو انہوں نے میری مام کے ساتھ کیا ہے۔'' وہ اپنی ہی سوچوں میں گم انہیں دیکھ، دیکھ کر اپنے آپ سے سوال کرتی رہی اور اسے وقت گزرنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ جب سب لوگ رخصت ہو گئے تو فادر ہنری نے کیتھی کی طرف بغور دیکھا۔

"what do you want?" فادر نے بھویں سکوڑ کر اس سے پوچھا۔
''کنفیشن۔'' اس نے آہ بھر کر کہا اور آہستہ، آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کنفیشن چیئر پر آ کر بیٹھی اور کافی دیر خاموش رہی۔
''بولو تم نے کیا گناہ کیا ہے؟'' فادر نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں پوچھا۔
''میں جیسز کرائسٹ سے بہت محبت کرتی تھی مگر اب میرا یقین ان پر کمزور پڑنے لگا ہے۔'' کیتھی نے آہ بھر کر کہا تو فادر اس کی بات سن کر چونکے۔
''کیا مطلب؟ کیا تم نے ایسا کوئی گناہ کیا ہے جس سے تمہارا یقین کمزور ہونے لگا ہے؟'' فادر نے حیرت سے پوچھا۔
''میں جیسز کو اپنا فادر، اپنا باپ سمجھتی تھی اور ان سے یوں محبت کرتی تھی جیسے کوئی بیٹی اپنے باپ سے کرتی ہے لیکن مجھے اب یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ جیسز میرے باپ نہیں۔'' کیتھی نے نہایت گلوگیر آواز میں کہا۔
''کیوں؟'' فادر نے چونک کر پوچھا۔
''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ ایک فادر کو اپنی بیٹی کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ کیسی محبت کرنی چاہیے؟'' کیتھی نے گہری سانس لے کر پوچھا۔

''آف کورس، ایک باپ کو اپنی بیٹی کی اچھی طرح پرورش کرنی چاہیے۔ اس سے محبت اور اس کی کیئر کرنی چاہیے اور اسے تحفظ دینا چاہیے۔'' فادر ہنری نے اپنی ہی لَے میں بتایا۔

''اور جو فادر اپنی بیٹی کو یہ سب نہ دے سکے تو پھر بیٹی کو کیا کرنا چاہیے؟'' کیتھی نے گہری سانس لے کر پوچھا۔

''تو پھر بیٹی کو اسے چھوڑ دینا چاہیے۔'' فادر نے جلدی سے کہا۔

''اسی لیے میں نے جیمز کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ میری مام کو پروٹیکٹ نہیں کر سکے۔'' کیتھی نے آہ بھر کر ٹھوس لہجے میں کہا۔

''تم کیا کہہ رہی ہو؟ جیمز کیسے حفاظت نہیں کر سکے، کیا تم اپنے حواسوں میں ہو؟'' فادر نے قدرے خفگی سے پوچھا۔

''ہاں...... جیمز میری مام کو آپ سے نہیں بچا سکے۔ پندرہ سال پہلے آپ نے میری مام کے ساتھ کیا، کیا تھا؟ فرینکفرٹ چرچ میں یاد ہے...... جب وہ جارج سے ملنے آئی تھیں تو آپ نے ان کے ساتھ......'' کیتھی پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا بکواس کر رہی ہو، میں کسی کو نہیں جانتا۔'' فادر غصے سے چلّائے۔

''فادر آپ تو لوگوں سے کنفیشن لیتے ہیں آج میں آپ سے کنفیشن (اعترافِ گناہ) لینے آئی ہوں۔ آپ جیمز کی قسم کھا کر کہیں کہ آپ نے میری مام کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا۔'' کیتھی نے قدرے جذباتی انداز میں فادر ہنری کے سامنے کھڑے ہو کر پوچھا تو فادر ہنری نے ایک دم گھبرا کر اسے دیکھا اور اپنی جگہ سے ہٹ کر پیچھے چلے گئے۔

''آپ میرے فادر ہیں اور میں آپ کی بیٹی ہوں۔ یہ دیکھیے میری مام کی پکچر...... ایلن ہکسلے ...... اور یہ کئی سال پرانی پیپر کٹنگ جو میری مام نے مجھے دکھانے کے لیے رکھی تھی اور یہ میری مام کی ڈائری...... جس میں انہوں نے آپ کے بارے میں سب کچھ لکھا ہے......'' کیتھی نے اپنے شولڈر بیگ میں سے ساری چیزیں نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

''سب جھوٹ ہے...... بکواس ہے...... مجھ پر الزام ہے، تمہاری مام ایک بری اور گندی عورت...... جس نے مجھ پر تب بھی کیچڑ اچھالا تھا اور اب پھر تمہیں بھیج دیا ہے۔ نہ جانے تم کس کا گندا خون ہو۔'' فادر نے غصے سے چلّاتے ہوئے کہا۔

''شٹ اپ...... جو میری مام کے بارے میں ایسا کچھ کہا...... ورنہ میں یہ ڈائری نیوز پیپرز میں شائع کروا کے آپ کے تمام اسکینڈلز کو بے نقاب کر دوں گی...... میری مام کو دلدل میں اتارنے والے آپ ہیں اور اگر میرا اور آپ کا ڈی این اے ٹیسٹ ہوا تو پھر ساری دنیا کو پتا چل جائے گا کہ دونوں کا خون کتنا گندا ہے۔'' وہ بھی غصے سے بولی۔

''میں تمہیں برباد کر کے رکھ دوں گا......'' فادر نے غصے سے آنکھیں نکال کر چلّاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے پہلے میری مام کو برباد کیا...... اب مجھے کر دیں گے تو کون سی بڑی بات ہو گی لیکن میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ میں خاموش نہیں رہوں گی...... میں ساری دنیا کو آپ کے بارے میں بتاؤں گی۔'' کیتھی چلّاتے ہوئے بولی۔

''میرا الائرتم پر اتنے کیسز بنائے گا کہ تمہیں پناہ نہیں مل سکے گی...... میں تم سے نہیں ڈرتا...... بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ...... ورنہ...... تمہارا انجام بھی تمہاری ماں کی طرح ہی ہو گا۔'' فادر نے آنکھیں گھماتے ہوئے قدرے مکارانہ انداز میں کہا۔

''تو...... تو کیا...... آپ...... اپنی بیٹی کے ساتھ وہی کچھ کریں گے جو آپ نے میری مام کے ساتھ کیا تھا؟'' کیتھی نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''تم میری بیٹی نہیں ہو...... رہی ڈی این اے ٹیسٹ رپورٹس تو اتھارٹی چاہے تو سب رپورٹس بدلی جا سکتی ہیں۔'' فادر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا اور منہ موڑ کر وہاں سے جانے لگا تو کیتھی نے روتے ہوئے جیسز کے statue کی طرف بے بسی سے دیکھا۔

''جیسز...... آج آپ کو مجھے ضرور پروٹیکٹ کرنا ہے۔ مجھے سپورٹ کرنا ہے۔ اس شخص کے جھوٹ کی سزا اسے ضرور دینی ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ کیا اب پھر آپ اسی طرح خاموش رہیں گے جس طرح مام کے لیے خاموش رہے تھے...... جیسز آج آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' وہ روتی ہوئی کرائسٹ کے مجسمے کو دیکھ کر چلائی تھی۔

''تم کرائسٹ کے نیک لوگوں پر الزام لگاؤ...... تو کیا وہ تمہاری بات سنیں گے۔ کرائسٹ ہمیشہ اپنے اچھے اور نیک لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ تم جیسی (گالی) کی نہیں۔'' فادر نے قدرے طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور چرچ سے باہر چلے گئے۔ کیتھی کرائسٹ کے مجسمے کی طرف دیکھ کر دھاڑیں مار، مار کر رونے لگی۔

''کرائسٹ...... آج سے میرا اور آپ کا relation ship ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے...... آپ نے آج پھر اس شخص کا ساتھ دیا ہے جو جھوٹا ہے۔ گناہ گار ہے اور بدکار ہے...... جس طرح میری مام نے چرچ آنا چھوڑ دیا تھا اور مجھے کہتی تھیں کہ چرچ میں گاڈ نہیں...... میں بھی آج یہی کہتی ہوں کہ اب میں دوبارہ چرچ میں نہیں آؤں گی۔ آج میرا یقین اور بھروسا آپ سے اٹھ گیا ہے۔'' وہ اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتی ہوئی چرچ سے باہر چلی گئی۔ ہیمبرگ سے برلن تک وہ سارا راستہ آنسو بہاتی رہی...... اس کا رو، رو کر برا حشر ہو چکا تھا۔ جب وہ گھر پہنچی تو شدتِ غم سے نڈھال ہو کر لاؤنج میں رکھے صوفے پر گر گئی پھر اسے ہوش نہیں رہا کہ وہ کہاں پڑی تھی اور کتنی دیر پڑی رہی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ مسز جیکسن کے گھر میں تھی اور مسز جیکسن اس کے قریب بیڈ پر بیٹھی پریشان اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مسز جیکسن کی چھوٹی بیٹی للی بھی ان کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر نرمی سے پوچھا۔

''میں...... یہاں......؟'' کیتھی نے ان کی طرف دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

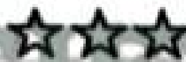
''ہاں...... میں اور جیکسن رات کو تمہیں یہاں لائے تھے۔ میں کل اچانک تمہارے گھر گئی تو تم لاؤنج میں صوفے پر بے ہوش پڑی ہوئی تھیں، ہم دونوں تمہیں یہاں لے آئے...... کیتھی ڈیئر...... تم کیوں اتنی اپ سیٹ رہتی ہو؟'' مسز جیکسن نے محبت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو کیتھی نے نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور بری طرح سسکنے لگی۔

''مسز جیکسن...... آئی ایم شیٹرڈ...... آئی ایم بروکن، آئی ایم ڈائنگ...... dieing'' وہ ہچکیاں بھرتے ہوئے بولی تو للی اسے روتے دیکھ کر رونے لگی...... مسز جیکسن نے پریشان ہو کر محبت سے للی کو بھی اپنے ساتھ لگایا اور کیتھی کو بھی......

"stop crying my child" مسز جیکسن نے کیتھی کو چومتے ہوئے کہا تو کیتھی اس کے گلے لگ کر بری طرح سسکیاں بھرنے لگی۔ اسی لمحے مسٹر جیکسن اندر داخل ہوئے اور کیتھی کو یوں روتے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

''کیا ہوا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کیتھی کو شدید ڈپریشن ہوا ہے......'' مسز جیکسن نے اسے بتایا تو وہ آہ بھر کر اسے دیکھنے لگے اور خاموشی سے وہاں سے چلے گئے۔



پیرن اپنے آفس میں بیٹھی تمام فائلز کو چیک کر کے اور انہیں سمیٹ کر ان کے فولڈرز میں رکھنے لگی کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے چونک کر موبائل کان سے لگایا تو دوسری طرف مسٹر جیکسن اس سے بات کرنے لگے۔

''ہائے مسز ویو جینیا پیرن...... آئی ایم مسٹر جیکسن...... I camewith Kathy if you remember well'' مسٹر جیکسن نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''اوہ آئی سی...... آپ کیسے ہیں......؟'' پیرن نے مسکرا کر پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن کیتھی ٹھیک نہیں......'' اس نے افسردگی سے بتایا۔

''کیا مطلب......؟ کافی روز سے اس کا کوئی فون بھی نہیں آیا اور نہ ہی کوئی آرٹیکل...... میں اس سے کانٹیکٹ کرنے کا سوچ رہی تھی۔'' پیرن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''she is under great stress...... آئی تھنک...... اسے آپ کی سپورٹ کی ضرورت ہے۔'' مسٹر جیکسن نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟ میں سمجھی نہیں......'' پیرن نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ بہت زیادہ ڈسٹربڈ ہے...... شاید اپنی ماں کی ڈیتھ کی وجہ سے وہ بہت تنہا رہ گئی ہے...... اس روز وہ آپ کے آفس آئی تو بہت خوش تھی۔ بہت ریلیکسڈ تھی لیکن اب وہ پھر بہت اپ سیٹ اور ٹینشن میں ہے۔ کیا آپ اسے اس سچویشن سے نکالنے میں مدد کر سکتی ہیں؟ آئی مین...... کیا آپ اسے ملنے...... یہاں میرے گھر آسکتی ہیں؟ اِف یو ڈونٹ مائنڈ......'' مسٹر جیکسن نے جلدی سے کہا تو پیرن سوچ میں پڑ گئی اور ایک پیپر پر ایڈریس لکھنے لگی۔ آفس سے فارغ ہو کر وہ کیتھی سے ملنے چلی گئی۔

کیتھی اب بھی بخار میں مبتلا تھی اور بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ پیرن بو کے ہاتھ میں پکڑے مسٹر جیکسن کے ہمراہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے قریب بیٹھ کر محبت سے اسے پکارنے لگی تو کیتھی نے آنکھیں کھول کر اسے حیرت سے دیکھا۔

''آپ......؟'' اس نے انتہائی حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ہاں...... مسٹر جیکسن نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تو میں نے سوچا تم سے خود جا کر ملتی ہوں...... میں تو تمہارے آرٹیکلز کا ویٹ کر رہی ہوں اور تم بیمار ہو کر بیڈ پر لیٹی ہو۔'' پیرن نے محبت سے اس کے ہاتھ۔ پکڑتے ہوئے کہا تو کیتھی کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ مسٹر جیکسن دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر خاموشی سے باہر چلے گئے۔ پیرن محبت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اسے یوں دیکھتے ہوئے کیتھی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تو پیرن نے محبت سے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

''مائی ڈیئر...... تم کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو......؟ اگر کوئی ایسی بات ہے جو تمہیں ہرٹ کر رہی ہے تو تم مجھ سے ڈسکس کر سکتی ہو...... میں بھی تمہاری مام کی طرح ہوں......'' پیرن نے محبت سے کہا تو کیتھی پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

"Mom is no more" کیتھی نے سسکی بھر کر کہا۔

''اگر تم یونہی...... ناامید ہو کر سوچتی رہو گی تو تم زندگی میں کچھ بھی نہیں کر سکو گی اور زندگی تو ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ پلیز تم اپنے مائنڈ کو چینج کرو...... اور میں تو کہتی ہوں تم کسی آرٹ کالج میں ایڈمیشن لے لو...... تم بہت ٹیلنٹڈ ہو

مجرب عمل

رمضان المبارک آخری طاق راتوں میں کرنے کا عمل......کوئی بھی شدید ترین حاجت ذہن میں رکھیں اور بارہ رات دو رکعت حاجت کے نفل پڑھ کر قرآن پاک میں آنے والے چودہ سجدوں کی آیات کو کھول باری باری پڑھیں اور سجدے کرتی چلی جائیں۔ جب یہ عمل چودہ آیات اور چودہ سجدوں کا مکمل ہو جائے تو کوئی ایک حاجت جو دل و دماغ میں رکھنی ہے۔ پروردگار عالم سے اس کے نبی پاک اور آل مطہر کے توسط سے دعا مانگیں۔ انشاء اللہ ضرور پوری ہوگی۔

سجدوں کی تفصیل

پہلا سجدہ پارہ نمبر 9، دوسرا سجدہ، پارہ نمبر 13، تیسرا سجدہ، پارہ نمبر 14، چوتھا سجدہ، پارہ نمبر 15، پانچواں، چھٹا دو سجدے، پارہ نمبر 17، دو سجدے۔ پارہ نمبر 19، 21، 23، 24، 27، پاروں میں ایک ایک سجدہ اور پارہ نمبر 30 میں دو سجدے۔ اس طرح 14 سجدوں کا عمل مکمل ہو جائے گا۔

طاق راتوں کی تفصیل انیس رمضان سے اکیس، تئیس، پچیس، ستائیس، انتیس۔

از: ایلیا مہدی، کورنگی، کراچی

اور مجھے یقین ہے ایک دن تم بہت بڑی آرٹسٹ بنو گی...... میرا بیٹا جوائے بھی بہت اچھا آرٹسٹ ہے۔ جب تم میرے گھر آؤ گی تو میں تمہیں اس کی پینٹنگز اور اسکیچز دکھاؤں گی۔'' پیرن نے مسکرا کر کہا تو کیتھی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کے گھر...... میں......؟'' کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ اور اس سنڈے کو ہم سب اکھٹے وقت گزاریں گے۔ میں تم، جم اور جوائے......'' پیرن نے مسکرا کر بتایا اور کیتھی اس کی باتیں سن کر خاموش ہوگئی اور ایک دم اس کے چہرے پر سنجیدہ تاثرات چھانے لگے۔

''کیا بات ہے کیتھی تم بات کرتے ہوئے بار، بار کیوں خاموش ہو جاتی ہو؟ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم بہت زیادہ مینٹلی ڈسٹربڈ ہو۔ کیا کسی بات نے تمہیں بہت زیادہ ہرٹ کیا ہے۔ کیتھی پلیز میرے ساتھ شیئر کرو...... ہوسکتا ہے تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور تم کچھ سکون محسوس کرو۔'' پیرن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہمت بندھاتے ہوئے کہا تو کیتھی اس کی طرف یوں بغور دیکھنے لگی جیسے آہستہ، آہستہ اپنی ہمت یکجا کر رہی ہو۔

''انسان جس رشتے کو بچپن سے بہت چاہتا آرہا ہو...... اگر وہ رشتہ اچانک ٹوٹ جائے اس کے کیا احساسات ہو سکتے ہیں...... یقیناً میری طرح بہت ڈس ہارٹ اور مایوس......'' کیتھی نے آہ بھر کر کہا اور پھر خاموش ہوگئی۔

''کیا تم اپنی مام...... کی بات کر رہی ہو......؟ آف کورس تم بہت ہرٹ ہو رہی ہو، مجھے تمہاری فیلنگز کا اندازہ ہے۔'' پیرن نے آہ بھر کر کہا۔

''نہیں...... میں گاڈ کی وجہ سے ڈسٹرب ہوں...... میرا اور ان کا لنک ٹوٹ گیا ہے۔ میں بچپن سے ہی ان سے بہت محبت کرتی آرہی تھی مگر اب وہ ساری فیلنگز اور اٹیچمنٹ ختم ہوگئی ہے۔'' کیتھی نے آہ بھر کر افسردہ لہجے میں کہا۔

''نہیں، نہیں، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ انسان اور گاڈ کا ریلیشن شپ تو بہت اسٹرانگ ہوتا ہے یہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ جب کبھی ہم بہت زیادہ دکھی ہوتے ہیں اور مایوس بھی...... اور ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ گاڈ ہمارے لیے کچھ نہیں کر رہا، مشکل میں وہ ہماری مدد نہیں کر رہا تو ہمارے اندر اس کے لیے نیگیٹو فیلنگز آنے لگتی ہیں اور ہمیں یوں

محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہمارا اور اس کا تعلق بہت کمزور ہو گیا ہے اور شاید ٹوٹ ہی جائے گا...... لیکن پھر آنے والے لمحوں میں وہ ہمیں یوں حوصلہ دیتا ہے کہ ہمارا ٹرسٹ پھر اس پر بڑھنے لگتا ہے۔ گاڈ اور انسان کا تعلق یونہی بنتا اور بگڑتا رہتا ہے یہاں تک کہ زندگی میں وہ وقت آجاتا ہے جب انسان مکمل طور پر گاڈ کے سامنے سرنڈر کر دیتا ہے اور پھر وہ کبھی اس سے ناراض نہیں ہوتا۔ کیتھی تمہارا تعلق ابھی اس کے ساتھ بن رہا ہے۔ اس لیے تم ابھی سے ہی اتنا نیگیٹو ہو کر مت سوچو...... اگر تم گاڈ سے سچی محبت کرتی ہو تو یقیناً گاڈ بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہے۔ اپنے (یقین) faith کو strong رکھو......'' پیرن نے اسے محبت اور نرمی سے سمجھایا تو وہ اس کی باتیں سن کر ایک دم چونکنے لگی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پیرن کی باتیں سن کر اس کا دل سنبھلنے لگا...... اس سے ایسی باتیں کبھی کسی نے نہیں کی تھیں...... اور نہ ہی اس انداز سے گاڈ اور انسان کے ریلیشن شپ کے بارے میں کسی نے اسے بتایا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہونے لگی اور وہ عجب بے بسی کے عالم میں پیرن کو دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے تم میری باتیں سن کر اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟'' پیرن نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں نے گاڈ اور اپنے تعلق کو کبھی ایسے نہیں دیکھا...... لیکن جیسز سے میں نے جو دعا کی...... وہ پوری نہیں ہوئی اور انہوں نے میری مام کی بھی کوئی ہیلپ نہیں کی تو پھر میں جیسز کو اپنا گاڈ کیسے مانوں......؟'' کیتھی نے آہ بھر کر افسردگی سے کہا۔

''میں گاڈ کی بات کر رہی ہوں...... جیسز کی نہیں...... آئی ڈونٹ نو کہ تم لوگوں کا جیسز کے ساتھ کیا ریلیشن ہے اور گاڈ کے ساتھ کیا ہے؟ میں اس گاڈ کی بات کر رہی ہوں۔ جس کو تمام religions کے لوگ خدا مانتے ہیں اور اس کا سب انسانوں کے ساتھ بہت قریبی تعلق ہے۔ جیسز کو آپ لوگ خدا مانتے ہیں پر ہم نہیں...... کیونکہ میں Zoroastrianism ہوں، اسی طرح باقی سب religions کے لوگوں کے لیے جیسز گاڈ نہیں...... تم گاڈ کے بارے میں سوچو جیسز کے بارے میں نہیں...... اور پازیٹو ہو کر سوچو...... اچھا اب میں کافی لیٹ ہو رہی ہوں۔ مجھے گھر جانا چاہیے جوائے میرا ویٹ کر رہا ہوگا...... اپنا خیال رکھنا......'' پیرن نے شولڈر بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا اور محبت سے کیتھی کو چوم کر پیار کرتے ہوئے رخصت ہو گئی۔

پیرن چلی گئی لیکن کیتھی کو بہت الجھن میں ڈال گئی...... وہ تو شروع سے ہی جیسز کو گاڈ سمجھتی آئی تھی...... لیکن پیرن نے تو اسے جس گاڈ کے بارے میں بتایا تھا وہ ان کے لیے جیسز نہیں تھے تو پھر حقیقت میں گاڈ کون ہے......؟ اس کے نازک اور امیچور ذہن نے کبھی ایسی باتوں کو گہرائی میں جا کر نہیں سوچا تھا...... اور وہ تو جیسز کو ہی گاڈ سمجھتی آئی تھی...... اور جیسز کا مجسمہ ٹوٹتے دیکھ کر اس کے اندر جیسز پر یقین متزلزل ہوا تھا لیکن فادر ہنری کو ملنے جانے سے پہلے اس نے پھر جیسز کے مجسمے کے سامنے گڑگڑا کر دعا مانگی تھی۔ اس وقت اس کا دل پھر اندر سے خواہش کرنے لگا تھا کہ گاڈ اس کی مدد کرے...... لیکن وہ مدد جیسز سے مانگتی رہی تھی......

''اس نے گاڈ سے تو کوئی مدد نہیں مانگی تھی پھر اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ جیسز اور گاڈ میں بہت گہرا فرق ہے۔ اس کی پہلی سوچ نے اسے مس گائڈ کیا تھا...... اس کا مطلب تو یہ ہے کہ پھر اسے اپنی سوچ کو درست راستے پر لانے کی ضرورت ہے۔'' اس کے ذہن میں جیسے ہی یہ سوچ پیدا ہوئی اس نے اس کے اندر چھائی مایوسی اور ڈپریشن کو گویا ایک دم ختم کر دیا اور وہ جو اندر ہی اندر خدا سے اپنا رشتہ ٹوٹنے کی وجہ سے ڈسٹربڈ تھی پھر ایک دم پُرامید ہونے لگی...... اور اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے اس کا رشتہ گاڈ سے ٹوٹا نہیں...... وہ اب بھی اس کے اندر موجود ہے۔

جاری ہے



چاند رات اور دروازہ

غزالہ فرخ

آج میرے زین نے پہلا دانت نکالا تھا۔ گلابی ہونٹوں کے درمیان وہ چمکتا ننھا سا دانت...... پہلا بچہ ...... ہر تجربہ پہلا اور ہر حرکت انوکھی لگتی ہے۔ ننھی سی چونچ نکل آئی تھی، آج سے زین کو فیڈ کراتے ہوئے بھی مجھے عجیب سا احساس ہوا...... چند دنوں سے بیمار ہو گیا تھا۔ پیٹ بھی خراب تھا اور دودھ بھی الٹ دیتا۔ میرا دل دھک سے ہو جاتا تو اماں کہتیں۔

''کیا نئے دیکھے ہیں بچے ہم نے؟ ایسے ہی پلتے ہیں بچے...... ذرا سا منہ نکال لیتی ہو تم جو ذرا زین بیمار ہو جائے۔''

''مگر اماں ابھی دودھ پلایا اور ابھی کچا ہی نکال دیا۔'' میں رو دینے کو ہو جاتی۔

''تو کیا ہوا...... دانتوں کی تھڑی رکھیں تو یونہی ہوتا ہے ناں......'' اس وقت تو مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی مگر آج...... میں ابھی تک کمرے میں جاگ رہی تھی۔ فیضان دکان سے آ گئے تھے۔ آج آنے میں ذرا دیر ہو گئی تھی۔ بھوک خوب جاگ گئی تھی۔ اندر گھسے تو ان کی حالت دیکھ کر روٹی توے پر ڈالنے بھاگی...... اماں اپنے کمرے میں جا چکی تھیں فیضی کو آنے میں دیر ہو تو میں انہیں جلد کھانا دے دیتی تو وہ لیٹنے چلی جاتیں۔ کھانے کے دوران ہی ان کا موبائل بول اٹھا۔ وہ کھانا کھا کر سگریٹ پینے کو باہر برآمدے میں چل دیے۔ فیضی گھر میں سگریٹ نہ پیتے...... اماں کا احترام تھا اب اماں سامنے نہ بھی ہوتیں تو بھی عادت سی پڑ گئی تھی۔ کھانا کھاتے ہی برآمدے میں چل دیتے۔

میں نے برتن سمیٹتے سوچا کہ فیضی کو چائے، کافی کا پوچھوں مگر زین رو پڑا...... خوب گرم کر کے بستر میں گھسایا تھا جانے ڈر گیا...... میں لپک کر کمرے میں آ گئی...... ماں کی قربت کی گرمی پائی پھر سے سو گیا...... میں فارغ ہو گئی تھی اب فیضی کا انتظار کرنے لگی۔ ابھی تک میں انہیں بتا نہیں پائی تھی کہ ہمارے ننھے نے ایک منا سا دانت نکال لیا ہے...... اب تو ہلکی سی اونگھ آنے لگی تھی۔ میں فیضی کے کمرے کے اندر آنے سے پہلے سونا نہیں چاہتی تھی۔ پہلو بدلے...... پھر اٹھ کر کمرے میں چکر بھی لگائے۔ اماں تو کافی دیر پہلے سے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ وہ تو شاید سو گئی ہوں گی۔ میں اٹھ کر باہر آ گئی۔ اماں کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور کمرے کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ میں واپس آ گئی۔

فیضی لوٹ آئے تھے مگر میں اب خاموش بستر میں دبک گئی تھی۔

''اماں کو دیکھا تم نے؟''

''جی......؟'' مجھے سمجھ نہیں آئی وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

''اماں کے پاؤں میں سوجن ہے......''

''اچھا......! اصل میں اماں آج کل ہر وقت موزے پہنے رکھتی ہیں ناں......''

''اماں کے رنگ میں بھی پیلاہٹ ہے، تم ان کا خیال رکھ رہی ہو ناں......؟''

''جی......!'' اب وہ لباس تبدیل کر کے بیڈ پر آ گئے تھے۔ سرسری سی نظر سوئے ہوئے زین پر ڈالی۔

''سو گیا زینی......''

''جی، آپ آج لیٹ ہو گئے تھے ناں......''

''ہاں' میں نے سوچا کہ اماں بھی سو گئی ہوں گی مگر اندر آنے لگا تو اماں کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ جانتی ہو ناں اماں سونے سے پہلے دروازہ ضرور بند کرتی ہیں...... ایک گھنٹا ہیٹر آن رکھا کہ کمرا گرم ہو جائے اور اب بند کر کے آیا ہوں اور......'' میں نے پہلو بدلا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

اگلے ہی روز ناشتا کرتے ہوئے زین کو گود میں اٹھایا تو اچانک سے ہی فیضی کی نظر پڑی۔

''ارے ہمارا منا تو جوان ہو گیا دانت نکال لیا اس نے۔'' یک دم مڑے......''تم نے تو مجھے بتایا ہی نہیں زارا۔''

میں کیا جواب دیتی ویسے فیضی نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے لاڈلے سے باتیں کر رہے تھے۔

''واہ جی واہ! اب تو ہمارا زین بوٹیاں کھائے گا، روٹی کھائے گا......اور اب مرغے کی ٹانگ تو میرے

بیٹے کے لیے رکھنا۔'' وہ لاڈ کر رہے تھے، میرا دل نہال ہوا۔

شادی شدہ زندگی ایسی ہی ہوتی ہے ناں، کبھی دل میں بدگمانی کے خیالات سر اٹھاتے ہیں اور کبھی معمولی سی بات من میں سکون کے موتی کھلا دیتی ہے۔ میری سسرال تو ویسے بھی بڑی محدود سی تھی۔ فیضی کی ایک بہن اور تھیں مگر لندن میں...... برسوں میں ملنے آتی تھیں، میری شادی کو دو برس ہو گئے تھے مگر میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں۔ شادی پر وہ آنہ پائی تھیں، فیضی ان کا لاڈلا چھوٹا بھائی تھا۔ کسی آتے جاتے کے ہاتھوں تحائف وغیرہ بھیجتیں۔ میرا زین پیدا ہوا تو تب بھی اس کے لیے پیارے، پیارے کپڑے اور کھلونوں کا انبار بھیج ڈالا۔

گھر کی کوئی خاص ذمے داری نہیں تھی، اماں کی اکیلی جان تھی، تنگ کرنے والی نہیں تھیں بلکہ ہر موقع پر میرا بڑا ساتھ دیتیں۔ زبان کی ذرا سخت تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ہی احساس ہو جاتا کہ ان کی بات درست تھی۔ بس دل میں ہلکی سی گرہ یہ بندھ جاتی کہ فیضی کے حواس پر اماں بری طرح مسلط رہتی تھیں۔ وہ اماں کی نظر سے ہی دیکھتے اور سوچتے تھے۔ مجھے ان کے پیار میں کوئی کمی نہیں لگتی مگر ہم یعنی میں اور میرا زین ہم دونوں کی جگہ اماں کے بہت بعد آتی تھی۔ میں دن بھر چپکے، چپکے ان کا انتظار کرتی، ایک بیوی اپنے شوہر سے محبت کا اظہار کچن میں دلجمعی سے کھانے بنا کر کرتی ہے مگر فیضی ہر کھانے کو صرف اماں کی نظر سے دیکھتے۔

''دیکھو بینا...... یہ کھانا اسپائسی ہے اماں کو مرچ بند ہے بھئی۔''

''جی میں جانتی ہوں فیضی مگر آپ......''

''مجھے چھوڑو اماں کو دیکھا کرو بھئی......''

''میں تو کہتی ہوں فیضی کہ اماں کے لیے الگ سے کھانا بنالیں تو......''

''نہیں...... نہیں اماں کے لیے الگ پرہیزی کھانا بناؤ گی تو وہ شوق سے نہیں کھائیں گی...... بس تم کھانے کا مرچ مسالا ہلکا کر دو......''

''جی ٹھیک ہے۔''

عید کا خوب صورت دن قریب آ رہا تھا۔ تبھی تو فیضی کو دکان سے دیر ہو جاتی۔ زین بڑا پرسکون سا بچہ تھا۔ سو یا رہتا اور جاگتا بھی تو اماں اسے اپنی گود میں جھلاتی رہتیں...... میں جلد ہی فارغ ہو جاتی۔ تب بس یہی دل چاہتا کہ فیضی چلے آئیں...... فیضی دیر سے آتے اماں کو دوائی دے کر کھانا کھلا کر میں فارغ ہو گئی ہوتی...... لیکن فیضی کھانا کھاتے ہی اماں کے کمرے میں چل دیتے۔ کبھی تو میں بھی ساتھ چل دیتی...... مگر اب زین کے سونے کا وقت...... وہ اپنے بستر کے لیے بے چین ہوتا اور یوں بھی فیضی کی مکمل توجہ کا مرکز اماں کی ذات، ان کی باتیں ہوتیں، مجھے اپنا آپ بڑا فالتو سا لگتا۔ تبھی تو میں اپنے کمرے میں چلی آتی اور پھر...... فیضی کا انتظار......

☆☆☆

فیضی دکان سے لوٹے ہاتھ میں لفافے پکڑے ہوئے تھے۔

''تمہارے لیے...... اور اماں کے لیے سوٹ کا کپڑا لایا ہوں، عید تک سلوا لینا۔''

''مگر فیضی میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں خود جاؤں گی آپ کے ساتھ......''

''میرا لایا ہوا سوٹ پسند نہیں آیا؟''

''میں نے تو ابھی دیکھا بھی نہیں فیضی...... مگر جی چاہ رہا تھا کہ اس دفعہ کوئی ریڈی میڈ سوٹ لوں۔''

''ارے ہٹو...... یہ موئے ریڈی میڈ سوٹ ... بھی بھلا خریدنے والے ہوتے ہیں، بس نری سجاوٹ...... نہ کپڑا کسی کام کا اور سلائی اتنی کھلی کھلی۔''

اماں نے شاپر کھول لیا تھا فیضی میری بات نہیں سن رہے تھے۔ اماں نے اپنا سوٹ پیس تھام

رکھا تھا اور وہ ماں، بیٹا اس پر تبصرہ کر رہے تھے۔ میں واپس مڑ آئی۔

☆☆☆

آج بہت مشکل سے میکے آنے کی اجازت ملی تھی اماں کو اکیلے تو واقعی چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ لگتا تھا کہ امی کی طرف جایا ہی نہ جائے گا۔ بس قدرت نے مسئلہ حل کیا...... اماں کی ایک منہ بولی بہن اپنے بیٹے کے ساتھ کچھ دن رہنے کو آ گئیں۔ ان کے بیٹے کو فیضی سے کپڑے کے کاروبار کے سلسلے میں کچھ رہنمائی لینی تھی۔

''فیضی میں سارے کام کر کے جاؤں گی...... خالہ جان، اماں کے پاس ہوں گی میں بس جلد ہی لوٹ آؤں گی...... وہ مہناز آپا بھی رہنے کو آ رہی ہیں اور......''

''اماں سے پوچھ لو......'' مختصر اور مدلل جواب تھا۔

اماں بھی شاید میری ہر وقت کی سنگت سے بور ہو گئی تھیں یا پھر کوئی وقت قبولیت کی گھڑی ہوتا ہے، اماں مان گئیں۔

''چلو ٹھیک ہے بہو کھانا بنا جانا، دو دن رہ آؤ، ہم دونوں بڑھیاں مل کر وقت گزار لیں گی۔'' اماں کے منہ سے یہ لفظ نکلے اور میں بھاگی پیکنگ کرنے......

مہناز آپا خاصی بڑی سسرال میں بیاہی گئی تھیں۔ خود بھی دو بچوں کی ماں بن گئی تھیں۔ دیورانیوں جیٹھانیوں کی سیاست...... نندوں کے بیٹھے، میٹھے وار...... کام کا بوجھ...... اور ایسی ہی نت نئی سی کہانیاں......

''میں تو الگ ہو جاؤں گی، میں نے کہہ دیا ہے اشعر سے چاہے ایک کمرے میں لے جاؤ...... مگر اس چڑیا گھر میں نہیں رہوں گی۔'' آپا کی شادی کو نو برس گزر گئے تھے اور ایک برس کے بعد سے ہی ان کا یہی مطالبہ تھا...... اور وہی انداز......

ہم سب اس بات کے عادی ہو گئے تھے مگر آپا مزے، مزے سے خوب قصے سناتیں، کیسے وہ محنت کر کے چائے کا اہتمام کرتیں اور کنواری نند بھاگ کر ٹرے لے کر باہر چل پڑتی اور یا پھر کیسے ایک جیٹھانی ایک جوڑا خریدتی تو ساری بہویں جل کر اپنے، اپنے شوہروں کے کانوں میں خوب بھنبھناتیں اور ان بیچاروں کو جیب ڈھیلی کرنی پڑتی...... مگر اس کے پاس تو کوئی چٹخارے دار قصہ کوئی کہانی نہ تھی۔ مختصر سی سسرال تھی اور سادہ سی زندگی......

مہناز آپا سے مل کر دل میں اماں کی طرف سے جو ملال آتا تھا وہ بھی اڑنچھو ہو جاتا۔ آپا کے لیے اس کی زندگی بڑی مثالی تھی۔

''لاڈلی تھی ناں امی کی کیسے پُرسکون گھر میں بیاہا...... نہ کوئی چخ، چخ...... نہ بک بک...... ایک بڑھیا ساس اپنے کونے میں پڑی رہتی ہو گی اور میاں بیوی کی موج......''

میں بس مسکرا دیتی۔

امی کے گھر سے واپس اپنے سسرالی گھر پر آئی تو جیسے وجود ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ دونوں بہنیں اکٹھی آئی تھیں۔ بھابی بیچاری ہماری خاطر داری میں اپنے بچوں کو بھولی پڑی تھیں...... اور ایک میری اکلوتی نند تھی...... جو کوئی بھی موقع تحائف کے بنا نہ جانے دیتی۔

خالہ جان میرے گھر آنے کے اگلے روز چلی گئی تھیں، ایک روز میں ان کے ساتھ رہی مگر بڑے خلوصِ دل سے ان کی میزبانی کی۔

اماں کی طبیعت کچھ خراب تھی، بی پی زیادہ ہو جاتا۔ میں بھی سب کچھ بھول کر اماں کی پٹی سے لگ کر رہ گئی۔ مگر فیضی بالکل بھی مطمئن نہیں تھے۔

''نینا تم نے اماں کا دھیان نہیں کیا۔ اتنے چٹ پٹے کھانے اور......'' میں نے نادم ہو کر سر جھکا لیا۔

''اور...... اور پانی کا بھی میں نے بتایا کہ اماں کو ابال کر دینا ہے اور سات گلاس دن بھر میں ضرور دینے ہیں اور......''

''مجھے پتا ہے فیضی اور میں ایسا ہی کرتی ہوں۔''

''اونہہ......'' اس اونہہ میں بے یقینی اور حقارت کا ایسا انبار تھا کہ میں شرمندہ سی ہوگئی۔ اماں سارا دن بے سُدھ سی پڑی رہتیں مگر فیضی کے آنے پر جیسے خود کو تازہ دم محسوس کرتیں اور اٹھ کر بیٹھ جاتیں، برآمدے میں تخت پوش بچھا تھا اور پر روئی کا نرم گدا بھی بچھا تھا مگر فیضی کو لگتا ہے کہ اماں وہاں سہولت سے بیٹھ نہیں پاتیں۔ تبھی تو انہیں ان کے کمرے میں بستر پر لٹا دیتے اور خود ان کے پاس ہی بیٹھ جاتے۔

میں زین کو سلا کر بلا مقصد ہی اندر گھومتی۔ کبھی ان کے پاس بھی چلی جاتی مگر فیضی، اماں کی پسند کا چینل لگا دیتے اور خود بھی بڑے شوق سے ٹی وی دیکھتے......

''تم کچھ کمزور ہوگئی ہو نینا اور......'' کبھی میرے چہرے پر غور سے دیکھتے تو کہتے۔

''اچھا ہے ناں...... ساتھ والی رحیمن کی بہو دیکھی ہے کیسے بارہ من کی دھوبن لگتی ہے۔ بہو تو ماشاء اللہ دھان پان سی لگتی ہے۔'' اماں کا فرمان، فیضی میاں خوش اور مطمئن اور بات ختم......

''نینا اماں نے ہمیں بڑے نامساعد حالات میں پالا ہے۔ ابا ہمیں چھوڑ کر چل دیے۔ ہم دونوں چھوٹے تھے۔ اماں نے ہمیں ہی زندگی کا محور بنالیا...... سمیعہ باجی تو سات سمندر پار چل دیں اب ہم ہی ہیں ناں ان کے لیے سب کچھ......'' یہ جذباتی تقریر میری اس خواہش کے جواب میں تھی جو میں انجانے میں ان سے کر چکی تھی۔

گھر کی دہلیز سے باہر نکلنا ایک خواب سا تھا۔ زین تھوڑا سا بڑا ہوگیا تو دل میں یہ خواہش مچلی کہ اسے کسی پارک میں لے جائیں یا پھر کسی پلے لینڈ وغیرہ میں...... بس صرف یہی خواہش ہونٹوں پر آئی جس کے جواب میں فیضی کا اپنی اماں کا قربانی نامہ جاری ہوگیا۔ دل دُکھا تو آنکھوں میں آپوں آپ پانی اتر آیا۔

''اچھا ساتھ والی رحیمن خالہ کو اماں کے پاس چھوڑ کر ہو آئیں گے مگر کھانا باہر نہ ہوگا...... کھانا اماں کے ساتھ مل کر......'' خوشخبری کے ساتھ ہی تنبیہہ مگر میں نے محسوس ہی نہیں کیا اور بھاگی تیاری کرنے کو...... وہ دن شاید میری زندگی کے بہترین دنوں میں سے تھا۔ فیضی اور میرا زینی...... خوب صورت ساعت اور دلنشیں گھڑیاں میرا جی چاہا کہ میں ان لمحات کو وقت کی گرفت میں قید کرلوں...... مگر وقت گزر گیا...... ہم واپس آگئے۔ رحیمن خالہ وہیں تھیں، ہمیں آتا دیکھ کر تیزی سے ہماری طرف بڑھیں۔

''کہاں چلے گئے تھے فیضان میاں بوڑھی ماں کا ہوش نہیں......''

''مگر خالہ آپ تو......''

''میں خود بڈھی ٹھڈی ہوں...... آنکھ لگ گئی میری، یہ خود ہی اٹھیں شاید پانی پینے کو...... شاید چکر آیا کہ گر گئیں۔ ماتھے پر چوٹ لگی ہے......'' خالہ کی بات مکمل ہونے کا انتظار نہ میں نے کیا...... اور فیضی تو تڑپ اٹھے۔ اماں اپنے کمرے میں اپنے بستر پر...... کروٹ سے لیٹی تھیں۔ جانے سو رہی تھیں یا پھر ناراض تھیں...... دو دفعہ فیضی نے پکارا میں بھی آوازیں دینے لگی۔ جواب نہ آنے پر ہم دوسری طرف آگئے۔ اماں آنکھیں موندے تھیں، ماتھے پر پٹی بندھی تھی۔

''اماں...... میری پیاری اماں......'' فیضی کے بس رو دینے کی کسر تھی اور میں پشیمانی کے ان دیکھے احساس میں ڈوبے جا رہی تھی۔

اماں نے ایک لفظ بھی گلے کا نہیں بولا مگر یہ انداز فیضان کے دل میں پھانس کی طرح چبھ گیا۔

''اماں نے کس طرح میری پرورش کی اور میں ان کا حق ادا نہ کرسکا۔''

''فیضی آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں جو ہماری قسمت کی تکلیف ہے وہ آ کر ہی رہتی ہے اگر ہم گھر میں ہوتے تو بھی اماں کو چوٹ لگ سکتی تھی۔''

جواباً انہوں نے اتنی گہری نظر سے تکا کہ میں پانی، پانی ہوگئی۔

مہناز آپا لڑ کر آئی تھیں اور مجھے بھی پیغام بھیج دیا۔

''بہن مر جائے گی تو بین کرتی آجانا...... جیتے جی بہن کا پتا نہ کرنا...... ان جانوروں میں کیا گزرتی ہے اس کے ساتھ۔''

مہناز آپا کے فون نے پھر دل میں تڑپ پیدا کردی۔

''فیضی آپا بیمار ہیں...... فیضی پلیز......'' وہ خاموش رہے مجھے دوبارہ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ اسی شب زینی اپنا سر کاٹ سے ٹکرا بیٹھا۔ ماتھے پر گومڑا بن گیا۔ آخر ماں تھی گھبرا گئی مگر اماں نے روٹی والا رومال گرم کروا کے اوپر رکھا تو سوجن کم ہوگئی۔ فیضان پہلے ذرا گھبرائے پھر بولے۔

''دیکھا ماں تھیں ناں تم بیٹے کی تکلیف پر تڑپ گئیں ناں ایسے ہی مائیں پالتی ہیں اور بیٹے انہیں چوٹ پہنچانے کے لیے تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔'' میری آنکھیں یک دم بھیگ گئیں۔

''بس کردیں فیضی ایک روز آپ مجھے آؤٹنگ پر کیا لے گئے بہت شکریہ اس کے لیے مگر پلیز اب مجھے یہ مت جتائیں......'' میری آنکھیں نم تھیں مگر لہجہ ذرا سخت ہوگیا...... وہ ایک پل کے لیے حیران ہوئے اور پھر پہلو بدل لیا...... مگر اگلے ہی روز صبح اماں سے کہہ رہے تھے۔

''اماں میری آفس میں چھٹیاں اکٹھی ہوگئی ہیں۔ دو دن میں آپ کے پاس رہوں گا۔ نینا اپنی بہن کو دیکھ آئے۔''

اماں کو بھلا کیا اعتراض تھا۔ پیارے اکلوتے بیٹے کا ساتھ...... نہ بیوی کا ٹنٹا نہ چھوٹے بچے کی کِل، کِل...... وہ مسکرائیں۔ اور میں فیضان کے لیے محبت بھرے جذبات لیے اپنی تیاری کرنے لگی۔

''مہناز آپا اس دفعہ بچیاں بھی وہاں چھوڑ آئی ہیں۔ انہیں کون دیکھے گا۔'' مہناز آپا بچیوں کے بغیر آئی تھیں میں بھونچکا سی رہ گئی۔

''لو کم لوگ ہیں گھر میں، کوئی نہ کوئی دودھ کی بوتل بھر دے گا۔ رات کو باپ کے پاس پڑ رہیں گی۔''

''لیکن آپا......''

مگر میں خود خاموش ہوگئی۔ آپا اس وقت ایسی مرد ناداں بنی تھیں کہ جس پر سارے نرم و نازک کلام بے اثر ہوجاتے ہیں۔ میں دو دن اماں کے گھر رہی...... متوسط سا گھرانا تھا۔ نوکر، ملازم کا تصور نہ تھا۔ بھابی بیچاری تھک گئی تھیں۔ میں کچن میں ساتھ گھسی تو بھائی...... بھابی پر ناراض ہونے لگے، میں باہر نکل آئی کہاں امی کے لیے دل ترس رہا تھا اور کہاں اگلے ہی روز دل اداس ہونے لگا۔ ننھا زین بھی اگلی دوپہر تک کہنے لگا۔

''مما...... مما...... دادو......''

''چلیں گے بیٹا، رات کو ماموں چھوڑ آئیں گے۔'' بھائی ہمیں گھر چھوڑنے آئے۔ فیضی نے دروازہ کھولا زین لپک کر باپ کی گود میں چڑھ گیا۔ میں نے دیکھا اماں کے کمرے کا دروازہ بند تھا یہ گویا گرین سگنل تھا کہ ہم دونوں اپنے کمرے میں جا سکتے تھے۔

☆☆☆

فیضی بہت خوش تھے۔ کتنے ہی برسوں کے بعد سمیعہ باجی لندن سے آرہی تھیں۔ بچے، باپ کے پاس ہی تھے۔ لندن کی مصروف زندگی سے بہت مشکل سے وقت نکال کر آرہی تھیں۔ اپنی ماں اور خاندان کے ساتھ دن بتانے کو...... فیضان کی دکان اللہ کے فضل سے خوب چلتی تھی اور ہم سب نے اپنی خواہشات محدود رکھی تھیں اس لیے ہمارے پاس پس انداز کی ہوئی رقم موجود تھی۔ موسم گرما کا آغاز تھا اور سمیعہ باجی کو گرمی کی عادت نہیں تھی تبھی تو سب سے پہلے چھوٹے کمرے میں ایک ٹن کا اے سی لگوایا گیا۔ کمرے کی آرائش بھی ہوئی۔ میں باجی کے آنے پر

خوش تھی مگر تھیں تو نند ہی ناں...... دل میں ایک ننھی سی خود غرضی بھی جاگی کہ باجی تو چل دیں گی بعد میں یہ کمرا اپنے زینی کو دے دوں گی۔

باجی آئیں تو جیسے ہمارا ننھا سا برآمدہ تحفوں سے بھر گیا۔اماں کے نرم جھاگ جیسے سویٹر اور ریشم جیسی چادریں۔بھائی کے لیے نیا موبائل اور رنگ برنگی ٹی شرٹس...... فیضی شرمائے۔

''باجی اب آپ نے مجھے ویسا ہی سمجھا جیسا چھوڑ کر گئی تھیں۔بڑا ہو گیا ہوں میں۔''

''ارے پگلے تو جتنا مرضی بڑا ہو جائے، میرے لیے وہی ننھا سا فیضی بابا ہے۔'' باجی دلار سے بولیں۔

زین یوں بھی شریف سا بچہ تھا اور پھر پھپو کے لائے ہوئے رنگ، برنگے کھلونے...... وہ اپنی دنیا میں مگن تھا۔میں کچن میں مصروف ہو گئی اور فیضی...... اپنی اماں اور پھر اپنی باجی کے ہر وقت کے ساتھی......

اماں کی اکیلی جان تھی تو رات کمرے میں آجاتے مگر باجی کے آنے کے بعد اماں بھی اسی...... ائرکنڈیشنڈ کمرے میں شفٹ ہو گئی تھیں۔شاید اے سی کی ٹھنڈی ہوا کا اثر ہوتا یا پھر اماں اور باجی کے ساتھ اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرنے وہ اسی کمرے میں پڑے کاؤچ پر پڑ رہتے۔اگلے روز میں ہی بیڈ ٹی لے کر ان کے پاس جاتی۔سمیعہ باجی اس بات پر خوش ہوتیں۔

''اچھی بھابی ہے میری...... اماں یہ میری پسند ہے ناں......'' وہ اماں سے داد وصول کرنا چاہتیں مگر اماں چہرہ سخت سا کر لیتیں یا سنی ان سنی کر دیتیں۔

''فیضی بابا تمہارے ججو تو صبح چائے خود ہی لیتے ہیں اور شاید ناشتا بھی...... میری جاب دو گھنٹے بعد کی ہے مجھے تو جگاتے بھی نہیں۔''

''ہاں تو نوکری کرتی ہو تم...... یہ بھی دیکھتی ہو یہاں والا حساب کہاں ہے۔بس الٹی سیدھی ڈوئی پھیرو اور کام ختم......'' اماں کا بیان...... اور بات ختم......

دن ڈھیرے، ڈھیرے گھسٹ رہے تھے۔دل چاہتا تھا کہ ڈھیر سارے بچوں کی فوج ظفر موج ہو اور میں خود کو ان میں سمولوں...... اپنی ذات کو ان کے لیے بھول جاؤں مگر اللہ کے ہر امر میں کوئی نہ کوئی بھلائی ہی ہوتی ہے۔زینو کے بعد میرے گلشن میں کوئی پھول نہیں کھلا...... میں کسی لیڈی ڈاکٹر کو چیک کروانا چاہتی تھی مگر اماں پھر آڑے آگئیں۔

''ہمارے خاندان میں بے اولادی تو نہیں مگر اولاد کم ہے...... کچھ بھی کر لو اب کچھ ہونے کا نہیں......'' دل ہول سا گیا...... فیضی کی طرف امید بھری نظروں سے تکا مگر وہ اماں کی ڈھیلی ہوئی چارپائی کس رہے تھے۔زینو بھی اب تھوڑا سا بڑا ہو گیا تھا۔بابا کو اتنا دلچسپ کام کرتے دیکھا تو ساتھ لگ گیا۔باپ، بیٹا شرارتیں کر رہے تھے اور اماں بھی مسکرا رہی تھیں۔یک دم سارا ماحول بڑا ہی مکمل لگنے لگا۔جیسے دل شرمندہ ہوا...... اللہ نے اولاد دی ہے اتنی پیاری...... مکمل گھرانا میں تو یونہی پریشان ہونے لگی تھی۔

مہناز آپا کے گھر گزشتہ برس جڑواں بچیاں پیدا ہوئی تھیں۔بیٹے کے لیے خوب منتیں مرادیں کی گئی تھیں۔آپا بچیوں کی پیدائش پر خوب روئیں اور ان کے میاں کا بھی چہرہ دھواں، دھواں ہو رہا تھا۔نرینہ اولاد کی خواہش میں چار بچیاں...... مگر یہ سب ردعمل تھوڑی دیر کے لیے تھا پھر وہ بچیوں میں اتنا مگن اور مصروف ہوئیں کہ لڑائی بھڑائی بھی بھولے بیٹھی تھیں۔بچیوں کو سجاتی سنوارتیں ان کی پونیاں، چوٹیاں بناتیں مگر میں ان کو ملتی تو ایک ٹھنڈی آہ ضرور بھرتیں......

''اللہ نے خاص کرم کیا تم پر......''

میں اس وقت سوچتی کہ اللہ تعالیٰ نے سب کے دل میں ایک کسک ضرور رکھی ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ اسی وقت میں اپنے آپ سے ایک وعدہ ضرور کر لیتی۔

اماں کافی کمزور ہو گئی تھیں۔چلنا پھرنا دشوار

ہو گیا تھا۔ باتھ روم جانے میں اور نماز پڑھنے میں بھی ہانپ جاتیں۔ میں اماں کا اپنے طور پر خوب خیال رکھتی مگر فیضی مطمئن نہ ہوتے۔ زین کو ایک اچھے اسکول میں داخل کرایا تھا اس کو خود پڑھانا ہوتا مگر اس عرصے میں ہی اماں گھبرا جاتیں۔

''مجھے اسپغول کا چھلکا بھگو دو...... پیٹ میں درد ہے۔'' میں زینی کی کتابیں چھوڑ کر اٹھ بیٹھتی۔ اگر میتھ کا سوال سمجھانے میں ذرا دیر ہوتی تو اماں تو بوکھلا جاتیں۔

''اب سہ پہر کی چائے سے بھی گئے ہم...... بچہ پی ایچ ڈی کر رہا ہے کیا......؟''

''جی اماں میں ابھی آئی۔''

فیضی نے اب تو گھر کے کام کاج کے لیے ایک ماسی بھی رکھ دی تھی مگر اماں کی اس سے کم ہی بنتی، اس کے ہاتھ سے کچھ نہ لیتیں بلکہ باتھ روم... بھی اس کے ساتھ نہ جاتیں۔ میں نے اپنے آپ کو اس گھر کے لیے ہی مختص کر رکھا تھا مگر پھر بھی...... ایک بیوی تو تھی ناں جی چاہتا کہ فیضی کچھ وقت میرے ساتھ گزاریں۔

دوڑتے ہوئے وقت میں کچھ لمحے...... چند گھڑیاں تھوڑی سی ساعتیں ہمارے اپنے لیے ہوں...... مگر فیضی...... میں نے انہیں دکھانے کو دو دن منہ نہیں دھویا کپڑے نہیں بدلے مگر انہیں احساس نہیں ہوا...... اپنا دل مرسا گیا تھا۔

ماہ رمضان آیا تو گرمی نے شدت پکڑی اور اماں کی بیماری نے بھی...... روزہ رکھنے کے قابل تو تھیں نہیں مگر عبادت میں کمی نہ کرتیں۔ زین ماشاءاللہ بڑا اچھا بچہ تھا۔ لڑکپن میں داخل ہو گیا تھا مگر دادو کی، ہم دونوں کی بہت عزت کرتا، روزے باقاعدگی سے رکھنے لگا تھا اور نماز بھی بابا کے ساتھ مسجد میں پڑھتا۔

ماہ رمضان ہم سے جدا ہونے کے قریب تھا۔ آخری عشرہ چل رہا تھا کہ من میں سوچ اٹھی کہ اس دفعہ فیضی کے ساتھ چاندرات کو شاپنگ کی جائے۔ فیضی اماں اور میرے لیے کپڑے لائے تھے جو میں محلے کی درزن سے سلا چکی تھی۔ ہم رنگ چوڑیوں اور بُندوں، ٹاپس کے لیے دل میں امنگ اٹھی۔ ہیل والی سینڈل بھی لوں گی۔ من ہی من میں سوچا۔ امی عید کے بعد اگلے روز دعوت کا اہتمام کرتیں۔ بس اسی روز ہی خوب بننے سنورنے کا جی چاہتا تھا۔

رات فیضی بستر پر آن لیٹے تو میں چائے کا کپ بنا کر لے آئی......

''ارے بیگم صاحبہ یہ کیا ظلم ہے...... جانتی ہیں سوتے وقت چائے پیوں تو نیند بھاگ جاتی ہے میری؟''

''یہی تو چاہتی ہوں میں......'' میں نے کہہ ڈالا تو ہنس دیے۔

''لو بھئی یہ سزا بھی ہم بھگت لیتے ہیں۔'' مزے سے بیٹھ کر چائے پی اور جان بوجھ کر رخ موڑ کر سونے کی ایکٹنگ کرنے لگے۔ میں بھی روٹھ کر لیٹ گئی تو خود ہی اٹھ بیٹھے۔

''اچھا بتاؤ کیا بات ہے؟''

''مجھے چاند رات پر جانا ہے بازار...... فیضی میرا کچھ سامان رہتا ہے۔''

''ہاں تو چلی جاؤ، محلے کی خواتین مل کر جاتی ہیں جتنے پیسے چاہیے ہوں لے لینا۔''

''نہیں...... مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے بس......'' لہجے میں نرمی اور پیار کا انداز دیکھا تو میں بھی ٹھنک کر بولی۔

''مگر نونی...... اماں......'' میں جانتی تھی کہ یہ میری زندگی کے امتحانی پرچے کا پہلا سوال ہے جو ہمیشہ ہی لازمی ہوتا ہے۔

''خالہ رحیمن کو......''

''چلو ٹھیک ہے......''

اور واقعی چاندرات کو میں فیضی کے ساتھ ان کی بائیک پر ان کی کمر میں بازو حمائل کیے مسرور سی بیٹھی تھی۔

زینی سو گیا تھا۔ ہم نے جاتے ہوئے اسے

جگانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نیند کا رسیا آنکھیں کھول کر نہ دے رہا تھا۔ اماں بھی بولیں۔

''صبح عید ہے، نمازِ عید تو باوا کے ساتھ پڑھے گا اسے چھوڑ جاؤ۔''

دادو کے بستر پر اسے لٹا کر ہم دونوں ہی چل دیے تھے۔ فیضی نے مجھے ایک کے بجائے سینڈل کی دو جوڑی دلوائی تھیں۔ کانوں کے ٹاپس......اور ہاتھوں کی مہندی......اور......اور سب سے بڑی خوشی یہ ہوئی کہ ایک ریڈی میڈ سوٹ بھی لے کر دیا۔

''تمہیں پسند تھا ناں...... لے لو......'' میرا دل خوشی کے بیکراں احساس سے بھر گیا۔ وہ میری پسند ناپسند سے واقف تھے اور...... میرے لیے سوچتے تھے...... ہاں مگر اس سے ان کا موڈ زبردست خراب ہوا جب دکاندار نے چوڑیاں میرے ہاتھ میں پہنانے کی کوشش کی۔

''ڈبے میں پیک کروالو صبح خود پہننا......''

''مگر فیضان میرا ہاتھ ایسا ہے کہ چوڑی مشکل سے پہن پاتی ہوں ٹوٹ جائیں گی۔''

''میں خود پہنا دوں گا...... چلو گھر......'' انہوں نے گھُرکا اور میں نے چوڑیاں بھی پیک کروالیں۔ اماں کے لیے سلیپر اور زین کے لیے گھڑی بھی لی تھی۔ گھر میں داخل ہوئے خالہ رحیمن نے دروازہ کھولا اور اپنے گھر کو چل دیں۔ ہم آگے بڑھے۔ اماں کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے قدم بڑھائے مگر فیضی نے روک لیا۔ ''زینی کو سونے دو ڈسٹرب ہوگا......'' ایک پل کو رکے اور لہجے میں پیار اور شوخی سما کر بولے۔

''اور مجھے اب اپنی بیگم صاحبہ کو چوڑیاں بھی تو پہنانی ہیں ناں......''

☆☆☆

عید کا دن بڑا خوشیوں بھرا اور مصروف گزرا میں نے فیضی کے سنگ خریدا ہوا وہ ریڈی میڈ سوٹ پہنا...... چوڑیاں بھی تھوڑی دیر بعد ہلکی سی حرکت کرنے پر کھنک اٹھتیں۔ کسی بھی بیوی کو یہ احساس کہ اس کا شریکِ حیات اسے محبت اور توجہ کا مرکز بنائے ہوئے ہے۔ کتنا مغرور بنا دیتا ہے۔

رات تک اماں کی طبیعت خراب ہوگئی۔ معدے میں شدید درد تھا اور قے بھی آرہی تھی۔

''بس الم غلم کھا گئی ناں خیال ہی نہیں کیا......'' بے دم سی بولیں۔

''سنو نینا تمہیں اماں کی ڈائٹ کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔''

''وہ......وہ فیضی آج میں بہت مصروف رہی ناں تو......''

''ایسی بھی کیا مصروفیت ہے اس گھر میں کہ اماں سے غفلت برتی جائے۔''

میں خاموشی سے کچن میں چلی آئی اماں کے لیے ساگو دانہ بھگونا تھا۔ جانتی تھی کہ چوڑیوں کی کھنک...... یا مہندی کی مہک سب کچھ اس وقت پھیکا پڑ گیا تھا۔ فیضی کی اماں بیمار تھیں اور......

☆☆☆

فیضی کو اللہ تعالیٰ کی رحیم ذات نے ایک شدید حادثے سے بچالیا۔ جانے کیا ہوا عین سڑک کے درمیان اور شدید رش میں بائیک کا پہیہ ہی نکل کر دور جا پڑا اور......

اماں اس وقت گھر میں بہت گھبرا رہی تھیں۔ جسم بھی یک دم پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔

''بہو ذرا جلدی سے میری تسبیح دو، ورد کروں گی۔ دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

چولھے پر زینی کے لیے کافی رکھی تھی اماں کو تسبیح دے کر کچن میں لپکی واپس آئی تو اماں خدا کے حضور سر بسجود تھیں اور ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔

فیضی واپس آئے تو سر اور بازو پر پٹی تھی ان کی دکان کا لڑکا انہیں گھر چھوڑ کر گیا۔ میں دھک سے

رہ گئی اور اماں...... ان کا رنگ تو خطرناک حد تک زرد پڑ گیا تھا۔ فیضی اماں کی آغوش میں چل دیے۔

"اماں...... جب حادثہ ہوا تو میرے اوسان خطا ہو گئے تھے...... مگر یکایک مجھے یوں لگا کہ اماں...... آپ کی دعاؤں کے حصار نے مجھے موت کے منہ سے نکال لیا...... اور...... اور آنے والی گاڑی کو یک دم بریک لگ گئے اور......"

میں نے دیکھا کہ اماں نے فیضی کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے رکھا تھا اور ان کی بوڑھی آنکھوں سے رواں آنسو فیضی کی شرٹ کو بھگو رہے تھے۔

فیضی کے زخم جلد بھر گئے...... معمولی خراشیں تھیں مگر میرا دل جیسے ڈر سا گیا۔ ہم جن ماؤں کو اپنی زندگی اور معاملات میں رکاوٹ سمجھنے لگتے ہیں ان کی دعائیں...... ان کی نیک خواہشات ہمارے لیے کیسے پناہ گاہ ثابت ہوتی ہیں۔

فیضی کا وزن کافی کم ہو گیا تھا۔ اور جلد ہی تھکاوٹ کا شکار ہونے لگتے۔ میں ان کے لیے پریشان تھی۔ بھائی آئے تو کہنے لگے فیضان کو...... ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ بظاہر کوئی شکایت یا مسئلہ نہیں تھا پھر بھی بھائی ہی ان کو ڈاکٹر کے ہاں لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر ٹیسٹ کرائے گئے۔ فیضی کو شوگر کی بیماری کی تشخیص ہوئی تھی۔ میں اور اماں گھبرائیں تو بھائی تسلی دینے لگے۔

"یہ مرض ہے تو موذی مگر اب تو گھر، گھر میں اس کے مریض ہیں۔" میں فیضی کے لیے بہت پریشان رہتی۔ مگر اماں تو جیسے مستقل زلزلے کی زد میں تھیں۔ فیضی پر پڑھ پڑھ کر پھونکتیں اور...... اور ہر وقت مجھے ہدایت کرتیں۔

"فیضی کو یہ دو...... یہ نہ دو...... بہو اس کا خیال کرو......" فیضی اماں کے لیے پریشان رہتے۔

"اماں کو سوپ دیا تھا۔"

"جی......"

اور اماں بیٹے کے ہراساں......

"بیٹا چائے میں چینی مت ڈالو، اس دفعہ سامان کی لسٹ میں نمکین بسکٹ ضرور لکھنا...... چاولوں کو ابال کر پانی ضائع کر دو۔" وہ دونوں میرے اپنے تھے...... میرے پیارے ان کے بِنا میری زندگی نامکمل تھی مگر کسی وقت بانورے سے من میں خیال آتا کہ اس تمام سلسلے میں...... میں کہاں تھی۔ مگر اللہ نے ہر دل کو سکون اور تقویت پہنچانے کا سامان رکھنا ہے۔ میری نظریں آپوں آپ اپنے زین کی طرف اٹھ جاتیں۔

☆☆☆

وہی گھر ہے اور وہی آشیاں گھر کی ساخت میں اور سجاوٹ میں تھوڑا فرق ہے اور کرداروں اور ان کی تقسیم میں بھی...... نیچے کی منزل میں...... اب میں ہوں، اماں دارِ فانی سے کوچ کر چکی تھیں اور میں اسی کمرے میں تھی...... اپنے ناتواں اعضا اور چاندی جیسے سفید بالوں کے ساتھ اور اوپر والے کمرے میں زینی تھا میرا زین...... اپنی بیگم اپنی شریکِ حیات مہرافروز کے ساتھ۔

مہرافروز...... زین کے لبوں سے یہ لفظ سن کر میں بھی چونکی تھی۔ شناسا نام تھا...... اوہو...... گڈی...... فرحان بھائی کی گڈی...... فرحان بھائی نے بیٹی کا نام مہرافروز رکھا تھا مگر امی کو بولنے میں مشکل ہوتی وہ اسے پیار سے گڈی پکارنے لگیں۔ دادی کا رکھا ہوا نام زبان پر چڑھ گیا اور سب ہی اسے گڈی پکارنے لگی۔ گڈی اپنے نام کی ہی طرح تھی۔ بوٹے سے قد والی سنہری بال اور سبز کانچ سی آنکھیں۔

مہناز آپا کے گھر بچیوں کی زیادتی کے باعث میں نے خود سے ہی وعدہ کیا تھا کہ ان کی ایک بچی کو اپنی بہو بناؤں گی...... مگر زین نے گڈی کا نام لے لیا...... ایک لمحے کے لیے تو میں ساکت سی رہ گئی مگر اگلے ہی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ فیصلے کا اختیار میرے پیارے بیٹے کے ہاتھ میں ہی ہوگا...... اور

اب مہر افروز میری بہو بن کر میرے گھر میں ہے۔

زین کے لبوں پر مہر کا نام آیا تو میں حیران رہ گئی۔

فیضی کی زندگی میں بھی تو ہم کم ہی امی کے گھر جاتے تھے اور ان کے چلے جانے کے بعد تو جیسے میں اس چار دیواری میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ امی، مہناز آپا بلاتیں بھی تو جی نہ مانتا...... اس گھر میں میرے کی یادیں تھیں، خوشبو تھی۔

اماں کے وصال کے بعد فیضی کو بہت چپ سی لگ گئی تھی۔ میں نے دکھ کی گھڑی میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑا تھا مگر وہ بہت غمزدہ سے رہتے۔ سمیعہ باجی بھی کچھ عرصے کے لیے چلی آئی تھیں۔ ماں کا چہرہ تو نہ دیکھ سکی تھیں مگر بھائی کو سنبھالتی رہیں۔ دو ہفتوں کے بعد وہ واپس چل دیں اور ہم تینوں نفوس اس گھر میں تنہا رہ گئے...... ہم ویسے تو تین لوگ تھے۔ میاں، بیوی اور ایک پیارا سا بیٹا مگر اماں کی کمی ایک خلا سی چھوڑ گئی تھی۔ میں خود اماں کی موجودگی، ہر دم ہر بات میں مداخلت سے گھبرا جاتی تھی مگر جب وہ ہمیشہ کے لیے ہمیں تنہائی بخش گئیں تو وہ تنہائی ہمیں کوئی خوشی نہ دے سکی۔ رات فیضی یک دم چونک اٹھتے۔

”اماں کا دروازہ کھلا ہے، وہ ابھی جاگ رہی ہیں۔“

”نہیں فیضی، وہ تو ابدی نیند سو گئی ہیں۔“ زین اپنے بابا کو یوں تڑپتا دیکھتا تھا مگر خاموش ہی رہتا۔

”ماما یہ دروازہ، یہ کمرا لاک کر دیں ناں......“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے......“

میں نے کمرا لاک کر دیا۔ اب تو دروازہ کھلا ہونے کا کوئی بھی چانس نہیں تھا۔ فیضی اب کافی سنبھل گئے تھے مگر میں اور زین محسوس کرتے کہ رات اپنے کمرے میں جاتے سے یونہی گھر میں گھستے ہی ان کی نگاہیں لاشعوری طور پر اس بند دروازے کی طرف ضرور اٹھ جاتیں۔

فیضی کمزور ہو گئے تھے مگر اپنے کاروبار کو بڑی مستعدی سے سنبھالے ہوئے تھے۔ زین بہت اچھا

بچہ تھا مگر کاروبار میں دل نہ لگا پایا۔

''بابا میں پڑھوں گا۔''

اور بابا نے فوراً اس کی بات مان لی۔ بابا کی زندگی میں ہی اس نے جاب کر لی تھی۔ گو تنخواہ بھی واجبی سی تھی مگر ترقی کے چانسز تھے اور سب سے بڑی بات ہمارا زین خوش تھا۔ فیضی نے اسے بائیک لے دی تھی وہ شرٹ پر ٹائی لگا کر جاتا تو جیسے میں اس سے نظریں ہٹانا بھول جاتی۔

ایک روز دکان سے واپس آتے ہوئے فیضی ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ اس دفعہ اماں کی شفیق ذات اور ان کی دعاؤں کا حصار نہیں تھا کہ فیضی جانبر ہو سکتے۔ زندگی جیسے مفلس کی قبا ہو گئی تھی کہ جس میں ہر دم درد کے پیوند لگے جاتے تھے۔ میں اور زین حواس باختہ سے ہو گئے تھے۔ زندگی اس موڑ پر آئے گی ایسا تو ہم نے کبھی بھولے سے بھی نہ سوچا تھا۔

زین رونے لگتا تو میں بازوؤں میں تھام لیتی اور میں غم سے بے دم ہو جاتی تو زین مجھے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیتا۔

دن یونہی گزر رہے تھے۔ فرحان بھائی کو میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ کھل اٹھے۔

''بہن گڈی تو ہے ہی تمہاری بیٹی...... اس کا رہن سہن اور انداز بھی تمہارے جیسا ہی ہے۔''

مہناز آپا تھوڑی دیر کے لیے ذرا کبیدہ خاطر سی ہوئیں مگر پھر نارمل ہو گئیں۔ میرے گھٹنوں میں ہر وقت درد رہتا تھا تبھی تو میں نے اور زین نے یہی فیصلہ کیا کہ اماں کا کمرا میرے لیے کھول دیا جائے۔

گھر کا تو اب نقشہ بدل گیا تھا۔ برآمدے پر چھت ڈال کر اسے ٹی وی لاؤنج کی شکل دے دی گئی تھی اور زین کو اپنا کمرا دیتے ہوئے اسے نئے طریق سے آراستہ کیا گیا تھا۔ گڈی اس گھر میں بہت خوش تھی۔ وہ بچپن ہی سے مجھے بوا جی کہتی اب زین نے ماما کہنے پر اصرار کیا تو ہنس دی۔

''میرے منہ پر چڑھ گیا ہے زینی......''

''تو اتار لو ناں......''

''اچھا کوشش کروں گی۔''

وہ مجھے اب ماما کہنے لگی تھی کبھی زبان سے بوا جی پھسل پڑتا تو کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ فیضی کے بعد ہم نے دکان کرائے پر چڑھا دی تھی۔ کرایہ کافی مناسب تھا۔ میرا زین اس میں سے ایک روپیہ خود نہ رکھتا۔ وہ سب میرے ہاتھ میں آتا۔

اس کی تنخواہ خود بہت بہتر تھی۔ گھر کا سلسلہ بہت اچھے طریق پر چل رہا تھا۔ زین کی جاب تھی وہ سرِ شام گھر آ جاتا۔ چائے ہم مل کر ٹی وی لاؤنج میں ہی پیتے۔ اس کے بعد میں وہیں رکھے صوفے پر نیم دراز ہو جاتی۔ عمر کا بھی تقاضا تھا شاید اونگھ آ جاتی یونہی یک دم جاگ جاتی تو وہ اپنے کمرے میں جا چکے ہوتے۔ رفتہ رفتہ جانے کیسے تنہائی اور غیر محفوظ ہونے کا احساس میرے اندر سرایت کرنے لگا۔ میں اماں میں فیضی کی دلچسپی سے بہت تنگ رہی تھی۔ تبھی تو میں اپنے زین اور اس کی بیوی کو مکمل آزاد ماحول دینا چاہتی تھی مگر یک دم جانے کیا ہوا مجھے اپنا آپ بڑا غیر ضروری سا لگنے لگا۔

گڈی پڑھائی میں اتنی ہوشیار نہیں تھی۔ فرحان بھائی نے میٹرک کے بعد ہی اسے امورِ خانہ داری میں لگا دیا تھا۔ چھوٹی سی فیملی تھی اس نے آتے ہی کمان اپنے ہاتھ میں سنبھال لی تھی۔

زین کو آفس جانے سے پہلے بہترین ناشتا تیار ملتا اور ہاٹ کیس میں مزیدار لنچ بھی...... زین میرا خیال کرتا تھا۔ آفس سے آنے سے پہلے ہی گڈی مجھے کوئی اسنیکس بنا دیتی۔

''بیٹا! زینی کو آنے دو ناں......''

''چائے ان کے ساتھ پی لیجیے گا، اس طرح رات کا کھانا نہیں کھا پائیں گی۔'' بات درست ہی تھی مگر جانے کیوں مجھے لگا کہ گڈی مجھے زین سے دور کرتی

جا رہی ہے۔ صبح وہ آفس جاتا تو میں جاگ رہی ہوتی مگر دروازہ بھڑا ہوا ہوتا۔ مجھے اس کی چاپ دروازے کے قریب محسوس ہوتی مگر پھر گڈی کی آواز......

''سنیئے، ماما ڈسٹرب ہوں گی۔ زین پلیز آ کر مل لیجیے گا۔'' اور قدم واپس مڑ جاتے۔

میں اماں کے اس کمرے میں اماں کی جگہ پر تھی اور اماں کا فیضی اب میرے زینی کے روپ میں تھا۔ میں فیضی کے حواس سے اماں کو آزاد نہ کر پائی تھی اور گڈی...... کہیں وہ میرے زینی کا ذہن نہ بدل دے۔ میرا دل دھڑکنے لگتا تھا اور رنگت سرخ ہو جاتی۔

''ماما آپ ٹھیک ہیں ناں......؟'' زینی گھبرا جاتا۔

''آپ پیچھے ہٹیں زین، آپ تو بچوں کی طرح ڈر جاتے ہیں۔ میں ابھی ماما کو بھلا چنگا کرتی ہوں۔''

دودھ میں پانی ملا کر گڈی مجھے پلاتی سر پر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر تولیا رکھتی تو بلڈ پریشر نارمل ہو جاتا۔ زین کی آنکھوں میں اس کے لیے تحسین اور تعریف کا عکس مجھے کمزور کر رہا تھا۔ شاید یہ میرے اندر کے ڈر کا جن تھا یا پھر اماں کے کمرے میں رہنے سے ان کی روح میرے اندر سرایت کرنے لگی تھی کہ میں ہر وقت زین کی توجہ کی طلبگار رہنے لگی۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف ہوتے تو میں جیسے کسی ان دیکھے خدشے کا شکار ہونے لگتی۔

''زین......'' میری آواز پر وہ چونک جاتے۔

''ماما...... کچھ چاہیے آپ کو...... مہرو تم ماما کا خیال نہیں رکھتیں۔ دیکھو وہ کتنی کمزور ہو گئی ہیں۔''

ایک دم زرد ہوتا گڈی کا رنگ......

''میں ماما کا خیال رکھتی ہوں زین......'' اس کی ہلکی سی منمناہٹ کسی وقت دل میں پچھتاوؤں کا رنگ بھر دیتی اور کبھی دل میں خوشی بھر دیتی۔

گڈی اور زینی کبھی گھومنے چل دیتے مگر میں نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ مگر جتنی دیر گھر میں اکیلی رہتی۔ تنہائی کا بھوت میرے جسم کو نوچ جاتا۔ میری روح کو سنگسار کیے جاتا۔ وہ کبھی خالی ہاتھ واپس نہ آتے جو خود کھاتے میرے لیے لے کر آتے۔ کسی شے کی کمی نہیں تھی مگر......

گڈی امید سے تھی۔ خوب صورت چہرے پر پیلاہٹ سی آ گئی تھی مگر بڑی اچھی بچی تھی طبیعت کی خرابی کے باوجود گھر داری سنبھالے تھی۔

''زینی چند دن امی کی طرف ہو آؤں طبیعت خراب ہے۔ ہانڈی بھونتے بڑا دل متلاتا ہے اور......'' وہ شاید ابھی اپنی حالت کے بارے میں بتاتی کہ زینی نے روک دیا۔

''نہیں...... مہرو، ماما گھر میں اکیلی رہ جائیں گی وہ اب تنہا رہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔''

میں ٹی وی لاؤنج سے ملحقہ باتھ روم میں وضو کر رہی تھی ان کی گفتگو سن کر دل مسوس کر رہ گیا۔ باہر آئی اور بلند آواز میں پکارا۔

''گڈی تم بھائی جان کی طرف جانے کی تیاری کرو، ہم گھر کا سلسلہ خود ہی دیکھ لیں گے۔''

گڈی کی طبیعت کافی بہتر تھی آج زین اسے واپس لینے جا رہا تھا۔ فرحان بھائی نے کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ مدعو تو مجھے بھی کیا گیا تھا مگر مجھ میں اب کب اتنی ہمت رہ گئی تھی۔ میں کافی دیر ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی رہی مگر تھک گئی تھی۔ نیند تو آنکھوں سے کوسوں دور تھی مگر اپنے بستر پر لیٹنے کو جی چاہنے لگا تھا۔ میں اندر چل دی۔ دروازہ بند کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ فیضی کے ساتھ گزرے شب و روز جیسے میرے ذہن میں روشن ہو گئے۔ یونہی اس عجیب سی کیفیت میں کتنا ہی وقت گزر گیا۔ وہ لوٹ آئے تھے ہنستے مسکراتے...... زینی کے قدم یقیناً میرے کمرے کی جانب بڑھے ہوں گے تبھی تو گڈی کی آواز آئی۔

''ماما سو رہی ہیں۔''

''اوکے......'' وہ اوپر چلے گئے۔

ماہ رمضان پھر بڑے طمطراق سے چلا آیا تھا۔ اس کی رحمتوں کو سمیٹتے دو عشرے گزر گئے تھے گڈی کا جسم بھر گیا تھا۔ اور چہرہ جیسے روشن چراغ ہوا جاتا تھا۔ زین بہت مسرور تھا۔ من چاہا شریکِ حیات تھا اور سارے گھر کو خوب صورت طریقے سے چلایا جارہا تھا اور اب ننھے مہمان کی آمد...... دن عید اور رات شبِ برات ہورہی تھی۔ میں بہت خوش تھی۔ گھر کی خاموش فضا کو توڑنے ایک ننھا سا فرشتہ آنے کو تھا اور پھر...... اور پھر یہ بھی تو ہوگا کہ میرا زینی ان ننھی شرارتوں میں...... اپنی بیوی کی اداؤں میں...... اور میں...... میں کہاں ہوں گی۔ دل ڈوبنے لگا تھا۔

عید کا چاند نظر آگیا تھا۔ میرے زینی نے میرے لیے عید کی نماز کے لیے نیا لباس اور سفید چکن کی چادر بھی لاکر دی تھی۔

''اماں آج چاند رات ہم جائیں گے اور آپ کے لیے۔'' میں سن ہی نہیں پائی کیونکہ میرا سر یک دم چکرا گیا تھا۔ بچے مجھے میرے کمرے میں لٹا کر میرے لیے دودھ لینے چل دیے۔

''ماما آپ ٹھیک ہیں ناں......'' زین رو دینے کو تھا۔

''ماما، ماما......'' گڈی بھی گڑبڑا سی گئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں بچوں......''

میں جانتی تھی زین میرے لیے دکھی ہورہا ہے۔ اور گڈی کو اپنا پروگرام ملیا میٹ ہوتا نظر آرہا تھا۔ میرے زین نے مجھے دوائی دے دی اور سکون سے لٹا دیا۔

''ماما ٹھیک ہیں اب...... زینی میری سینڈل رہ گئی ہے اور چوڑیاں بھی......''

''تمہیں اپنی چیزوں کی پڑی ہے اور میں ماما کو اس حال میں چھوڑ سکتا ہوں بھلا؟''

''پلیز...... پلیز زینی...... زینی...... میرے پیارے زینی......'' گڈی لاڈ دکھانے لگی تھی۔ دوا لے کر کچھ دیر لیٹی تو ذہن ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ میں کمرے سے نکلنے لگی تھی کہ سامنے ہونے والے منظر نے میرے قدم روک دیے تھے۔ میں یہاں گھر میں اور...... وہ دونوں چاند رات کو نکل جائیں گے، روشنیوں میں چہچہاتے بازاروں میں گھومیں گے۔ چاندی کی بالیاں اور لاکٹ...... اور ناک سے پاؤں میں رنگ برنگی سینڈلیں...... اور کس باپ کا بیٹا ہے۔ چوڑیوں والے دکاندار کو ہاتھ نہ لگانے دے گا...... خود پہنائے گا بڑے چاؤ سے اور...... وہیں کھڑے، کھڑے جانے کہاں تک کا سفر کرلیا میں نے......

بے آواز قدموں سے میں واپس بیڈ تک آگئی۔ اماں کا کمرا...... اور ان کا بستر...... جی چاہا وہاں سے بھاگ جاؤں، اماں جانے اس جگہ لیٹے کیسے، کیسے خدشات کا شکار ہوتی تھیں خود بھی بے چین سی زندگی گزاری اور...... اور...... میں بھی کانٹوں پر چل کر زیست کے دن بتاتی رہی...... اور اپنے ان دیکھے شبہے اور خدشات کو میرے اندر بھی بیج گئیں...... میں نے یکا یک اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں چکر لگائے۔ کئی دفعہ فیصلہ کرنے کو ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے۔ شاید وہی لمحہ قریب تھا کہ مجھے میرے بچوں کی آواز آرہی تھی۔

''نہیں...... گڈی، ماما ابھی بے چین ہیں، دروازہ کھلا ہے کمرے کا۔ ماما سکون سے سونے سے پہلے دروازہ......'' میں نے خود کو یک دم ہلکا پھلکا سا محسوس کیا چاروں اور اعتماد اور اعتبار کی ہلکی سی پھوار پڑی...... زندگی سہل اور حسین لگنے لگی۔ صبح میٹھی عید تھی۔ میں آگے بڑھی اور مضبوط ہاتھوں سے دروازے کو اچھی طرح بند کردیا۔



سوال

سحرش رانی

''ہیپی برتھ ڈے......'' سنبل نے تیز، تیز قدم اٹھاتے اس تک پہنچ کر اسے وش کیا تھا۔

''اوہ! تھینکس یار......'' کومل نے ایک ادا سے شانے جھٹک کر بال پیچھے کرتے ہوئے کہا تو اسکارف میں لپٹی سنبل نے مسکراتے ہوئے ویلکم کہا......وہ ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر ہاسٹل جارہی تھی۔

''تم نے کلاسز اٹینڈ نہیں کیں......؟ دراصل کلاس میں تمہیں دیکھا نہیں ناں......'' سنبل نے پوچھا تو کومل شانِ بے نیازی سے مسکرادی۔

''نہیں، ایکچوئیلی میں اپنا برتھ ڈے سیلی بریٹ کرنے جوائے لینڈ گئی تھی۔''

''اچھا...... فرینڈز کے ساتھ......؟'' اس نے

معمول کے انداز میں پوچھا۔

''آں......'' وہ لمحہ بھر کو رک گئی تھی۔ ''نہیں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ......'' اس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اوہ...... اچھا......'' سنبل سمجھ نہیں پائی کہ وہ کس طرح کا ردِعمل ظاہر کرے۔

''نام کیا ہے؟'' سنبل اپنی تجسس بھری فطرت کو دبانے میں ناکام ہوئی تو پوچھ لیا۔

''ثاقب نام ہے پر میں اسے پیار سے ثاقی کہتی ہوں۔''

''تم اتنے آرام سے سب کو سب کچھ بتا دیتی ہو؟'' سنبل کو اس کے اتنا کھل جانے پر حیرت ہوئی۔

''عموماً نہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اگر میں کوئی غلط کام نہیں کر رہی تو میں کیوں ڈروں......؟'' اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں اس کی پکچرز دکھاؤں؟ بہت ہینڈسم ہے۔'' اس نے موبائل نکالتے ہوئے کہا...... سنبل نے نظر ڈالی تو چونک گئی۔ ثاقب اور کومل اتنے قریب......

''بہت کلوز پکچرز نہیں ہیں؟'' سنبل نے طنزاً پوچھا تو کومل مسکرا دی۔

''ارے نہیں...... ثاقی تو بالکل میرے بھائیوں جیسا ہے۔ بہت عزت کرتا ہے میری۔''

''ایک تو پتا نہیں لڑکیوں کو ہر لڑکا بھائی کیوں لگتا ہے؟'' سنبل نے اکتاہٹ سے سوچا۔

''تمہارے تو اپنے سگے بھائی ہیں ناں...... پھر تمہیں کیا ضرورت تھی اسے بھائی بنانے کی......'' سنبل نے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو کومل ٹال گئی۔

''اچھا یہ دیکھو...... واچ...... میرے کالج فرینڈ نعیم نے برتھ ڈے پر گفٹ پارسل کی ہے...... ویسے پارسل وصول کرنے کا ایک اپنا ہی مزہ ہے۔'' وہ خود ہی خود مسکرا رہی تھی۔

''اگر کسی دن تمہارے ابو اچانک بِنا بتائے یہاں آ جائیں اور تمہیں ثاقی کے ساتھ دیکھ لیں تو......؟'' وہ اس کے تلخ سے سوال پر چونکی۔

''آ...... میں کہہ دوں گی بھائیوں کی طرح ہے۔''

''کیا واقعی تمہارے ابو کچھ نہیں کہیں گے؟'' سنبل کو تو حیرت ہوئی اگر اس کے اپنے ابا جی ایسی حرکتیں دیکھیں تو...... اللہ، اللہ۔

''پتا نہیں...... کیا ری ایکشن ہوگا ان کا...... ویل...... تو ڈے از مائی برتھ ڈے...... کیوں ایسی غلط، غلط باتیں کر رہی ہو......'' کومل کو چڑ ہونے لگی تو سنبل خاموش ہو گئی۔

اب سنبل کو اپنی بے بسی پر حیرت ہو رہی تھی کہ کیا انسان اس قدر مجبور ہو سکتا ہے کہ غلط بات پر جانتے بوجھتے خاموش ہو جائے...... مزید بے کسی یہ کہ کسی کو کچھ کہنے کا اہل بھی نہیں...... وہ لب بھینچ کر رہ گئی...... لیکن ایک آخری سوال تو کر ہی سکتی تھی۔

''تم لڑکوں سے فرینڈ شپ کیوں کرتی ہو؟'' دل میں ڈر بھی کہ کہیں کچھ سنا ہی نہ دے۔

''جسٹ فن یار...... انجوائے منٹ...... یہی لائف ہے...... اب یہ سب اب نہیں کریں گے تو کب کریں گے...... بس مجھے اچھی کمپنی چاہیے...... چاہے لڑکیوں کی ہو یا لڑکوں کی...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... انسان اچھا ہونا چاہیے بس......''

☆☆☆

''او...... ہیلو سنبل......'' کومل نے اسے آواز دی تو وہ رک گئی۔

''ساتھ چلتے ہیں......'' دونوں ہاسٹل سے نکل کر ڈیپارٹمنٹ جا رہی تھیں۔

''ایک بات پوچھنی تھی......'' سنبل نے جھجکتے ہوئے پوچھا...... تو اسے خود پر تاؤ آیا کہ لوگ جب غلط حرکتیں کرتے ہوئے نہیں شرماتے تو وہ سوال کرتے ہوئے کیوں ڈر رہی ہے۔

''ہاں...... پوچھو......'' اس نے خندہ پیشانی

سے کہا۔

''تم...... وہ تمہاری امی...... امی کے کتنے یار دوست ہیں؟'' اتنا واہیات سوال......؟ مگر وہ کہہ چکی تھی۔ لفظ واپس نہیں لیے جا سکتے...... کومل کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے...... یکبارگی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

''یہ...... یہ کیا بدتمیزی...... کیا بے ہودگی ہے...... تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس طرح کی بات کرنے کی؟'' کومل کا خون کھول اٹھا تھا...... وہ چیخ رہی تھی۔

''تم آرام سے میری بات سنو...... یہاں بیٹھو......'' سنبل اسے بازو سے پکڑ کر بینچ پر بٹھا رہی تھی اور وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔

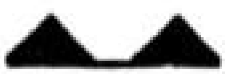
''نہیں...... مطلب کیا ہے اس بات کا؟''

''کل کو تمہارے بچے تم سے یہ سوال کریں تو کیا جواب دو گی؟'' سنبل اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''کس، کس کا نام بتاؤ گی؟ ثاقب، نعیم، جنید، کیا، کیا بتاؤ گی...... جب تمہیں یہ برداشت نہیں ہو سکتا کہ کوئی تمہاری ماں پر انگلی اٹھائے تو سوچو کل کو تمہارے بچوں کو کیسے برداشت ہو گا...... کوئی کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ ماں جیسی عظیم ہستی کے بوائے فرینڈز ہوں...... آج کی لڑکی کل کی ماں ہے...... کئی نسلوں کی امین...... یہ امین کیسے بتائے گی...... نسلیں برباد ہو جائیں گی...... بے شک تمہاری نسلیں سوال نہیں کریں...... بے شک تمہیں جواب دہ نہ ہونا پڑے مگر کوئی اور ہے جو سوال کرے گا۔ جس کے سامنے تم جوابدہ ہو...... جو تمہارے لمحے، لمحے کا حساب رکھتا ہے، وہ تم سے پوچھے گا تمہاری اس سو کالڈ انجوائے منٹ اور فن کے متعلق...... وہ جب سب کچھ پوچھے گا...... کیسے جواب دو گی...... ؟ کیا کہو گی...... کہ یہ سب تمہارے بھائی جیسے ہیں...... ؟ کیا تم اپنی ماں کے بوائے فرینڈز کو ماموں مان سکتی ہو؟

نہیں ناں...... تو پھر تمہارے بچے ان سب کو ماموں مانیں گے کیا؟ نہیں ناں...... پھر یہ عارضی فرینڈ شپ کیوں...... ؟ یہ بھائی والا، بہن والا ریلیشن کیوں...... ؟ تم سمجھ رہی ہو ناں؟'' سنبل نے پیار سے کومل کے شانے پر ہاتھ رکھا مگر وہ کسی ٹرانس میں کھوئی ہوئی تھی۔ سنبل کھڑی ہو گئی تھی۔

''جسٹ تھنک اباؤٹ اٹ......'' اس نے رسانیت سے کہا تو کومل نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا...... سنبل چلی گئی تھی...... مگر کومل میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس بینچ سے اٹھ بھی سکے...... اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ ہوا میں آکسیجن کی مقدار کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے اردگرد گھیرا تنگ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ لڑکیاں تیز، تیز چلتی اس کے پاس سے گزر رہی تھیں اور وہ شل وجود لیے بیٹھی ہی رہی...... اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ آنسو پلکوں سے جدا ہو رہے تھے۔ انکشاف ہونے پر وہ ہاتھوں میں منہ چھپائے رو دی...... ہچکولے لیتی...... پھر دہاڑیں مار کر روتی لڑکی کو سب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر آج اسے پروا کب تھی...... آج پہلی دفعہ اس نے بند آنکھوں سے اپنے آپ کو دیکھا تھا...... جانا تھا...... پہچانا تھا...... اسے اپنے اردگرد اندھیرا محسوس ہوا...... اور یہ اندھیرا تھا کہ بڑھتا چلا گیا...... وہ آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر روشنی تلاش کر رہی تھی...... مگر اندھیرا...... پھر اللہ کا کرم چاروں طرف پھیل گیا...... کی ایک کرن نے اس کی ساری کائنات روشن کر دی تھی...... اس نے نظر اٹھا کر راستے کی طرف دیکھا ایسے جیسے اسے اب بھی سنبل کا ہیولہ نظر آ رہا ہو...... اس کی نظر سنبل کے ہیولے سے ہٹ کر آسمان کی جانب دعائیہ انداز میں اٹھ گئی۔ جیسے اپنے گناہوں پر معافی کی طلبگار ہو اور معاف کر دینے والا اس کی توبہ کا منتظر......



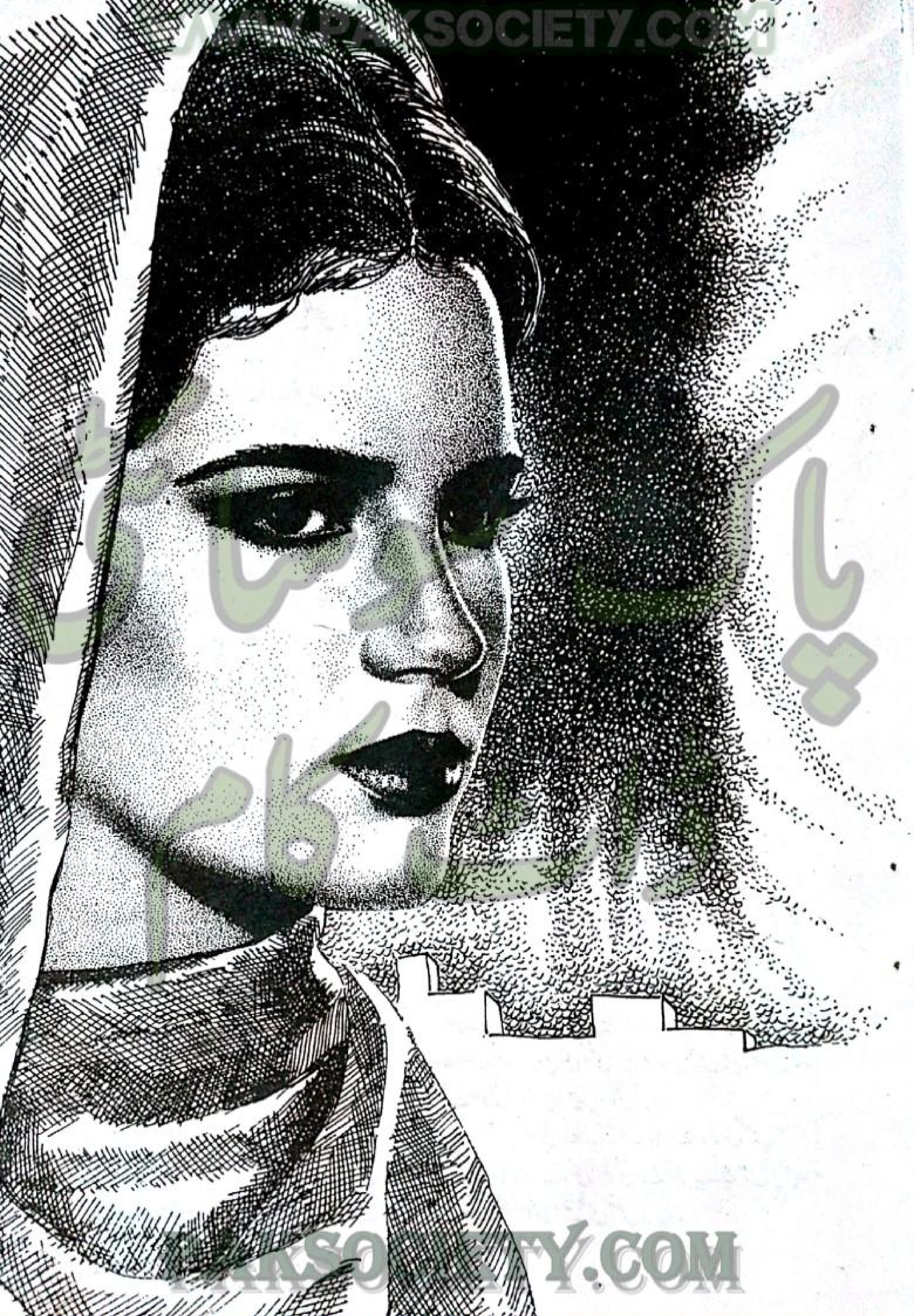


ناولٹ

جو کرے برابر نیکی

سارہ ملک

مارکر کا ڈھکن بند کر کے اس نے سفید چارٹ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی اور مطمئن ہو کر الماری سے پلاسٹک شیٹ نکال کر ٹیبل پر پھیلائی۔ ہاتھ سے شیٹ کی شکنیں دور کر کے اس نے چارٹ کے سائز کے مطابق کاٹا اور چارٹ کو صفائی سے کور کر کے کمرے کی مرکزی دیوار پر چسپاں کر دیا۔ یہ دیوار اس کے بیڈ کے عین سامنے تھی اور اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اس دیوار پر موجود چارٹ پر نظر پڑتے رہنا یقینی امر تھا۔ وہ مڑ کر بیڈ پر بیٹھی



اور چارٹ پر موجود عبارات کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ موٹے مارکر سے اس نے جلی حروف میں ہیڈنگ دی تھی۔

"رمضان المبارک کا مہینہ کیسے گزاریں؟"

☆☆☆

سحری کا الارم بجا تو وہ آہستگی سے بیڈ سے اتری۔ مرتضٰی گہری نیند میں تھے۔ کمرے میں جلتے نائٹ بلب کی روشنی میں موٹے حروف میں لکھی چارٹ کی عبارات کافی حد تک واضح تھیں۔

"صبح آنکھ کھلتے ہی تین مرتبہ درود شریف پڑھیں اور اپنی ہتھیلیوں پر پھونک مار کر ہتھیلیاں چہرے پر پھیرلیں۔" یہ عمل کرکے وہ وضو کی نیت سے واش روم میں چلی گئی۔ وضو کرکے نکلی تو اگلا عمل تہجد کی ادائیگی کا تھا۔ اس نے جائے نماز بچھا کر مرتضٰی کو تہجد... کے لیے جگایا اور نیت باندھ لی۔ آج پہلا روزہ تھا اور رمضان کے آسان اور مختصر اعمال اس نے کسی میگزین میں پڑھے تھے سو وہیں سے چارٹ پر اتار لیے تاکہ... بہ آسانی اور باقاعدگی سے عمل کرسکے۔ کچھ اعمال اور تسبیحات اس نے خود شامل کرلی تھیں۔ وہ چاہتی تھی دن کا کوئی حصہ بھی عبادت سے خالی نہ جائے۔ تہجد ادا کرکے اس نے جانماز بچھی رہنے دی کیونکہ مرتضٰی وضو کرکے نکل آئے تھے۔ کمرے سے نکل کر اس نے کچن کا رخ کیا۔ اس کی ساس عاصمہ بیگم پراٹھوں کے پیڑے بنا رہی تھیں اور دوسرے برنر پر چائے رکھی تھی۔ سر پر لپٹا دوپٹا بتا رہا تھا کہ وہ بھی تہجد ادا کرچکی ہیں۔ وہ انہیں سلام کرکے ٹرے میں برتن سیٹ کرنے لگی۔

"مرتضٰی اٹھ گیا؟"

"جی امی، تہجد پڑھ رہے ہیں۔" عاصمہ بیگم نے دھیرے سے سر ہلایا اور بیٹی کو آواز لگائی۔

"سلوٰیٰ اٹھ جاؤ بیٹا۔"

دیا ٹرے لے کر لاؤنج میں موجود ڈائننگ ٹیبل تک آئی تو دیکھا سلوٰیٰ کے کمرے کی لائٹ آن تھی۔ وہ چائے کے مگ اور پلیٹیں وغیرہ ٹیبل پر سیٹ کرکے خالی ٹرے لیے واپس پلٹی تب سلوٰیٰ ڈھیلی ڈھالی چال چلتی کمرے سے نکلی۔ چہرہ اور اطراف میں بکھری لٹیں نم تھیں۔ دیا اسے دیکھ کر مسکرائی اور کچن میں جاکر چائے تھرماس میں انڈیلنے لگی۔ عاصمہ بیگم اب پراٹھے تلنا شروع ہوچکی تھیں۔ سلوٰیٰ نے تکلفاً کچن میں جھانکا اور واپس لاؤنج میں جاکر کونے میں پڑے صوفہ کم بیڈ پر لڑھک گئی۔ دیا زیرِلب مسکرائی اور انڈے فرائی کرنے شروع کردیے۔ اس کے لب مسلسل حرکت میں تھے۔ وہ پہلے عشرۂ رحمت کی دعا کا ورد کررہی تھی۔ اپنے اور سلوٰیٰ کے لیے انڈے فرائی کرکے اس نے چکن کا سالن برنر پر رکھا اور انڈوں کی پلیٹیں لیے میز تک پہنچی تو مرتضٰی بھی آگئے۔ مرتضٰی سحری میں کوئی سا سالن لیتے تھے، عاصمہ بیگم صرف چائے کے ساتھ پراٹھا لیتی تھیں جبکہ دیا اور سلوٰیٰ دونوں پراٹھے کے ساتھ انڈا لیتی تھیں۔ اس نے پانی کا جگ اور گلاس میز پر رکھے تو عاصمہ بیگم پراٹھے اور سالن لیے چلی آئیں۔ پہلی، پہلی سحری خوشگوار ماحول میں کھائی گئی۔ سحری مکمل کرتے ہی دیا برتن سمیٹنے لگی۔ سلوٰیٰ نے ماں کو دوائیں لاکے دیں۔ وہ بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں ساتھ کچھ طاقت کی دوائیں بھی لیا کرتی تھیں۔ مرتضٰی سے باتیں کرتے وہ دوائیں لینے لگیں۔ عاصمہ بیگم نے گھر کا اصول بنا رکھا تھا کہ سحری مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے ختم کرلی جائے تاکہ یہ اندیشہ نہ ہو کہ اِدھر اذانیں شروع اور اُدھر منہ میں پانی کا آخری گھونٹ۔ اس اصول کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اذانیں ہونے تک دیا برتن دھو کر کچن بھی صاف کرلیا کرتی تھی۔ سو آج بھی یہی ہوا۔ اذان مکمل ہوتے ہی مرتضٰی مسجد کے لیے نکل گئے اور دیا کچن سمیٹ کر بند کرکے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ عاصمہ بیگم کرسی پر ہی بیٹھی تسبیح کررہی تھیں جبکہ سلوٰیٰ پھر سے صوفہ کم بیڈ پر ڈھیر ہوچکی تھی۔

"یہ بھابی صاحبہ کیا منہ ہلائے جارہی تھیں؟" دیا کے کمرا بند کرتے ہی سلوٰیٰ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا تو عاصمہ بیگم استہزائیہ ہنسی ہنس دیں۔

ڈھکوسلے۔'' انہوں نے صرف سوچا کیونکہ تسبیح پر جو دعا پڑھ رہی تھیں وہ ادھوری تھی۔ مکمل کر کے دانہ گرایا اور ہاتھ روک کر ایک محتاط نظر دیا کے کمرے کے دروازے پر ڈالی پھر آہستگی سے بولیں۔

''رمضان ہے بھئی، اب تو خوب عبادتیں، خوب تسبیحات ہوں گی، لوگ بڑے نیک ہو جائیں گے۔''

کہہ کر وہ پھر سے تسبیح کرنے لگیں۔

''ہم سے تو نہیں ہوتے یہ ڈرامے۔ بھائی کو امپریس کرنے کے ناٹک ہیں سارے۔ بڑی توجہ سے جائزہ لے رہے تھے بھائی کہ جی کتنی عبادت گزار بیگم ہیں ان کی۔'' سلویٰ اپنے خوب صورت چہرے پر مزید بیزاری سجا کر بولی۔

''ارے یہ کیا اور ان کی عبادتیں کیا۔ باسی کڑھی کا ابال...... جو صرف رمضان میں چڑھتا ہے باقی کا سال موج مستی، شاپنگ اور آؤٹنگ۔ بس رمضان میں سارا دن ہونٹ ہلا کر سمجھیں کہ سارے سال کے گناہ پیشگی معاف اور سارے سال کی عبادتوں کا حق ادا۔'' عاصمہ بیگم دانہ گرا کر پرجوش سے بولیں۔ پھر سے دعا پڑھتے تسبیح کا ایک اور دانہ گراتے وہ سلویٰ کی طرف مڑیں۔

''اور اب تم بھی اٹھو، وضو کر کے نماز پڑھو، قرآن پاک تلاوت کرو، دیکھو ہم اپنی باتوں میں لگے ہیں اور وہ پاک بی بی نماز ادا کر چکیں اور اب غالباً تلاوت کی آواز آ رہی ہے۔'' سلویٰ نے چونک کر دیا کے کمرے کی جانب دیکھا۔ دبے پاؤں اس کے دروازے تک گئی پھر ماں کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا اور وضو کرنے چل دی۔ عاصمہ بیگم نے بھی تسبیح میں نشانی لگا کر کیل پر ٹانگی اور جائے نماز اٹھالی۔ عبادت و غیبت کا حسین امتزاج اور بھلا کہاں ملے گا۔ جو فرشتوں کو بھی پریشان کر دے کہ تسبیح و عبادت کا اجر لکھیں یا غیبت و بدگمانی کی وعید۔

☆☆☆

روزے کی نیت کر کے دیا نے چارٹ کے مطابق اکیس مرتبہ یا مالک پڑھ کر سینے پر پھونک ماری اور جائے نماز...... بچھا کر فجر کی نیت کر لی۔ لاؤنج سے باتوں کی ہلکی، ہلکی آوازیں آ رہی تھیں اور نوعیت بتاتی تھی کہ موضوعِ گفتگو اسی کی ذات ہے۔ سلام پھیر کر اس نے دعا مانگی اور جائے نماز لپیٹ کر اٹھ گئی۔ دروازے کے قریب رکھے ریک میں جائے نماز رکھتے ہوئے اس نے واضح سن گن لینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی پھر تاسف سے سر ہلاتی ہوئی پلٹی اور کمرے کے کارنر میں نصب خاص طور پر قرآن پاک کے لیے بنائے گئے اونچے سے تکون شیلف سے قرآن پاک اٹھا کر چوما اور بیڈ پر بیٹھ کر تلاوت کرنے لگی۔ اس اثنا میں باہر خاموشی چھا گئی۔ وہ بھی ایک لمحہ کو تلاوت روک کر خاموش ہوئی پھر سر جھٹک کر دوبارہ توجہ قرآن پاک پر مرکوز کر لی چونکہ وہ یہ آواز بلند تلاوت کرنے کی عادی تھی اس لیے عموماً کمرے میں ہی تلاوت کیا کرتی تھی۔ رمضان میں اس نے خود ایک روٹین بنائی ہوئی تھی کہ فجر کے بعد آدھا پارہ ضرور پڑھا کرتی تھی۔ بقیہ آدھا سو کر اٹھنے کے بعد گھر کی صفائی مکمل کر کے پڑھتی پھر کام کاج کی روٹین اور نوعیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک پورا پارہ ظہر اور عصر کے بعد پڑھ لیا کرتی تھی۔ یوں روز دو پارے پڑھنے سے یہ ہوتا کہ کسی دن بوجوہ تلاوت رہ جائے یا کم ہو پائے تب بھی رمضان کے ماہ کا قرآن پاک ادھورا رہنے کا خدشہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ آدھا پارہ پڑھ کے نشانی لگا رہی تھی جب مرتضیٰ کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ ان کے لیے جگہ خالی کرتی اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ مسکرا کر تلاوت کرنے بیٹھ گئے۔ دیا نے شیلف کے نچلے خانے سے اوراد و وظائف کا کتابچہ اٹھایا اور بیڈ کے دوسری جانب بیٹھ کے درج اذکار پڑھنے لگی۔

☆☆☆

مرتضیٰ اور دیا کی شادی کو دو برس کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اولاد کا فی الحال کوئی سلسلہ نہ تھا۔ عاصمہ بیگم اور سلویٰ پر مشتمل یہ مختصر سی سسرال بہت آئیڈیل نہیں تھی البتہ اتنی ظالم بھی نہ تھی کہ اولاد کے معاملے کو لے کر دیا

کو تنگ کرتے۔ کم سے کم اس معاملے میں عاصمہ بیگم کے دل میں خوفِ خدا تھا کہ یہ سراسر مالکِ ارض وسما کی مرضی تھی۔ وہ جسے چاہے دے اور جسے چاہے نہ دے۔

البتہ باقی دنیاوی و زمینی معاملات میں عاصمہ بیگم مداخلت کرنا اپنا حق و فرض سمجھتی تھیں۔ بظاہر ان کا گھرانا کافی آئیڈیل تھا۔ ساس، بہو، نند، بھابی کے تعلقات دنیا کے سامنے بہت اچھے تھے لیکن کچھ تھا جو دلوں کے اندر بہت اندر تھا۔ وہی روایتی جلن یا پھر یہ کہ ساس خواہ کتنی بھی اچھی ہو جائے بہو اور بیٹی کے معاملات کو جانبدارانہ انداز سے ہی دیکھتی ہے اور بہو سے پوری توقع کرتی ہے کہ وہ بہرصورت ساس اور نند کو ماں اور بہن سمجھے۔

''ماں، بہن بھی تو بہت کچھ کہہ دیتی ہیں وہ تو برا نہیں لگتا۔ ساس، نند کا کیوں لگتا ہے۔'' کہہ کر وہ سارا الزام دیا کے سر ڈال دیتیں جو یہ نہیں کہہ پاتی تھی کہ......

''بیٹی بھی تو بہت کچھ کر جاتی ہے، وہ قابلِ اعتراض کیوں نہیں لگتا۔ بہو کا کیوں لگتا ہے۔'' لیکن وہ بہو تھی۔ زبان بندی جس کا فرض اور سر جھکانا جس کا مقدر تھا۔ گھرانا کتنا بھی دین دار کیوں نہ ہو جہاں بات آئے بہو، بھابی کی وہاں سارا دین اُڑنچھو وہاں اخلاقیات، سماجیات اور سسرالیات کی کتاب کھل جایا کرتی ہے۔

☆☆☆

فجر کے بعد تلاوت واذکار پڑھ کے سب لوگ سو جایا کرتے تھے پھر دوبارہ جاگنے کا وقت دس ساڑھے دس کے درمیان ہوتا۔ مرتضیٰ کا الیکٹرانک مصنوعات کا ڈسپلے سینٹر تھا، مرحوم باپ کا چھوڑا چلتا ہوا کاروبار۔ سو کاروباری لوگ آرام سے ہی جایا کرتے ہیں۔ وہ بھی عموماً گیارہ بجے شاپ کھولتے اور رمضان میں بارہ بجے، دس بجے اٹھ کر وہ پہلے اخبار پڑھتے تھے پھر گھر کا سودا سلف لا کر شاپ پر جایا کرتے تھے۔ پہلا روزہ تھا، کچن کی بیشتر خریداری تو رمضان کے آغاز سے دو روز قبل ہی کر لی گئی تھی سو فی الحال کوئی سودا نہیں لانا تھا۔ مرتضیٰ لاؤنج میں اخبار سنبھال کر بیٹھ گئے۔ عاصمہ بیگم نے بھی اخبار کا دوسرا حصہ اٹھا لیا۔ سلویٰ کمرے سے نکلی تو ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ دیا نے چارٹ پر درج ہدایات کے مطابق کام کاج شروع کرنے سے پہلے اکیس مرتبہ یا غفار پڑھا اور جھاڑو اٹھا کر سب سے پہلے ساس کے کمرے کا رخ کیا۔ عاصمہ بیگم نے ایک نظر مرتضیٰ کو دیکھا۔ وہ اخبار میں بری طرح منہمک تھے۔ دوسری نگاہ کام کرتے ہوئے زیرِلب تسبیح پڑھتی اپنی اکلوتی بہو پر ڈالی اور تیسری نگاہ ٹی وی کے آگے جمی بیٹھی اپنی بیٹی سلویٰ پر آ کے ٹھہر گئی۔ انہوں نے بڑی بےقراری سے پہلو بدلا۔ سلویٰ بالکل بھی متوجہ نہ تھی۔ وہ ذرا سا کھنکھاریں۔ ہنوز نتیجہ صفر۔ طیش میں آ کے انہوں نے دانت پیستے ہوئے نیچی آواز سے اسے پکارا تو وہ چونکی۔ ماں کے چہرے پر چھائی سختی۔ کچھ باور کروانے کا انداز لیے ہوئے تھی۔ اس نے افرادِ خانہ پر غور کیا تو ماں کے کمرے سے آتی صفائی کی کھٹ پٹ نما آوازوں پر معاملہ سمجھ گئی۔ ناچار وہ ٹی وی آف کر کے بھابی کی مدد کروانے اٹھ گئی لیکن صفائی کے دوران ماں کی ہدایت کے مطابق وہ بھائی کے سامنے، سامنے رہی۔ دیا ساس کے کمرے کی صفائی میں مگن تھی۔ عاصمہ بیگم اور سلویٰ کے کمروں کے بیچ کی دیوار میں ایک چھوٹا دروازہ تھا جو دونوں کمروں کو ملاتا تھا۔ سلویٰ اپنے کمرے کا مرکزی دروازہ ہمیشہ لاک رکھا کرتی تھی اور آمد و رفت کے لیے ماں کا کمرا استعمال کرتی تھی سو دیا ساس کے کمرے کی صفائی کے بعد اسی درمیانی دروازے سے سلویٰ کا کمرا بھی صاف کر دیا کرتی تھی۔ یوں مرتضیٰ کو کبھی اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ سلویٰ کا کمرا بھی صاف کرتی ہے۔ کبھی کبھار ماں کی باتوں میں الجھ کے وہ دبے لفظوں میں کہہ بھی دیتے تھے۔

''دیا تم گھر کی صفائی کرتی ہو سلویٰ تمہاری بھرپور مدد کرواتی ہے تو تم بھی امی کا کمرا صاف کرتے ہوئے سلویٰ کا کمرا بھی دیکھ لیا کرو۔ سلویٰ کو چھوٹی بہن سمجھو، نند نہیں۔'' نرم لہجے میں کیا گیا یہ شکوہ دیا کا دل

توڑ کے رکھ دیا کرتا تھا۔

”مرتضیٰ، سلوئی کے کمرے کا بیرونی دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے اسی لیے آپ کو کبھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ میں اندرونی دروازہ استعمال کر کے اس کا کمرا بھی روز صاف کرتی ہوں۔ وہ واقعی میرے لیے چھوٹی بہنوں جیسی ہے۔“ وہ جواباً ضرور کہتی۔

”او کے ڈیئر بس خیال رکھا کرو۔“ مرتضیٰ جھگڑا نہیں کرتے تھے، اس کی بات کی نفی بھی نہیں کرتے تھے اور بحث بھی نہیں کرتے تھے لیکن ان کے انداز میں کچھ تو ایسا ہوتا تھا جو دیا کو یہ باور کرا دیتا تھا کہ مرتضیٰ کو اس کے بیان پر یقین نہیں آیا تھا اور اس کی وجہ یقیناً اس کی ماں کا وہ بیان تھا جو بیوی کے بیان پر بہر حال فوقیت رکھتا تھا۔ جب دیا صفائی مکمل کر کے اپنے کمرے کی راہ لیتی تب سلوئی ماں کے پاس آ کے کہتی۔

”اچھا امی، میں ذرا اپنا کمرا دیکھ لوں۔“ یہ مبہم سا جملہ کہتی وہ پلٹ جاتی اور عاصمہ بیگم انتہائی سرسری سے لہجے میں بولنے لگتیں۔

”مہمانوں کے آنے جانے کا کوئی پتا نہیں ہوتا سو پہلے باقی گھر کی صفائی ضروری ہوتی ہے۔ سلوئی کے کمرے میں کسی نے جانا نہیں ہوتا اس لیے میں نے اسے کہا ہوا ہے کہ پہلے بھابی کے ساتھ بقیہ گھر کی صفائی مکمل کروایا کرو پھر آخر میں اپنا کمرا صاف کیا کرو۔“

یوں بے حد عام سے بے ضرر سے انداز میں وہ مرتضیٰ کے کان بھر دیتی تھیں جسے کان بھرنے کا نام بھی نہ دیا جا سکے اور مرتضیٰ بس سر ہلا دیا کرتے تھے۔ وہ ماں اور بیوی دونوں میں بیلنس رکھنا چاہتے تھے سو معاملہ فہمی سے کام لیا کرتے تھے اور اب تک خاصے کامیاب بھی تھے۔

☆☆☆

دیا کی شدید خواہش کے باوجود اسے کوکنگ کا چارج نہیں مل سکا تھا۔ وہ صرف ہیلپر کے کام سرانجام دیا کرتی۔ کھانا عاصمہ بیگم خود پکاتی تھیں اور اس امر کے پیچھے وہی روایتی سوچ کارفرما تھی کہ کچن خاتونِ خانہ کی راجدھانی ہوتا ہے اور کوئی بھی عورت اپنی راجدھانی سے آسانی سے دستبردار نہیں ہوا کرتی کجا کہ یہ راج پاٹ بہو کو سونپ دے پھر جو عورت بیوہ ہو جائے اس کا تو ویسے بھی زندگی کا محور اس کا بیٹا بن جاتا ہے۔ یوں ساس بہو کی چپقلش جنم لیتی ہے۔ عورت سہاگن بھی ہو پھر بھی اس کے اپنے شوہر سے تعلقات خراب رہتے ہوں، اختلافات ہوں یا سرد مہری والا رشتہ ہو تب بھی وہ عورت، بہو کے لیے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ طلاق یافتہ اور بیوہ تو ٹھہریں محروم تمنا۔ ہاں جس عورت کے اپنے شوہر سے تعلقات مثالی ہوں وہ کبھی اپنے بہو کے لیے روایتی ظالم ساس ثابت نہیں ہوتی۔ یہاں ایک اور پوائنٹ بھی ہے۔ شوہر کے ساتھ مثالی تعلقات رہے ہوں لیکن اب وہ بیوہ ہے تب بھی مسئلہ ہے اور عاصمہ بیگم اس آخری قسم سے تعلق رکھتی تھیں۔ بہو سے حسد اور جلن محسوس کرتی تھیں اور وہی زہر بیٹی میں بھی منتقل کرتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

رمضان میں عاصمہ بیگم کی روٹین تھی کہ اخبار پڑھ کر وہ ظہر سے پہلے، پہلے ہنڈیا چڑھا لیتی تھیں۔ مرتضیٰ شاپ پر چلے جاتے تھے۔ سلوئی بی اے کے ایگزام دے کر فارغ تھی سو وہ اپنے مشاغل کو زیادہ وقت دیا کرتی۔ دیا ان اوقات میں کپڑے دھونے یا استری کرنے جیسے کام نمٹایا کرتی۔ عاصمہ بیگم ہنڈیا چڑھا کر کچن سے نکلتیں تو دیا کوکنگ کے دوران استعمال ہونے والے تھوڑے بہت برتن دھو کر کچن صاف کر کے بند کر دیا کرتی تھی۔ ہنڈیا چڑھاتے وقت ہی عاصمہ بیگم پکوڑوں کے لیے بیسن گھول کے ڈھک کے رکھ دیا کرتیں۔ کئی گھنٹے گھولا ہوا پڑا رہنے سے پکوڑے زیادہ مزیدار بنتے ہیں۔ اس سب کے بعد عاصمہ بیگم کا کام ختم ہو جاتا تھا۔ عصر کے بعد افطاری کی تیاری شروع کی جاتی تھی اور وہ ڈیوٹی سلوئی اور دیا کی تھی۔ عاصمہ بیگم اس وقت صرف تلاوت کلام پاک کیا کرتیں، دیا پکوڑے اور فروٹ چاٹ بناتی تھی جبکہ سلوئی کے ذمے شربت بنانا اور روٹیاں پکانے کا کام

تھا۔ اس دن بھی عاصمہ بیگم مسالا بھون کر آنچ دھیمی کر رہی تھیں جب مرتضیٰ شاپ پر جانے کے لیے ماں کو اللہ حافظ کہنے آئے۔

''آج کا کیا مینو ہے امی جی؟'' عاصمہ بیگم بیسن کا جار اٹھا کے دیکھ رہی تھیں، اندازے سے پیالے میں بیسن نکالتے ہوئے انہوں نے سر اٹھا کر بیٹے کو دیکھا۔

''سلویٰ نے بریانی کی فرمائش کی تھی۔ میں نے سوچا دیا کو بھی بہت پسند ہے۔ شروع روزوں میں تو کھانے پینے کی روٹین سیٹ نہیں تھی تو اہتمام ہی نہ کر سکے۔ آج سلویٰ بھی موڈ میں ہے۔ بریانی کے ساتھ کباب، رائتہ اور سلاد ہو جائے گا۔ سلویٰ نے افطاری میں چنا چاٹ اور کٹلس کا پلان بنایا ہے۔'' اپنی اور سلویٰ کی پلاننگ بیٹے کے گوش گزار کر کے وہ دانستہ طور پر پکوڑوں اور فروٹ چاٹ کا تذکرہ حذف کر گئیں جو دیا کی ذمے داری تھا اور مرتضیٰ کو بھی خیال نہ آیا۔ افطاری کی تیاری کے منظرنامے میں ماں اور بہن چھائی نظر آئیں وہ بے اختیار بولے۔

''دیا کو بھی ساتھ لگایا کریں، آپ کی ہیلپ کروا دیا کرے یا کبھی کبھار کوئی آئٹم وہ بھی بنا لیا کرے۔'' بیسن میں مسالے مکس کر کے پھینٹتے ہوئے وہ مسکرائیں۔

''ہاں تو آ جائے بے شک، ہیلپ کرا لے یا کوئی ڈش بنائے ہم نے کب روکا۔ اس کا اپنا گھر ہے شوق سے جو چاہے بنائے جو کام چاہے کرے۔ ہم نے کب کوئی روک ٹوک کی۔'' انتہائی فراخدلانہ انداز میں سیاسی قسم کا بیان دیتے ہوئے انہوں نے بیسن کا پیالہ پیچھے کھسکا کر پلیٹ سے ڈھکا اور گندے برتن جمع کر کے سنک میں ڈالنے لگیں۔ اب یہ کام تو روز دیا ہی کرتی تھی لیکن چونکہ بیٹا موجود تھا سو مقاصد تبدیل ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ برتن دھونا شروع ہو گئیں۔ شامتِ اعمال دیا اس وقت نہانے کے لیے واش روم گئی ہوئی تھی۔ یہ بات مرتضیٰ کو معلوم تھی سو ماں کو برتن دھوتے دیکھ کر انہوں نے دروازے سے باہر سلویٰ کے کمرے کی جانب جھانکا لیکن انہیں اندازہ نہیں ہو پایا کہ سلویٰ کہاں تھی اور کیا کر رہی تھی۔ عاصمہ بیگم نے مرتضیٰ کی نگاہوں کا مرکز بھانپ لیا لیکن وہ واپس کچن میں آ کے خاموشی سے سلیب سے ٹیک لگا کے کھڑے ہو گئے تو عاصمہ بیگم ذرا کھٹک گئیں۔ دھلے برتن ریک میں لگا کر وہ اپنے ازلی سرسری انداز میں بولیں۔

''سلویٰ ابھی ابھی میرے سارے کپڑے اٹھا کر استری کرنے لے گئی ہے۔ بہت غصہ ہو رہی تھی مجھ پر کہ امی آپ بہت بے پروا ہو رہی ہیں بنا استری کے مسلے ہوئے کپڑے پہنتی رہتی ہیں۔ میں نے بہت کہا کہ رہنے دو، مجھے بھلا کس نے دیکھنا ہے تم لوگ جوان ہو، سجنا سنورنا بنتا بھی ہے لیکن یہ ضدی لڑکی ہفتے بھر کے سوٹ اٹھا کے لے گئی کہ استری کر کے لٹکا دوں گی جو دل کرے پہن لیجیے گا۔ دیا کیا ریسٹ کر رہی ہے؟'' ہنستے، ہنستے بات کرتے ہوئے آخر میں اپنی بات میں ایک پھندنا ٹانک کر بیٹے کی طرف دیکھا جو بغور ماں کی بات سنتے ہوئے ان کے سلیب صاف کرتے ہاتھوں پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ آخری بات پر جیسے چونک کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ ٹراؤزر کی پاکٹس تھپتھپا کر موبائل اور والٹ کی موجودگی کا یقین کیا اور ماں سے بھی زیادہ سرسری لہجہ اپنایا۔

''نہیں امی، وہ شاور لے رہی ہے اچھا اللہ حافظ۔'' کہہ کر ماں کے آگے سر جھکا کر پیار لیا اور لاؤنج سے گاڑی کی چابی اٹھا کر نکل گئے۔ پورچ میں گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر وہ سلیب صاف کرنے والا کپڑا دھوتے، دھوتے فاتحانہ مسکرائیں۔ کپڑا اسٹینڈ پر پھیلا کر وہ مڑیں۔ اب ان کا رخ بیٹی کے کمرے کی جانب تھا۔ درمیانی دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو سلویٰ بیگم بیڈ پر اوندھی لیٹی سامنے لیپ ٹاپ دھرے انٹرنیٹ پر مصروف تھی۔

''اور جو مرتضیٰ تمہارے کمرے میں جھانک لیتا ناں تو میں جھوٹی پڑ جاتی۔'' عاصمہ بیگم نے دانت پیس کر بیٹی کو ساری بات بتائی اور کوسنے لگیں۔

''تو میں کہہ دیتی کہ سارے سوٹ پریس ہو گئے

کیونکہ میں آپ کی بات سن چکی تھی البتہ آپ سے گزارش ہے کہ والیوم تھوڑا کم رکھا کریں۔ بھابی ساری بات آرام سے سن لیتی ہوں گی۔'' سلوئی ہنس دی اور بے پروائی سے لیپ ٹاپ پر کھٹا کھٹ بٹن پریس کرتے ہوئے بولی۔

''تو سنا کرے۔ میں کوئی اس سے ڈرتی ہوں اور میں کون سا اس کی برائی کررہی تھی اپنے بیٹے سے بات کررہی تھی۔'' عاصمہ بیگم تنک کر بولیں۔ وہ کچھ اور بھی کہتیں لیکن دیا کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو فوراً درمیانی دروازہ بند کر کے جائے نماز بچھالی کیونکہ دیا کا رخ کچن کی جانب تھا۔ برتن دھلے دیکھ کر اس نے لازمی آکر ساس سے استفسار کرنا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے عاصمہ بیگم نے فوراً ظہر کی نیت باندھ لی اور ٹھیک اسی لمحے دیا نے اندر جھانکا۔ انہیں نماز پڑھتا دیکھ کر وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اس کا ارادہ تھا برتن دھو کے کچھ دیر تسبیحات کرے گی پھر ظہر پڑھے گی۔ وہ نہا کر جب نکلی تو ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑے بال سلجھاتے ہوئے ساس کی گفتگو اس کے کانوں میں پڑی وہ سن کھڑی رہ گئی۔

''اور اب مرتضیٰ کہیں گے کہ... میری ماں کو کپڑے تک استری کر کے دینے والا کوئی نہیں۔ بہن کو احساس ہوا بیوی کو بھی نہیں ہوا۔'' وہ اپنے استری شدہ سوٹ پر نظریں جمائے سوچ میں گم ہوگئی۔ اس نے بارہا عاصمہ بیگم کو خود کپڑے استری کرتے دیکھا تھا اور سلوئی نے کبھی ان کے کپڑے استری نہیں کیے تھے جبکہ وہ خود ہر بار ساس کے ہاتھ سے کپڑے لینے کی کوشش کیا کرتی مگر ہر بار وہ ہنس کر کہہ دیا کرتیں۔

''ارے نہیں، تم کوئی اور کام دیکھ لو میں تو بس ایک ہاتھ مار کر سیدھا کرتی ہوں کپڑوں کو۔ یہ لو ہو بھی گئے۔'' کہہ کر وہ استری بند کردیتی تھیں۔ ''اور آج......''

عموماً وہ کپڑے استری بھی ان اوقات میں کرتی تھیں جب دیا کمرے میں ریسٹ کررہی ہوتی تا کہ اسے پتا نہ چلے اور بعد میں وہ کہہ دیتی تھیں کہ کپڑے سلوئی نے استری کیے۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ.... جانماز بچھا کر ظہر پڑھنے کھڑی ہوگئی۔ پوری نماز میں اس کا دھیان بھٹک بھٹک کر ساس، نند کی چالبازیوں میں ہی الجھتا رہا۔ اس کی سسرال میں بڑا جھگڑا کبھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہی چھوٹی، چھوٹی باتیں تھیں جو قطرہ، قطرہ دریا بناتی جارہی تھیں اور دیا کو لگ رہا تھا وہ اس دریا میں ڈوبتی جارہی ہے اور ایک دن آئے گا جب مرتضیٰ کنارے کھڑے اسے ڈوبتا دیکھتے رہ جائیں گے۔

نماز مکمل کر کے اس نے چارٹ میں دی گئی ہدایات کے مطابق اکیس مرتبہ یا قہار پڑھا اور دل کی جگہ پھونک مار کر جائے نماز لپیٹ لی۔ لاؤنج کے کونے میں موجود ریک میں جانماز رکھتے ہوئے اس نے دیکھا عاصمہ بیگم تسبیح تھامے کمرے میں ہی ٹہل رہی تھیں۔ وہ ان کے کمرے کے دروازے پر آکے رکی تو ان کی واک بھی تھم گئی۔

''کوئی کام ہو تو بتادیں امی جی۔'' دھلے برتنوں کا تذکرہ اب بے معنی تھا۔ انہوں نے خود ہی جتادینا تھا اور ہوا بھی یہی وہ تسبیح کے دانے گراتے ہوئے شفقت سے بولیں۔

''نہیں، نہیں تم اب ریسٹ کرو اب بس افطاری کی تیاری کے لیے ہی عصر کے بعد آنا۔ ابھی قرآن پاک پڑھ لو یا کوئی تسبیح۔ میں بھی تسبیح کر کے ذرا کمر ٹکاؤں گی۔ برتن تو میں نے ہنڈیا چڑھاتے ہوئے ساتھ، ساتھ دھو لیے تھے۔ ہاتھ کے ہاتھ کام سمیٹو تو مشکل نہیں ہوتی۔ تم بھی اب جاکے ریسٹ کرو۔'' کہتی ہوئی پھر سے ٹہلنے لگیں تو دیا تلخی بھرے گھونٹ بھرتی مڑ گئی۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے تھکے، تھکے انداز میں بیڈ پر آبیٹھی۔ اس کے نم بالوں سے اب بھی قطرے ٹپک رہے تھے۔ شفاف قطروں کو کپڑے بھگوتے دیکھ کر کچھ قطرے اس کی آنکھوں سے بھی ٹپکے اور پانی کے ان خوشبودار قطروں کے ساتھ مل گئے۔

☆☆☆

گھر چھوٹا سا تھا پانچ مرلے۔ مرتضیٰ کے والد

مرحوم مصطفیٰ کلیم صاحب نے اچھے وقتوں میں تعمیر کروایا تھا۔ ہر آسائش سے مزین مگر سادہ۔ مرتضیٰ اور سلویٰ بس دو ہی بہن بھائی تھے۔ گھر میں تین بیڈ روم تھے اور تینوں اٹیچڈ باتھ، لاؤنج، ڈرائنگ روم اور پورچ۔ چھوٹی سی اس فیملی کے لیے بالکل موزوں...... نقشہ کچھ یوں تھا کہ پورچ سے لاؤنج میں داخل ہوتے تو دائیں ہاتھ پر ڈرائنگ روم جس کا ایک دروازہ پورچ میں بھی کھلتا تھا۔ اس کے ساتھ کچن جڑا تھا بائیں جانب دیکھیں تو مرتضیٰ اور دیا کا کمرا تھا اور سامنے مرکزی دیوار میں ساتھ، ساتھ جڑے دو کمرے۔ عاصمہ بیگم اور سلویٰ کے۔ لاؤنج بس اتنا تھا کہ چار کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل اور ایک صوفہ کم بیڈ سمایا ہوا تھا۔ یوں سلویٰ کے کمرے کے ساتھ کچن جڑا تھا اور عاصمہ بیگم کے کمرے کے ساتھ دیا کا کمرا۔ یہی وجہ تھی کہ اسٹار پلس کا ڈراما نہ ہونے کے باوجود اسٹار پلس کی طرح ایک دوسرے کی باتیں بھی بہ آسانی اور کبھی پلاننگ کے ساتھ سن لی جاتی تھیں۔ اس کام میں سلویٰ اور عاصمہ بیگم ماہر تھیں تو دیا انہیں دیکھ دیکھ کر تربیت لے رہی تھی۔

☆☆☆

''بعد ظہر تھوڑی دیر سونے کے لیے لیٹیں تو اکیس مرتبہ یاخبیرُ پڑھیں۔'' ساس کی باتوں پر دلگرفتہ ہوتی وہ لیٹی تو سامنے چسپاں چارٹ پر نظر پڑی۔ اسے پڑھ کر وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹی ہی تھی کہ موبائل پر میسج ٹون بجی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' مرتضیٰ کا میسج تھا۔

''ریسٹ۔'' اس نے ایک لفظی ریپلائی بھیج کر موبائل پاس ہی رکھ لیا۔ لاشعوری طور پر وہ جواب کے انتظار میں تھی۔

''نہ کبھی جھوٹ بولنا آیا نہ اپنے کام کاج جتا کر سازشوں کی بنیاد رکھنا آیا۔'' وہ یاسیت سے سوچتی خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔ مرتضیٰ کا پھر کوئی میسج نہیں آیا غالباً انہیں ریسٹ پر اعتراض ہوا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر چیک کیا کہ شاید اسے آواز نہ آئی ہو۔ کچھ دیر یوں ہی بار، بار چیک کرتی رہی پھر غصے سے موبائل بیڈ پر پٹخ کر دوسری جانب رخ پھیر کر یوں کروٹ لی گویا وہ موبائل نہ ہو بلکہ مرتضیٰ خود ہوں پر غصے میں بھلا نیند آئی ہے کبھی۔

''کسی وقت غصہ آئے تو اکیس مرتبہ یاحفیظُ پڑھیں۔''

کروٹ کے بل بھی نگاہ چارٹ پر پڑی وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھ بیٹھی۔ ورد پورا کیا اور خود پر پھونکا تو کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا یک دم موبائل بجا۔ اس نے پھرتی سے اٹھایا کہ شاید مرتضیٰ کی کال ہو مگر اسکرین پر پیاری ماں کے الفاظ بلنک کر رہے تھے۔ وہ مسکرا اٹھی۔ پھر ماں سے دکھ سکھ کرتے دل کی بھڑاس نکالی۔ ساس، نند کی جی بھر کر غیبتیں کرتے ہوئے وہ اور اس کی ماں دونوں فراموش کر گئیں کہ یہ ماہِ رمضان ہے۔ بس اس کے دکھے دل کو سکون آجاتا تھا روز ساس نند کے دکھڑے ماں کو سنا کے۔ گھنٹا بیچ مکمل ہوا تو گھڑی پر نظر گئی اور پھر اسی کے نیچے لگے اس رمضان چارٹ پر۔

''افوہ، اس گھنٹے میں، میں نے کلمے کی تسبیح مکمل کرنی تھی۔'' اسے افسوس ہوا چند لمحے خود کو کوسنے میں صرف کیے پھر اٹھی اور قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر میں عصر کا وقت ہو جاتا پھر افطاری کی تیاری شروع کرنی تھی۔ اس نے اپنی نشانی سے ربن پکڑ کر قرآن پاک کھول کر اسے چوما مگر دل میں ایک خاموش سرد جنگ سی چھڑی ہوئی تھی۔

''رمضان، عبادات اور...... یہ ہم کیا کر رہے ہیں۔'' پھر سر جھٹکا۔ ''اللہ غفور و رحیم ہے۔ لیکن پھر بھی کوئی تو سوچے، ہم عبادات کرتے ہیں پھر غیبتیں کرتے ہیں پھر تسبیحات کرتے ہیں پھر ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے ہیں پھر نوافل ادا کرتے ہیں پھر جھوٹ بولتے ہیں پھر تہجد پڑھتے ہیں پھر بدگمانیاں پالتے ہیں۔ یہ کیا بن رہا ہے؟ کیا بنا رہے ہیں ہم اپنے لیے؟ گڑبڑ گھٹالا کسی ایک بھی چیز کا کوئی فائدہ ہے......؟''

☆☆☆

عاصمہ بیگم آرام کی غرض سے لیٹی تھیں۔ سلوی لاؤنج سے اخبار اٹھانے آئی۔ کونے میں پڑے چھوٹے سے پلاسٹک ریک کے اوپری شیلف پر جانمازیں رکھی ہوتی تھیں۔ درمیانی شیلف پر اخبارات اور سب سے نچلے شیلف پر میگزین وغیرہ رکھے ہوتے تھے، وہ جھک کر اخبار اٹھانے لگی تو دیا کے کمرے سے باتوں کی ہلکی، ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اخبار اٹھا کر سیدھی ہوئی اور تھوڑا آگے ہوکے سننے لگی اور بس عورت کی فطرت میں یہ تجسس اور ٹوہ لینے کی خصلت نہ ہوتو بہت کچھ سنور جائے لیکن کیا، کیا جائے کہ عادت تو بدلی جاسکتی ہے لیکن فطرت نہیں۔

''کتنا صبر کروں امی، دو سال تو ہوگئے ہیں حالات ذرہ بھر بھی نہیں بدلے۔ ہمیشہ یہ لوگ میرے ساتھ یہی کرتے ہیں۔ میں امی اور سلوی کا کتنا خیال کرتی ہوں، کتنے خلوص سے اپنا سمجھ کے کام کرتی ہوں پھر بھی نہ جانے کیوں یہ لوگ ہر وقت میرے لیے گڑھے ہی کھودتی رہتی ہیں۔ وہ تو شکر ہے مرتضیٰ اچھے ہیں ان لوگوں کی باتوں میں نہیں آتے لیکن پھر بھی۔ قطرہ، قطرہ آخر پتھر میں شگاف ڈال ہی دیتا ہے۔'' دیا قدرے جوش میں آگئی تھی سو آواز تھوڑی سی اونچی بھی ہوگئی تھی۔

سلوی کے تو تن بدن میں گویا چنگاریاں اور شرارے پھوٹ پڑے۔

''مجھے تو بس...اب صرف سلوی کی شادی کا انتظار ہے۔ اپنے ہی جیسی نند سے جب واسطہ پڑے گا ناں تو لگ پتا جائے گا۔ ساری چالبازیاں اور طراریاں بھول جائے گی پھر اماں بھی اپنی بیٹی کے چکروں میں میرے خلاف سازشیں کرنا بھول جائیں گی اللہ ہی سمجھے انہیں تو۔''

اور بس سلوی سے مزید کھڑا ہونا دوبھر ہوگیا۔ وہ من، من بھر کے قدم لیے ماں کے کمرے میں آئی اور ان کی پائنتی کی طرف دھڑام سے بیٹھ کر جو رونا شروع ہوئی تو عاصمہ بیگم جو دھڑام کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھیں اسے روتا دیکھ کر ہوش وحواس کام کرنا چھوڑ گئے۔

''ارے کیا ہوا بیٹی...... میری بچی...... سلوی؟''

وہ بے ربط انداز میں بولتی ہوئی سلوی کے نزدیک آئیں۔ اس حواس باختگی میں بھی انہیں پرائیوسی نہیں بھولی۔ انہوں نے جھٹ سے ہاتھ بڑھا کر چھکوں پھکوں روتی سسکتی سلوی کو گھسیٹا اور اس کے کمرے میں لے گئیں۔ بیڈ پر بٹھا کر پانی لانے اٹھیں تو خیال آیا رمضان ہے۔ پھر کمر سہلانے لگیں۔

''بس میری بیٹا، بولو تو سہی ہوا کیا...... تم تو اچھی بھلی اپنے کمرے میں تھیں۔ اچانک کیا ہوگیا......؟''

اور بیٹا کا آتش فشاں پھٹ پڑا اور پھر ایک کی دس کے بجائے پچاس لگائیں آنسوؤں کے تڑکے کے ساتھ۔

☆☆☆

خاموشی سے آکر ٹھہرے ہوئے طوفان سے بے خبر ...محترمہ دیا مرتضیٰ صاحبہ سکون سے سپارہ ختم کر کے اٹھیں۔ قرآن پاک شیلف پر رکھ کے بیڈ کی چادر درست کی اور عصر کی نیت باندھ لی۔ نماز پڑھ کے وہ درود پاک کا ورد کرتی کمرے سے نکلی اور کچن کا رخ کیا۔ کچن میں سلوی کو مصروف دیکھ کر اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

''سلوی کچن میں کام کرے اور اتنی خاموشی سے بنا کسی شور شرابے کے...... بنا برتن کھڑکائے آج کون سی انہونی ہوگئی۔'' وہ حیرت سے سوچتی آگے بڑھی تو ایک اور جھٹکا لگا۔ ایک برنر پر چنے ابل رہے تھے، دوسرے پر آلو اور تیسرے پر املی کی چٹنی پک رہی تھی۔ کچھ ابلے آلو چھلے ہوئے ایک بڑے پیالے میں پڑے تھے اور سلوی دھنیا، پودینہ اور ہری مرچیں بکھرائے چٹنی تیار کررہی تھی۔ وہ مزید حیران ہوئی چند قدم اور آگے بڑھی اور ایک اور جھٹکا لگا۔ سلوی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تک نہیں...... پکوڑوں کے آمیزے کے قریب ہی پیاز اور آلو بھی کٹے پڑے تھے۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ آج کیا مینو ہے۔ اسے ذرا سُبکی کا احساس تو ہوا لیکن پھر بھی جاننا تو ضروری تھا۔

''کیا بنا رہی ہو سلویٰ؟ کوئی اسپیشل اہتمام تھا تو مجھے بھی بتا دیتیں، میں تمہارے ساتھ ہیلپ ہی کرا دیتی۔ کب سے لگی ہو؟ دن میں ریسٹ نہیں کیا؟'' وہ سلویٰ کے دل کی حالت سے بے خبر اپنی ہی دھن میں بولے گئی مگر سلویٰ کی جانب سے جواب ندارد..... تھوڑا آگے ہو کر ہری چٹنی کو پیالے میں انڈیلتی سلویٰ کے چہرے کو اس نے بغور جانچا۔

''کیا ہوا ہے سلویٰ؟'' نہ جانے اس کے چہرے پر ایسا کیا تھا کہ سلویٰ مزید کچھ بول نہیں سکی۔ سلویٰ ایک سپاٹ سی نگاہ دیا پر ڈال کر پیالے میں رکھے ابلے آلوؤں کو چھیلنے لگی۔

''کچھ نہیں، چاٹ وغیرہ بنا رہی ہوں۔'' آلو چھیل کر مسالے ڈالتے ہوئے اس نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا تو دیا کو غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ یک دم اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔

''یہ نہ جانے کب سے کچن میں لگی ہے کہیں اس نے میری گفتگو تو نہیں سن لی؟'' اس سوچ سے ہی دیا کا چہرہ زرد پڑنے لگا۔ اب وہ مزید کچھ بھی پوچھتی سلویٰ نے جواب نہیں دینا تھا۔ اتنا تو وہ جان ہی گئی تھی اسے..... سو باسکٹ سے چھری اٹھا کر فروٹ چاٹ بنانے کے لیے فروٹس چننے لگی تب چھلے آلوؤں کی ٹکیاں بناتی سلویٰ کے ہاتھ ذرا گی ذرا تھمے اور وہ تیزی سے بولی۔

''فروٹ چاٹ میں بنا کر فریج میں رکھ چکی ہوں۔'' اور دیا کے ہاتھ فروٹ باسکٹ میں ہی جم گئے۔ اب کے اسے شدید ترین گڑبڑ کا احساس ہوا اور اپنا اندیشہ درست لگنے لگا۔ وہ فروٹس چھوڑ کر پلٹی اور اب کے خود کو سوال کرنے سے روک نہیں پائی۔

''کیوں سلویٰ، ایسی کیا بات ہو گئی؟ دو سال ہو گئے یہ روٹین ہے کہ فروٹ چاٹ اور پکوڑے میں ہی بناتی ہوں پھر آج کیا ہوا ہے؟ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟ کوئی ناراضی ہے مجھ سے؟''

سلویٰ کا رنگ قدرے پھیکا پڑ گیا۔ وہ چونکہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی سو کبھی کسی مسئلے میں ڈائریکٹ نہیں الجھتی تھی اور نہ ہی دو بدو جھگڑا کرتی تھی، وہ ہمیشہ ماں کو آگے کیا کرتی تھی۔ اور فی الوقت وہ کمرے میں تھیں۔ سو اسے اپنی ٹون تھوڑی چینج کرنی پڑی۔ دیا کو ٹالنا ضروری تھا۔

''نہیں، اصل میں مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ مرتضیٰ بھائی چنا چاٹ اور کٹلس کی فرمائش کر کے گئے تھے سو میں نے سوچا اسی کی تیاری کر لوں۔ چنے اور آلو ابلنے میں ٹائم لگ رہا تھا۔ میں فارغ تھی تو فروٹ چاٹ بھی بنا لی۔'' اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور کٹلس کی ٹکیوں والی پلیٹ اٹھا کے سائڈ پر رکھتے ہاتھوں میں واضح لرزش تھی۔ دیا نے مزید کچھ بھی کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کچن سے نکل کر لاؤنج میں آ بیٹھی۔ یہ تو طے تھا کہ اب اسے افطاری تک مزید کچھ بھی کرنے نہیں دیا جائے گا۔ وہ اپنی ساس، نند کو بخوبی جانتی تھی۔ سو وہ ہی اخبار اٹھا کر بیٹھ گئی جسے لینے سلویٰ کمرے سے نکلی تھی اور پھر اس پر دیا کے دل کے راز کھلے تھے۔ نظریں اخبار پر جبکہ دھیان کچن میں ابلے چنے اور آلو مکس کر کے چٹنیاں ملاتی سلویٰ میں اٹکا تھا۔ دوسری طرف سلویٰ کا دھیان بھی سارا اخبار میں منہ گھسائے بیٹھی دیا کی جانب تھا۔ اتنے میں عاصمہ بیگم کمرے سے نکلیں۔ سر پر لپٹا دوپٹا بتا رہا تھا کہ وہ عصر پڑھ کے نکلی ہیں۔ وہ بھی سیدھی کچن میں چلی گئیں۔ وہ اخبار واپس پٹخ کر ساس کے پیچھے کچن میں چلی آئی۔

''بھلے سے کچھ نہ کرنے دیں، میں بھی ان کے سروں پر سوار رہوں گی۔'' سوچتے ہوئے وہ کچن کے دروازے کی چوکھٹ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ لبوں پر درودِ پاک کا ورد تھا۔ دل میں بغض تھا...... لیکن دوسری طرف بھی حال کچھ ایسا ہی تھا۔

''آ گئیں اب مدد کا ڈراما رچانے...... اندر اتنا زہر بھرا ہے اور سارا دن کیسے امی، امی کرتی پھرتی ہے۔'' عاصمہ بیگم اندر ہی اندر کلستے ہوئے چاول نکال کر ابالنے رکھ رہی تھیں۔ دوسرے برنر پر بریانی کا مسالا گرم کرنے رکھا ہوا تھا۔ ان کے لبوں پر پہلے

عشرے کی دعا تھی۔

"اے اللہ مجھے معاف کر دے، میرے اوپر رحم کر، تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔" اللہ کیسے رحم کرے ظالموں پر......؟

"بھائی کو کلیئر تو بتا نہیں سکتے کہ میں نے بھابی کی باتیں سنی ہیں۔ امی ہی کوئی چکر چلائیں گی مگر اب اس چلتر بھابی کو کوئی موقع نہیں دینا... خیال رکھنے کے ڈرامے کرنے کا۔" سلویٰ چاٹ تیار کر کے فریج میں رکھ رہی تھی۔ لبوں پر درود پاک کا ورد تھا۔ سرکارِ دو عالم صرف لبوں سے ادا کردہ درود قبول کر لیتے ہیں؟ وہ درود جو لبوں پر ہو، دل و دماغ میں......؟

ایک گہری چپ، معنی خیز خاموشی اور دل توڑ دینے والی مگر اذیت سوچوں کا عفریت چاروں اطراف گردش کرتا تینوں نفوس کو اپنی، اپنی جگہ بوجھل کیے دے رہا تھا۔ عاصمہ بیگم اب بریانی کی تہیں لگا رہی تھیں۔ سلویٰ شربت گھول رہی تھی۔ دیا خاموش تماشائی......نہ مزید سوال کرنے کی ہمت تھی نہ آگے بڑھ کر کوئی کام کرنے کا حوصلہ......اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ قریب تھا کہ چھلک پڑتیں، وہ سرعت سے آنسو چھپانے کو مڑی، عین اسی لمحے عاصمہ بیگم بریانی کو دم پر لگا کے مڑیں اور سلویٰ فریزر میں سے برف نکالنے کو مڑی...... دیا کی جھلملاتی آنکھوں کی چھب دونوں نے دیکھی...... عاصمہ بیگم کا دل ذرا سا پسیجا مگر سلویٰ کے چہرے پر پھیلتا تنفر دیکھا تو بیٹی کی آنسو بھری آنکھیں بہو کی جھلملاتی آنکھوں پر سبقت لے گئیں۔ وہ پھر سے بے نیاز بن گئیں۔ کچن سے نکل کر لاؤنج میں پڑے کاؤچ پر بیٹھ کر پھر سے وہی اخبار سنبھالنے تک دیا خود کو کمپوز کر چکی تھی لیکن اس منتشر دماغ کے ساتھ کوئی خبر کیا خاک پلے پڑتی۔ عاصمہ بیگم لاؤنج میں ہی ڈائننگ ٹیبل کی کرسی سنبھالے اب تلاوت کر رہی تھیں، گاہے بگاہے ایک چور نظر دیا پر ڈال لیتی تھیں۔ بالآخر دیا سے رہا نہیں گیا۔ ایک بار پھر انا کو کچل کر مصالحت پسندی کا انتخاب کرتے ہوئے ساس کو مخاطب کیا۔

"پکوڑے تلنے ہیں امی؟" عاصمہ بیگم نے ذرا کی ذرا اسے نظر اٹھا کر دیکھا۔ مزید بے اعتنائی نہ جتا سکیں۔ دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ غنیمت جان کر اٹھی اور کچن میں آ گئی۔ سلویٰ نے ایک چولھے پر ابھی ابھی کڑاہی چڑھائی تھی اور دوسرے پر کٹلس تل رہی تھی۔ گویا اگر وہ ذرا بھی لیٹ ہوتی تو سلویٰ پکوڑے تلنا بھی شروع کر چکی ہوتی۔ دیا نے دیدہ دلیری سے پکوڑوں کے بیسن کا باؤل سلویٰ کے آگے سے اٹھایا اور آلو پیاز مکس کرنے لگی۔ کڑاہی میں گھی گرم ہوا تو پکوڑے تلنے کے لیے ڈالے اور پھرتی سے ٹرے اٹھا کر برتن سیٹ کرنے لگی۔ سلویٰ خاموشی سے کٹلس تلتی ہوئی اس کی پھرتیاں دیکھ رہی تھی۔ افطاری میں بس دس منٹ باقی تھے۔ مرتضیٰ کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو جیسے دیا کو اندر تک سکون اترتا محسوس ہوا تھا۔ وہ مسلسل درود پاک کا ورد کرتی جا رہی تھی اور دل ہی دل میں سلویٰ کو کوستی جا رہی تھی۔ دوسری جانب بھی یہی حال تھا۔ خدا جانے ہمارے دلوں کو کیا ہو گیا ہے۔ خدا رسول ﷺ کی یاد بھی دلوں کے میل نہیں اتارتی، دلوں میں کھوٹ کی زیادتی ہو گئی ہے یا دکھاوے کی عبادات بڑھ گئی ہیں، کچھ سمجھ نہیں آتا۔ ضمیر بیچارہ بھی کب تک چیخے۔ چیخ، چیخ کے ملامت کر کر کے بالآخر شرمندہ ہو کے چپ ہی کر جاتا ہے یا پھر تیزی سے بڑھتے گناہوں کے بوجھ تلے بری طرح دب جاتا ہے اور دبی ہوئی چیز کی آواز بھلا باہر کب آتی ہے۔

مرتضیٰ نے لاؤنج میں قدم رکھا تو نہ جانے کیوں دیا کا دل ڈوب کے ابھرا......وہ سلام کر کے واپس کچن میں آئی اور پکوڑے نکال کر ٹرے میں رکھنے لگی۔

"کیسے ہو سکتا ہے کہ مرتضیٰ ماحول کی کشیدگی اور تناؤ محسوس نہ کریں۔ ماں اور بہن میں تو ان کی جان بندھی ہے۔" اس نے یاسیت سے سوچا اور درودِ پاک کا ورد تیز کر دیا۔

"بھائی کے آگے فی الحال تو موڈ بگڑا ہی رکھوں گی۔ سمجھ جائیں گے کہ ان کی بیگم ہی کی کوئی کارستانی

ہے۔ ہمیں خود سے بتانا نہیں پڑے گا۔'' برتنوں کی ٹرے لے جاتی دیا کو دیکھ کر سلوی نے سوچا پھر یک دم جیسے ہوش میں آئی۔ پھرتی سے فریج کھول کر چنا چاٹ، فروٹ چاٹ اور شربت کا جگ نکالا...... گلاس کے ساتھ ہی جمبو سائز ٹرے میں سب سیٹ کیا اور ٹیبل پر پہنچ گئی۔ افطاری میں اب محض چند منٹ تھے۔ مرتضٰی نے سلوی کے خاموش انداز کو نوٹ کیا، دوسری نگاہ ماں پر ڈالی تو انہوں نے سنجیدگی سے نظریں چرائیں۔ تیسری نگاہ کا مرکز دیا تھی جو نگاہوں کے اس تصادم سے پھیکی پڑ چکی تھی اور اس کے چہرے پر پھیلا پھیکا پن بنا کچھ کہے سنے اسے مجرم ثابت کر گیا۔ مرتضٰی نے ایک گہری سانس خارج کی اور پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔ دیا نے کھجوروں کی کٹوری اٹھا کر سب کی پلیٹ میں ایک، ایک کھجور رکھی، جگ اٹھا کر سب کے گلاس شربت سے بھرے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ عین اسی لمحے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ چاروں نے دعا پڑھ کر روزہ افطار کیا۔ یوں یہ روزہ انتہائی بوجھل ماحول میں اختتام کو پہنچا۔

☆☆☆

''اتنے شوق سے بچی بیچاری نے افطاری میں اہتمام کیا۔ پوری دوپہر لگی رہی اور پھر نظر ہی کھا گئی اسے۔ کسی سے ڈھنگ سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔'' عاصمہ بیگم نے کمزور سے لہجے میں بات شروع کی۔ دیا افطاری کے برتن دھو رہی تھی، سلوی کمرا نشین، مرتضٰی ماں کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ درمیانی دروازے کے پار بچی بیچاری چپک کے کھڑی روداد سن رہی تھی۔

''کیا بات ہوئی ہے؟'' مرتضٰی نے آہستگی سے پوچھا۔

''چھوڑو بیٹا بس......'' عاصمہ بیگم نے ٹھنڈی آہ بھر کر بات ادھوری چھوڑی تو مرتضٰی مزید شرمندہ ہوئے۔ کیونکہ اتنا تو وہ بھانپ گئے تھے کہ جو بھی غلط ہوا ہے دیا سے ہی ہوا ہے اور آخر وہ بیوی تو انہی کی تھی۔ اس لیے انہیں شرمندگی تو ہونی تھی۔ وہ بیڈ پر ماں کی پائنتی پر آ بیٹھے اور ان کے پیروں کو دھیرے سے دبا کے بولے۔

''بتائیں ناں دیا کی کوئی بات بری لگی ہے؟ مجھے بتائیں۔''

''دیا کو کچھ مت کہنا......اس سے کیا گلہ کرنا...... پرائی لڑکی ہے، سگوں جیسی محبت کیونکر ہو سکتی ہے اسے ہم سے۔ ایسی توقع کرنا ہی بےوقوفی ہے۔ بس سمجھو تم نے سنا اور بھلا دیا۔'' وہ دلگرفتگی سے کہنے لگیں۔

''بہوؤں بھابیوں کو گھر بیٹھی نند برداشت نہیں ہوتی۔ ڈائریکٹ تو کچھ بھی نہیں کہا دیا نے...... لیکن اپنی ماں سے گلے شکوے کر رہی تھی۔ جذبات میں آ کے کچھ آواز اونچی ہو گئی۔ سلوی تو دوپہر بھر سے کچن میں ہی تھی۔ اس کے کان میں پڑ گئی ساری بات...... دیا بھی ہو گی ہم دونوں سو رہی ہیں۔ بس سوچو پھر...... سلوی کے دل کا کیا حال ہو گا۔ کتنی مشکل سے تو میں نے اسے چپ کرایا پھر کام میں لگا دیا کہ ذرا ذہن بٹے۔'' مرتضٰی کا سر کچھ اور جھک گیا۔ کچھ شرمندگی کے بوجھ سے اور کچھ ماں اور بہن کی اعلیٰ ظرفی کے بوجھ سے۔ وہ خاموش ہی رہے۔ عاصمہ بیگم کچھ دیر اُن کے تاثرات جانچتی رہیں پھر کچھ سمجھ نہ پائیں تو مزید بولیں۔

''سلوی تو بچی ہے پھر بھی میں نے کافی سمجھایا ہے۔ موڈ خراب ہے اس کا لیکن بڑی بھابی سے بدتمیزی بالکل نہیں کی اس نے......دل دُکھنا تو فطری ہے، کل تک سیٹ ہو جائے گی۔ میں آہستہ، آہستہ سمجھا رہی ہوں اسے۔ خود کو بوجھ نہ سمجھنے لگ جائے اس لیے غصہ نہیں کر سکتی۔'' اب کے مرتضٰی کسی نتیجے پر پہنچ کر مسکرائے اور ماں کا ہاتھ تھام کر ازلی دھیمے پن سے بولے۔

''دیا بھی سمجھ جائے گی آہستہ، آہستہ...... ابھی نئی ہے پھر اس کی عمر بھی کوئی اتنی زیادہ نہیں...... آپ صحیح کہہ رہی ہیں وہ پرائی ہے، نند سے سگی بہنوں جیسی محبت پیدا نہیں کر سکتی لیکن محبت بہرحال ہو جائے گی۔ ضد اور ہٹ دھرمی نہیں ہے اس میں، بات سمجھاؤ تو سمجھ بھی جاتی ہے۔ آپ بڑی ہیں درگزر کر دیا کریں۔ سلوی چھوٹی ہے اس کے لیے دیا کو سمجھاؤں گا میں۔'' مرتضٰی نے نہایت سلیقے سے ماں کو قائل کیا۔ عاصمہ بیگم کو مرتضٰی کا دیا کی حمایت کرنا چبھا تو بہت لیکن پی گئیں۔ دیا چائے کی ٹرے اٹھائے اسی وقت اندر آئی تھی۔ عاصمہ

بیگم کے کمرے میں موجود سینٹر ٹیبل پر ٹرے رکھ کر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ مرتضیٰ نے دھیرے سے حکم دیا۔

''سلویٰ کی چائے اسے بیڈ روم میں دے آؤ۔''

وہ بیٹھنے کے لیے جھکی تھی اور جھٹکے سے ہی سیدھی ہوگئی۔

''ہونہہ...... مہارانی صاحبہ......'' شدید جلن کو دل میں دبائے وہ مگ اٹھا کر سلویٰ کے کمرے میں چلی گئی۔ عاصمہ بیگم تسبیح کے دانے گراتی طمانیت سے مسکرائیں۔

''بڑی آئیں خیال رکھنے والی بھابی...... ہونہہ......'' سلویٰ نے زہر خند سوچوں کے ساتھ دیا کے ہاتھ سے مگ تھام کر سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور نظریں کتاب پر مرکوز کر دیں۔ دیا بوجھل دل کے ساتھ واپس آکر مرتضیٰ کے برابر بیٹھ گئی اور اپنا مگ اٹھالیا۔

''بس چلے تو گود میں بیٹھ جائیں میاں کی......'' عاصمہ بیگم نے حسد سے سوچا اور آخری دانہ گرا کر تسبیح تکیے کے نیچے رکھ کر اپنا مگ اٹھالیا۔ مرتضیٰ گہری سوچ میں گم چائے کے سپ لے رہے تھے۔ دیا نے تھک کر کرسی کی بیک سے سر ٹکا دیا۔

چائے کے برتن دھو کر وہ کچن سے نکلی تو عاصمہ بیگم عشا کی نیت باندھ چکی تھیں۔ مرتضیٰ تراویح کے لیے مسجد جا چکے تھے۔ سو وہ بھی تراویح کی نیت سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ گرمی سے برا حال تھا۔ اس نے الماری سے کپڑے نکالے اور شاور لینے گھس گئی۔ شاور لے کر سکون محسوس ہوا تو عشا کے لیے کھڑی ہوگئی پھر تراویح کے دوران اس کے آنسو امڈ امڈ کر آتے رہے۔ عاصمہ بیگم کی گفتگو کا آخری حصہ اور مرتضیٰ کے کمنٹس وہ چائے لاتے ہوئے سن چکی تھی۔ ایک تو گھر ہی اتنا چھوٹا سا تھا کہ راز اکثر راز نہیں رہ پاتے تھے اور کچھ عورتوں کی ٹوہ لینے والی فطرت اور یہ فطرت ان تینوں عورتوں میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہی عادت دراصل دکھ بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ آگہی بہت بڑا عذاب ہے تو اگر عورتیں تجسس کرنا، ٹوہ لینا ترک کر دیں تو اس نام نہاد آگہی کے حصول کے لیے ہلکان ہونا

چھوڑ دیں تو آدھے سے زیادہ دکھ کم ہو جائیں۔ انہی منتشر سوچوں کے بیچ دیا نے تراویح مکمل کی اور چارٹ کو دیکھ کر اکیس مرتبہ یا قوی پڑھ کر جانماز لپیٹ لی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ تمام نمازوں کے بعد جو، جو سورتیں پڑھی جاتی ہیں ان کی پابندی کرنے والی دیا صاحبہ آج مغرب کے بعد سورۂ واقعہ پڑھنا یکسر فراموش کر گئیں۔ وجہ وہی تجسس...... کیونکہ مرتضیٰ اسی وقت مغرب پڑھ کر آئے تھے اور دیا کو لگا اب اس کی ساس کچھ نہ کچھ کہیں گی۔ وہ سب چھوڑ چھاڑ کر کمرے سے نکلی تھی اور اب اسے افسوس ہوا...... اس نے پنج سورہ اٹھایا اور پہلے سورۂ واقعہ کی تلاوت کی پھر سورۂ ملک، عبادت میں سکون بہت ہے۔ خواہ ہم پوری توجہ سے نہ بھی کریں۔ اللہ پاک اتنا غفور الرحیم ہے کہ ہماری ادھوری توجہ پر بھی مکمل رحمت سے نوازتا ہے۔ اسے مزہ آنے لگا۔ یوں سورۂ سجدہ، پھر سورۂ یٰسین اور پھر جب سورۂ رحمٰن پڑھی تو یوں لگا کائنات کی گردش تھم گئی۔ ہر طرف سکون پھیل گیا۔ پنج سورہ واپس رکھ کر مڑی تو اسے لگا اب کچھ، کچھ بھوک محسوس ہونے لگی ہے۔ ٹینشن میں افطاری جو ٹھیک سے نہیں کھائی تھی۔ گھر میں صرف عاصمہ بیگم تھیں جو نہایت کم افطاری لیتی تھیں اور کھانا ساتھ ہی کھالیا کرتی تھیں۔ باقی تینوں تراویح کے بعد کھانا کھایا کرتے تھے۔ اور آج تو عاصمہ بیگم نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ ایک بار پھر شام کے سارے واقعات اس کی نگاہوں میں گھوم گئے لیکن اب وہ شانت تھی۔ اسی وقت مرتضیٰ اندر داخل ہوئے۔ ٹوپی اتار کر ریک پر رکھی اور بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے نارمل انداز میں بولے۔

''چلیں جناب ڈنر کے لیے شدید بھوک لگ رہی ہے۔'' ان کے ہلکے پھلکے انداز پر دیا کی جان میں جان آئی۔ اسے مرتضیٰ کی یہی خوبی پسند تھی۔ وہ ماں اور بہن کی کسی بھی بات کا اثر اپنے اور دیا کے تعلق پر نہیں پڑنے دیتے تھے۔ اگر دل میں ان کی شکایت کو درست سمجھتے بھی تھے تب بھی دیا سے سوال جواب نہیں کرتے

تھے۔ نہ ہی گلہ شکوہ، نہ بحث، نہ جھگڑا بلکہ بے حد سبھاؤ سے موقع دیکھ کر چند جملوں میں ایسے انداز سے نصیحت کر دیا کرتے تھے کہ دیا سمجھ بھی جائے اور اس کا دل بھی برا نہ ہوا۔ اس وقت بھی ڈنر خوشگوار ماحول میں کرنے کی خاطر مرتضٰی نے کوئی بات نہیں کی۔ دیا بھی سمجھ گئی اور مسکراتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

عالیہ بیگم اپنے کمرے میں ہی تھیں۔ اس نے کچن میں آ کر بریانی گرم کرنے رکھی اور برتن ٹرے میں رکھ کر ٹیبل پر سیٹ کرنے لگی۔ فریج سے رائتہ نکالا اور پانی کے جگ کے ساتھ ٹیبل پر رکھ رہی تھی کہ مرتضٰی کمرے سے نکلے...... پھر جتنی دیر میں اس نے کباب فرائی کیے، بریانی بھی گرم ہو گئی۔ وہ دونوں چیزیں ٹیبل پر رکھ رہی تھی جب اس نے دیکھا مرتضٰی ماں کا ہاتھ تھامے ٹیبل تک لا رہے تھے۔ وہ فریج سے سلاد نکال کر لا رہی تھی جب اس نے دیکھا اب وہ سلوٰی کے کندھوں کے گرد بازو پھیلائے اسے بھی ٹیبل تک لا رہے تھے۔ سلوٰی کا چہرہ سپاٹ تھا۔ سب نے اپنی، اپنی جگہ سنبھالی تو دیا نے سب کو کھانا سرو کیا پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ افطاری کی نسبت کھانا ذرا بہتر ماحول میں کھایا گیا۔

☆☆☆

ڈنر کے برتن دھو کر کچن صاف ستھرا کر کے جب وہ کمرے میں آئی تو مرتضٰی کو اپنا منتظر پایا۔ وہ ڈریسنگ میں جا کے نائٹ ڈریس پہن آئی۔ مرتضٰی نائٹ بلب جلا کر لیٹ چکے تھے۔ وہ بھی لیٹ گئی۔ چند لمحوں بعد انہوں نے معمول کی طرح اپنا بازو پھیلایا تو دیا نے اپنا سر اُن کے بازو پر رکھ دیا۔

”میں جانتا ہوں میری دیا بہت سمجھدار اور کیئرنگ ہے۔“ وہ اسے قریب کر کے بولے۔ دیا نے پلکیں اٹھائیں، وہ محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے یوں ہی دیکھتے رہے جیسے سوچ رہے ہوں کہ بات کے لیے کیا الفاظ چنے جائیں پھر لمبی بات کہنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی اور بولے۔

”بس اتنا کہوں گا...... احتیاط کیا کرو......“ اور بس گتھی سلجھ گئی۔ دیا کی فون پر کی جانے والی باتیں سلوٰی نے سن لی تھیں، اس خدشے پر تصدیق کی مہر لگ گئی۔ بیک وقت کئی احساسات نے دیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شرمندگی، دکھ، تاسف، غصہ اور بے بسی ......مرتضٰی نے ایک نرم مسکان اس کے حوالے کی اور آنکھیں موند لیں۔

”تو یہ تھا رمضان جیسے بابرکت مہینے کا استقبال......“ غنودگی میں جانے سے پہلے یہ آخری سوچ تھی جس نے تمام نفوس کے دماغ کا احاطہ کیا تھا۔ اپنی، اپنی جگہ عاصمہ بیگم، سلوٰی، مرتضٰی اور......دیا بھی......

☆☆☆

”آپ کے بالکل سامنے جو گھر ہے ناں اس کے اوپر والے پورشن میں کرایے دار رہ کے گئی ہے ان کی فیملی...... نندیں بیاہی گئیں پھر ساس، سسر فوت ہو گئے تو دو میاں، بیوی کو اتنا بڑا بنگلا ضرورت سے سوا ہو گیا۔ اس لیے چھوٹے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ پچھلے شوال کی بات ہے۔“ دیا دس بجے کے قریب اٹھ کر آئی تو ڈرائنگ روم میں عاصمہ بیگم کے ساتھ کسی نفیس سی خاتون کو بیٹھے دیکھا۔ سلام کر کے وہ بھی وہیں بیٹھ گئی۔

”ہاں کچھ یاد تو پڑتا ہے لیکن وہ فیملی کسی سے زیادہ میل جول نہیں رکھتی تھی اس لیے ٹھیک سے جانتی نہیں میں۔“ عاصمہ بیگم تسبیح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے بولیں تو وہ خاتون ہنس دیں۔

”جی تقریباً سارا محلہ یہی بات کہہ رہا ہے۔ اصل میں ساس، سسر گھر کے بڑے ہوتے ہیں، دونوں ہی بیمار تھے۔ مریم ان کی اکلوتی بہو تھی وہ ہمہ وقت خدمت میں جتی رہتی تھی۔ اب جا کے فراغت نصیب ہوئی تو سب نے اسے کہا کہ جو علم حاصل کیا ہے اس کی شمع گھر، گھر پہنچاؤ۔ اولاد کوئی دی نہیں اللہ پاک نے۔ شادی کو چھ برس ہو گئے تو اس رمضان سے مریم نے باقاعدہ آغاز کیا۔“ بات اب کچھ، کچھ دیا کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ رمضان کی وجہ سے خاطر تواضع تو کوئی ہو نہیں سکتی تھی سو وہ آرام سے بیٹھی تھی۔ وہ خاتون اب دیا کو بغور

دیکھ رہی تھیں۔

”یہ بہو ہے آپ کی......؟“ انہوں نے پوچھا تو دیا مسکرادی۔ عاصمہ بیگم نے ہی جواب دیا۔

”جی ہاں، میرا بھی ایک ہی بیٹا ہے ماشاء اللہ دو سال ہوئے شادی کو...... اور بیٹی چھوٹی ہے۔ اصل میں، میں بھی زیادہ آنے جانے کی عادی نہیں اور پھر آپ کا گھر گلی کا پہلا گھر اور ہمارا آخری...... سو بس......“ عاصمہ بیگم نے بات ادھوری چھوڑی تو وہ خاتون خوش دلی سے مسکرائیں اور بولیں۔

”کوئی بات نہیں لیکن اب اس نیک مقصد کے لیے ضرور وقت نکالیے گا۔ مریم لوگوں کا محلے میں اگر مجھ سے بھی میل ملاپ تھا تو اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ میرا بیٹا عثمان اور مریم کا میاں داؤد بچپن کے دوست ہیں۔ ساتھ بڑھے ہیں یونیورسٹی تک...... اس محلے میں مریم لوگوں کو عمر بھی عثمان کے ذریعے ملا ورنہ ان لوگوں نے بڑا عرصہ سیٹلائٹ ٹاؤن میں گزارا۔ اب فی الحال مریم نے ترتیب کچھ یوں رکھی ہے کہ پہلا عشرہ تو وہ اپنے ہی علاقے میں درس دے رہی ہے گھر پہ آتی ہیں عورتیں دوسرے عشرے کے لیے اس کے سسرالیوں نے اپنے علاقے کا کہا ہے اور آخری عشرے کے لیے میں نے اس سے اپنے محلے کی بات کرلی اسی لیے اس نے محلے والوں کو مطلع کرنے کا ذمہ مجھے ہی دے دیا۔“ اندر فون کی گھنٹی بج رہی تھی، سلوی شاید باتھ روم میں تھی تو عاصمہ بیگم معذرت کر کے اٹھ گئیں۔ دیا نے آداب میزبانی آگے بڑھاتے ہوئے گفتگو جاری کرنے کی غرض سے پوچھا۔

”مریم، جن کا آپ ذکر کررہی ہیں، کوئی عالمہ ہیں؟“ وہ خاتون مسکرائیں۔ غالباً خاصی ہنس مکھ تھیں ہر جملے سے پہلے یا ہنستی تھیں یا مسکراتی تھیں۔

”ہاں بیٹا، شادی سے پہلے بی اے کے بعد عالمہ فاضلہ کا کورس کیا پھر کئی مدرسوں میں پڑھایا۔ شادی کے بعد بھی چند سال پڑھاتی رہی پھر ساس، سسر کی بیماری اور نندوں کی شادیوں کے سلسلوں میں جاب چھوڑنی پڑی۔ اب سب پھر سے اصرار کررہے ہیں۔ بہت ہی باعمل بچی ہے ماشاء اللہ...... نندیں تعریف کرتی ہیں، ساس، سسر راضی خوشی دنیا سے گئے ہیں۔ اس رمضان سب نے اس سے اصرار کیا کہ درس کا اہتمام کرے، داؤد اس کا زیادہ باہر نکلنا پسند نہیں کرتا لیکن اس مقصد کے لیے اس نے فی الحال اس شرط پر اجازت دی ہے کہ وہ روز بس ایک گھنٹا درس دے گی اور رمضان کے بعد اپنے گھر پر ہی اہتمام کرے گی۔ جسے طلب ہے وہ وہیں جائے۔ ماشاء اللہ شرعی پردہ کرتی ہے اور وہ خود بھی اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ بلاوجہ گھر سے نکلنے سے گریز کرے۔“ دیا کو بے اختیار رشک آیا۔ اس نے پکا فیصلہ کرلیا کہ وہ ضرور یہ درس اٹینڈ کرے گی جو مریم اُن خاتون ہی کے گھر آ کے دے گی۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے ایک بار پھر...... بے حد اصرار سے عاصمہ بیگم کو کہا۔

”عاصمہ بہن، میری گزارش ہے محض ایک گھنٹا اپنے قیمتی وقت میں سے نکال کر اس وقت کو مزید قیمتی بنانے درس میں ضرور آیئے گا اور بچیوں کو بھی لایئے گا۔ بچیوں کے لیے تو ایسے درس بے حد فائدہ مند ہوتے ہیں۔“ وہ رخصت ہوگئیں اور عاصمہ بیگم کو نئی سوچ عطا کرگئیں۔

”نیک، باپردہ، فرمانبردار، خدمت گزار بہو اور بھابی، نندیں، ساس، سسر راضی خوش، ہر جگہ چرچا، دیا کو تو ضرور ہی لے جاؤں گی درس میں۔ کچھ گن تو ہماری بہو میں بھی آئیں۔“ انہماک سے صفائی کرتی دیا کو دیکھتے ہوئے عاصمہ بیگم گہری سوچ میں گم تھیں۔ دوسری جانب دیا بھی اسی سوچ میں مدغم تھی کہ کس طرح درس میں جایا جائے۔

”صبح گیارہ سے بارہ کا وقت ہے۔ صفائی ستھرائی میں تقریباً گھنٹا لگتا ہے۔ دس کے بجائے اگر میں نو بجے اٹھ جایا کروں...... دس بجے تک صفائی سے فارغ ہو کر اپنا حلیہ درست کر کے آرام سے گیارہ بجے درس کے لیے جانا ممکن ہے۔“ دونوں ساس، بہو تا نے

با نے بُن رہی تھیں۔

اس روز کی تلخی کے بعد سے دیا بھی کافی محتاط ہوگئی تھی اور عاصمہ بیگم اور سلوئی کا مزید خیال رکھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ عاصمہ بیگم بھی کافی حد تک بھول گئی تھیں لیکن سلوئی نے اب تک بات دل میں رکھی ہوئی تھی۔ بات تو کرلیتی تھی لیکن بس ضرورت کے تحت...... کچھ وہ پہلے سے ہی کم گو تھی۔ یوں چار پانچ روزے تو خیریت سے گزر گئے تھے۔ آج ساتواں روزہ تھا جو یہ خاتون درس کا بلاوا دینے آئی تھیں اور سوچ کے نئے در وا کرگئی تھیں۔ ہنڈیا بنانے کے لیے اٹھنے تک عاصمہ بیگم درس اٹینڈ کرنے کا مصمم ارادہ کرچکی تھیں۔

دیا نے اچھی طرح چادر اپنے گرد لپیٹی اور پرس اٹھا کر کمرے سے نکلی۔ مرتضیٰ ماں کے پاس کچن میں کھڑے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر چابی اٹھائی اور نکل گئے۔ وہ بھی ساس کو جانے کا بتا کر نکل آئی۔ آخری عشرے میں عید کی تیاریوں کے باقی کام بھی بہت ہوتے ہیں اور اس بار درس ایک اضافی مصروفیت کے طور پر سامنے آیا تھا اس لیے عاصمہ بیگم نے فیصلہ کیا کہ عید کی شاپنگ دوسرے عشرے میں ہی مکمل کرلی جائے۔ وہ خود سلوئی کو لے کر الگ سے شاپنگ پر جایا کرتی تھیں۔ ایسے معاملات میں وہ دیا کو ہمیشہ الگ رکھا کرتی تھیں۔ سو دیا کی شاپنگ کی ذمے داری مکمل طور پر مرتضیٰ کے سر ہوتی تھی۔ اس وقت بھی وہ دونوں شاپنگ کے لیے ہی نکلے تھے۔ عاصمہ بیگم ہانڈی چڑھا رہی تھیں۔ مرتضیٰ نے چند گھنٹوں کے لیے شاپ کی ذمے داری منیجر کو سونپی تھی۔ یہ اوقات شاپنگ کے لیے مرتضیٰ کو موزوں لگتے تھے کیونکہ افطاری کے بعد شاپنگ کرنے میں تراویح رہ جانے کا خدشہ رہتا ہے پھر ان اوقات میں بازار میں بھی بے پناہ رش ہوجاتا ہے سو تفصیلی شاپنگ وہ دن میں کیا کرتے تھے اگر آخر میں کوئی ایک آدھ آئٹم رہ جاتا تو اس کے لیے افطاری کے بعد نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا تھا۔ مرتضیٰ اور دیا کے گھر سے نکلتے ہی سلوئی بی بی بھی کمرانشینی چھوڑ کر باہر نکل آئیں۔

''چلی گئیں مہارانی صاحبہ......؟'' سلوئی نے کچن کے دروازے سے ٹیک لگاتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

''ارے ہاں بھئی، پوچھ رہی تھی آپ نے کچھ منگوانا ہو تو بتا دیں۔ میں نے کہا نہیں ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولیں۔

''ہونہہ...... چاپلوسیاں، اچھا دفع کریں...... یہ بتائیں ہم کب جائیں گے عید کی شاپنگ کرنے؟'' وہ اشتیاق سے بولی تو عاصمہ بیگم نے ہنڈیا بھونتے ہوئے بیزاری سے اسے دیکھا۔

''تمہارے بھائی صاحب اپنی دلہن رانی کو تو شاپنگ کرالائیں پھر ہمارا خیال آئے گا۔ ہم کون سا خود کماتے ہیں۔ بیٹے نے چند پیسے دے دیے تو لے آئیں گے جو کچھ اس میں آسکا۔'' سلوئی نے اسٹول گھسیٹا اور کچن میں ہی بیٹھ گئی۔ موضوعِ گفتگو نے گرمی کے احساس سے دور کردیا تھا۔

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے، پہلے بھابی کی شاپنگ دیکھ لیں پھر اپنی کریں گے۔ بھابی پر تو بھائی دل کھول کے روپیہ لگاتے ہیں۔ آپ صحیح کہہ رہی ہیں کہ ہمارے لیے تو جتنا دے دیا اسی میں لے آئیں گے جو بھی آسکا۔'' سلوئی نے بھی ناشکری کی حد کردی۔ حالانکہ مرتضیٰ اگر بیوی پہ دل کھول کے خرچ کرتے تھے تو اتنا ہی کھلا ماں اور بہن پہ بھی خرچ کرتے تھے۔ اب اگر وہ مرتضیٰ کے ساتھ چلی جایا کرتیں تو جتنا کھلم کھلا خریداری کرتیں مرتضیٰ ہی پے منٹ کرتے جاتے لیکن چونکہ پرائیوی برتنی ہوتی تھی تو ایسے میں مرتضیٰ اندازے سے ہی رقم دے سکتے تھے۔ گوکہ عاصمہ بیگم انتہائی چالاکی سے کافی رقم بچا بھی لیتی تھیں پھر بھی ظاہر یہی کرتی تھیں کہ سب کچھ ہاتھ کھینچ کر خریدا گیا ہے۔

ان دونوں کو گئے تین گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ ہنوز واپسی نہیں ہوئی تھی۔ عاصمہ بیگم کا طیش کے مارے برا حال تھا اور سلوئی کا حسد کے مارے......

''اللہ جانے پورا بازار خرید نے کھڑی ہوگئی ہیں یا کیا بات ہے۔''

''آپ فون ملائیں ناں بھائی کو......'' سلویٰ نے مشورہ دیا تو ان کے دل کو لگا۔ ابھی ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ مرتضیٰ کی گاڑی کا ہارن بجا...... انہوں نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

''اچھا ہوا ملایا نہیں تھا فون...... ورنہ بہو رانی کے ماتھے پر جو بل آجاتے تو افطاری تک دور نہ ہوتے۔ دیکھا تھا ناں اس دن...... غلطی بھی اپنی تھی اور کیسے ڈنر تک منہ بنائے رکھا تھا۔'' مبالغہ آرائی کی حد ختم تھی عاصمہ بیگم پر۔

''دیکھنا کیسے لتے لیتی ہوں میں۔'' اتنا ہی کہا تھا کہ سلویٰ نے اشارہ کیا کہ دونوں اندر آچکے ہیں۔ وہ خاموش ہوگئیں۔ مرتضیٰ اور دیا شاپرز سے لدے پھندے جب عاصمہ بیگم کے کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے جھٹ سے قرآن پاک کھول لیا۔ سلویٰ بے نیاز بنی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ دیا کا خوشی سے جگمگاتا چہرہ یک دم بجھ گیا۔ وہ جتنے جوش سے اندر داخل ہوئی تھی اتنے ہی بکھرے ہوئے سے انداز میں کرسی پر ڈھے سی گئی۔ مرتضیٰ نے بھی صورتِ حال کی کشیدگی بھانپ لی لیکن مرد خوش قسمت ہوتے ہیں۔ جھٹ سے بولے۔

''اچھا بھئی منیجر کا دو مرتبہ فون آچکا ہے میں تو چلا......شام کو ملاقات ہوتی ہے پھر......اللہ حافظ......'' کہہ کر چلتے بنے، پیچھے رہ گئی دیا بیچاری......شاپرز وہیں عاصمہ بیگم کے بیڈ پر چھوڑ کے وہ چادر اتارنے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آکے ساس کے کمرے میں ہی ظہر پڑھی۔ نماز مکمل کر کے سلام پھیرا تو بالآخر عاصمہ بیگم نے قرآن پاک رکھ دیا۔

''ظہر تو بس قضا ہی ہونے لگی تھی۔ میں نے سمجھا بازار ہی میں نماز بھی پڑھنے لگے ہو تم لوگ......'' انہوں نے طنز کیا۔ دیا پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

''بس اصل میں رش بے تحاشا تھا۔ اب تو لوگ دن میں بھی نکلتے ہیں اور رات میں بھی۔ ہم سمجھتے رہے کہ دن میں بازار خالی ملے گا۔'' وہ ڈھیٹ بن کر بولی۔ اور یہ بات بھی اس کے خلاف ہی ہوگئی۔

''ارے ہاں بھئی سب پیسے کے کھیل ہیں۔ چار پیسے ہاتھ میں آجائیں تو بازار نکل پڑتے ہیں لوگ......پھر ایک چیز تو لیتے نہیں، میچنگ کے نام پر ہزاروں آئٹم بھرے پڑے ہیں بازار میں اور لینے والیاں دیوانوں کی طرح خریدے جاتی ہیں۔'' عاصمہ بیگم اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں بولیں۔ دیا کہہ کر پچھتائی پھر ان کی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے اٹھی اور شاپرز کھولنے لگی۔

''تمہارا مطلوبہ سامان مل گیا تمہیں؟'' انداز اب بھی طنزیہ تھا۔

''جی بالکل...... اصل میں مرتضیٰ کی بھی تو شاپنگ تھی ناں اور پھر مردوں کے لیے تو الگ ہی شاپس ہیں۔'' اور عاصمہ بیگم مزید تپ گئیں۔

''تو اپنی شاپنگ مرتضیٰ بعد میں خود کرتا رہتا۔ اس وقت تمہاری شاپنگ ضروری تھی، وہ مکمل کرنی چاہیے تھی۔'' ایک بار پھر دیا اپنی ہی کہی بات پر پچھتائی۔ اس بار اسے تھوڑا سا غصہ بھی آگیا تو وہ ہنس کر کہنے لگی۔

''میری پسند سے لینا چاہ رہے تھے ناں مرتضیٰ اس لیے آج ہی لے لیا۔ اب ظاہر ہے میں نے اپنی ساری شاپنگ ان کی پسند سے کی تو انہیں اصولاً میری پسند سے کرنی چاہیے تھی۔'' اور بس عاصمہ بیگم تو خاک ہی ہوگئیں۔ طیش کے مارے ایک لفظ بھی ان کے منہ سے ادا نہ ہوسکا۔ موقع غنیمت جان کر دیا نے شاپنگ کا سامان نکالنا شروع کیا۔ اب اس کے دل میں ٹھنڈ پڑ چکی تھی۔ پھر عاصمہ بیگم آخر تک ایک لفظ بھی نہ بولیں۔

فل بلیک لان کا ڈیزائنر سوٹ، میچنگ کی بے حد اسٹائلش بلیک سینڈل، میچنگ پرس، جیولری، عاصمہ بیگم کا رنگ بھی اتنا ہی سیاہ پڑتا جا رہا تھا۔ اس کے بعد مرتضیٰ کا بلیک اسٹائلش ڈیزائنر کرتا شلوار، بلیک جوتے، کمرے میں گویا بلیک کلر کا راج ہوگیا۔ اس قدر

میچنگ پہ عاصمہ بیگم پھٹ ہی پڑیں۔

"یہ کیا ہر چیز بلیک اٹھالائے۔ عید خوشی کا دن ہوتا ہے، شادی کو بھی ابھی عمر تو نہیں گزر گئی، ہر چیز میں کالا سیاہ رنگ دیکھو بھلا کوئی تک ہے۔" بولتے، بولتے وہ یک دم رک گئیں۔ دیا ایک اور سوٹ نکال رہی تھی۔

"کیا دو سوٹ لائی ہو عید کے لیے؟" انہیں لگا وہ بے ہوش ہو جائیں گی۔ دیا بھرپور انداز سے مسکرائی۔ اتنا واویلا سن کر سلوئی بھی باہر نکل آئی تھی۔ اس سے بھائی، بھابی کی میچنگ دیکھے بنا رہا نہیں گیا اور عین اسی لمحے دیا نے وہ سوٹ نکالا جسے دیکھ کر سلوئی کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

سی گرین اور وائٹ کنٹراسٹ میں بے حد اسٹائلش ڈیزائنر ویئر جو بلاشبہ کسی بھی طرح دیا کے بلیک سوٹ سے کم نہیں تھا۔ دیا دونوں کی نظروں میں... بے تحاشا ستائش دیکھ کر فاتحانہ مسکرائی۔ زبان سے تو یہ لوگ کبھی مر کے بھی تعریف نہ کرتیں۔ اسی لیے وہ پہلے نہیں بولی۔ عاصمہ بیگم کا تو تحیر اور پریشانی کے مارے منہ ہی بند نہیں ہو رہا تھا۔ تب دیا بولی۔

"یہ تمہارے لیے ہے سلوئی!" کہہ کر اس نے سوٹ سلوئی کی طرف بڑھایا۔ چند لمحے سلوئی نے ہاتھ ہی نہیں بڑھایا پھر جیسے یقین و بے یقینی کے بیچ جھولتے ہوئے اس نے ہچکچاتے ہوئے سوٹ تھام لیا۔

"میرے لیے......؟" انداز میں اب بھی... بے یقینی تھی۔ دیا بھرپور طریقے سے مسکرائی۔ عاصمہ بیگم سارا طیش بھول کر قدرے شرمندہ سی ہوئیں۔

"ہاں سلوئی، ویسے تو تم لوگ اپنی شاپنگ خود کرتے ہو لیکن اپنا سوٹ پسند کر کے جب میں مڑی تو اس سوٹ کو دیکھتے ہی تم میرے ذہن میں آئیں۔ بس میں تو بضد ہو گئی۔ حالانکہ انہوں نے بہت کہا کہ سلوئی اپنی پسند سے لیتی ہے لیکن میرا دل نہیں چاہا کہ یہ سوٹ چھوڑ دوں۔ سو میں نے کہہ دیا کہ کوئی بات نہیں اس بار میری پسند سے پہن لے گی۔ پھر بھی اگر اسے پسند نہ آیا تب وہ دوسرا لے لے...... یہ میں لے لوں گی...... تو پھر پسند آیا؟" آخر میں اس کا لہجہ شرارتی ہو گیا...... سلوئی قدرے جھینپ گئی۔

"نہیں، نہیں بھابی، بہت پیارا ہے۔" عاصمہ بیگم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ یہ سچویشن ان سے ہضم نہیں ہو رہی تھی پھر سلوئی کو کچھ شرمندگی محسوس ہوئی تو پوچھنے لگی۔

"اور اپنی شاپنگ دکھائیں ناں آپ......" دیا خوشی، خوشی اسے سب چیزیں دکھانے لگی۔ وہ بھی دل کھول کے تعریفیں کر رہی تھی۔ عاصمہ بیگم نے یکلخت سوٹ سلوئی کے ہاتھ سے جھپٹا اور تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لینے لگیں۔

"کتنے میں آیا یہ سوٹ......؟ تم تو لگ رہا ہے مرتضیٰ کا بٹوا سارا جھونک آئی بازار میں۔" دیا کو ان کی جھنجلاہٹ خوب مزہ دے رہی تھی جبکہ سلوئی ذرا سا کھسیا گئی۔ دیا محض قہقہہ لگا کر ہنس دی اور چیزیں سمیٹنے لگی۔

"چلو یار اب ریسٹ کروں گی بری طرح تھک گئی، روزہ بھی لگنے لگا ہے اب تو...... بس گھنٹا بھر ہی ہے آرام کرنے کو...... پھر افطاری کی تیاری کرنی ہے۔" وہ شاپر اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ عاصمہ بیگم کو اس کی شوخیاں ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھیں۔ سلوئی پھر سے اپنے خول میں بند ہو چکی تھی، مبادا ماں سے کھری، کھری سننی پڑ جائے کہ بھابی کے سوٹ دینے پر ریجھ گئیں۔ دیا نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کیا اور عاصمہ بیگم شروع ہو گئیں۔

"اللہ جانے کتنا پیسہ اڑا آئی یہ فتنی...... اور چالاکیاں دیکھو...... سلوئی یہ تمہارے لیے......" عاصمہ بیگم نے ناک چڑھا کر دیا کی نقل اتاری تو سلوئی ہنس پڑی۔

"ہمارے ہی بیٹے کے پیسے سے خرید کر ہم پہ ہی احسان...... پسند آگیا تو لے لیا...... دیکھو بھلا...... کیسے کہہ دیا صاف منہ پہ کہ ویسے تو آپ لوگ اپنی شاپنگ خود کرتے ہیں، ہونہہ...... کیا تم اپنی شاپنگ خود نہیں کرتیں؟ تو ہم پہ کاہے کا اعتراض......" عاصمہ بیگم کو کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا بہو...

اجنبی کیوں؟

میں کیوں رنجور رہتی ہوں
تھکن سے چور رہتی ہوں
کبھی آکر ملا بھی کر
کوئی مجھ سے گلا بھی کر
جو کچھ بھی پاس ہے میرے
مری جاں نام ہے تیرے
مجھے پھر چوم کر ساجن
اتارو ہاتھ سے کنگن
خموشی ساز بن جائے
تری آواز بن جائے
جو دل کہتا ہے کہنے دو
بہیں آنسو تو بہنے دو
خدارا اب نہ شرماؤ
مُچھپے کیوں ہو نظر آؤ
تمہارے ساتھ رہنا ہے
سب ہی دکھ درد سہنا ہے
تو یہ بیگانگی کیوں ہے
ہر اک شے اجنبی کیوں ہے

کلام، پروفیسر سیما سراج

آج کل ہر بوتیک میں چل رہا ہوتا ہے ایک سوٹ کے ساتھ ایک فری...... تو کیا پتا یہ سوٹ بھی فری......'' ایک لمحے کو تو عاصمہ بیگم کا بھی منہ کھلا رہ گیا پھر جیسے غصہ نئے سرے سے عود کر آیا۔

''ہوں...... ہو نہ ہو سلوئی یہ پیکج کا ہی سوٹ ہو گا۔ میں بھی کہوں بہو بیگم کو یکا یک اتنی محبت کہاں سے پھوٹ پڑی۔ ہونہہ...... دیکھی چالبازیاں، مکار عورت نہ ہو تو......'' سلوئی بھی دل کی بھڑاس نکالنے لگی اور۔

اپنے کمرے کے دروازے کے پیچھے کمر ٹکائے آگہی کے لیے ہلکان ہوتی دیا مرتضیٰ کے آنسو لڑیوں کی صورت رواں تھے۔ سامنے بیڈ پر پڑے عید کی شاپنگ کے شاپرز بکھرے نوحہ کناں تھے۔ کچھ ہی دیر پہلے ساس

خود مختاری کا رعب جما رہی ہے۔

''چھوڑیں بھی امی...... دیکھیں تو سہی کتنا قیمتی اور اسٹائلش سوٹ ہے۔'' سلوئی نہ شدہ قمیص کو پھر سے کھول کر پھیلا کے بیٹھ گئی تو عاصمہ بیگم نے قمیص کا کونا پکڑ کے پرے جھٹکا۔

''ارے جاؤ...... ان ڈھکوسلوں سے تم بہلو...... تم تو بے وقوف ہو، جانتی نہیں ہو اپنی چلتر بھابی کا اصل مقصد......'' قمیص کو دوبارہ سے تہ لگاتی سلوئی کے ہاتھ رک گئے۔

''کیا مطلب امی جی...... کیسا مقصد؟'' وہ الجھی۔

''آج ایک سوٹ لائی ہے کل کو جوتے بھی لائے گی پھر کبھی میرے لیے بھی لے آئے گی یوں کرتے، کرتے خریداری پہ اپنا تسلط جمائے گی اور میاں پہ دھاک بٹھا کے گھر کا خرچہ اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔ ہمیں مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دے گی۔ سمجھا کر میری بھولی بچی یہ چاہتی ہے وہ کہ بس خود مختار ہو جائے اور ہم اس پر انحصار کرنے لگ جائیں۔''

''اوہ...... امی آپ تو واقعی کتنی عقلمند ہیں، مجھے تو بچی بات ہے اتنی سمجھ ہی نہیں۔'' سلوئی یک دم پریشان سی ہو گئی۔

''اپنے لیے دیکھ میچنگ کے نام پر کیا کچھ اٹھا لائی ہے۔ اب مرتضیٰ صرف میرے سوٹ اور تیرے جوتوں کے پیسے پکڑا دے گا۔ باقی تیری جیولری، پرس میک اپ سب دھرا رہ جائے گا۔ ایک سوٹ مہنگا لا کے سر پر احسان دھرا سو الگ اور باقی چیزوں کا خرچہ بچا وہ اس کی اپنی جیب میں۔'' سلوئی گم صم ماں کی دور اندیشی سے مستفید ہو رہی تھی کہ یک دم اس کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔

''اور امی......'' وہ بیٹھے سے کھڑی ہو گئی۔ عاصمہ بیگم جو اب لیٹنے لگی تھیں پھر سے سیدھی ہو گئیں۔

''کیا ہوا؟''

''یہ سوٹ؟'' سلوئی کا انداز کھویا، کھویا سا تھا۔

''یہ سوٹ بھی کیا پتا پیکج میں ملا ہو...... یعنی وہ جو

کی جھنجلاہٹ سے لطف لینے والی اب اپنے بارے میں اعلیٰ درجے کی بدگمانی بھری باتیں سن، سن کر سسک رہی تھی کیونکہ وہ بہو تھی۔ بے بس، لاچار......

☆☆☆

اس کے بعد بہت سے روزے اسی بیزاری اور بوجھل پن کے زیرِ اثر گزرے...... سلوئی پھر سے کھنچی، کھنچی رہنے لگی، عاصمہ بیگم دھوپ چھاؤں اور دیا...... بے حس، ٹھس......

برکتوں اور رحمتوں سے بھرے ماہِ رمضان کو انسانوں نے کن سیاستوں اور بدگمانیوں کی نذر کردیا ہے کہ اب وہ لطف ہی نہیں آتا۔ آج ہم کہتے ہیں کہ جو ہمارے بچپن کا رمضان تھا اور جو ہمارے بڑوں کے بچپن کا رمضان تھا، جو تہوار تھے وہ کہیں کھو گئے ہیں۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ وہ بڑے بھی تو کہیں کھو گئے ہیں، آج ہم نے اپنے گھروں کو جو سیاسی اکھاڑا بنا کے رکھ دیا ہے تو فرشتے بھی دس گز دور سے گزرتے ہوں گے ہم جیسوں کے گھروں سے۔ کہاں سے آئیں رحمتیں اور برکتیں۔ جب دلوں میں بدگمانی، نفرت اور حسد کے پودے نمو پارہے ہوں۔ کہاں سے قبول ہوں تہجد، نمازیں، قرآن اور تسبیحات، جب ہماری نمازوں میں بھی دوسروں کے خلاف پلان بنائے جارہے ہوتے ہیں، لبوں پر نماز اور ذہن میں بغض بھری سوچیں، لبوں پر تسبیح و درود اور ذہن و دل میں چھڑی نفرت کی جنگ...... رحمتوں کی جگہ ہی کہاں بچتی ہے؟ چاروں نفوس کی عبادات اپنی جگہ قائم و دائم تھیں پھر بھی دلوں کو سکون نصیب نہیں ہورہا تھا۔ اب دیا بھی لیے دیے رہنے لگی تھی۔ مرتضیٰ خاموشی سے تجزیہ کررہے تھے، عاصمہ بیگم بے نیازی کا چولا پہنے رہتیں اور سلوئی ازلی معصومیت کا...... ماں، بیٹی اپنی شاپنگ ایک ایسے دن میں جاکے کرآئی تھیں جب صبح کے اوقات میں دیا چند گھنٹوں کے لیے میکے گئی تھی۔ بس وہی چند گھنٹے غنیمت جان کر دونوں اپنی شاپنگ کرلائیں اور الماریوں میں چھپا کے رکھ دی۔ دیا کو اندازہ ہوگیا تھا لیکن نہ اس نے پوچھا نہ ان دونوں نے منہ سے بھاپ نکالی۔ عجیب بے حسی تھی جس نے دیا کے وجود کا احاطہ کررکھا تھا، وہ خود بھی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

دھاگوں کے نفیس سے کام والا لان کا سفید سوٹ زیب تن کیے، چادر نما لمبا چوڑا وائٹ دوپٹا اچھی طرح لپیٹ کے دیا نے سفید جوتی پاؤں میں ڈالی اور کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آگئی۔ عاصمہ بیگم بادامی رنگ کا بریزے کا سوٹ پہنے تیار بیٹھی تھیں۔

مرتضیٰ شاپ پہ جاچکے تھے، دیا نے لاؤنج میں آکے پرس ٹیبل پر رکھا اور سینڈل کا اسٹریپ بند کررہی تھی کہ سلوئی کمرے سے نکلی...... ٹی پنک سادہ مگر نفیس سا سوٹ پہنے دوپٹا پھیلائے سر پر اسکارف لپیٹے وہ بھی تیار تھی۔ آج اکیس رمضان المبارک تھی۔ مریم داؤد کے درس کا پہلا دن......

☆☆☆

’’ہر انسان کی شکل صورت و ہیئت ظاہری دوسرے انسان سے قطعی مختلف ہوتی ہے، جب ظاہر مختلف ہے تو باطن بھی ہوگا...... آپ یہاں جتنی خواتین بیٹھی ہیں ہر ایک کا مزاج دوسری سے مختلف ہوگا، گھر کا ماحول، رہن سہن، زبان، پسند ناپسند غرض ہر چیز دوسرے سے یکسر مختلف ہوگی۔ کچھ باتیں اگر یکساں ہوں بھی تب بھی تمام یکساں نہیں ہوسکتیں۔ تو سوچیں کہ اتنا کچھ مختلف ہونے کے بنا پر ایک دوسرے کے خلاف طبع بات ہونا بھی ممکن ہے ناں......؟ اور خلاف طبیعت بات پہ اگلے کو تکلیف پہنچنا بھی لازم ہے۔ آپ سب مانتی ہیں ناں......؟ بس یہی زندگی کی حقیقت ہے اور اسی میں حُسن بھی ہے۔‘‘ سیاہ ڈھیلا ڈھالا عبایا زیب تن کیے سیاہ چادر کے ہالے میں دھلا دھلایا شفاف چہرہ لیے انتہائی نرم اور پُراثر انداز کی یہ شخصیت مریم داؤد کی تھی۔ اس کی بات پہ عاصمہ بیگم اور دیا کی نظریں بے اختیار ملیں اور اختیاری طور پر چرالیں۔

’’سو اگر آپ چاہیں گی کہ آپ کا بیٹا سو فیصدی

آپ کی مرضی و خواہش کے تابع ہو جائے تو یہ ناممکن ہے اگر آپ چاہیں گی کہ آپ کی بیٹی کا مزاج آپ کے مزاج کے مطابق ہو جائے، ناممکن ہے...... اگر آپ چاہیں گی کہ آپ کے شوہر، باپ، بھائی، بہن، بہو، کوئی بھی رشتے دار آپ کے مزاج اور شخصیت کے مطابق ہو جائے تو میری پیاری بہنو! ایسا ناممکن ہے اور اگر آپ ایسا چاہتی ہیں تو آپ غلطی پر ہیں۔'' مریم نے ذرا توقف کیا تو عورتیں معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ مریم نے روایتی درس کے بجائے ایسے موضوعات چنے تھے جو گھریلو مسائل سے متعلق اور جو عورتوں کے مسائل سے متعلق ہوتے ہیں سو اس کی ہر دوسری بات کسی نہ کسی عورت پر صادق آرہی تھی اور جو عورتیں گھر والوں کے ہمراہ آئی تھیں وہ پہلو پہ پہلو بدلے جا رہی تھیں اور ان ہی میں سے ایک عاصمہ بیگم بھی تھیں۔

☆☆☆

''جب آپ چار پانچ لوگ اکٹھے رہتے ہیں تو تکالیف بھی پہنچتی ہیں اس لیے یہ سوچ کر ساتھ رہیں کہ ہم ساتھ رہیں گے تو تکلیف بھی پہنچے گی اور اس پر صبر کرنا پڑے گا اور اگر صبر نہیں کریں گے تو حدیث کا مفہوم ہے کہ آپس کے جھگڑے، نفرتیں اور ناچاقیاں دین کو مونڈنے والی چیزیں ہیں کیونکہ نفرت کی وجہ سے جھگڑے ہوتے ہیں، جھگڑوں کے نتیجے میں انسان غیبت، بہتان اور ایذا رسانی جیسے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور نتیجتاً انسان دین سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔''

''یہی سب تو ہو رہا ہے ہمارے گھر میں بھی۔'' یہ مشترکہ سوچ تھی، عاصمہ بیگم، دیا اور سلویٰ تینوں کی۔ اس مشترکہ سوچ کے زیر اثر گویا کوئی ٹیلی پیتھی تھی جس نے تینوں کی نظروں کو باہم ملایا۔ تینوں کی نگاہوں میں شرمندگی تھی۔

''اب آپ سوچ رہی ہوں گی کہ ایسی صورت میں ہم کریں تو کیا کریں...... میں آپ کو بتاتی ہوں، جب آپ کو کسی سے کوئی گلہ محسوس ہو، بدگمانی ہونے لگے تو اس بات کو لے کر نہ بیٹھ جائیں، دنیا میں کوئی انسان مکمل نہیں...... صرف یہ سوچ لیں کہ سو اچھائیاں اگر خود آپ میں موجود ہیں تو ہزار برائیاں بھی ہوں گی اور جس سے آپ کو نفرت محسوس ہو رہی ہے اگر ہزار برائیاں اس میں ہیں تو سو اچھائیاں بھی تو ہوں گی۔ زندگی میں کبھی نہ کبھی تو اس نے آپ سے محبت کا کوئی برتاؤ بھی کیا ہی ہوگا۔ بس اسے یاد کر لیا کریں۔ اس کی اچھائی کا تصور کریں گے تو برائی میں کمی محسوس ہونے لگے گی۔''

''کچھ بھی ہے خدمت تو کرتی ہے دیا...... دیکھا جائے تو سلویٰ تو زیادہ تر کمرے میں ہی رہتی ہے۔ میری بری بھلی بھی ہنس کے سنتی ہے پھر بھی کام کاج کراتی رہتی ہے۔'' یہ سوچ عاصمہ بیگم کی تھی۔ مریم کی بات کے زیر اثر دماغ میں آنے والی پہلی، پہلی خوبی جو دیا میں انہیں نظر آئی۔

''ایک بات تو ہے، جتنا مرضی مرتضیٰ کو بھڑکا لیں لیکن ٹپیکل ساسوں کی طرح جھگڑے نہیں کرتیں امی، نہ ہی سلویٰ نے کبھی بدتمیزی کی۔'' یہ دیا تھی۔

''ماننا پڑے گا، بھابی جیسی بھی ہیں اندازہ ہوتا ہے کہ بھائی کو ہمارے خلاف بھڑکاتی نہیں ہیں نہ ہی کبھی جھگڑا کرتی ہیں۔'' یہ سلویٰ تھی اور یہ تین ہی کیا...... وہاں موجود تقریباً ہر عورت ہی کے دل پر پڑے قفل کھلتے جا رہے تھے۔ ملبے تلے دبا سسکتا ہوا ضمیر منظر عام پر آنے لگا تھا، کچھ اس کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ ہر کوئی اپنی ذات کے احتساب میں مگن تھا اور مریم کہہ رہی تھی۔

''آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں بات، بات پہ شکوے شکایات کرنے کی عادت پڑ گئی ہے جو ناشکری کا دروازہ ہے۔ ہمیں یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا، اسے ہم سے زیادہ مل گیا، اس نے یہ نہیں دیا، وہ نہیں کیا، ایسے کہہ دیا، ویسے کر دیا۔ کوئی حد ہی نہیں شکوے شکایات کی...... اس کے نتیجے میں دلوں میں نفرتیں بڑھتی ہیں، گھر اجڑ جاتے ہیں، کیا ہوگا اگر ہم...

درگزر کر دیں...... اللہ کے لیے معاف کر دیں...... ہم بھلا کس چیز پہ لڑتے ہیں؟ صرف دنیاوی دھن دولت، عزت، شہرت، کپڑا لتا، جو آج اللہ چاہے تو ہم سے چھین لے۔ آج چاہے تو ہمیں موت دے، دے اور سب یہیں رہ جائے۔''

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا
جب لاد چلے گا بنجارا

عورتیں شرمساری سے پانی، پانی ہو رہی تھیں۔ یہ تو سب کے دلوں کی باتیں تھیں۔

''حدیث کا مفہوم ہے کہ اپنے بھائی سے جھگڑا مت کرو۔'' اور اسی حدیث میں آپ ﷺ نے دوسرا حکم یہ دیا کہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ دل لگی اور مذاق نہ کرو...... یعنی وہ مذاق جس سے اگلے کو تکلیف پہنچے...... آج ہم مذاق کے نام پر طنز، طعن و تشنیع سے اگلے کا دل چھلنی کر دیتے ہیں۔ اس سے بھی دلوں میں نفرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم جو سوچتے ہیں ناں کہ اس کے سامنے ذرا یہ بات کروں گی، دیکھنا آگ لگ جائے گی اور اس آگ لگنے میں ہمارے دل میں ٹھنڈی پھوار پڑ جاتی ہے۔ ہم سوچتے ہی نہیں کہ اس وقت ہمیں لطف دینے والی بات آخرت میں ہمیں کتنا بڑا عذاب پہنچانے والی ہے۔''

دیا کو یکلخت وہ دن یاد آیا جب وہ اپنی شاپنگ دکھا کر ساس کو جلا رہی تھی اور مزہ لے رہی تھی...... پھر جب ساس نے دل کی بھڑاس نکالی اور اس کے خلاف برا گمان کیا تب اس کا دل کس بری طرح دکھا تھا۔ وہ اب شرمندگی میں غرق تھی۔

''پھر دوسری بڑی غلطی جو ہم کرتے ہیں وہ بدلہ لینے کی ہے۔ کوئی شخص ہمارے خلاف کوئی بات کر دیتا ہے۔ مثلاً بہو نے کوئی ناگوار بات کر دی، ساس کے دل میں ایسی آگ بھڑکی کہ اس نے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ اب یا تو وہ خود کسی موقع پر کوئی ایسی بات کہہ دے گی کہ اس کے دل میں ٹھنڈ پڑ جائے گی یا بیٹے کو بہو کے خلاف اکسا دے گی۔ اب ساس کے دل کی آگ تو ٹھنڈی ہو گئی لیکن بتائیں کہ وہ پیمانہ کہاں سے لائی جس سے اس نے بہو کی جانب سے حاصل ہونے والی اذیت کو ناپا؟ کیا ممکن ہے؟ نہیں ناں پھر اگر ساس اسے تکلیف کا جواب لوٹانے میں ذرا زیادتی کر گئی جو کہ بدلہ لینے والا لازماً کر جاتا ہے تو پھر آخرت میں لازمی پکڑ ہوگی جیسا حساب خدا تعالیٰ کر سکتا ہے ویسا ہم نہیں کر سکتے، سو سیدھی بات ہے کہ بدلہ لینے کا بھی ہم حق نہیں رکھتے...... ٹھیک ہے بدلہ لینے کا شرعاً ہمیں حق ضرور حاصل ہے لیکن یہ حق (ہماری کم فہمی کے باعث) اس لحاظ سے اتنا خطرناک ہے کہ اس سے دستبردار ہونا بہتر ہے۔ سو اگر آپ نے معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے وہ بے حد و حساب، بے اندازہ اجر و ثواب دے گا۔ اتنا کہ اگر آپ گمان کر سکیں تو یہ دعا کریں کہ یا اللہ ساری عمر مجھے کوئی سکھ ہی نہ دینا تاکہ میں اتنا اجر پا سکوں۔'' کسی عورت نے ہاتھ بلند کر کے مریم سے سوال کرنا چاہا تھا سب لوگ اس کی جانب متوجہ ہو گئے اور مریم کو بھی توقف کرنا پڑا۔

''اور میں نے کیا، کیا اپنی بہو کے ساتھ...... بدلہ لینے میں کتنا آگے بڑھ گئی کہ اس نے تو محض اپنی ماں کے آگے دل کی بھڑاس نکالی اور میں نے بیٹے کو ہی بدگمان کر دیا۔'' یہ اس عورت کا اعترافِ جرم تھا جو آبدیدہ تھی۔ عاصمہ بیگم کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ سلویٰ بھی گہری سوچ میں گم تھی۔ سب عورتیں مریم کی جانب متوجہ تھیں جو اس عورت کے سوال کا جواب دے رہی تھی لیکن عاصمہ بیگم، دیا اور سلویٰ اپنی ہی سوچوں میں ڈوبی تھیں۔

☆☆☆

مرتضیٰ نوٹ کر رہے تھے کہ گھر کی جملہ خواتین جب سے درس اٹینڈ کر کے آئی تھیں بالکل خاموش تھیں۔ یہ خاموشی طوفان سے پہلے والی خاموشی ہرگز نہیں تھی بلکہ یہ تو ٹھنڈے پانیوں جیسی ٹھنڈی ہواؤں جیسی اور گرمیوں میں گھنے پیڑ کی چھاؤں جیسی خاموشی تھی جو مقابل کو خوفزدہ یا پریشان کرنے کے بجائے

پُرسکون کر رہی تھی۔ تینوں ضرورت کے تحت بات بھی کر رہی تھیں لیکن ایک بات تینوں میں مشترک نظر آ رہی تھی۔ نگاہوں میں نرمی، محبت، احترام، خلوص اور رواداری جو اَب تک نظر نہیں آئی تھی۔ مرتضیٰ نے... بے اختیار مریم داؤد کو غائبانہ تشکر پیش کیا۔

☆☆☆

''روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا...... یعنی جو اجر و ثواب اللہ پاک عطا کرے گا ہمارے پیمانوں میں اس کا تصور بھی نہیں...... پھر صدقے کے بارے میں آتا ہے کہ اس کا اجر سات سو گنا ہے، ہمارے حساب سے نہیں، اللہ کے حساب سے تو حضور پاک ﷺ نے ایک روز صحابہ کرامؓ سے فرمایا، مفہوم ہے۔ ''کیا میں ایسی چیز نہ بتاؤں جو اس نماز سے بھی افضل ہے، اس روزے سے بھی افضل ہے، اس صدقہ کرنے سے بھی افضل ہے، جن کی فضیلتیں تم نے سن رکھی ہیں؟ صحابہ کرامؓ کے دل میں شوق پیدا ہوا تو انہوںؓ نے کہا یا رسول اللہ وہ چیز ضرور بتائیں، آپؐ نے فرمایا۔ وہ چیز ہے، اصلاحِ ذات البین...... یعنی اگر دو مسلمانوں کے درمیان ناچاقی، اختلاف اور کٹاؤ ہو گیا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تو اب کوئی ایسا کام کرو کہ ان کا جھگڑا ختم ہو جائے اور دونوں کے دل آپس میں مل جائیں، دونوں آپس میں ایک ہو جائیں، تمہارا یہ عمل نماز سے بھی افضل ہے، روزے سے بھی افضل ہے اور صدقے سے بھی۔'' خواتین سُن تھیں گویا مسمیریزم کے تحت، کتنی عام فہم باتیں تھیں، جو آج تک کسی نے درس میں بیان نہیں کی تھیں۔ عموماً درس وغیرہ میں عبادات و فرائض وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ یہ روزمرہ کے مسائل عام سے گھریلو جھگڑوں وغیرہ کا تو کسی نے کبھی دین سے تعلق بتایا ہی نہیں کہ لوگ سمجھ پائیں کہ کس طرح دین ہمیں روزمرہ کے حُسنِ سلوک کے بارے میں مثالوں سے بتاتا ہے۔

''خدارا اپنے دلوں کو صاف کر لیجیے، نفرتیں ختم کر دیجیے، یہ زندگی بہت چھوٹی ہے، مہلت بہت کم ہے اور میں آپ کو ایک بات بتاؤں، شاید کہ اسے سن کر آپ لوگ پکا تہیہ کر لیں کہ دلوں کو بغض اور کینہ سے پاک کر لیں گے۔ وہ بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں تمام مسلمان ایک نہ ایک دن جنت میں ضرور داخل ہو جائیں گے تو اس بارے میں ارشادِ رب العزت ہوتا ہے جو شخص ایمان کی حالت میں رہا اور شرک نہیں کیا میں آج کے دن اس کی مغفرت کا اعلان کرتا ہوں یعنی یہ شخص ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا بلکہ کسی نہ کسی وقت جنت میں ضرور داخل ہو جائے گا لیکن جن دو اشخاص کے درمیان آپس میں کینہ اور بغض ہو ان کو روک لیا جائے کہ ان کے جنتی ہونے کا فیصلہ میں ابھی نہیں کرتا، یہاں تک کہ ان کے درمیان آپس میں صلح نہ ہو جائے۔ اندازہ کر لیجیے کہ اللہ اور اس کے رسول کو مسلمانوں کا آپس میں بغض رکھنا اور نفرت کرنا کتنا ناپسند ہے۔ حتیٰ کہ بغض رکھنے والے شخص کی شب برات میں بھی مغفرت نہیں ہوگی۔'' تمام عورتوں کے گویا رونگٹے کھڑے ہو گئے، محفل میں اس قدر خاموشی اور سکوت تھا گویا یہاں کوئی ذی روح موجود ہی نہیں ہے۔ مریم کا خوب صورت درس خوب صورت انداز میں جاری تھا۔

''ایک اور حدیث کا مفہوم ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے روز صبر کرنے والوں کو اپنی رحمتوں سے نوازے گا اور ان کو صبر کا صلہ عطا فرمائے گا تو جو لوگ دنیا میں آرام اور راحت سے رہے ہیں، وہ تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالوں کو قینچیوں سے کاٹا گیا ہوتا اور اس پر ہم صبر کرتے اور ہمیں بھی اتنا ہی ثواب ملتا جتنا ان لوگوں کو مل رہا ہے۔''

زندگی، اے زندگی، ہم تجھے گزار رہے ہیں یا تو ہمیں گزار رہی ہے۔ یہ ہم کیا کر رہے ہیں، کیسی ڈھور ڈنگروں والی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا ہم انسان کہلانے کے لائق ہیں؟ کیا ہمیں اتنے عیش و آرام سے

جینے کا ایک فیصد بھی حق ہے؟

☆☆☆

''بھابی جان، آپ نے میرے شوز نہیں دیکھے ناں...... میرے کمرے میں آئیں، میں آپ کے لائے گئے سوٹ کے ساتھ زبردست شوز لائی ہوں۔'' سلویٰ ہاتھ سے پکڑ کر دیا کو اپنے کمرے میں لائی اور محبت سے اپنے بیڈ پر بٹھایا پھر ایک ،ایک چیز نکال، نکال کر دکھائی۔ میچنگ جیولری، پرس، دیا نہال ہو رہی تھی۔

''سب کچھ بہت پیارا ہے سلویٰ بالکل تمہاری طرح......'' دیا نے حقیقتاً محبت سے کہا تو سلویٰ نے اسے لپٹا لیا۔

''اپنی بھابی سے کم......'' دیا نے محبت سے اس کا ماتھا چوم لیا۔ در و دیوار گنگنا اٹھے۔

☆☆☆

''دیا بیٹا کوئی درزی سوٹ نہیں لے رہا، آخری روزے ہیں، میری بچی مجھے پتا ہے تم سارا دن کام کاج میں مصروف رہتی ہو لیکن مجبوری ہوگئی ہے......''

''میں سی دوں گی امی، کیسی باتیں کر رہی ہیں، آپ میری ماں ہیں، کام کاج بھی میرے اپنے گھر کے ہیں۔ آپ سوٹ لائیں، میں ایک دن میں سی دوں گی۔'' دیا نے ساس کی بات کو بیچ میں ہی قطع کر کے محبت کا جواب محبت سے دیا تو عاصمہ بیگم نہال ہوگئیں۔ الماری سے کپڑے نکال کر اسے تھماتے ہوئے وہ قدرے شرمندہ سی تھیں۔

''تمہیں دِکھا نہیں پائی تھی بیٹی......'' وہ پھر ہچکچا گئیں تو دیا نے انہیں شرمندگی سے نکالنے کے لیے فوراً بات بدلی۔

''ارے واہ امی، کتنا پیارا سوٹ ہے، میں ایسا کرتی ہوں اسے شرنک کرنے کے لیے بھگوتی ہوں، اتنے میں اس کے ساتھ کا دھاگا لے آؤں یہ سامنے تو دکان ہے۔'' کہتی وہ پھرتی سے مڑ کر کمرے میں گھس گئی۔ عاصمہ بیگم کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ محبتیں کرنا اور بانٹنا اتنا مشکل بھی نہیں پھر ہم کیوں اس آسان کام سے کتراتے رہتے ہیں؟

☆☆☆

''سورۂ حجرات میں آتا ہے کہ بدگمانی سے پرہیز کرو، کسی شخص کے بارے میں جب تک پوری تحقیق نہ ہو جائے اس وقت تک بدگمانی نہ کرو اور کسی کے بارے میں یقین کے ساتھ کسی برائی کا اعتقاد نہ رکھو جب تک کہ تحقیق سے ثابت نہ ہو جائے۔ ایک دوسرے کا تجسس نہ کرو، کسی کی ٹوہ میں نہ لگو، اس کے حالات کی خفیہ طریقے پر معلومات کرنے کی فکر میں نہ لگو، جس کو عام طور پر تجسس کہا جاتا ہے۔ ٹوہ لگانا بھی کہتے ہیں...... یعنی اس بات کی کوشش کرنا کہ اس کے خفیہ راز معلوم ہو جائیں یا ایسی بات جو وہ چھپانا چاہتا ہے دوسرا آدمی اسے خفیہ طریقے سے معلوم کرنے کی کوشش کرے اس کی قطعی ممانعت فرمائی گئی ہے کہ اس طرح کا تجسس مت کرو۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ قرآن پاک نے اس طرح کے تجسس کو حرام کہا ہے جس کے تحت ہم چوری چھپے کسی کی باتیں سنتے ہیں یا دیکھتے ہیں کہ وہ تنہائی میں کیا کر رہا ہے؟''

سلویٰ اور دیا...... گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں...... دونوں کی کیفیت ایسی تھی کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔ مریم مزید کہہ رہی تھی۔

''مثلاً کوئی فون پر بات کر رہا ہے اور آپ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی باتیں سنیں، یہ تجسس حرام ہے، ناجائز ہے اس لیے کہ آپ دوسرے کی باتیں اس کی اجازت کے بغیر سن رہے ہیں، صرف شراب پینا ہی حرام نہیں...... افسوس کہ ہمارا مسئلہ ہی لاعلمی ہے میری پیاری دینی بہنو......'' سلویٰ کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو گیا اور سر جھکے، جھکے سینے سے جا لگا۔

☆☆☆

عاصمہ بیگم اور سلویٰ نے کمرے میں مرتضیٰ کے ساتھ ایک خفیہ میٹنگ کی۔ جس کے نتیجے میں اب مرتضیٰ ان دونوں کو گاڑی میں کہیں لے کے جا رہے تھے۔ کل چاند رات تھی، جانے افطاری کے بعد ان لوگوں کو کون سا کام یاد آ گیا تھا۔ دیا کو جانے کے لیے نہیں کہا گیا۔

وہ لوگ نکل گئے تو دیا برتن دھونے کچن میں آگئی۔ دل پھر سے بوجھل سا ہو گیا تھا۔

''کچھ بھی کرلو سسرالی ہمیشہ سسرالی ہی رہتے ہیں، چار دن درس کا اثر رہا اور آج پھر...... بیٹی کو لے گئیں بہو کو چھوڑ دیا۔'' شیطان نے بہکایا...... ورغلایا...... اکسایا...... دیا نے بے دلی سے برتن پٹخ پٹخ کر دھونے شروع کر دیے۔

''بدگمانی، بنا تصدیق، اونہوں......'' ضمیر ملبے تلے سے ابھر آیا تھا۔ فوراً ٹوکا...... مریم کی باتیں یاد دلائیں، پھر وہ دانستہ تمام درس کے پوائنٹس ذہن میں دہرانے لگی۔ ذہن بٹ گیا، دل بہل گیا، شیطان منہ چھپا کے بھاگ گیا۔

☆☆☆

''سب سے آخری اور سب سے اہم ترین خرابی جو بدقسمتی سے ہم عورتوں میں کُوٹ کُوٹ کے بھری ہے اور جس کے بنا ہمیں لگتا ہے ہماری زندگی ادھوری ہے۔ ہمارے آخری روزے کا آخری موضوع غیبت''...... تمام عورتیں مسکرا اٹھیں۔

''آج تو پکی والی شامت ہے۔'' ایک عورت بلند آواز میں بولی تو مریم مسکرا دی۔ باقی عورتیں بھی دبی، دبی ہنسی ہنسنے لگیں۔

''غیبت کیا ہے؟ ہم سب جانتے ہیں...... اپنے مسلمان بھائی کا ذکر اس کی پیٹھ پیچھے ایسے انداز میں کرنا کہ اگر اسے پتا چلے تو اسے ناگوار گزرے...... خواہ وہ بات آپ اس شخص کے منہ پر کہنے کی ہمت بھی رکھتے ہوں، پھر بھی وہ بات غیبت کے زمرے سے خارج نہیں ہو جاتی۔ غیبت یہی ہے کہ وہ برائی اس شخص کے اندر موجود ہو جو آپ بیان کر رہے ہیں...... اور اگر وہ بات اس کے اندر موجود ہی نہیں تو یاد رکھیے وہ غیبت نہیں بلکہ بہتان میں شمار کی جاتی ہے...... اور بہتان کا گناہ غیبت سے بھی دُگنا ہے۔'' تمام عورتیں مُہر بہ لب تھیں۔ باقی برائیاں چاہے سب میں موجود نہیں ہوں لیکن غیبت کی عادت ننانوے فیصد عورتوں میں ہوتی ہے۔

''ذرا غور فرمائیں ایک حدیث کا مفہوم بتانے جا رہی ہوں، زندگی بھر کے لیے پلو سے باندھ لیجیے...... رسول پاک ﷺ نے فرمایا غیبت زنا سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے۔'' عورتوں کی سسکاریاں نکل گئیں۔ مریم چند لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ ہر عورت خاموش تھی۔

''غیبت کا تعلق زنا سے کیسے ہے مریم؟'' دیا سے رہا نہ گیا تو سوال کر بیٹھی۔ اس کے سوال پر سب عورتیں چونک گئیں اور مریم نرمی سے مسکرائی۔

''میں اسی سوال کے انتظار میں تھی۔ دیکھیے زنا کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے جبکہ غیبت کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ غیبت کر کے آپ کسی انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کرتے ہیں اور حدیث شریف کے مفہوم کے مطابق مسلمان کی جان، مال اور اس کی آبرو کی حرمت بیت اللہ کی حرمت سے بھی بڑھ کے ہے۔ سوچیں ہم روزانہ کتنے کعبہ ڈھا دیتے ہیں۔ حقوق اللہ تو اللہ پاک انسان کی توبہ سے معاف فرما دیتے ہیں لیکن حقوق العباد کی معافی تب تک نہیں مل سکتی جب تک وہ بندہ خود معاف نہ کر دے۔'' اور آج اس موضوع کے بعد عورتوں کے سوالات کی ایسی بوچھاڑ ہوئی کہ ایک گھنٹے کا درس دو گھنٹے پر محیط ہو گیا اور پھر بھی عورتیں مریم کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھیں۔ سب کا اصرار تھا کہ مریم درس کا سلسلہ جاری رکھے۔ اس قدر شور پہ مریم نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کرایا پھر بولی۔

''یہ اللہ پاک کا کرم ہے کہ اس نے مجھ جیسی گناہ گار کو آپ سب کی اتنی محبتیں عطا کیں۔ میرے لیے درس دینے کسی اور جگہ جانا ممکن نہیں ہو گا اس لیے میں نے اپنے گھر پر ہی اہتمام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہر پیر کی صبح دس بجے سے بارہ بجے کے اوقات میں نے مقرر کیے ہیں۔ آپ سب کی آمد میرے لیے خوشی کا باعث ہو گی۔ اس محفل کا اختتام میں ان خوب صورت اشعار پر کرنا چاہوں گی۔

اے شخص بدی کا بیج نہ بو اس آگ سے اپنی جان بچا
ہو تجھ سے جہاں تک نیکی کر نیکی ہی نفع پہنچائے گی

اللہ کا وعدہ سچا ہے برباد نہ ہوگا نیک عمل
اِک جَو کے برابر نیکی بھی جنت میں تجھے لے جائے گی

☆☆☆

چاند رات کو تو جیسے خوشیوں کی بارات اتر آئی۔ دیا کی امی نفیسہ بیگم دیا کی عیدی لائی تھیں۔ وہ چونکہ تمام حالات و واقعات سے باخبر رہی تھیں اس لیے اس بار عیدی کے لوازمات بے حد اسپیشل تھے۔ محبتوں کی تجدید، خلوص کا برتاؤ، نئے سرے سے جیسے تعلق مضبوط ہونے جارہا تھا۔ نفیسہ بیگم نے ان محبتوں میں اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا تھا۔ عیدی صرف دیا کی نہیں تھی۔ عاصمہ بیگم اور سلویٰ کی بھی تھی۔ بلکہ مرتضیٰ کی بھی...... چاروں کے سوٹ، خواتین کے لیے چوڑیاں بھی، مہندی، مٹھائی، سوّیاں، میوہ، کیک، پھول، کارڈز، دیا کی خوشیوں کا ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ سب نہال تھے، پور پور خوشیوں اور محبتوں میں ڈوبے، مرتضیٰ کونے والے صوفے پر بیٹھے سب کے خوشیوں سے چمکتے چہرے دیکھ کر بے انتہا خوش ہو رہے تھے۔ نفیسہ بیگم نے ان سب کو عید کے دن ڈنر پر اپنے گھر انوائٹ کیا تو عاصمہ بیگم نے سختی سے انکار کر کے الٹا انہیں ڈنر پر انوائیٹ کرلیا۔ دیا اور سلویٰ جی بھر کے ہنسیں۔

☆☆☆

خوب صورت بلیک سوٹ پہنے، نکھری نکھری مہندی سے سجی ہتھیلیاں اور خوب صورت میک اپ سے سجا چہرہ لیے دیا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اسی وقت مرتضیٰ عید کی نماز پڑھ کے کمرے میں آئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو محبت سے دیکھا۔ عید ملے، مبارک باد دی اور پھر دیا کو اپنی زندگی کا سب سے خوب صورت سرپرائز ملا۔ مرتضیٰ کے ہاتھ میں دبے اپنے ہاتھ پہ اسے سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے نظریں جھکا کے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ بے حد نفیس اور نازک سی گولڈ کی رِنگ تھی جو مرتضیٰ نے اس کی انگلی میں پہنا دی تھی۔ وہ تحیر سے دیکھنے لگی۔

''یہ......!''

''تمہاری عیدی...... خوب صورت سے رمضان کے بعد تمہاری ریاضتوں کا خوب صورت سا انعام......'' مرتضیٰ مسکرائے۔

''اب ذرا باہر چلیں......'' وہ اسی حیرت میں گھری باہر نکلی...... امی اور سلویٰ لاؤنج میں کھڑی تھیں۔ عید کے کپڑوں میں سجی بنی مکمل تیار...... وہ بھاگ کے دونوں سے عید ملی۔

''اپنی عیدی نہیں لوگی؟'' عاصمہ بیگم نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''کیوں نہیں، ضرور لوں گی۔'' انہوں نے ایک خوب صورت جڑاؤ انگوٹھی نکالی۔ دیا پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

''اُف اللہ امی جی، یہ کیا گولڈ کی برسات ہو رہی ہے۔''

''یہ ہماری خاندانی انگوٹھی ہے بہو رانی، میری پہلی عید پر میری ساس نے مجھے پہنائی تھی۔'' عاصمہ بیگم نے فخر سے کہا تو دیا نے منہ بنایا۔

''اچھا اور آپ مجھے تیسری عید پر پہنا رہی ہیں۔'' سب لوگ کھلکھلا کر ہنس دیے۔

''اچھا تو آپ لوگ اس دن اس مہم پر نکلے تھے جو مجھ سے اتنی رازداری برتی۔'' اس نے مصنوعی خفگی دکھائی تو عاصمہ بیگم مسکرائیں۔

''ہاں مرتضیٰ نے رِنگ خریدنی تھی اور میں نے پالش کروانی تھی۔''

''پر بھابی جی...... میں اتنی مالدار بالکل بھی نہیں ہوں۔'' سلویٰ نے برا سا منہ بنایا تو دیا نے ہنس کر اسے گلے سے لگالیا۔

''اور میری پیاری بہنا، تمہیں تو میں عیدی دوں گی ناں......'' کہہ کر دیا نے اپنے پرس میں سے کڑکتا ہوا پانچ ہزار کا نوٹ نکالا اور سلویٰ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ سلویٰ نے نعرہ مارا۔

''تھری چیئرز فار بھابی ہپ ہپ ہُرّے۔''

عید کا دن کھلکھلا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ باتیں تری وہ فسانے ترے

فاطمہ رضوی



اسے کبھی کسی المیہ نغمے یا لو اسٹوری نے متاثر نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ خوشیاں اور مسکراہٹیں اس کا سایہ بن کر ساتھ چلتی رہیں...... غم کا سایہ بھی اسے چھو کر نہ گزرا تھا۔ اگر کوئی مشکل آئی تو نبیل احمد نے کبھی ہمت نہیں ہاری تھی...... ہر بات کو ایزی لینا...... ہر مسئلے کو چٹکی میں حل کرنا...... اس کی شخصیت کا خاصہ تھا...... نبیل کا زیرِ لب مسکراتا تل، شریر آنکھیں اور متاثر کن گفتگو اسے رونقِ محفل بنا دیتی...... وہ المیہ اور

طربیہ گیتوں پر لوگوں کو سر دھنتے دیکھتا تو حیران ہوتا۔ وہ سوچتا، لوگ کس طرح محبت میں تارے گننے کی بات کرتے ہیں..... سارا دن کھانا پینا چھوڑ کر ساری رات جاگنے، بے چین رہنے کے قصے سناتے ہیں۔ مجنوں کا سا حلیہ بنائے..... پریشان زلفیں بکھیرے پھرتے ہیں۔ آخر کیوں..... اس کا جی چاہتا ہیئر برش لے کر جلدی سے ان کے بال سنوار دے..... بہت سوں کو یہ گیت گاتے سنا..... "نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں.....اور بال بناؤں کس کے لیے....."

"ارے بھئی کس نے کہا مجنوں بال نہیں بناتا تھا..... رانجھا کپڑے ہی نہیں بدلتا تھا..... مہینوال کے سر میں جوئیں پڑی ہوئی تھیں..... یا مرزا جی کو نہانے کا ہوش نہیں تھا.....لیلیٰ بیگم دنیا و مافیہا سے بیگانی تھیں۔" اس کے نزدیک یہ سب فرضی باتیں تھیں۔ کچھ بھی ہو جانے سے ..... کچھ بھی تو نہیں بدلتا.....خواہ مخواہ کی باتیں ہیں یہ.....

پھر وہ سب کچھ ہو گیا جس کی نبیل کو ہرگز توقع نہیں تھی..... وہ ایف ایس سی کا ایگزام دے کر رزلٹ کے انتظار میں تھا اور آج کل بھرپور تفریح کا ٹائم گزار رہا تھا مگر اس بے قاعدگی میں بھی والدین کی جانب سے اسے ایک روٹین میں رہنے کی ہدایت تھی سو صبح، صبح جاگنگ ٹریک پر جانا اس کی عادت تھی۔ من موہنی صورت..... گلابی رنگت اور شولڈر کٹ بالوں والی نیلما اسے پارک میں ہی پسند آگئی تھی۔ وہ بھی یوں اچانک کہ نبیل اپنے خیالات کے ہاتھوں خود ہی مار کھا گیا۔ بس چند دن کے دیکھے' دیکھے میں وہ اسے پوری کائنات لگنے لگی تھی۔ جس نے اس کی دلی کیفیات ہی بدل ڈالیں۔ دوست احباب حیران تھے۔ گھر والے الگ پریشان کہ نبیل جیسے ہنس مکھ، زندہ دل لڑکے کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ سارا' سارا دن کمرے میں گزار دیتا پر علی الصباح اٹھ کر جاگنگ کرنا نہیں چھوڑا تھا۔ کیونکہ وہیں تو اس کا دل اٹکا رہتا تھا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ وہ سب کچھ گوارا کر سکتا تھا مگر نیلما سے جدائی کا تصور ہی سوہان روح لگتا..... سونے پر سہاگا یہ یک طرفہ محبت نہیں تھی۔ نیلما نے بھی اسے اپنی محبت کا بھرپور یقین دلا دیا تھا۔

تین مہینے بعد اس کے امتحان کا رزلٹ آیا تو وہ میڈیکل کے داخلے میں لگ گیا مگر صبح کی روٹین نہیں چھوٹی۔ نیلما بھی اس سے ملتی رہی اور اپنی محبت کا یقین دلاتی رہی.....مگر نبیل کی روٹین میں اپنی پڑھائی کی وجہ سے تبدیلی آگئی تھی وہ اب مہینے میں دو یا تین دفعہ ہی نیلما سے مل پاتا۔

وہ میڈیکل کے سیکنڈ ائیر میں تھا جب اس کے بہت قریبی دوست عمار نے بتایا کہ اس کے بڑے بھائی اظہار جو سویڈن میں مقیم ہیں وہ آج کل پاکستان آئے ہوئے ہیں اور والدہ کے بے حد اصرار پر انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سو سبھی بہت خوش ہیں۔ عمار نے نبیل کے علاوہ دیگر دوستوں کو بھی یہ خوشخبری سنائی اور باقاعدہ شادی کے فنکشنز میں شرکت اور ہلا گلا کرنے کی دعوت دی۔ ان کا پورا گروپ ہی بہت شوخ اور زندہ دل تھا۔ سب نے بڑھ چڑھ کر شرکت کی حامی بھری۔ نبیل بڑے ارمانوں سے خوشی، خوشی تیار ہو کر گیا اس روز مہندی کا فنکشن تھا۔ سب ہلے گلے میں مصروف تھے۔ سب کے ساتھ میرون کلر کے کرتوں کی کلر اسکیم میں بانکا سجیلا نبیل خوب جچ رہا تھا..... پھر سب دوستوں کے جھرمٹ میں اظہار بھائی کو مہندی کے اسٹیج پر لایا گیا تھوڑی دیر بعد ہی دلہن کو لایا گیا..... اور مہندی کی رسم شروع ہو گئی..... ڈھولک کی تھاپ پر مہندی کے گیت کانوں میں رس گھول رہے تھے..... اظہار بھائی بہت خوش نظر آرہے تھے۔

اتنے میں نبیل کے دوست احسن نے اس کے کان میں سرگوشی کی مگر نبیل کو دلہن دیکھنے کے بعد ہوش

ہی کہاں تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اسٹیج پر پہنچنا چاہ رہا تھا۔ تبھی ایک دوست اسے تھام کر ایک طرف لے گیا۔

”پاگل نہ بنو نبیل، مجھے پتا تھا تم کیا کرنے جارہے ہو۔ اس کی زندگی تباہ ہوجائے گی، تم کر سکتے تھے اس سے فوری شادی......؟ نہیں ناں کیونکہ تمہارا میڈیکل...... تمہارے والدین کے خواب...... سب کچھ تباہ ہوجائے گا۔ کیا کروگے اگر نیلما نے خود انکار کردیا۔“ نیلما کو دیکھ کر خود عمار کو بھی دھچکا لگا تھا مگر یہ ان کی ماما کی پسند تھی جس پر نیلما کے والدین کے ساتھ خود نیلما نے بھی بخوشی رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ عمار اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا مگر نبیل اپنے حواسوں میں نہیں تھا...... دونوں دوست اسے پکڑے ہوئے تقریب سے باہر لے گئے تھے۔ اپنی ہی محبوبہ کی شادی میں غیروں کی طرح شرکت کرنا نبیل کو جیتے جی مار گیا۔

وہ اگرچہ نیلما سے اسٹیج پر جاکر یہ پوچھنے کا حق تو ضرور رکھتا تھا کہ اس نے اسے دھوکا کیوں دیا...... اگر منزل تک ساتھ نہیں جانا تھا تو خواب ہی کیوں دکھائے تھے۔ بیچ منجدھار میں کیوں چھوڑ دیا اس نے۔

مگر وہ محبت میں بھی ایمانداری اور وفا کا قائل تھا...... نبیل نے ایسی بے وفائی کا کبھی سوچا تک نہیں تھا...... اسی لیے وہ خاموشی سے نیلما کی زندگی سے نکل گیا...... مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پڑھائی چھوٹ گئی...... والدین کا لاڈلا بیٹا، اساتذہ کا قابل شاگرد...... محبت کی راہ میں لُٹ جانے کے بعد زندگی سے بھی بیزار ہوگیا...... وہ بیمار رہنے لگا...... اس کے والد کو اس کا غم کھائے جارہا تھا۔ ماں چھپ، چھپ کر روتی تھی مگر نبیل، نیلما کو بھلا نہیں پا رہا تھا۔ بالآخر باپ جوان بیٹے کے دل پر لگا یہ گھاؤ دیکھ نہ سکا اور خاموشی سے ہمیشہ کے لیے اسے تنہا چھوڑ گیا...... یہ

صدمہ نبیل کے لیے ایک اور دھچکا تھا...... اس کے باپ نے اس کی خاطر اپنی جان کو روگ لگالیا تھا...... ماں اداس رہنے لگی تھی...... پھول سی معصوم بہن جو ہر پل چہکتی تھی...... اداس بلبل کی طرح ایک کونے میں بیٹھی رہتی۔

”اُف نبیل تم نے اس بے وفا کی خاطر کتنے چاہنے والوں کو درد دیا...... کتنے برے ہو تم...... اب ارادہ کرلو کہ اس بے وفا کو یاد نہیں کروگے...... زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہے گی...... کچھ نہیں ہوتا...... کسی کے ہونے نہ ہونے سے...... سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے...... چند روز دل کو درد تو ضرور محسوس ہوتا ہے پھر سارا سلسلہ جوں کا توں چلتا رہتا ہے۔“ اس کا دماغ اسے راہ دکھا رہا تھا پر وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وقت کا کام ہے آگے بڑھنا سو وہ رواں دواں رہتا ہے۔ ”منزل کیا ہے یہ کوئی نہیں جانتا...... نہ کوئی کسی کے لیے مرتا ہے...... نہ کسی کے لیے کوئی عمر بھر روتا ہے۔ جو یادیں کسی کو رلاتی ہیں، جو نقش کسی کی زندگی اجیرن کیے ہوئے ہوتے ہیں انہیں مٹادینا چاہیے۔ ان منظروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹادینا چاہیے۔ جن کی وجہ سے آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں...... اس وقت کے انتظار کا کیا فائدہ...... جو کبھی نہیں آنے والا۔“ اس کے دل و دماغ میں جنگ مسلسل جاری رہتی۔ ”کون دے گا ان اجاڑ، اداس اور ویران لمحوں کا حساب جو میں نے اس بے وفا کی یاد میں تڑپ کر گزارے۔“ وہ سسک اٹھتا...... کافی مہینوں کی ذہنی کشمکش اور دوستوں کی مدد سے اس نے خود کو صرف اور صرف پڑھائی کے لیے مخصوص کردیا۔ اس کی ماں کی دعائیں رنگ لائیں اور وہ کامیابیاں پاتا چلا گیا اور پھر ایک دن نبیل احمد ملک کا بہترین.... کارڈیالوجسٹ بن گیا۔ اس کی محنت، لگن اور انتھک کوششیں رنگ لائیں اور آج پورے ملک میں اس کی قابلیت کا چرچا تھا وہ چالیس برس کا ہوچکا تھا مگر

اسلامی تعلیمات ناپ تول کے بارے میں

حقیقت یہ ہے کہ دینِ اسلام تین چیزوں سے عبارت ہے، اعتقادات، عبادات اور معاملات...... مسلمانوں کی بدقسمتی کی آغاز اس دن سے ہوا جب لوگوں نے تھک ہار کر عبادات اور اعتقادات کو الگ کردیا اور معاملات کو الگ کرلیا، ہمارا اجتماعی مزاج یہ ہے کہ طاقت کے آگے، آگے اور دولت کے پیچھے، پیچھے چل رہے ہیں، بلکہ دوڑ رہے ہیں۔

اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت شعیبؑ کی قوم پر عذاب کے نزول کا سبب ناپ تول میں کمی تھا۔

کاروباری بددیانتی کی وجہ سے وہ اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے، جبکہ پیغمبرِ خدا ہمیشہ انہیں ناپ تول میں کمی سے روکا کرتے تھے۔ ارشاد باریِ تعالیٰ ہے۔ ''اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا تو انہوں نے کہا، اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو اور میں تمہیں خوش حال دیکھتا ہوں اور مجھے تمہارے بارے میں ایسے دن کے عذاب کا خوف ہے جو تم کو گھیر کر رہے گا اور میری قوم، ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری، پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔'' (سورۂ ہود، آیت 84) ایک اور جگہ ربّ کائنات نے فرمایا۔ ''ہلاکت ہے ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے جو لوگوں سے تو

شادی کے نام سے دور بھاگتا تھا...... چھوٹی بہن اور بھائی بیاہے جا چکے تھے، ماں اسی آس پر زندہ تھی کہ نبیل کے سر پر سہرا دیکھ لے مگر اس کی زندگی کا مقصد دلوں کا علاج کرنا بن گیا تھا کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ خود تو شکستہ دل تھا مگر مسیحا بن کر سب کے زخمی دلوں کو نئی زندگی کی نوید دیتا۔ وقت تیزی سے گزرتا چلا گیا۔ ایک روز اماں بھی زندگی کی بازی ہار بیٹھیں۔

☆☆☆

''سر وہ مسز اظہار کے کیس کے بارے میں ڈاکٹرز کا پینل بیٹھ رہا ہے، آپ اپنا شیڈول فائنل کردیں۔ کل تین بجے کا وقت ہے۔'' اس کے سیکرٹری نے اسے فون پر اطلاع دی جب وہ اسی کیس کی فائل پر غور کررہا تھا۔ مسز اظہار کے نام نے اسے چونکا دیا تھا کیونکہ چند ماہ قبل اسی نام کی مریضہ صحت یاب ہوکر جا چکی تھی۔ استفسار کرنے پر پتا چلا کہ یہ کوئی اور مسز اظہار ہیں، وہ اسے دیکھنے کا مشتاق ہوا کیونکہ یہ کیس اس کے پاس ڈائریکٹ نہیں آیا تھا۔ دل نے کہیں گواہی دی کہ شاید یہ نیلما اظہار ہو۔

جب پینل بیٹھا تو معلوم ہوا کہ اٹھارہ سالہ نئی شادی شدہ لڑکی تھی جس کا کیس کافی پیچیدہ تھا، وہ ایک دفعہ پھر نام سے دھوکا کھا گیا تھا۔ وہ یہیں پاکستان میں اپنے ملک کے لوگوں کا علاج کرنا چاہتا تھا سو باہر سے اعلیٰ ڈگریاں لے کر اپنی جگہ ہی آبسا تھا۔ اس کے پیارے وطن کے پیارے لوگوں کو اس کی ضرورت تھی اور اس کے دل کو کس کی چاہ تھی یہ خود اس کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

☆☆☆

نیلما سویڈن سے پاکستان واپس آگئی تھی وہ بھی ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے...... اس کی اور اظہار کی علیحدگی ہوگئی تھی۔ یہ بات اسے اپنے پرانے دوستوں سے معلوم ہوئی تھی۔ عمار سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا شاید نیلما کے اس کی بھابی بننے کے بعد

پورا پورا ناپ لیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔ (سورہ مطففین)
ناپ تول کے متعلق سرکارِ دو عالمؐ نے فرمایا۔ "اے تولنے والے تُو تول اور جھکتا ہوا تول۔"
آپ ﷺ نے فرمایا۔
"جھوٹی قسم سے سودا بک جاتا ہے مگر (انجام کار) کاروبار تباہ ہو جاتا ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "سچا تاجر قیامت کے دن عرش کے سایے کے نیچے ہوگا۔" اے لوگو...... تمہیں معلوم ہے کہ خدا کی مدد نیک تاجروں کے ساتھ ہے۔ اور سچا تاجر انبیا، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہوگا۔" آپ ﷺ نے مزید فرمایا۔ "جس نے (کاروبار) میں دھوکا دیا۔ وہ میرا پیروکار نہیں۔"

رسول اللہ ﷺ نے تجارت کو نفع اور خیر و برکت کا ذریعہ قرار دیا، جہاں آپ ﷺ نے ایمان دار تاجر کے فضائل اور مقام و مرتبہ بیان فرمایا، وہاں آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا۔ "خریدنے والا اور بیچنے والا جب تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں، وہ معاملہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں پورا اختیار رکھتے ہیں۔ اگر انہوں نے سچائی اور دیانت سے کام لیا تو ان کے معاملے میں برکت ہوگی، اگر غلط بیانی (جھوٹ) اور کچھ چھپایا (عیب) تو ان کے معاملے میں تجارت کی برکت ختم کر دی جائے گی۔"

اقتباس از مضمون: ڈاکٹر سعید احمد صدیقی

مرسلہ: جبیں نیاز، ملتان

خود نبیل ہی اس سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔

اُدھر نیلما نے اظہار سے شادی تو کر لی تھی مگر اسے کسی کا دل توڑنے کی سزا کچھ یوں ملی کہ اب تک وہ تنہا اور آبلہ پا چل رہی تھی...... کوئی اسٹیٹس، کوئی شاہانہ رہن سہن، دولت کی جھنکار کچھ بھی دل کا قرار واپس نہ لا سکا تھا۔ صرف اضطراب ہی نبیل سے بے وفائی کے بعد اس کا مقدر بنا تھا۔ اور وہ پندرہ برس کا بیٹا لے کر پاکستان لوٹ آئی تھی۔

نیلما اور اظہار کا بیٹا جو بہت خوب صورت اور ذہین بچہ تھا مگر افسوس کہ دل میں پیدائشی نقص لے کر پیدا ہوا تھا۔ سویڈن کے ڈاکٹرز نے اس کی عمر پندرہ سے بیس سال تک بتائی تھی کہ بس اس سے زیادہ وہ جی نہیں سکتا وہ بھی اگر غذا، دوا اور دیگر پرہیز کرتا رہا تو...... نیلما سویڈن کے ڈاکٹروں سے مایوس ہو چکی تھی...... اس کا بیٹا سالار دیکھنے میں بہت خوب صورت تھا مگر جسامت کے لحاظ سے کمزور تھا۔ نیلما اس کی حد درجہ نگہداشت کرتی مگر پھر بھی آئے دن اسے کوئی نہ کوئی مسئلہ رہتا...... نیلما کے سر درد نے اور بیٹے کی بیماری سے تنگ آ کر اظہار نے سویڈن میں ہی دوسری شادی کر لی اور نیلما اس سے طلاق لے کر واپس اپنے ملک چلی آئی...... ہاں اظہار نے اتنی مہربانی ضرور کی تھی کہ لاہور میں موجود اپنا مکان سالار کے نام کر دیا تھا اور سویڈن کے قانون کے مطابق اچھا خاصا بینک بیلنس بھی ماں، بیٹے کے حصے میں آیا تھا سو فی الحال تو اُسے مالی طور پر پریشانی نہیں تھی۔ پاکستان آ کر اسے سب سے پہلے مشہور معالج ڈاکٹر نبیل سے ملنا تھا...... اپنی گمشدہ محبت پانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے بیٹے کے معالج کی حیثیت سے۔

"سر وہ کوئی مسز نیلما اظہار آپ سے اپنے بیٹے کے لیے اپائنٹمنٹ لینا چاہ رہی ہیں۔" اس کے سیکرٹری نے اسے فون پر بتایا۔

وہ اپنے آفس میں بیٹھا بڑے انہماک سے

ایک کیس کی فائل اسٹڈی کر رہا تھا۔سیکرٹری کی بات پر اسے جیسے کرنٹ سا لگا تھا پھر کچھ دیر توقف کر کے اس نے انہیں نزدیک ترین وقت دینے کو کہا۔

''یہ نیلما اظہار کا بیٹا......؟ آخر ایک ہارٹ اسپیشلسٹ کی اسے کیا ضرورت پیش آ گئی؟'' دو دن وہ اسی اُدھیڑ بن میں رہا پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب اس کی محبت اس کے سامنے کھڑی تھی۔بے انتہا بے ڈول جسم کی نیلما مگر چہرے پر وہی معصومیت تھی البتہ رنگ کہیں اور زیادہ سرخ و سفید ہو گیا تھا۔ساتھ کھڑے پندرہ سالہ لڑکے میں ماں، باپ دونوں کی جھلک تھی مگر پھر بھی وہ غیر ملکی بچہ لگ رہا تھا۔جسامت سے وہ دس سال کا دکھائی دیتا۔اصل عمر تو کیس ہسٹری پڑھ کر معلوم ہوئی تھی۔

نیلما نے شاید بیٹے کی وجہ سے ماضی کی کسی یاد کا حوالہ نہیں دیا تھا اور وہ بس ایک پروفیشنل ڈاکٹر کی طرح اسے ٹریٹ کر رہی تھی اور ڈاکٹر نبیل احمد بھی ایک باوقار شخصیت کا مالک تھا۔سو اس نے اپنے قلب کی اصل حالت سے قطع نظر اس کے بیٹے کی بیماری پر ہی دھیان دیا......یوں ان کی پہلی ملاقات اختتام پزیر ہوئی تھی۔وہ رات نبیل نے آنکھوں میں گزاری تھی......یہ وہی نبیل احمد تھا جو کبھی رانجھا، کبھی مجنوں اور کبھی مہینوال کے قصوں پر ہنستا تھا آج وہ خود کسی رانجھے سے کم نہیں تھا۔اس کی لیلیٰ اس سے اگرچہ بیس سال بعد ملی تھی اور وہ بھی اجنبیوں کی طرح مگر اس کے دل کی کسک بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر نبیل احمد سمیت سب ڈاکٹرز نے سالار کا آپریشن تجویز کیا تھا۔گزشتہ ایک مہینے سے اس کے مختلف ٹیسٹ چل رہے تھے۔نیلما اس سلسلے میں کئی مرتبہ نبیل سے ملی تھی مگر دونوں کی صرف سالار کے متعلق ہی گفتگو ہوتی......نبیل کسی، کسی وقت سالار میں اظہار کا عکس دیکھتا تو جھنجلا اٹھتا مگر پھر وہ خود کو احساس دلاتا کہ وہ صرف اس کا معالج ہے۔اس کے باپ کا رقیب نہیں۔البتہ نیلما کی بے نیازی اسے بہت دکھ دیتی۔صرف اسی کی وجہ سے وہ زندگی کی حقیقی خوشیوں سے محروم تھا۔نبیل کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔اس کا دل چاہتا نیلما کو اس کی گم شدہ محبت کی یاد دلائے، اسے احساس دلائے کہ اس وقت وہ کسی سنگدل حسینہ کی طرح اسے ٹھکرا کر ایک روشن مستقبل کی خاطر چلی گئی تھی مگر وہ روشن مستقبل اس کے لیے تاریک غار ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

آج سالار کا آپریشن ہونا تھا۔کل رات نبیل کے لیے بڑے امتحان کی رات تھی۔وہ چاہتا تو اظہار اور نیلما سے بدلہ لے سکتا تھا مگر یہاں اظہار تو بیچ سے لاتعلق تھا اور دشمنِ جاں نیلما......وہ کسی بھی پرانی یاد کے زیرِ اثر بالکل نہیں تھی......نبیل نے بھی بڑے باوقار طریقے سے یہ پورا عرصہ گزارا تھا لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو نوخیز جوانی میں زخم کھا بیٹھا تھا اور آج اس عمر میں پھر سے اپنی محبت پا کر بائیس چوبیس سالہ نوجوان بننا چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

''مبارک ہو مسز نیلما اظہار آپ کے بیٹے کا آپریشن کامیاب ہوا ہے اور اس کا سہرا ڈاکٹر نبیل کے سر جاتا ہے۔'' سینئر اسٹاف نے اسے آ کر گویا زندگی کی نوید دی تھی۔

آپریشن کے بعد کے سارے مراحل کے بارے میں ہدایات وہ جونیئر ڈاکٹرز سے حاصل کرتی رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بہت دیر سے اس کے آفس میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔تبھی ڈاکٹر نبیل بڑے مصروف انداز میں کمرے میں داخل ہوا اور پھر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا آج نیلما کافی حد تک اسے پرانے انداز کی نیلما

لگی تھی۔ بیٹے کے ٹیسٹ وغیرہ اور آپریشن کے چکر میں وہ کافی دبلی ہو گئی تھی۔ لگتا تھا آج وہ اسی کے لیے خاصی تیار ہو کر آئی ہے۔

نبیل کو دیکھتے ہی وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں خوب صورت پیکنگ میں ایک بلیک چاکلیٹ کیک تھا جو اس نے بے حد تعریفی کلمات کے ساتھ نبیل کو دینا چاہا۔

نبیل نے کیک کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے بلکہ اسے واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی ریوالونگ چیئر پر آ بیٹھا۔ نیلما نے کیک میز پر ہی رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی نبیل نے ہی اسے مخاطب کیا۔

”جی مسز اظہار، آپ کے بیٹے سالار کی اب کیسی طبیعت ہے؟“ اس نے اس کے بیٹے کے متعلق پوچھا جسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔

نیلما نے جز بز ہو کر پہلو بدلا۔

”وہ تو بالکل ٹھیک ہے نبیل...... لیکن آج میں صرف تم سے ملنے آئی ہوں...... اپنے پرانے ہمدم، اپنے دوست سے جو کبھی صرف میرا تھا۔“ وہ بڑی ادا سے بول رہی تھی۔

”کیوں نبیل...... کیا تم سب کچھ بھول گئے ہو؟ پر مجھے تو سب یاد ہے۔“ نیلما نے سنگدلی کی انتہا کر دی۔

نبیل اسے بس دیکھ کر رہ گیا۔ دل میں اٹھتے طوفان...... آنکھوں اور لبوں سے ابھرتے رہ گئے...... اس نے اک گہری سانس لی۔

”نیلما اظہار صاحبہ......! میں اپنے مکمل ہوش و حواس میں اس وقت بھی ہوں جیسا کہ اپنی نوجوانی کے زمانے میں تھا کچھ بھی بھولنے کا کیا مطلب ہے......؟ میرا خیال ہے اتنا تو اندازہ آپ کو بھی ہو گیا ہوگا کہ میری یادداشت بفضلِ خدا سلامت ہے تو پھر بیس سال پہلے کی باتیں بھی کیوں بھولوں گا۔

کوئی صدیاں تو بیت نہیں گئیں؟'' نبیل نے میز پر دونوں ہاتھ ٹکا کر بڑے جتانے والے انداز میں کہا۔

اس کے لب و لہجے پر نیلما سن سی ہو کر رہ گئی۔

''میرا مطلب تھا تم نے اس پورے علاج کے عرصے میں کوئی بات بھی ماضی کے حوالے سے نہیں کی...... چاہے تم یقین نہ کرو مگر میں تمہیں نہیں بھولی۔ میں آج بھی تمہیں چاہتی ہوں۔''

نیلما بظاہر بڑے افسردہ لہجے میں کہہ پائی تھی مگر جانے کیوں نبیل کو اس کے الفاظ میں ذرا بھی سچائی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''یار نبیل، نیلما اگرچہ میری بھابی بننے جارہی ہے مگر میرا دل بڑا خراب ہوتا ہے یہ سوچ کر کہ اس نے صرف بھائی کا پیسہ دیکھ کر اپنے ماں، باپ کو بھی راضی کرلیا ہے...... وہ تو تمہاری تھی ناں تو پھر......؟'' نبیل کو عمار کی برسوں پرانی بات یاد آئی تو وہ اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گیا۔

''آج...... یہ کیوں اس انداز میں میرے سامنے آئی ہے؟ یہ کیا چاہتی ہے...... کیا اظہار سے علیحدگی کے بعد اب میری اسٹرانگ پوزیشن کو دیکھ کر میری جانب بڑھ رہی ہے؟'' وہ حد درجہ بدگمانی کا شکار تھا۔ اس نے نیلما کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''کیوں نبیل، کیا تمہاری زندگی میں کوئی اور آگیا ہے جو تم مجھ سے اتنی اجنبیت برت رہے ہو......؟ مجھے سچ، سچ بتاؤ کیا بات ہے؟'' اس کا لب و لہجہ منت آمیز تھا جو نبیل کو چونکا رہا تھا۔

''مسز نیلما اظہار آپ کیا سننا چاہ رہی ہیں؟''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا جبکہ یہ وہی نبیل تھا جو ایک ڈیڑھ ماہ سے یقیناً نیلما کی آمد کے بعد سے بے انتہا ڈسٹربڈ تھا۔ وہ تو اپنے ماضی میں سفر کررہا تھا مگر آج نیلما کے انداز و الفاظ نے اسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ وہ اس محبت کے جنون سے، اس پیار کی کشش سے باہر آچکا تھا۔ آج اس پر نیلما کی حقیقت واضح ہوگئی تھی۔

اس کی طویل خاموشی نے نیلما کو بھی خاموش کر دیا تھا۔

''مسز اظہار جائیں، آپ کو آپ کا بیٹا سالار یاد کررہا ہوگا۔ اب آپ صرف اور صرف اس کا اور اس کی دوا اور غذا کا بھرپور خیال رکھیے، انشاء اللہ وہ بہت جلد روبصحت ہوگا اور مجھے یقین ہے وہ اب آپ کا منتظر ہوگا۔'' ان چند جملوں میں وہ بہت کچھ کہہ کر معذرت کرکے کسی اور مریض کی فائل کھول کرا سے پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔

نیلما بڑے تھکے، تھکے انداز میں اپنی نشست سے اٹھ کر دروازے کے قریب گئی۔ ذرا کی ذرا مڑ کر کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا گویا کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ نبیل نے کچھ محسوس کرکے میز پر رکھے انٹرکام کا ریسیور تیزی سے اٹھایا تھا۔

''مسٹر کریم نیکسٹ اگر کوئی وزیٹر ہے تو بھیج دیجیے...... آپ کو تو علم ہے میں کل صبح کی فلائٹ سے دو مہینے کے لیے نیویارک جارہا ہوں جہاں دو سیمنارز ہیں اور پھر کینیڈا چھوٹی بہن کے پاس جاؤں گا تو پلیز آج کے وزیٹرز آپ اپ ڈیٹ کرلیجیے تاکہ انہیں کوئی دشواری نہ ہو۔''

مسٹر کریم اس کا سیکریٹری جو اس کے پروگرام سے مستقل آگاہ رہتا تھا مگر وہ یہ سب باتیں محض نیلما کو سنانے کے لیے دُہرا رہا تھا۔

نبیل نے اس وقت تک ریسیور تھامے رکھا جب تک وہ کمرے سے نکل نہیں گئی۔

''جانے وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔'' نبیل نے ایک آہِ سرد بھری اور پھر اپنی یادوں کی ڈائری کی ورق گردانی شروع کردی۔ وہ اپنی پہلی اور آخری محبت ہرگز نہیں بھولا تھا۔



وارث

ریحانہ حسن

مجھے فنِ مصوری وراثت ہی میں ملی...... میرے والد بھی اپنے زمانے کے مشہور مصور کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ شاید میرے کام سے زیادہ لوگ اب میرے نام سے محبت کرتے تھے۔ کام کیسا ہی ہو نام بن جائے تو لوگ پینٹنگ پر صرف نام دیکھتے ہی خرید لیتے ہیں...... اس طرح گھر بیٹھے کی گئی محنت کے صلے میں مجھے بھی اچھی خاصی رقم مل جاتی...... اور میں اپنی تنہا زندگی کو سکون سے بسر کر رہا تھا۔

انہی دنوں میں exhibition کے سلسلے میں کچھ پینٹنگز کراچی لے کر جا رہا تھا روانگی سے قبل اپنے اس شاہ کار کو آخری ٹچ دے ہی رہا تھا کہ میرے ایک قریبی دوست اکمل قریشی نے آ کر مجھے

چونکا دیا۔ وہ میری بنائی ہوئی تصویر کی بڑے کھلے دل سے تعریف کر رہا تھا۔ شاید وہ اس حسینہ کی تصویر سے کافی متاثر تھا۔

''یار سرمد! تم اتنی خوب صورت، خوب صورت لڑکیوں کی تصاویر بناتے رہتے ہو، کبھی اصل میں بھی کسی خوب صورت لڑکی کو اپنے دل کے کینوس پر فٹ کیا ہے؟''

اکمل قریشی کا یہ سوال اکثر اس وقت ہوتا تھا جب، جب اس کو میرے کینوس پر کسی خوب صورت لڑکی کی تصویر نظر آتی تھی اور ہر بار اس کے اس سوال کا جواب میں نفی میں سر ہلا کر اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیا کرتا تھا۔

''یار شاہ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ تم تمام زندگی یونہی گزار دو...... بھائی میرے، یہ زندگی بہت حسین ہے اسے انجوائے کرنا سیکھو...... یہ درست ہے کہ تم صرف اور صرف اپنا سارا دن اپنے اسٹوڈیو کے بند کمرے میں رہ کر اپنے فن کی خدمت میں گزار دیتے ہو لیکن کبھی تم نے یہ نہیں سوچا کہ اس فن کو تمہارے بعد بھی زندہ رہنا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے تمہارے والد کے بعد تم نے اس فن کو اپنایا اس کو زندہ رکھا......'' وہ کافی جذباتی ہو رہا تھا۔ ''تم نے کبھی نہیں سوچا کہ تمہارے بعد بھی اس فن کو زندہ رہنا چاہیے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب تم اس فن کو کوئی وارث دو گے...... بھئی میرے ساتھ، ساتھ تمہاری بھابی کا بھی یہی خیال ہے کہ اب تم کو جلد از جلد شادی کر لینی چاہیے...... چلتا ہوں سوچنا ضرور پھر ملاقات ہوگی۔''

اکمل قریشی تو یہ کہہ کر چلا گیا...... لیکن جو اسٹروک میں تصویر پر لگا رہا تھا وہ نہ جانے کیوں مجھ سے نہ لگ سکا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ میں اس کی باتوں کی سچائی میں کھو سا گیا تھا۔ میں جو خود اپنی ذات کے حصار میں جکڑا ہوا تھا، مجھے دنیا کی خبر ہوتی تھی اور نہ میں دنیا کو اپنی خبر دینا چاہتا تھا۔ آج اکمل کی کہی بات نے مجھے ہلا کر رکھ دیا...... اس کی ہر بات سے خلوص و اپنائیت جھلک رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ اکمل کے ساتھ میری وہ دیرینہ دوستی تھی جو بے شمار دوستوں میں اسے الگ ظاہر کرتی تھی۔

اس کی شادی کو پانچ برس ہو چکے تھے ایک بیٹا بھی تھا اس کا...... اس روز میں ساری رات نہ سو سکا۔ وقت کی تیزی کا مجھے کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔ کافی دیر اپنے ویران اور بے ترتیب گھر کو دیکھتا رہا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ گھر ایک عورت کا منتظر ہے۔ اس کی ویرانی کو دور کرنے کے لیے قہقہوں سے بھرپور زندگی کی ضرورت ہے پھر میں غیر ارادی طور پر ان قیمتی ماہ و سال کا حساب لگانے لگا۔ جو جوانی کے بہترین سال جانے جاتے ہیں...... ایک طویل عمر گزر چکی تھی لیکن پھر اندازہ ہوا کہ مرد تو کبھی بوڑھا نہیں ہوتا...... چالیس، پینتالیس سال کی عمر کا کنوارہ مرد بھی زندگی کی خوشیاں حاصل کر سکتا ہے اور پھر آج کل تو فیشن بن گیا ہے کہ لڑکیاں اپنے سے زیادہ عمر کے مردوں سے شادی کرنے کو فوقیت دیتی ہیں اور نہ بھی دیں...... عورتوں کی کون سنتا ہے، ہمارا معاشرہ تو مرد کا معاشرہ کہلاتا ہے، عورت تو آج بھی بے بس نظر آتی ہے، مرد کوئی بھی فعل کسی بھی وقت انجام دے سکتا ہے۔ اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی لگانے والا موجود نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اکمل قریشی صحیح کہتا ہے۔ اب مجھے سنجیدگی سے شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے اور جلد شادی کر لینی چاہیے۔ ہاں اس گھر کے لیے، میرے لیے، میرے فن کے لیے مجھے شادی کرنی ہوگی وہ بھی بہت جلد۔

کراچی جا کر میں نے اپنے فن پاروں کو ہاتھوں ہاتھ فروخت کیا اور جلد ہی لاہور آ گیا۔ یہ میری عادت تھی کہ جب بھی میں ان تصاویر کی نمائش کے لیے کہیں جاتا تو وہاں کے مشہور بازار سے کچھ خریداری ضرور کرتا تھا...... اور اس بار ایک دو سوٹ پیس یہ سوچ کر لے

لیے کہ جلد از جلد انہیں محلے کے ماسٹر سورتی سے تیار کروالوں گا تاکہ پھر کہیں جانا ہو تو نئے کپڑے تیار ہوں۔ ماسٹر صاحب کی سلائی بہت نفیس تھی۔

دوسرے روز ہی سوٹ پیس لے کر ماسٹر صاحب کی دکان پر گیا مگر دکان بند دیکھی...... میں نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر دکان سے متصل ان کے گھر کے دروازے کی بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد ایک پچیس چھبیس سالہ لڑکی نے دروازہ کھولا اور ملنے کی وجہ پوچھی...... میں ایک لمحے کو اس کے سراپا میں کھو سا گیا۔ وہ حیرت سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں اسے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا ہوں، میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس نے پھر سے توجہ حاصل کرنے کے لیے اپنا سوال دُہرایا لیکن میری خاموشی بدستور قائم تھی۔

''آپ غالباً سرمد شاہ صاحب ہیں؟'' میری خاموشی سے تنگ آ کر وہ خود ہی بولی۔ ''ابا سے آپ کو کیا کام ہے؟ وہ تو فی الحال گھر پر نہیں ہیں......'' میں اس کی طلسماتی شخصیت سے باہر آ چکا تھا۔ بیک وقت کئی حوالوں نے مجھے اپنے حواس درست کرنے پر مجبور کر دیا...... مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ وہ مجھے جانتی تھی مگر میں نے خوشی ظاہر کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

''آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہے؟'' وہ مجھے الٹا سوال کرنے پر مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ شاید سمجھ گئی تھی کہ میں نروس ہو رہا ہوں۔

''وہ جی آپ کو کون نہیں جانتا اس محلے میں، آپ تو بڑے آدمی ہیں، آپ کی تصاویر تو پورے شہر میں پسند کی جاتی ہیں۔''

''بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ مجھ ناچیز کو جانتی ہیں، میں دراصل ماسٹر صاحب کو یہ کپڑے دینے آیا تھا۔ جلد از جلد تیار کر دیں۔ میرا ناپ ان کے پاس ہے۔ میری طرف سے انہیں سلام کہیے گا۔ شکریہ...... خدا حافظ۔''

کسی فاتح کی طرح میں واپس گھر آ گیا۔ مجھے اکمل قریشی کا فوراً خیال آیا...... ہاں کیوں نہ میں اکمل کو یہ بات فون پر بتاؤں...... نہیں، میرے خیال میں زیادہ بہتر ہو گا کہ میں خود ہی اس کے گھر چلا جاتا ہوں۔ وہاں بھابی بھی موجود ہوں گی...... ماسٹر صاحب کی صاحبزادی کا ذکر ان کے سامنے ہی کروں تو بہتر ہو گا۔

میں کچھ دیر کے لیے اپنی بے تاب دھڑکنوں کو سنبھالنے کی غرض سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ یوں تو میرے کینوس پر نہ جانے کتنی خوب صورت لڑکیوں کے چہرے بنے ہوئے تھے مگر خدا کی مصوری کا بے شک کوئی جواب نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سادہ لباس میں بھی کسی الگ دیس کی شہزادی لگ رہی تھی۔ اس کے تیکھے نقوش میرے دل میں اترنے لگے...... اس کا سانولا پن، سفید اجلی رنگت کو بھی مات دے رہا تھا۔ وہ قدرت کا حسین شاہکار تھی اور میں حسینوں کی قدر کرنا جانتا تھا۔

اور پھر جلد ہی اکمل قریشی اور بھابی کو میں نے ماسٹر صاحب کے پاس اپنے رشتے کے لیے بھیج دیا۔ ماسٹر صاحب خوش تھے مگر انہوں نے صاف بتا دیا کہ وہ بینا کو جہیز وغیرہ کچھ نہیں دیں گے۔ مجھے اس وقت ان کی کسی بات سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ میں نے صرف نکاح پر زور دیا کہ وہ جلد از جلد ہو جائے۔ باقی ہر شے میرے گھر میں موجود ہے۔ یوں ایک ہفتے بعد ہی بینا دلہن کے روپ میں میرے گھر آ گئی۔ اس کا حسن اس نئے روپ میں اور کھل اٹھا۔ وہ رات میرے لیے زندگی کی سب سے خوب صورت رات بن گئی۔ اس روز مجھے ادراک ہوا کہ مجھے کائنات کی سب سے بڑی خوشی مل گئی ہے۔ جس سے اب تک میں ناآشنا تھا، محروم تھا اور اب جبکہ یہ خوشی حاصل ہو گئی ہے تو مجھے اور کسی شے کی تمنا باقی نہ رہی۔ سوائے اپنے فن کے لیے ایک وارث کے۔

وقت بہت خوب صورت گزرنے لگا۔ اب میں جلد سے جلد اپنا کام ختم کرنے لگا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ کوئی میرا منتظر رہتا ہے۔ بینا نے اپنے سلیقے سے اس گھر کو جنت بنا دیا تھا۔ ہر شے خوب صورت لگنے لگی تھی۔ میرے دل میں روز بروز اس کی عزت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ حسن و سیرت کا شاہکار تھی...... ایسا شاہکار جو میں کبھی تخلیق نہیں کر سکتا تھا۔ شادی کے تین ماہ بعد مجھے خوش خبری ملی کہ میں باپ بننے والا ہوں۔ اس روز سے ہی میں نے ایک حسین لڑکے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ ہر پل بینا سے اپنے آنے والے مہمان جس کا نام میں نے جہانزیب سوچا تھا...... ذکر کیا کرتا تھا۔ وہ میری شدت اور بے تابی کو محسوس کرتی تھی۔ اگرچہ میں دن رات لڑکیوں کی تصاویر بنایا کرتا تھا مگر مجھے لڑکی کی پیدائش سے نفرت تھی۔ شاید یہ بات بینا نے بھی محسوس کر لی ہوگی۔ مگر وہ خاموش رہی۔ یہی وجہ تھی کہ قدرت نے میرے تمام خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔ میرے گھر بیٹی پیدا ہوگئی...... میں نے پہلے دن غصے میں آ کر بینا اور بچی کا چہرہ تک نہیں دیکھا۔

پھر اکمل قریشی نے مجھے سمجھایا کہ اس میں بینا یا بچی کا کیا قصور ہے۔ یہ تو اللہ کی رضا اور مرضی سے ہوا ہے۔ اس بار نہ سہی اگلی بار وہ تمہاری خواہش پوری کر دے گا۔ اس آس پر میں دوسرے دن بینا سے ملنے اسپتال چلا گیا۔ وہ بیچاری بھی میرے رویے سے پریشان ہوگئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے کتنی شدت سے بیٹے کی خواہش تھی۔ مگر خدا کے کاموں میں بندے کی کیا مجال...... میں اب بجھ سا گیا تھا بہت کم بات چیت کرتا...... بیٹی کے تو قریب سے بھی نہیں گزرتا...... یونہی دو سال گزر گئے...... بینا نے مجھے پھر ایک روز اطلاع دی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ میں اب باقاعدہ نمازوں میں اللہ سے بیٹے کی خواہش کرنے لگا تھا۔ مگر دوسری بار بھی میرے گھر بیٹی پیدا ہوگئی۔ اب تو میں بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو خوب کوسا کہ میری قسمت ہی خراب ہے، میں بڑھاپے میں بس ان لڑکیوں کا جہیز تیار کرتے، کرتے ہی گزر جاؤں گا۔ اب تو بیٹے کی خواہش کرنا ہی فضول ہے، مجھے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ دن رات اپنے کام میں مصروف رہتا۔ اکثر کئی دنوں کے لیے شہر سے باہر بھی رہنے لگا تھا۔ لڑکیاں تو دوسرے گھر کی ہوتی ہیں، کون میرے بعد میرے فن کو قائم رکھے گا یہ غم مجھے اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔

ایک بار painting exhibition کے سلسلے میں کراچی جانا ہوا تو اپنے ایک دوست کے اصرار پر چند دنوں کے لیے وہیں رک گیا...... وہاں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ نسیم خان جس کے چار بچے تھے تین بیٹے اور ایک بیٹی...... بیوی بچوں کے علاوہ نسیم خان کی ایک جوان بہن بھی ساتھ رہا کرتی تھی۔ والدین کے انتقال کے بعد اس کی ذمے داری اب نسیم کے کندھوں پر تھی وہ اس گھر میں آدھے حصے کی مالک بھی تھی۔ یعنی نسیم خان اس کے لیے گھر داماد تلاش کر رہا تھا۔

ایک دن میں اپنا کام ختم کر کے گھر آیا۔ تو نسیم خان اپنی فیملی کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا۔ صرف ایک بڑا لڑکا جو بارہ تیرہ برس کا تھا۔ اپنی پھوپی کے ساتھ گھر پر موجود تھا۔ میں جس کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا اس کا ایک دروازہ اندر گھر کی جانب بھی کھلتا تھا۔ میں باہر والے دروازے سے آیا جایا کرتا تھا۔ میرے آنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی نسیم خان کا بیٹا کھانے کی ٹرے لے کر اندر والے دروازے سے داخل ہوگیا۔

''چاچا کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو دروازہ بجا دینا۔ میرا نام سلیم ہے۔''

کھانے کے بعد میں نے کمرے میں رکھے کولر سے پانی لینا چاہا مگر وہ خالی تھا۔ مجبوراً مجھے دروازے

پر دستک دینی پڑی۔ اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔
''سلیم تو نہیں ہے آپ کو کیا کام ہے؟''
''جی دراصل میرے کمرے کے کولر میں پانی بالکل نہیں ہے، پینے کا پانی چاہیے تھا۔'' میں نے مدھم لہجے میں کہا۔ دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک لمبی چوڑی گوری رنگت والی لڑکی جو سیاہ لمبے بال بکھرائے اور سیاہ کاجل بھری آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری جانب ایک اسٹیل کا جگ پانی سے بھرا بڑھانے لگی۔
''فی الحال تو آپ یہ لے لیں، سلیم آتا ہے تو میں کولر بنا کر رکھ دوں گی۔''
میں کچھ دیر بعد نظریں نیچی کر کے دوازے سے ہٹ گیا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا تھا۔ پیٹ بھر کے کھانا کھانے کے بعد میں سکون کی نیند سو گیا۔ مغرب کے قریب آنکھ کھلی تو وہ بھی نسیم خان کے دستک دینے پر...... اس نے حال احوال پوچھا۔ اور پھر بتایا کہ رشتے داروں میں کسی کا انتقال ہو گیا تھا۔ صبح سے شام وہیں ہو گئی۔ ہم نے پھر چائے ایک ساتھ پی، باتوں ہی باتوں میں اس نے میرے گھر، بیوی اور بچیوں کی خیریت معلوم کی اور ساتھ ہی سوال کیا کہ کیا تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے؟
یہ بات وہ جانتا تھا مگر شاید میرے منہ سے وہ میرے دل میں دبی حسرت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔
''اب تو بیٹے کی خواہش کے بارے میں بھی سوچنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ قدرت نے میرے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی ہے، تقدیر نے میری قسمت میں آزمائش ہی لکھی ہوئی ہے۔''
''اول تو ایسی بات نہ کرو قدرت کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتی ویسے سر مد اگر تمہیں بیٹے کی اتنی ہی خواہش ہے تو تم دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے ہو۔ اس میں حرج بھی کیا ہے۔ اس بات کی اجازت تو

دعا

دعا ایک امید ہے
دعا ایک یقین ہے
دعا ایک بھروسا ہے
دعا ایک وسیلہ ہے
دعا ایک حوصلہ ہے
دعا محبت ہے، چاہت ہے، وفا ہے
میری دعا ہے میرے پیارے ہمیشہ
خوش آباد و سلامت رہیں۔

از: صدف آصف، کراچی

مردوں کو اسلام بھی دیتا ہے۔ تمہاری خواہش جائز ہے اگر ایک بیوی سے اولادِ نرینہ نہیں ہو رہی تو دوسری کر کے دیکھو......''
''لیکن میری بیوی، اس کے گھر والے اور میرے ...دوست احباب کیا سوچیں گے؟ نہیں وہ مجھے ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔''
''ارے یار اجازت تو تب دیں گے جب تم ان کو دوسری شادی کی اطلاع دو گے۔ بس جیسے کام کے سلسلے میں لاہور سے کراچی آتے ہو ایسے آتے رہنا۔ جب تمہارے گھر بیٹا ہو جائے تو سب کو خبر کر دینا...... پھر دیکھنا سب تمہارے فیصلے پر خوش ہی ہوں گے کوئی ناراضی نہیں رہے گی۔''
''مگر یار میں تو کراچی دو چار دن کے لیے آتا ہوں، یہاں تمہارے علاوہ باقی کسی سے اچھی دوستی اور واقفیت بھی نہیں ہے۔ کہ کہیں رہ سکوں اور شادی بھی کر لوں۔ کون دیکھے گا میرے لیے لڑکی...... اور پھر سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے اس عمر میں اور ان حالات میں دو، دو بیویوں کا بوجھ بھی نہیں اٹھایا جائے گا۔''

''تو کوئی بات نہیں یار...... تم یہ مسئلہ مجھے حل کرنے دو...... دیکھو تم میرے دوست ہو...... صرف اور صرف اسی لیے میں تمہیں اپنی بہن کا رشتہ دینے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے تم پر پورا اعتماد ہے، اسی لیے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ ورنہ میری بہن کو رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ صاحبِ جائداد ہے، آدھے گھر کی مالک ہے اور ہاں یہ کمرا جس میں تم موجود ہو اسے تم اسٹوڈیو بنا کر اپنا کام یہاں کراچی میں بھی شروع کر سکتے ہو۔ پندرہ دن لاہور اور پندرہ دن کراچی میں رہنے سے تمہارا کام بھی چلتا رہے گا اور کسی کو کوئی شک بھی نہیں ہوگا۔ تم اچھی طرح سوچ لو، میری طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہاں تمہارے جواب کا میں انتظار کروں گا۔''

دوسرے روز مجھے واپس کراچی سے لاہور جانا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا مجھے نسیم سے کیا کہنا ہے۔ اسی لیے جانے سے قبل میں نے اسے خود بلوایا تاکہ تفصیلی بات کر سکوں۔

''یار نسیم مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے۔ تم نے میرے لیے جو سوچا ہے وہ واقعی ایک اچھا دوست ہی سوچ سکتا ہے۔ آج سے صوفیہ تمہارے پاس میری امانت ہے، میں اگلی بار مکمل تیاری کے ساتھ آؤں گا۔ اب اجازت دو۔'' نسیم نے مسکراتے ہوئے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور میں سرشار تھا آنے والے وقت کے بارے میں سوچ کر...... مگر فکرمند بھی تھا کہ کیا میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے...... ہاں کیوں نہیں...... اللہ تعالیٰ نے یہ راستہ نکالا ہے تو یقیناً میرے حق میں بہتری ہوگی...... جب راستہ دکھانے کا کام قدرت کر رہی ہے تو میں کیوں نہیں فائدہ اٹھاؤں...... ویسے بھی مجھے ایک وارث چاہیے، اپنا بیٹا چاہیے...... اور نسیم کو صوفیہ کے لیے گھر داماد...... سب کچھ بیٹھے بٹھائے مل رہا تھا۔ شاید اسے ہی قدرت کی مہربانی کہتے ہیں......

ہاں، میں بینا سے کہہ دوں گا کہ کراچی میں کام زیادہ ہے، مجھے وہاں نیا اسٹوڈیو بنانا ہوگا۔ اس لیے وہاں جا کر رہنا ضروری ہے۔ سال دو سال میں کام سیٹ ہو جائے گا تو میں تم لوگوں کو بھی وہاں بلوالوں گا...... فی الحال شروع میں حالات کچھ اچھے نہیں ہوں گے...... یہی بات اکمل سے بھی کہنی ہوگی...... تاکہ مجھ پر کوئی شک نہیں کرے۔

لاہور آکر میں نے حرف بحرف بینا سے وہی کہا جو راستے بھر سوچ رکھا تھا۔ اکمل کو بھی یہی کہا...... ویسے بھی وہ اپنی کمپنی کی طرف سے سعودی عرب جانے والا تھا۔ یہ اس کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ خوب مال کمائے، بھابی اور بچے بھی جا رہے تھے۔ میں نے سب کی دعوت کی اور وہ دعوت زندگی کی یادگار دعوت بن گئی...... کیونکہ آہستہ، آہستہ میرا تعلق اکمل قریشی سے کم ہوتے، ہوتے ختم ہی ہو گیا تھا۔

بینا میری باتوں پر ایمان لا چکی تھی۔ میری تیاری میں وہ برابر سے شریک تھی۔ شاید وہ خواب بُننے لگی تھی کہ کچھ عرصے بعد میں اسے اور بچیوں کو کراچی اپنے پاس بلوالوں گا۔ فی الحال پندرہ دن کا کہہ کر میں نے پہلی بار بینا سے رخصت لی۔ وہ میری ترقی سے بے حد خوش تھی۔ اکثر میں صرف دو چار دن کے لیے زیادہ سے زیادہ جایا کرتا تھا مگر اس بار لمبی رخصت کا سن کر معصوم بچیاں ماں کا دامن پکڑے کھڑی تھیں۔ جن کو میں نے پیار تک نہیں کیا اور روانہ ہو گیا۔ یہاں صوفیہ کی پہلی شادی کی بھرپور تیاریاں زور شور پر تھیں...... سب میرے آنے کے منتظر تھے۔ نسیم اور اس کی فیملی نے دل کھول کر ارمان پورے کیے۔ صوفیہ عروسی لباس میں اپنی بھرپور جوانی کے ساتھ ایک خوب صورت اور بڑے کمرے میں خوب صورت مسہری پر بیٹھی میری منتظر تھی۔ اس کمرے سمیت آدھا گھر میرے اور صوفیہ کے لیے مختص تھا۔

میں صوفیہ کی قربت پا کر بینا کو بھول گیا تھا۔ سچ کہتے ہیں مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ شاید صوفیہ کو میں

پسند آگیا تھا جب ہی نسیم نے رشتے کی بات کی تھی۔ صوفیہ کی باتوں سے بھی یہ بات ظاہر تھی کہ وہ جس چیز پر انگلی رکھ دے، بھائی نسیم وہ فوراً لا کر اس کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔ پندرہ دن اب مہینے میں بدل گئے تھے۔ میں صوفیہ کے ساتھ کئی مقامات کی سیر و تفریح کر چکا تھا۔ صوفیہ کو ہنی مون پر جانے کا شوق جو تھا۔ اُدھر بینا کے اکثر آنے والے فون کو بھی میں اگنور کرنے لگا تھا۔ یا پھر کام کی زیادتی کا بہانہ کر دیتا تھا۔ بہت اصرار پر میں ایک ہفتے کے لیے لاہور چلا گیا۔ بینا نے قطعاً شکایتوں کے دفتر نہیں کھولے۔ وہ میری ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی تھی۔ کبھی کبھی تو میں بینا کی سچائی اور وفا دیکھ کر دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا تھا کہ اتنی مہربان عورت کو دھوکا دے رہا ہوں۔ صوفیہ نے فون پر فون کر کے ناک میں دم کر دیا تھا۔

''جلدی آجاؤ...... میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے اگر تم چلے جاتے ہو...... تم اپنا سارا سامان لے کر میرے پاس آجاؤ...... اپنی بیوی بچیوں کو ہر ماہ رقم بھیج دیا کرو...... میں تم کو اب کہیں جانے نہیں دوں گی......'' اس دن فون کر کے اس نے سختی سے کہہ دیا تھا۔ میں اپنے آپ کو دو کشتیوں کا سوار سمجھنے لگا تھا اور ضروری معلوم ہوتا تھا کہ بالآخر صوفیہ کی بات ماننی ہی پڑے گی...... ایک بار بیٹا پیدا ہو گیا تو بینا بھی مجھے معاف کر دے گی۔

میں کراچی میں سیٹ تھا۔ میں نے ویسا ہی کیا، جانا تو دور کی بات اب میں بینا سے فون پر بھی رابطہ نہیں رکھتا تھا۔ شروع کے چند ماہ تک باقاعدگی سے مہینے کا خرچ بھیجا کرتا تھا مگر جیسے، جیسے صوفیہ کی طبیعت بگڑنے لگی تو علاج معالجے پر رقم پانی کی طرح خرچ کرنے لگا اور کیوں نہیں کرتا صوفیہ میرے بچے کی ماں بننے جا رہی تھی۔ میں اس کے ایک اشارے پر کام کرتا تھا۔ میرے رابطہ نہ کرنے پر بینا نے مجھے ایک خط بھی بھیجا۔ جس میں فون پر رابطہ نہ ہونے کی شکایت تو کی...... مگر پیسوں کی فرمائش نہیں کی...... ساتھ ہی اطلاع دی کہ اس کے والد یعنی ماسٹر سورتی صاحب کا ہارٹ اٹیک ہونے کے باعث انتقال ہو گیا ہے۔

انہیں بینا کی بہت فکر رہتی تھی۔ اس کے والد اپنا مکان بیٹی کے نام کر گئے تھے۔ بینا نے اس مکان میں ٹیوشن سینٹر کھول لیا تھا۔ اس کے خط سے معلوم ہوا کہ میری دوسری شادی کے بارے میں وہ آگاہ ہو چکی ہے۔ صرف روزی کی خاطر کراچی میں رہنا اور ایک ملک ہوتے ہوئے بھی چکر نہ لگانا ہر بیوی کو کھٹک سکتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ میری منتظر تھی۔ ادھر میں نے شرم سے خط پڑھ کر نظریں جھکا لیں۔ میری ہمت ہی نہیں تھی کہ میں خط کا جواب دیتا یا فون کر کے ماسٹر صاحب کی موت پر تعزیت کے دو بول بولتا۔ میری بینا کتنی اکیلی ہو گئی تھی۔ یہ صدمہ تو تھا...... مگر صوفیہ کی آواز نے میری آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روک دیا۔

''اُف خدا...... سرمد...... سرمد...... جلدی آؤ......'' اور میں نے جلدی سے ٹیکسی کر کے صوفیہ کے ساتھ اسپتال کا رخ کیا۔

''مبارک ہو...... مبارک ہو......'' کے نعرے لگنے لگے۔ نسیم اور اس کی فیملی کے علاوہ خاندان کے بے شمار لوگ صوفیہ کی گود ہری ہونے پر جمع تھے۔ صوفیہ نے مجھے خوب صورت اور صحت مند بیٹا دیا تھا۔ میں تو جیسے آسمانوں کی سیر کر رہا تھا۔ میری دیرینہ خواہش آج پوری ہو چکی تھی، نسیم نے خوش ہوتے ہوئے گلے لگایا۔

''یار سرمد شاہ اب تو بتا...... میں کہتا تھا ناں کہ اللہ تعالیٰ تیری خواہش پوری کر دے گا۔ تو ہمت پکڑ...... اور دیکھ رب نے تیری مراد پوری کر دی۔ اب تو بڑی دعوت کا اہتمام کر...... میں تو اپنی بہن اور بھانجے کے گھر آنے پر جشن کرنے والا

ہوں۔'' صوفیہ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا اور میں تو اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے بس مسکراتا رہتا تھا۔

ادھر بینا میرا جواب نہ ملنے پر دل برداشتہ ہو چکی تھی۔ مگر بھی اس عظیم عورت نے میرے در پر آ کر اپنا شکوہ بیان نہ کیا...... وہ دن رات محنت کر کے اپنی بچیوں کے اخراجات پورے کر رہی تھی۔

اور میں یہاں کراچی میں اپنی زندگی میں مست تھا۔ صوفیہ کے منہ سے نکلی ہر فرمائش کو پورا کرتا...... مگر کبھی بینا کا خیال نہ آتا۔ بیٹے کی خوشی میں اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ اپنی پیدا کردہ بچیوں تک کو بھول چکا تھا۔ میرے اخراجات بھی اب بڑھ گئے تھے۔ لہٰذا بینا کو میں جان بوجھ کر نظر انداز کر چکا تھا۔ جبکہ صوفیہ کو میں نے خود سر پر چڑھا رکھا تھا۔ وہ جو من مانی چاہتی کرتی تھی۔ میں دن رات محنت کرنے لگا۔ دوسرے ہی سال مجھے صوفیہ نے پھر ماں بننے کی خوشخبری سنائی۔ میں پھر سے بیٹے کی خواہش کرنے لگا اور پھر ایک روز اللہ نے میری یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ اب میں دو بیٹوں کا باپ بن چکا تھا۔ صوفیہ کے پیر زمین پر ہی نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ دن رات جوان ہوتی جا رہی تھی اور میں دن رات محنت کر کر کے بوڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ دونوں لڑکے خوب پڑھیں لکھیں...... مگر دونوں ہی پڑھائی میں دلچسپی لینے کے بجائے لاڈ پیار میں بگڑ رہے تھے۔ ان کی ہر حرکت، ہر عادت اپنی ماں جیسی تھی۔

ان سب کی صرف ایک ہی خواہش رہتی تھی کہ ان کے منہ سے نکلنے والی ہر فرمائش پوری ہو جائے۔ ایک دن صوفیہ بڑے گھمنڈ میں آ کر بچوں سے کہہ رہی تھی۔

''میں تو بہت کم عمر تھی جب میری شادی ہوئی تھی اور تمہارے ابا...... وہ تو تب بھی بوڑھے تھے اور اب تو بالکل ہی بابا لگتے ہیں۔'' یہ بات میں نے اچانک سن لی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مزید جملہ مکمل کیا......'' کسی بھی شادی یا تقریب میں ہم جاتے ہیں تو لوگ باگ انہیں میرا ابا سمجھتے ہیں۔'' دونوں بچے میرا مذاق زور، زور سے ہنس کر اڑا رہے تھے اور اپنی ماں کی حسین جوانی کی تائید کر رہے تھے۔ جو چوبیس گھنٹے بجی سنوری رہتی تھی۔

ایک لمحے کو میری آنکھوں کے سامنے معصوم صاف و شفاف پاکیزہ حسن والی بینا کا چہرہ لہرا گیا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں اور میں اپنے کمرے میں خاموشی سے آ گیا۔ نہ جانے کیوں صوفیہ کا رویہ دیگر گھر والوں کے سامنے تو ٹھیک ہوتا تھا مگر اکیلے میں وہ مجھے ذلیل کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتی تھی۔

اس کے مزاج میں ایک چڑچڑا پن آ چکا تھا۔ بچے بھی نہ پڑھنا لکھنا چاہتے تھے اور نہ ہی میرے فن میں دلچسپی لیتے تھے۔ مختصر یہ کہ میں جس فن کی حفاظت کے لیے ایک وارث چاہتا تھا وہ مجھے نہ ملا...... اللہ تعالیٰ نے بیٹے تو دیے مگر خود سر اور بدتمیز...... میری سوچ محض ایک خواب بن کر رہ گئی۔ دونوں لڑکے قد نکال چکے تھے۔

ایک دن صوفیہ کی بدزبانی بدستور چل رہی تھی۔ لڑائی جھگڑا بڑھ گیا اور میں نے صوفیہ پر ہاتھ اٹھا دیا۔ وہ شیرنی کی طرح بھپر گئی اور اپنے دونوں لڑکوں کے ذریعے اپنے بھائی نسیم کو بلوا لیا اور فیصلہ سنا دیا کہ میں اب اس گھر میں ایک دن بھی اور نہیں رہ سکتا۔ وہ میری شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ نسیم نے بھی میری جانب سے منہ موڑ لیا اور لڑکوں نے بھی یہ جان لیا کہ یہ سب کچھ عیش و آرام ماں کا دیا ہوا ہے۔ باپ چلا بھی گیا تو کیا فرق پڑے گا۔ ماں ہی اس گھر اور جائداد کی حصے دار ہے۔ لہٰذا دونوں بیٹوں نے بھی باپ کی حمایت نہ کی۔ اس طرح میں دل پر اپنے کیے کا بوجھ لے کر دوسری صبح ہی گھر سے باہر فٹ پاتھ پر آ گیا۔ کئی دن تک در بدر گھومتا رہا۔ ایک دن غم سے نڈھال سڑکوں پر گھوم رہا

تھا کہ ایک گاڑی نے آ کر ٹکر مار دی۔ آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک بہت بڑے اسپتال میں پایا۔

کافی دن زیرِ علاج رہا...... ٹھیک ہونے کے بعد نرس نے مجھے اس محسن کے کمرے تک پہنچا دیا جو مجھے یہاں لے کر آیا تھا اور میرا علاج کروایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے جانتے تھے۔ انہوں نے میرا ایڈریس مجھ سے معلوم کرنا چاہا تھا اور جواب میں، میں نے رو رو کر اپنی داستان سنا دی۔ میں جینا نہیں چاہتا تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک نئی زندگی دی تھی۔ اس لیے سچ بتانا پڑا۔ میں بینا کو بہت مس کر رہا تھا۔ مگر کس منہ سے وہاں واپس جاتا۔

ڈاکٹر صاحب کو میری حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ انہوں نے ایک لیٹر لکھا اور اپنے کارڈ پر ایک ایڈریس لکھ کر کہا۔ ”یہ میری بہو کا ایڈرس ہے، وہ ایک اسکول کی پرنسپل ہیں۔ انہیں اپنے اسکول کے لیے ایک دیانتدار فرد کی ضرورت ہے۔ تنخواہ کے ساتھ رہائش اور کھانا بھی دیں گی۔ آپ ڈرائیور کے ساتھ وہاں چلے جائیں۔“

میں شکر گزار نظروں سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی فرشتہ صفت انسان تھے۔ گاڑی گلشن کے ایک پوش ایریا میں داخل ہوگئی۔ اسکول کافی بڑا تھا۔ ساتھ میڈم کی رہائش بھی تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ میرا سارا دن پڑھنے لکھنے والوں بچوں کے درمیان گزرے گا۔ پہلے دن مجھے میڈم نے صرف آرام کرنے کے لیے کہا۔ دوسرے روز میں اپنی نوکری پر حاضر تھا۔ میں مطمئن تھا اپنے کام سے...... ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے۔ میڈم کا رویہ میرے ساتھ روز بروز اچھا ہوتا جا رہا تھا۔ میں ویسے بھی اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ کم بولتا تھا اور ان کی تمام تر ہدایتوں پر فوراً عمل کرتا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر اور میڈم میرے محسن تھے۔ ان کی بدولت مجھے ایک نئی زندگی ملی تھی۔ اب میری باقی عمر عزت سے گزر سکتی تھی۔ اسی اطمینان

لیلتہُ القدر

حضور نبی کریم کو جب دوسری امتوں کی عمروں کی خبر دی گئی تو آپ نے اپنی امت کی عمر کو، حقوق و فرائض کی بجا آوری کے لیے بہت کم سمجھا چنانچہ باری تعالیٰ نے اس امت کو یہ رات عطا فرمانے کے بعد اس رات کی فضیلت بڑھا دی۔ حدیث میں آیا ہے کہ اسے (شب قدر کو) رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ گویا محض آخری دس روز کی عبادت 83 سال کی عبادت ہوئی۔ اس شب کی فضیلت خود ربِ کریم نے بیان فرمائی ہے اور ایک مستقل سورہ قرآن پاک میں اس حوالے سے آئی ہے۔ لیلتہ القدر مقدر کی رات ہے جس میں بندوں کی تقدیر فرشتوں کے حوالے کی جاتی ہے۔ قدر کی رات کا مطلب عظمت کی رات ہے یعنی عملاً اس رات کی عبادت عزوشرف میں بڑھی ہوئی ہے پھر اس رات میں اتنے فرشتے زمین پر نزول کرتے ہیں کہ زمین تنگ ہو جاتی ہے۔ یہ فرشتے صبح صادق تک انعام و اکرام کی بارش کرتے ہیں۔ لیلتہ القدر کی فضیلت کی کئی اور وجوہ بھی ہیں۔ قرآن پاک کا نزول اسی رات کو شروع ہوا۔ روایت ہے کہ اس رات ملائکہ کی پیدائش ہوئی۔ یہی وہ مکرم رات ہے جب آدمؑ کا مادہ جمع ہونا شروع ہوا۔ اسی پاک رات کو جنت میں درخت لگائے گئے۔ اسی رات میں حضرت عیسیٰؑ آسمان پر اٹھائے گئے اور اسی رات بنی اسرائیل کی توبہ قبول کی گئی۔

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

کے ساتھ بستر پر لیٹا تھا کہ چند لمحوں بعد مجھے اچانک سے بینا کی یاد آنے لگی اس کے ساتھ گزرے شادی کے بعد کے دن فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے آنے لگے۔

''نہ جانے اس نے عمر کا یہ طویل سفر کیسے طے کیا ہوگا؟ کیا اب بھی وہ وہیں ہوگی؟ میں کس منہ سے وہاں جانے کے بارے میں سوچوں، ہاں چاہے ایک بار ہی سہی...... میں اپنے گھر ضرور جاؤں گا۔ پتا نہیں اب مجھے وہاں کوئی پہچانے گا بھی یا نہیں...... مدتوں سے کسی نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ ہاں گرمیوں کی چھٹیوں میں تو میڈم بھی منع نہیں کریں گی۔ میں ایک بار اپنی بینا اور بچیوں کے پاس ضرور جاؤں گا۔ صرف دور، دور سے ہی دیکھ لوں گا۔ میرا کوئی حق نہیں تھا کہ میں دوبارہ ان کی زندگی میں آؤں...... اور کیونکر وہ مجھے اپنائیں گی۔ میں تو اس قابل ہی نہیں ہوں۔''

میرے آنسو میرے چہرے کو تر کرنے لگے۔ میرا دل اب بہت کمزور ہوگیا تھا۔ شاید میں بوڑھا ہو چکا تھا۔ نم آنکھوں کے ساتھ میری آنکھ کب لگی مجھے علم نہیں ہوا۔ دوسری صبح اسکول لگنے کے بعد میں اپنی میز پر فارغ بیٹھا ہوا تھا کہ میڈم بھی میٹنگ میں تھیں۔ میں نے وقت کو ضائع کرنے کے بجائے سامنے پڑے کاغذ پر بینا کی تصویر بنانی شروع کردی۔ کافی دیر بعد جیسے ہی تصویر مکمل ہوئی۔ میڈم نادیہ میرے قریب آچکی تھیں۔ ان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''بہت خوب بابا...... یہ کس کی تصویر ہے؟'' آپ تو مجھے کوئی مصور معلوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ کی اجازت ہو، تو میں یہ تصویر دیکھ سکتی ہوں۔'' ان کی بات سے لگا کہ ڈاکٹر صاحب نے میرے متعلق انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔

''واہ بہت خوب...... بابا ایک بات کہوں...... کیا آپ آج میرے ساتھ چھٹی کے بعد شام کو میرے گھر چل سکتے ہیں؟ وہ دراصل آج میری چھوٹی بہن کی منگنی کی رسم ہے...... میں امی کی طرف جاؤں گی...... وہ اور بہن اکیلے ہی رہتے ہیں...... اس لیے زیادہ تر ذمے داریاں میرے ہی کندھوں پر ہیں...... اچھا ہوگا کہ آپ ساتھ ہوں گے تو کچھ میری ہیلپ ہوجائے گی۔''

میں جو ابھی تک میڈم کی تعریف سن کر خوش ہورہا تھا ان کے پوچھنے پر اثبات میں سر ہلانے لگا۔ جیسے ان کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہو۔ وہ مسکرا کر مجھے دیکھنے لگیں اور پھر اسی دوران چھٹی کی گھنٹی بج گئی۔ بچے بھاگنے لگے اور میں اور میڈم بھی اپنے اپنے راستے ہولیے...... حسب وعدہ کچھ آرام کرنے کے بعد میں شام کو نہا دھو کر تیار تھا کپڑے بھی نئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور نے گاڑی میں آکر بیٹھنے کو کہا۔ میں جاکر بیٹھ گیا۔ میڈم بھی تیار تھیں۔

گاڑی گلشن کے علاقے میں داخل ہوگئی جہاں چھ سو گز پر پڑے، بڑے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک گھر کے سامنے گاڑی رک گئی۔

''بابا پلیز...... ڈرائیور کے ساتھ یہ سارا سامان اندر ڈرائنگ روم میں رکھوادیں۔'' میڈم کہہ کر بنگلے میں داخل ہو چکی تھیں...... میں نے ان کے حکم کے مطابق سامان اندر رکھوادیا۔ ملازمہ نے مجھے اسی ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کو کہا اور ڈرائیور کو مزید کچھ سامان کی لسٹ دے کر رخصت کردیا...... میں کافی دیر تک اس وسیع وعریض ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتا رہا۔ جہاں ہر شے قیمتی معلوم ہورہی تھی اور بہت سلیقے اور خوب صورتی کے ساتھ اسے سجایا گیا تھا۔ اچانک میڈم کی آواز سے میں چونک گیا۔

''ان سے ملو ندا...... یہ ہمارے اسکول میں نئے بابا جی آئے ہیں...... مجھے ان سے بڑی ہیلپ ملتی ہے۔ بہت شفیق انسان ہونے کے ساتھ یہ بہت اچھے مصور بھی ہیں...... اور جانتی ہو، ان کی بنائی

ہوئی ایک تصویر نے تو مجھے حیران کر دیا۔ بالکل تمہاری تصویر معلوم ہوتی ہے...... کیوں بابا جی ندا آپ کی بنائی ہوئی اس تصویر سے کتنا ملتی ہے؟ جو آپ نے اسکول میں بنائی تھی۔"

"جی...... پتا نہیں...... میں نے تو ایسے ہی بنا دی تھی۔" ایک نظر ندا کو دیکھنے کے بعد میں بہ مشکل یہی کہہ سکا...... کیونکہ وہ تصویر تو میری بینا کی تھی۔

"آپا بچے کب آئیں گے؟ ان کے بغیر سارا گھر ویران ہے۔" ندا نے بھی مجھے نظر انداز کر کے بات شروع کر دی۔

"بس کچھ ہی دیر میں وہ اپنے پاپا کے ساتھ آجائیں گے اگر ساتھ لاتی تو یہ سارے کام کیسے کر سکتی تھی...... دیکھو اب بھی کافی تیاری نامکمل معلوم ہو رہی ہے۔" میڈم منہ بنا کر بیٹھ گئیں۔

"اوکے، آپ لوگ بیٹھیں، میں امی کو بلواتی ہوں تاکہ جلدی جلدی کام نمٹ جائیں...... بس دو منٹ......" وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

"بہت غیر سنجیدہ لڑکی ہے۔ آج منگنی ہے پھر بھی محترمہ ہاتھوں میں کتابیں لیے بیٹھی تھیں۔ نہ ڈریس کی پروا ہے نہ تیاری کی خبر...... دراصل گھر میں چھوٹی ہونے کے سبب یہ محترمہ سب کی لاڈلی ہیں...... اور پھر میڈیکل کے لاسٹ ائیر کی اسٹوڈنٹ بھی ہیں...... منگنی بھی ڈاکٹر سے ہو رہی ہے...... دونوں ایک دوسرے کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ لڑکا باہر جانے والا ہے۔ اسی لیے سب منگنی کی رسم ادا کرنا چاہتے ہیں۔ سب کچھ اچانک ہوا ہے۔ اسی لیے امی پریشان بھی ہیں کہ نکاح ہو جاتا تو اچھا تھا۔ خیر چھوڑیں، آپ چائے لیں، یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔" ملازمہ چائے کی ٹرالی قریب لا چکی تھی اور میں خاموشی سے چائے پینے لگا...... ندا اپنی امی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

"لیں جناب، امی بھی آگئیں۔ اب جلدی، جلدی بتائیں کیا، کیا کرنا ہے۔" شوخ سی ندا اماں کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"سب سے پہلے امی آپ میرے بابا جی سے ملیں۔ بہت اچھے انسان ہیں جو کام سوچتی ہوں وہ یہ کر چکے ہوتے ہیں...... یہ ایک اچھے مصور بھی ہیں...... بابا جی کیا اس وقت آپ ہمیں وہ تصویر دکھا سکتے ہیں؟" جیسے وہ جانتی تھی کہ میں اس تصویر کے بہت قریب ہوں، اسی لیے ہر پل ساتھ رکھتا ہوں۔ میں نے اپنی شرٹ پر لگی جیب سے کھڑے ہو کر فولڈ کی ہوئی وہ تصویر نکال کر میڈم کو دے دی۔

"دیکھو ندا...... میں نہ کہتی تھی کہ تم سے کتنی ملتی جلتی تصویر ہے۔" میڈم اٹھ کر ندا کے برابر چلی گئیں۔

"ہاں واقعی!" ندا اور اس کی والدہ بغور تصویر کو دیکھ رہی تھیں۔ میں تعجب سے تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ یک دم میڈم کی والدہ مجھے بار، بار دیکھنے لگیں۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ شاید اب تک نہ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا تھا اور نہ ہی باتوں ہی باتوں میں میرا دھیان ان کی جانب رہا...... میں نے الجھ کر نظریں جھکا لیں۔

"مصور" لفظ سن کر اور پھر اپنی تصویر کو سامنے دیکھ کر بینا کے وجود میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ وہ بار، بار چشمہ درست کر کے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی اور دونوں بچیاں حیران تھیں کہ میں نے ندا سے ملتی ہوئی تصویر بغیر اس کی موجودگی کے کیسے بنا ڈالی...... دراصل ندا اپنی ماں کی ہم شکل تھی۔

بے اختیار بینا رونے لگی۔ اس کی سسکیاں بندھنے لگیں۔ میں پریشان تھا اس اچانک ہونے والے حادثے پر...... اس کے رونے پر میں نے بھی بغور دیکھا، بڑھاپے کی جھریوں میں، میں اپنی بینا کا چہرہ کھوج رہا تھا۔

"میرے سرتاج...... میرے شاہ جی...... آپ کہاں چلے گئے تھے۔ مجھے کس کے سہارے چھوڑا

تھا...... آپ نے......؟ بتائیں میرا قصور کیا تھا...... آپ تو مجھ سے محبت کرتے تھے...... ساتھ جینے مرنے کے وعدے کیے تھے ہم نے......تو پھر یہ سزا کیوں دی؟ بتائیں جواب دیں؟'' وہ غش کھانے لگی۔ بچیاں جلدی سے امی کہہ کر آگے بڑھیں اور ساری صورتِ حال سمجھ گئیں۔ میں نظریں چرانے لگا کیونکہ حالات نے میری بینا کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے خوب صورت نین نقش اب بڑھاپے کی دہلیز کو چھونے لگے تھے۔ میں نے بھی بڑھ کر اسے سہارے سے صوفے پر بٹھا دیا۔ بینا کی باتوں سے سچائی کھل چکی تھی۔ بچیاں بھی نم آنکھوں اور سوالیہ نظروں سے میری جانب ہی دیکھ رہی تھیں۔ ان کو تو شاید اپنے باپ کی صورت بھی یاد نہیں تھی۔ میں کمرے سے نکلنے لگا کیونکہ میں ان معصوم بچیوں کی خوشیاں برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری سزا صرف جیتے جی موت تھی۔ میں ان تینوں کا مجرم تھا۔

''نہیں بابا اب نہیں، مجھے یاد ہے آپ کی آنکھوں میں موجود اپنے لیے نفرت جب میں چھوٹی سی تھی۔ مگر اب آپ میرے بابا ہیں، مجھ سے پیار کرتے ہیں میرا خیال رکھتے ہیں، سچ پوچھیں تو جن اندھیروں میں آپ مجھے، میری ماں اور بہن کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، میں نے ساری زندگی صرف آپ سے نفرت کی مگر اپنی ماں کے دل میں آپ کے علاوہ کسی کو موجود نہیں پایا۔ بھری جوانی میں...... دو بچیوں کے ساتھ انہوں نے کیسا وقت گزارہ ہے یہ سب میں کبھی نہیں بھول سکتی...... اب میں خود صاحبِ اولاد ہوں، شوہر کی محبت کیا ہوتی ہے، جانتی ہوں...... آج برسوں بعد اللہ تعالیٰ نے اس خوشی کے موقع پر ہمیں آپ سے شاید اسی لیے ملوایا ہے کہ آپ دیکھ سکیں...... ہاں یہ دیکھ سکیں کہ زندگی میں لڑکیوں کی کیا اہمیت ہے۔ بیوی، ماں، بیٹی، ہر روپ میں اس کی عزت اور اس کی اہمیت ہے...... بابا لڑکیاں کسی طور بھی لڑکوں سے کم نہیں ہوتیں...... انہیں صرف اور صرف اپنے ماں، باپ کا پیار چاہیے ہوتا ہے...... ساتھ چاہیے ہوتا ہے، ان کا مان چاہیے ہوتا ہے۔ وہ ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر سکتی ہیں۔ وہ اس کائنات کی روحِ رواں ہیں...... کاش...... کاش کے یہ بات آپ جان سکتے۔'' میڈم نادیہ رونے لگیں تو میری سسکیاں بھی نکل گئیں اور میں دعا کرنے لگا کاش زمین پھٹ جائے اور میں اس میں دفن ہو جاؤں۔ میں دو قدم اور آگے بڑھ گیا۔ ماں، بیٹی دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہی تھیں اور ندا مجھے بھیگی آنکھوں سے جاتے دیکھ کر دوڑ کر میرا ہاتھ پکڑنے لگی۔ جیسے میں آج گیا تو پھر کبھی نہیں مل سکوں گا۔ اتنے میں بینا میرے نزدیک آ گئی۔

''نہیں شاہ جی نہیں...... میں آپ کو اب کہیں نہیں جانے دوں گی۔ میں اس بار یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکوں گی۔''

نادیہ نے جھٹ سے ہاتھ پکڑ لیا جیسے وہ بھی مجھے معاف کر چکی ہو...... میں زمین میں مٹی تلے دھنس چکا تھا۔ سینہ تھا کہ کسی لمحے پھٹ جاتا...... میں زار و قطار رونے لگا...... اور بینا میرے شانے سے لگی۔ دونوں بچیوں کو گلے لگاتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔ اسی لمحے ندا کی معصوم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

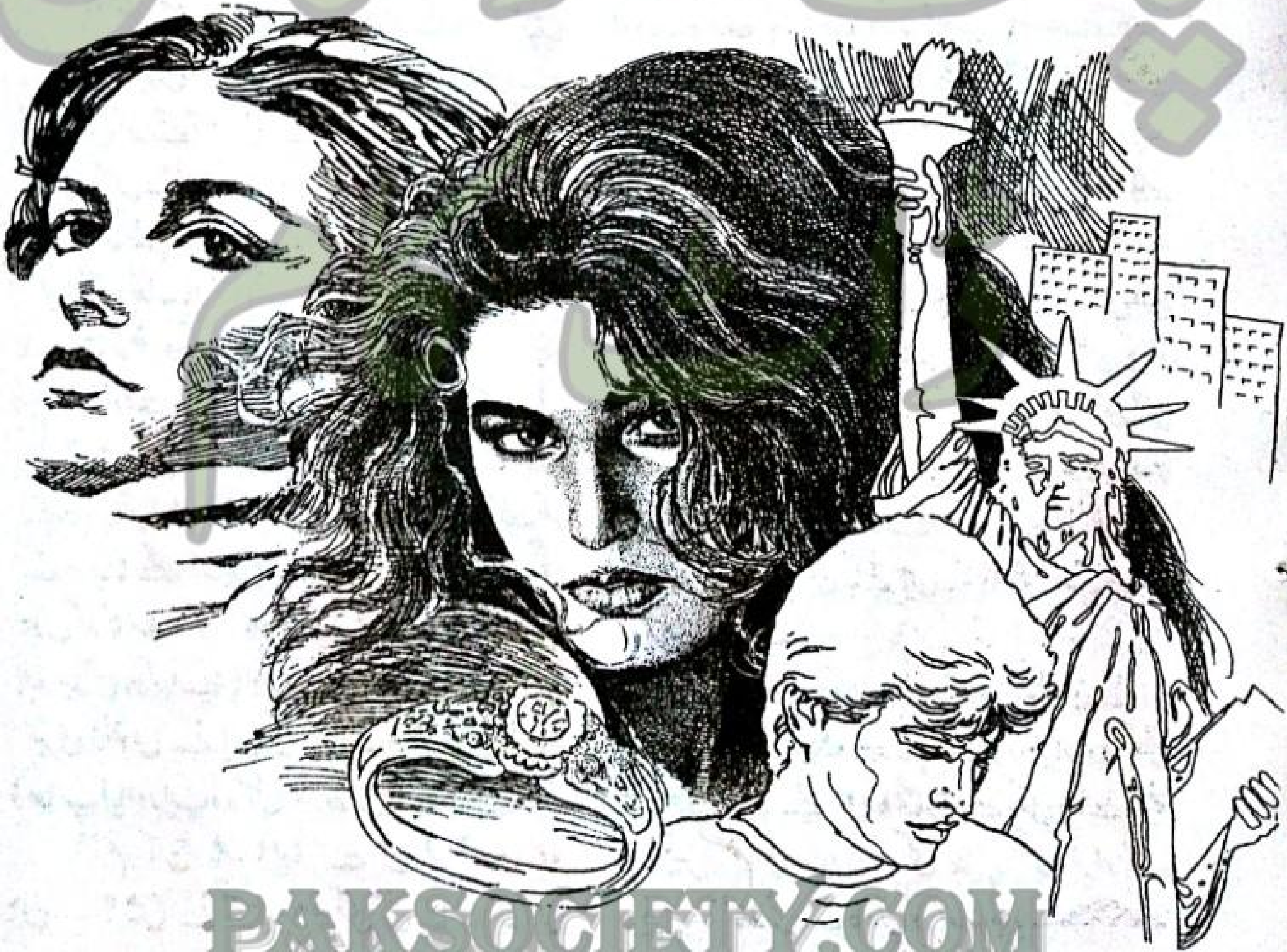
''بابا آج آپ کی بیٹی کو دُہری خوشی ملنے والی ہے۔ ایک ڈاکٹر سیف کی صورت اور دوسرے میرے بابا جانی کی صورت میں...... مجھے آپ بالکل یاد نہیں...... مگر زندگی بھر کی نفرت کے باوجود آج آپ کو سامنے دیکھ کر میں نفرت نہیں کر پا رہی ہوں۔ پلیز، کیا آپ مجھے میرے بابا کا پیار واپس دے سکتے ہیں؟''

یہ بات سنتے ہی میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تینوں کو اپنی بانہوں میں بھر لیا کبھی نہ چھوڑنے کے نئے عزم کے ساتھ۔

ناممکن ہے

نورعین

''بڑے اچھے وقت پر واپس آئی ہو جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر آجاؤ...... ڈیڈی نے بہت میٹھے آم بھجوائے ہیں، سچ اتنے میٹھے اور رسیلے آم ہیں کہ حد نہیں۔ مان گئی بھئی میں تو آم ہی واقعی پھلوں کا بادشاہ ہے اگر ہمارے پاکستان سے تعلق رکھتا ہو۔ یہاں کے آموں میں تو کوئی مزہ ہی نہیں بلکہ آم ہی کیا سارے فروٹس کا ذائقہ ایک جیسا ہی لگتا ہے۔ یخ ٹھنڈا، برفیلا اور پھیکا...... اچھا اب جلدی سے آجاؤ ورنہ میں یہ ساری پلیٹ ہڑپ کر جاؤں



گی۔" پیلے، پیلے رسیلے آم کی قاشوں سے لطف اندوز ہوتی نازش نے لانگ کوٹ اتار کر الماری میں ہینگ کرتی ہوئی کاوش کو آم کی قاشوں سے بھری پلیٹ کی طرف متوجہ کیا۔

"نو تھینکس، تم ہی کھاؤ ڈیئر...... ویسے یہاں کے فروٹس اتنے برے بھی نہیں، مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی سو کالڈ ہوم سک نیس کا شکار ہوگئی ہو ورنہ امریکا جیسے ملک میں رہنے یہاں بسنے اور یہاں کی اعلیٰ کوالٹی چیزیں استعمال کرنے کی تو تمام پاکستانی خواہش کرتے ہیں۔" کاوش نے گلے میں پڑا گلابی مفلر نکال دیا تھا اور اب جھک کر چمکدار گلابی کورٹ شوز اتار رہی تھی۔ ملائم چمکدار و لچھے دار سنہری بالوں کا ڈھیر اس کے دائیں کندھے سے ہوتا ہوا گھٹنوں کو چھو رہا تھا۔ بلیک اور پنک کامبینیشن کی ٹی شرٹ اس کے دلکش گلابی رنگ کو کچھ اور ابھار رہی تھی۔

"لیکن تمہیں تو آم بہت پسند تھے...... تمہیں یاد نہیں گرمیوں کے سیزن میں تم کیسے ڈیڈی سے فرمائشیں کر کے آموں کے کریٹ کے کریٹ منگوایا کرتی تھیں۔" نازش کو کاوش کے بدلے ناز و انداز ایک آنکھ نہیں بھا رہے تھے سو عام سی بات میں بھی گہرا شکوہ تھا۔ ہاں کاوش کی بڑھتی ہوئی خوب صورتی اسے متاثر ضرور کر رہی تھی۔

"وقت کے ساتھ، ساتھ خیالات بھی بدل جاتے ہیں ڈیر...... اینی ویز...... ابھی مجھے بھوک نہیں ہے جب تمہارا یہ شغل پورا ہو جائے تو لائٹ آف کر کے سو جانا مجھے شدید نیند آ رہی ہے، میں سونے لگی ہوں گڈ نائٹ......" کاوش نے جوتے اتارنے کے بعد سیدھی ہو کر اپنے بالوں کو کمر پر گرایا تو اس کی ریشمی سنہری زلفوں نے اس کی نازک کمر کو پوری طرح ڈھانپ لیا اور اب وہ کمبل اوڑھ کر لیٹ چکی تھی۔

"تم آج پھر ڈیوڈ سے مل کر آ رہی ہو ناں......؟ میں نے تمہیں پہلے بھی منع کیا تھا کہ اس سے راہ و رسم نہ بڑھاؤ، ہم مسلمان ہیں اور وہ...... اس کا تو کوئی مذہب ہی نہیں...... دوستی اگر ہم خیال انسانوں میں نہ ہو تو خیالات کے بگاڑ کا باعث بنتی ہے۔" نازش نے اس نازک مسئلے کو آج پھر چھیڑا تھا کاوش حسب عادت بھڑک اٹھی۔

"دوستی کا مذہب سے بھلا کیا تعلق......؟ ویسے بھی میں ڈیوڈ کو پسند کرتی ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں اور تم بجائے میرا ساتھ دینے کے ایسی الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو، تمہیں تو فخر ہونا چاہیے کہ اتنا ہینڈسم، بریلینٹ اور کسی کو گھاس نہ ڈالنے والا ڈیوڈ تمہاری بہن کو پسند کرتا ہے۔" کاوش نے لیٹے، لیٹے ہی جواب دیا البتہ انداز میں تلخی اور فخر دونوں کی آمیزش تھی۔

"لیکن یہ ناممکن ہے کاوش، ایک مسلمان لڑکی کی شادی کسی غیر مسلم سے نہیں ہو سکتی۔ تم اپنے ارادے سے باز آ جاؤ ورنہ غضب ہو جائے گا۔" نازش نے خوفزدہ انداز میں کہا، وہ آم کھانا بھول چکی تھی۔

"ہمارے ڈیڈی بہت لبرل ہیں نازش، مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے۔ ہمارے خاندان میں پسند کی کئی شادیاں ہو چکی ہیں ویسے بھی میں ان کی لاڈلی بیٹی ہوں، جہاں تک بات ہے ناممکن کی تو میں نے اس سلسلے میں بہت سوچا ہے، ڈیوڈ سے بھی ڈسکس کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ممکن یا ناممکن کچھ نہیں ہوتا انسان جس کام کا ارادہ کر لے اور وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے بس اسی کو ممکن کہتے ہیں۔" کاوش اب سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

"لیکن کاوش، ہمارے ارادوں کو توڑنے والی ایک ذات اوپر بھی موجود ہے اور ہمارا ہر ارادہ تکمیل تک پہنچنے کے لیے اسی کا محتاج ہے وہی ذات مسلم اور غیر مسلم کی شادی کو کسی بنا پر ممکن قرار نہیں دیتی......" نازش نے کاوش کو سمجھانا چاہا۔

"نہیں نازش، تمہارا سوچنے کا نظریہ غلط ہے۔ ڈیوڈ نے مجھے سمجھایا ہے کہ وہی چیزیں ناممکن ہیں جو انسان کے بس سے باہر ہیں۔ جیسے انسان آسمان کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، پانی میں سانس نہیں لے سکتا لیکن وہ چیزیں جن پر قدرت رکھتے ہوئے انسان انہیں ناممکن قرار دیتا ہے دراصل انسان کے کمزور ارادے ہوتے ہیں اور میرا ڈیوڈ کو پانے کا ارادہ ہرگز کمزور نہیں۔" کاوش کا لہجہ قطعیت لیے ہوئے تھا۔

"اگر اللہ چاہے تو انسان پانی میں تو کیا پانی کے اندر موجود مچھلی کے پیٹ میں بھی سانس لے سکتا ہے اس کے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں...... چاہے وہ آگ کو گلزار بنانا ہو یا پھر آسمان کی سیر کروانا پھر تم گمراہ کیوں ہو رہی ہو؟" اس بار نازش کے چہرے سے شدید پریشانی مترشح تھی۔ بہن کا ایمان خطرے میں تھا۔

"کیا دن، رات میں اور رات، دن میں بدل سکتی ہے؟" کاوش نے نازش کے سوال کو نظرانداز... کرتے ہوئے نیا سوال داغا...... "اگر تمہارے مشاہدے میں کوئی ایسی بات آئے تو مجھے بھی ضرور بتانا، آئی پرامس تب میں تمہاری بات پر ضرور غور کروں گی لیکن اب مجھے تمہارے ساتھ کوئی بحث نہیں کرنی آرام سے سو جاؤ اور ہاں اب مجھے پریشان مت کرنا۔" قائل نہ ہونے والے انداز میں کہتے ہوئے کاوش سر تک کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ نازش ہراساں نظروں سے اس کے کمبل میں لپٹے وجود کو دیکھ رہی تھی، جانتی تھی کہ نافرمان اور جیل و حجت کرنے والے لوگوں کو عذاب سے دوچار ہونے سے ہدایت کی روشنی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں روک سکتی اور کاوش اس روشنی کو اپنے قلب پر اثر انداز ہونے ہی نہیں دے رہی تھی۔ آم کے میٹھے رس سے لتھڑے ہاتھ جو کچھ دیر پہلے اسے مسرت بخش رہے تھے اب پریشان کرنے لگے تھے۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر واش بیسن کی طرف بڑھی، دل و دماغ میں جیسے یادوں کا

منافقت

تم سے بچھڑنے کے بعد
اک منافقت سی میرے اندر سرائیت کر گئی ہے
اب میں حوادث میں گھرے
لوگوں کے دُکھوں پر
ان کے شانے سے لگ کر
شریکِ غم ہونے کے بہانے سے لگ کر
در پردہ تیرے ہجر پر آنسو بہاتی ہوں
تم چاہو تو کہہ دو
یہ گناہ ہے میرا
جو میرے درد کا احساس کرو تو جان لو
یوں دل کا بوجھ اتارنا
جینے کا آسرا ہے میرا
جینے کا آسرا ہے میرا

شاعرہ: نصرت جبیں ملک، خوشاب

وہ لڑکی

بکھری بکھری سہمی سہمی لڑکی
اپنے آپ میں رہتی ہے
جانے کتنے خواب سجائے
اپنی دنیا میں رہتی ہے
کرتی ہیں اس کو من کی باتیں
نہ جانے کس سے ڈرتی ہے
کالی، کالی آنکھوں والی
جانے کس پر مرتی ہے
بکھری، بکھری سہمی، سہمی لڑکی سیف
پیار کسی سے کرتی ہے

شاعر: احمد توصیف سیف
مرسلہ: ایشل شادیان، گولارچی

طوفان آ گیا تھا۔

☆☆☆

''سچ ڈیڈی آپ مجھے پڑھنے کے لیے امریکا بھیج رہے ہیں؟'' کاوش نے شہر یار صاحب کے ہاتھ سے فائل لیتے ہوئے ایکسائٹمنٹ سے کہا۔

''مجبوری ہے اب اپنی لاڈلی بیٹی کی خواہش پوری کرنا بھی تو ضروری تھا۔'' کاوش کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر شہر یار صاحب طمانیت سے مسکرائے۔

کاوش پچھلے دو دنوں سے بھوک ہڑتال پر تھی اور امریکا سے گریجویشن کرنا اس کی خواہش ہی نہیں جنون تھا لیکن شہر یار صاحب جو بہت بڑے انڈسٹریالسٹ تھے بیٹی کو اتنی دیر کے لیے خود سے دور بھیجنے پر رضامند نہیں تھے سو اس کی ضد کے باوجود انکار کیے جا رہے تھے لیکن جب اس نے کھانا پینا چھوڑ کر اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تو شہر یار کا انکار اقرار میں بدلتے زیادہ دیر نہیں لگی اور آج وہ اپنے منیجر کے ذریعے یونیورسٹی میں ایڈمیشن سے لے کر امریکا میں ایک زبردست سی رہائش کا انتظام کر کے واپس پہنچے تھے۔

''یہ لیں ڈیڈی، کاوش کا فیورٹ پاستا آج اس کی بھوک ہڑتال کے خاتمے کی خوشی میں اسے اپنے ہاتھوں سے کھلائیں۔'' نازش نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا ٹرے بیڈ پر رکھنے کے بعد وہ شہر یار صاحب کے دائیں جانب جا بیٹھی۔

''آج ڈیڈی اپنی نازش کو بھی اپنے ہاتھ سے پاستا کھلائیں گے آخر اسے بھی تو اپنے ڈیڈی سے بہت دور امریکا جانا ہے۔ ہاں نازش بیٹا آپ بھی کاوش کے ساتھ ہی امریکا سے پوسٹ گریجویشن کرو گی، میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔'' انہوں نے پاستا سے بھرا چمچ نازش کے منہ میں ڈالا جس کا منہ حیرت کی زیادتی کے باعث کچھ زیادہ ہی کھل گیا تھا۔

''مم...... میں لیکن مجھے اپنے ملک کو، آپ سب کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا، آپ پلیز مجھ سے ایسا مذاق نہ کریں۔'' پاستے کو بغیر چبائے جلدی، جلدی نگل کر وہ ناگوار انداز میں گویا ہوئی۔

''پلیز بیٹا بات کو سمجھو، کاوش ابھی چھوٹی ہے... ناسمجھ ہے...... تم بڑی ہو اس کے ساتھ رہو گی تو مجھے تسلی رہے گی ویسے بھی اب تمہیں ایڈمیشن تو لینا ہی ہے اگر امریکا سے ماسٹرز کی ڈگری مل جائے تو کیا حرج ہے۔'' ڈیڈی کی بات پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''ٹھیک ہے ڈیڈی اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو میں راضی ہوں۔'' شہر یار صاحب کے گلے لگتے ہوئے نازش کی آواز بھرا گئی۔ اتنی دیر سے دم سادھے ان کی باتیں سنتی ہوئی کاوش نے سکھ کی سانس لی، وہ جان گئی تھی کہ ڈیڈی، نازش کے بغیر اسے امریکا نہیں بھیجیں گے۔ یوں وہ دونوں اپنے ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں امریکا آ پہنچیں۔

یہاں پہنچ کر کاوش بے تحاشا خوش تھی کہ اس کا ڈریم لینڈ اس کے سامنے تھا سو وہ تتلی کی طرح اڑتی پھر رہی تھی ہاں نازش البتہ اداس تھی لیکن کلاسز کے شروع ہوتے ہی کاوش کی ایکسائٹمنٹ اور نازش کی بوریت کو پڑھائی کی سخت روٹین نے یک لخت ہی ختم کر دیا تھا۔ وہ دونوں پڑھائی میں اتنی جان مار رہی تھیں کہ آپس میں بات کرنا بھی بھول گئی تھیں۔ انہی دنوں کاوش، نازش سے دور اور ڈیوڈ کے قریب آ گئی۔ ڈیوڈ جو ایک ذہین اور بے تحاشا ہینڈسم لڑکا تھا لیکن نظریے کے حساب سے وہ ایک لادین شخص تھا اور اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ کائنات از خود ہی وجود میں آ گئی ہے اور بس سائنسی تبدیلیوں کی وجہ سے خود بخود چل رہی ہے۔ کاوش کے کچے اور معصوم ذہن میں وہ اپنے زہریلے خیالات کے بیج بو چکا تھا جو اَب باقاعدہ جڑ پکڑ چکے تھے یہ سب کب اور کیسے ہوا نازش جان ہی نہیں پائی۔

''سوری ڈیڈی، میں کاوش کا خیال نہیں رکھ

پائی۔'' بے آواز روتے ہوئے نازش دل ہی دل میں شہریار صاحب سے مخاطب تھی۔

☆☆☆

''کہاں تھیں تم......؟ میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ اپنے آپ کو درست کرلو لیکن تم سنتی ہی نہیں ہو اور تمہیں ایسا گھٹیا ڈریس پہننے کی اجازت کس نے دی......؟ میں تمہیں آخری بار وارن کر رہی ہوں کہ اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ ورنہ میں ڈیڈی کو سب کچھ بتادوں گی۔'' نازش نے کاوش کے گہرے گلے اور گھٹنوں کو بہ مشکل چھوتے دہکتے سرخ رنگ کے اسکرٹ کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنی مرضی کا ڈریس پہننے کے لیے کسی تیسرے فرد کی اجازت کی ضرورت نہیں اور ہاں اس دفعہ پاکستان جا کر میں خود ڈیڈی سے اس ایشو پر بات کروں گی، آج ڈیوڈ نے مجھے باقاعدہ طور پر پروپوز کیا ہے اور ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شادی کے بعد وہ اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارے گا اور میں اپنے مذہب کے مطابق...... اب تو تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہے ناں۔'' نازش نے اپنی انگلی میں پڑی انگوٹھی کو گھمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن انگوٹھی شاید تنگ تھی تبھی وہ اپنی کوشش میں ناکام ٹھہری تھی۔

''پلیز کاوش، ڈیڈی کا ہی خیال کرلو انہوں نے صرف تمہاری خواہش پر ہمیں پڑھنے کے لیے یہاں بھیجا تھا تمہاری اس حرکت کے بعد وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے پلیز ان پر رحم کرو۔'' نازش نے بہن کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

''میں ایسا کچھ غلط نہیں کر رہی ہوں، شادی ہی تو کر رہی ہوں اور دیکھنا جب ڈیڈی اپنے ہونے والے داماد کو دیکھیں گے تو فخر سے ان کی گردن میں کلف لگ جائے گا۔'' کاوش نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔''اور پلیز تم مجھے ایسے اسٹوپڈ پوز بنا کر بور مت کرو۔'' بدتمیزی سی بدتمیزی تھی، نازش دھک سے رہ گئی لیکن ابھی اسے ہار نہیں ماننی تھی سو سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے کاوش کے قریب آئی۔

''یہ شادی ہونا ناممکن ہے کاوش...... تم بے شک کسی عالم دین سے پوچھ لو۔ ایک مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کرسکتی۔'' کاوش کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نازش نے نرم لہجے میں اسے سمجھانا چاہا۔

''مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں...... تمہیں یہ ہی پرابلم تھی ناں کہ میرے مذہبی معاملات متاثر نہیں ہوں تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ شادی کے بعد میں اپنے مذہب کی ہی پریکٹس کروں گی۔'' کاوش کا انداز اکتاہٹ سے بھرپور تھا، جیسے ''مذہب'' اس کا نہیں نازش کا مسئلہ تھا جسے اس نے احسن طریقے سے نمٹا دیا تھا۔ ''اور ہاں ذرا پندرہ بیس منٹ سانس روک کر تو دکھانا۔'' اگلی بات کاوش نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہی تھی۔

''کیا مطلب؟ میں اتنی دیر کے لیے سانس کیسے روک سکتی ہوں اور اس بے تکی بات کا اس معاملے سے کیا تعلق......؟'' نازش نے غصے اور حیرانی کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

''اصل میں ڈیئر سانس روکنا اور وہ بھی اتنی دیر کے لیے ناممکن بات ہے اور ایسی ہی باتیں ناممکن ہوتی ہیں۔ ہاں البتہ سانس لینا ممکن ہے اس پر کوئی روک نہیں لگا سکتا دیکھو یوں۔'' کاوش نے آنکھیں بند کرکے ایک گہری سانس لی۔

''ڈرو اس وقت سے کاوش جب تمہاری اس سانس پر سچ مچ روک لگا دی جائے گی تب یہ ممکن، ناممکن ہو جائے گا۔'' گہری سانس لیتی ہوئی کاوش کو دیکھتے ہوئے نازش نے دلگرفتی سے سوچا۔

☆☆☆

''سیٹ بیلٹ کھول لو نازش اور یہ لو چپس کھالو بہت مزے کے ہیں۔'' جہاز میں ہونے والی اناؤنسمنٹ کے بعد کاوش نے نازش کو مخاطب کرتے ہوئے آفر کی جواباً نازش نے اسے بری طرح گھورتے ہوئے سیٹ بیلٹ کھولی اور اب اس کی آفر کو نظرانداز کرتے ہوئے میگزین کی ورق گردانی میں مصروف ہوگئی اس دن کے بعد سے نازش مکمل طور پر کاوش سے ناراض تھی۔ وہ دونوں اپنے سمسٹر کے اختتام پر پاکستان چھٹیاں گزارنے جارہی تھیں۔

''نازش تم مجھ سے بات کیوں نہیں کررہی ہو، یہ سفر تو بہت دیر سونے کے بعد بھی ختم نہیں ہوگا ...... پلیز مجھ سے باتیں کرو ورنہ میں بوریت سے پاگل ہوجاؤں گی۔'' مندی، مندی آنکھیں لیے وہ کچھ سستی سے بولی۔'' اور پلیز ڈونٹ وری میں ڈیڈی کو منالوں گی ان کی مرضی سے شادی ہوگی پھر تو ان کی رسوائی نہیں ہوگی ناں...... باقی رہے مذہبی معاملات تو تم خود ہی بتاؤ، ہم لوگوں نے کبھی پوری طرح مذہبی احکامات مانے ہیں؟ نماز تک کی تو پوری طرح سے پابندی کرتے نہیں ...... اچھا چلو چھوڑو یہ بتاؤ کہ ٹائم کیا ہوا ہے؟'' نازش کے ہنوز کھڑکی سے باہر دیکھنے پر کاوش نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''فکر نہ کرو ابھی بہت ٹائم پڑا ہے امریکا سے بیس بائیس گھنٹے کی فلائٹ ہے پاکستان کی۔ ابھی تو تین گھنٹے ہوئے ہیں۔ آتے وقت کا سفر یاد نہیں!''

''یعنی کل چار بجے صبح ہم پاکستان پہنچ جائیں گے ویسے نازش کیا ہم چار کے بجائے دو یا تین بجے بھی پاکستان پہنچ سکتے ہیں؟ نہیں ناں کیوں کہ ایسا ہونا ناممکن ہے، فلائٹ تو پورا ٹائم لے گی ناں...... میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ ناممکن وہیں موجود ہوتا ہے جہاں ممکن کا وجود ناممکن ہو۔'' نازش کی حیرت بھری نظروں کے جواب میں ہلکا سا قہقہہ لگا کر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کاوش کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔

اسی دم جہاز زور سے دائیں اور پھر بائیں جانب ڈولا۔ نازش جو کاوش کی بے تکی بات کا جواب دینے والی تھی کچھ بول ہی نہیں پائی۔ اس بار کاوش کو جواب نازش سے نہیں قدرت سے ملنے والا تھا۔

''یہ...... یہ کیا ہورہا ہے؟'' کاوش نے گھبرا کر اپنی سیٹ کے بازو کو زور سے پکڑتے ہوئے نازش سے دریافت کیا جو خود بھی زرد ہورہی تھی۔

''پتا نہیں کیا ہوا ہے شاید جہاز گرنے والا ہے۔'' نازش کی سرسراتی ہوئی آواز کبھی اونچی اور کبھی نیچی ہورہی تھی کیونکہ اب جہاز باقاعدہ جھٹکے کھانے لگا تھا۔ مسافروں میں ہڑبونگ مچ گئی۔ وہ سبھی پریشانی اور خوف کے عالم میں اپنے ہی جیسے لاعلم مسافروں سے ان جھٹکوں کی وجہ دریافت کررہے تھے۔

''نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔'' کاوش نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا لیکن اس کے ہونٹوں کی سفیدی اس کی بے یقینی کو پوری طرح عیاں کررہی تھی۔ فلائٹ اسٹاف مسافروں کو تسلی دے رہے تھے۔

جہاز میں لگے اسپیکرز سے آنے والی اناؤنسمنٹ نے مسافروں کو پوری طرح سے بدحواس کردیا تھا۔ آہیں، چیخیں، سسکیاں سن کر گھبرائے ہوئے دل اور بھی سہم گئے۔ قومی ائر لائن کی یہ پرواز ناہمواری کے باعث جھٹکے کھانے لگی تھی۔ جہاز گولی کی رفتار سے آگے کی طرف بڑھ رہا تھا زمین سے جہاز کا فاصلہ گھٹتا ہی چلا جارہا تھا۔ سمندر کا نیلا پانی جسے کاوش بڑے شوق سے دیکھ رہی تھی سفید بھربھری برف میں تبدیل ہوچکا تھا، تاحدِ نظر ہر جانب سفید چمکتی برف بکھری ہوئی تھی دہشت اور خوف کے مارے اس کا پورا جسم برف کے مانند ٹھنڈا اور سفید پڑ گیا تھا شاید وہ کسی برف پوش پہاڑ سے ٹکرانے والے تھے۔ سبھی مسافر اونچی آواز میں آیاتِ قرآنی کا ورد کرنے لگے کاوش نے بھی بے اختیار زیرِلب

کلمہ پڑھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں، زندگی بچانے کی جدوجہد فضول تھی۔ اس نے ہار مان لی تھی اب وہ چیتھڑے، چیتھڑے ہو کر فنا ہو جانے کا انتظار کر رہی تھی، تبھی جہاز کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ کاوش کا دل زور سے سکڑ کر پھیلا کتنے ہی لمحے سرک گئے اور پھر جیسے ہر جانب سکون چھا گیا۔ جہاز کو لگنے والے جھٹکے اب ختم ہو چکے تھے کاوش نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد دیکھا اس بار کھڑکی کے باہر سفید برف نہیں نیلا پانی تھا۔

☆☆☆

جہاز حادثے کا شکار ہوتے، ہوتے بچا تھا اور وقتِ مقررہ سے پہلے پہنچ رہا تھا۔ یہ خبر میڈیا کے ذریعے سب جگہ پھیل چکی تھی۔ اسلام آباد ائرپورٹ پر اس فلائٹ کا شدت سے انتظار ہو رہا تھا۔

''جی تو ناظرین ہم اس وقت ان خوش نصیب مسافروں کے درمیان موجود ہیں جو برمودا ٹرائی اینگل جیسے خطرناک اور پُراسرار علاقے سے متاثر ہو جانے کے باوجود بال، بال بچ گئے اور اب ہمارے درمیان موجود ہیں......''

''جی محترمہ آپ اس حادثے سے بچ جانے پر کیسا محسوس کر رہی ہیں؟'' کیمرے کا رخ اب کاوش کی جانب تھا لیکن وہ کہاں سن رہی تھی۔

''ویسے نازش کیا ہم وقتِ مقررہ سے قبل پاکستان پہنچ سکتے ہیں؟ نہیں ناں...... کیوں کہ یہ ناممکن ہے۔''

کاوش کے ذہن میں رہ، رہ کر یہی باتیں گونج رہی تھیں اور یہ گونج اسے بہت سی حقیقتوں سے روشناس کروا رہی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔

''ہیلو مس کیا آپ بتائیں گی کہ اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟'' نیوز رپورٹر اپنا مائیک اس کے چہرے کے سامنے کیے شاید چوتھی دفعہ پوچھ رہا تھا۔ ''ہمارا خیال ہے کہ یہ محترمہ ابھی تک صدمے سے باہر نہیں آسکیں ہم کسی اور مسافر سے بات کرتے ہیں۔'' نیوز رپورٹر اپنی جھنجلاہٹ کو بہ مشکل دباتا وہاں سے ہٹ گیا۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں؟'' کاوش کے کورے لٹھے کی طرح دُھلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر نازش نے پریشانی سے دریافت کیا...... کاوش کا بی ہیویئر نارمل نہیں تھا، نازش نے یہ بات محسوس کرلی تھی۔

''نہیں، میں ٹھیک نہیں ہوں، میں ٹھیک ہی تو نہیں ہوں۔'' نفی میں سر ہلاتے ہوئے تیزی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ان جملوں کی تکرار کرتے ہوئے کاوش، نازش کے گلے جا لگی۔

گھریلو آزمودہ ٹوٹکے

موسم بدلتے رہتے ہیں، کچھ لوگوں پر اس کے اثرات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً نزلہ، زکام، کھانسی وغیرہ

☆ فلو کے دنوں میں تازہ لیموں کا رس...... ایک پوتھ لہسن، دو کھانے کے چمچ ادرک پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ شہد، تین کپ مالٹے یا پائن ایپل کا جوس 1/4 چمچ لال مرچ پاؤڈر...... سب چیزوں کو خوب ملا کر شیشے کے جگ میں رکھ لیں، دن میں دو بار ایک کپ پی لیں۔

☆ جوڑوں، ہڈیوں کے درد کے لیے 1/4 چھوٹی چمچ، ہلدی پاؤڈر ایک گرم دودھ میں ملا کر پییں۔

☆ سانس کے مریضوں کو ایک کپ دودھ میں ایک چھوٹی چمچ ہلدی ملا کر پینا چاہیے۔

☆ شوگر کے مریض ایک چھوٹا چمچ ہلدی پاؤڈر کھانے کے ساتھ استعمال کریں۔

تحریر: فریدہ افتخار، اسلام آباد

☆☆☆

''برمودا ٹرائی اینگل یا شیطانی تکون وہ جگہ ہے جہاں سے گزرنے والے بحری بیڑے اور ہوائی جہاز اکثر پُراسرار طور پر غائب ہو جاتے ہیں، ان کا سراغ نہیں مل پاتا اس کی حدود کا باقاعدہ طور پر کسی نقشے میں ذکر نہیں ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ اس علاقے کے اوپر سے روزانہ کئی جہازوں کی آمد و رفت ۔۔۔ بھی جاری رہتی ہے، مختلف لوگ اس مثلث کی پُراسراریت کے بارے میں مختلف تھیوریز پیش کرتے ہیں کچھ لوگوں کے نزدیک یہ جگہ ایک دروازے کی حیثیت رکھتی ہے جہاں سے دوسری دنیا کی مخلوق اس دنیا میں داخل ہوتی ہے کچھ لوگ اسے وقت کا خلا کہتے ہیں جہاں پہنچ کر ہر چیز وقت میں غائب ہو جاتی ہے لیکن تنقید نگار ان باتوں کو صرف ایک افسانہ قرار دیتے ہیں لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اس جگہ پر قطب نما درست سمت نہیں بتاتا جہاں تک بات رہی تازہ ترین واقعے کی تو یہ واقعہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ برمودا ٹرائی اینگل واقعی پُراسرار ہے اور اس کی حد میں پہنچنے والی چیزیں زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتی ہیں اسی لیے تو جب یہ جہاز حقیقی دنیا میں واپس آیا تو جہاز کے مسافروں کی کلائی کی گھڑیوں کے ٹائم اور حقیقی دنیا کے اسٹینڈرڈ ٹائم میں ایک گھنٹے کا فرق تھا اس لیے تو جہاز اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی ائرپورٹ پہنچ گیا تھا خیر وجہ چاہے جو بھی ہو، ہم اس خوش قسمت جہاز میں سفر کرنے والے مسافروں کو ان کی زندگیاں بچ جانے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اس خوش نصیب جہاز کی طرح ہمارے وطن پاکستان پر بھی اپنا کرم کرے۔'' تجزیہ نگار اپنے مخصوص لب و لہجے میں بول رہا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے بیٹا کہ تم دونوں خیریت سے واپس آگئیں ورنہ میں تو برباد ہو جاتا، اس ذات پاک کا مجھ جیسے گناہ گار بندے پر بڑا کرم ہے کہ اس نے مجھے میری آنکھوں کی روشنی لوٹا دی۔'' ٹی وی بند کرتے ہوئے شہریار صاحب نے دونوں بیٹیوں کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''ڈیڈی کاوش نے صبح سے سوائے ایک دودھ کے گلاس کے اور کچھ نہیں کھایا پیا...... آپ اسے سمجھائیں ناں کہ یہ کھانا کھالے۔'' نازش نے شہریار صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بری بات کاوش بیٹا، تمہیں گھر آئے کتنے گھنٹے گزر چکے ہیں اور تم نے ابھی تک اس حادثے کو اپنے سر پر سوار کر رکھا ہے تم نے کل سے مجھ سے بھی کوئی بات نہیں کی...... بھول جاؤ اس حادثے کو بلکہ تم دونوں ایسا کرو کہ تیار ہو جاؤ آج میں تم دونوں کو خود شاپنگ پر لے کر جاؤں گا۔ تم لوگوں نے واپس جانے سے پہلے شاپنگ تو کرنی ہی ہے تو موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آج ہی کر لینا، جی بھر کر اپنے ڈیڈی کی جیب خالی کرنا، میں تمہیں بالکل نہیں روکوں گا ٹھیک ہے ناں کاوش!'' شہریار صاحب نے اس کے ماتھے کو پیار سے چومتے ہوئے کہا ان کی یہ بیٹی شاپنگ کی دیوانی ہے، یہ بات وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

''نہیں ڈیڈی، مجھے اب امریکا واپس نہیں جانا، کبھی نہیں......'' کاوش نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر نہیں اٹھایا تھا کہ شرمندگی کا احساس بہت شدید تھا اتنا کہ اگر شہریار صاحب اس کی آنکھوں میں جھانک لیتے تو ضرور چونک جاتے۔

''کیا......؟ لیکن تمہاری پڑھائی، بیٹا زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، ایسے ڈر کے اپنی منزل نہیں گنواتے...حادثوں کا کیا ہے وہ تو کسی سواری کے بغیر چلتے ہوئے انسان کو بھی اپنا شکار بنا لیتے ہیں۔''

''نہیں ڈیڈی، مجھے واقعی امریکا نہیں جانا میں اپنی پڑھائی یہاں رہ کر بھی تو پوری کر سکتی ہوں چھ ماہ

کا فرق ہی تو ہے لیکن واپس ہرگز نہیں۔" کاوش نے ڈیڈی کے کندھے سے سر لگا دیا۔

"میں واپس جا کر اپنی اصل منزل گنوانا نہیں چاہتی کیونکہ زندگی اور موت سمیت ہر چیز واقعی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس بار اس نے مجھے جھٹکا دے کر بچا لیا اگر میں پھر سے بھٹک گئی تو شاید عذاب پانے والوں میں سے ہو جاؤں گی......" دل ہی دل میں ڈیڈی سے مخاطب ہوتے ہوئے کاوش کی آنکھیں پھر سے برسنے لگیں۔

انہوں نے کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے فوراً سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کاوش کی ذہنی حالت کے بارے میں تشویش کا شکار ہو رہے تھے لیکن نازش نم آنکھوں اور ہنستے ہوئے لبوں کے ساتھ کاوش کی ذہنی حالت کے متوازن ہو جانے پر اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔

"جماعت کا وقت ہو گیا ہے میں نماز پڑھ کر آتا ہوں پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔" شہریار صاحب کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے عجلت میں کھڑے ہوئے اس حادثے نے ان جیسے مصروف انسان کو بھی اللہ سے قریب کر دیا تھا۔

"میں تمہارے لیے کھانا لے کر آؤں؟" ان کے جانے کے بعد نازش نے محبت لٹاتی نظروں سے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں لیکن پہلے میں نماز پڑھ لوں۔" کاوش فیصلہ کر لینے کے بعد مطمئن تھی تبھی مسکرا کر بولی۔ نازش خوشی کی شدت سے کانپتے ہوئے وجود کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔

☆☆☆

"یہ لو تمہارے فیورٹ آم۔" نازش کھانے کے بعد اس کے لیے آم کاٹ کر لائی تھی۔ "ویسے تم یہ کیا کر رہی ہو؟" اس نے پلیٹ سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کاوش سے پوچھا جو اپنی انگلی سے دھینگا مشتی میں مصروف تھی۔

"ڈیوڈ کی دی ہوئی رِنگ اتار رہی تھی سوچا کہ اسے واپس بھجوا دوں لیکن یہ تو اتر ہی نہیں رہی۔" کاوش نے زور آزمائی کرتے ہوئے بیچارگی سے کہا۔

"ایک منٹ رکو میں ابھی آتی ہوں۔" اور پھر واقعی ایک منٹ کے اندر، اندر وہ ایک باؤل میں برف ملا پانی لیے کمرے میں موجود تھی۔

"آئی ایم سوری نازش میں نے تمہیں کتنا تنگ کیا۔ میں کتنی بے وقوف تھی جو اپنے ایمان کو داؤ پر لگانے چلی تھی۔" انگلی کا انگوٹھی سے نیچے والا حصہ پانی میں ڈبوئے کاوش نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"تم واپس پلٹ آئیں میرے لیے یہ سب سے بڑی بات ہے اور سنو اس فضول بات کو اپنے دماغ سے کھرچ کر نکال دو ویسے ہی جیسے میں نے نکال دیا......تم آج بھی میری پیاری سی معصوم سی چھوٹی سی بہن ہو، یہ لو اتر گئی۔" نازش نے نرمی سے انگوٹھی نکال لی۔

"ارے یہ کیسے ہوا مجھ سے تو اتر ہی نہیں رہی تھی......" کاوش نے حیرت سے دریافت کیا۔

"ارے بھئی سمپل سی بات ہے ٹھنڈا پانی انگلی کو سکیڑ دیتا ہے تبھی تو یہ ناممکن کام ممکن ہوا۔" نازش نے انگوٹھی کو سائڈ ٹیبل پر رکھا۔

"نہیں یہ ناممکن کام اس لیے ممکن ہوا کیونکہ اللہ اسے ممکن بنانا چاہتا تھا۔ اس کی چاہت نہ ہو تو بظاہر ممکن کام بھی ناممکن ہو جایا کرتے ہیں۔" کاوش نے آم کی قاش اٹھاتے ہوئے کہا۔

نازش نے کھلکھلا کر مسکراتے ہوئے اس کی تائید کی، اس نے کاوش کے چمکتے ہوئے چہرے پر ہدایت کی روشنی جو دیکھ لی تھی۔

منی ناول



زندگی خاک نہ تھی

شیریں حیدر

فون پر پیغام کی بیپ سنائی دی، میں نے آٹے سے لتھڑے ہاتھوں سے فون کو اٹھایا، مما کا پیغام تھا مگر پورا پیغام سلائڈ کر کے نظر آ سکتا تھا، اوپر سے گھی سے ہاتھ پھسلواں ہو رہے تھے، اتنے قیمتی فون کو خراب کیا کرتی۔ ”ابھی دیکھ لوں گی.....“ سوچ کر میں نے فون کو واپس رکھ دیا۔ مما کے بارے میں سوچنے لگی، مما دور بیٹھی ہر روز کی طرح رات سونے سے پہلے مجھے صبح بخیر کہیں گی۔ پھر پوچھیں گی کہ مصطفیٰ کیا کر رہا ہے، اس



کے سینے پر تم نے کان رکھ کر اس کے سینے کی خرخراہٹ کو محسوس کیا تھا کہ نہیں...... رات کو اس کے پاؤں اور سینے پر ...س کی مالش کی تھی کہ نہیں...... عابد بیٹا کیسا ہے؟ تمہ...ی جاب کیسی جا رہی ہے؟ کتنے بجے نکلو گی؟ اچھی ...رح گرم کپڑے پہن کر باہر نکلنا، گاڑی بہت احتیاط سے چلانا وغیرہ وغیرہ...... انہیں یہ علم نہ تھا کہ آج یہاں چھٹی تھی، برف کی وجہ سے سب راستے بند تھے اور کسی کا اپنی جاب پر پہنچنا ممکن ہی نہ تھا، گھر کے باہر درجہ حرارت منفی تیس سے بھی نیچے تھا مگر گھر اندر سے اس طرح آرام دہ کہ ہم نے سویٹر بھی نہ پہن رکھے تھے...... عابد کے دل کا موسم بھی عاشقانہ ہو گیا اور انہیں پراٹھوں کے ناشتے کی سوجھی تھی۔ میں کافی عرصے سے اس شعبے سے دور رہنے کی وجہ سے اب بھول ہی چکی تھی مگر آج عابد کا اصرار تھا کہ انہیں میرے ہاتھ کے پراٹھے ہی کھانا تھے...... جانے کب میں نے انہیں آخری بار پراٹھے کھلائے ہوں گے۔

ہر روز تو دودھ کا کپ اور ڈبل روٹی، انڈے کا اپنا، اپنا ناشتا ہم دونوں خود ہی بنا لیتے تھے۔ پھر میں مصطفیٰ کو تیار کر کے، اس کی دن بھر کی ضروریات کا بیگ تیار کر کے عابد کے حوالے کرتی تھی جو اسے اپنی اماں کی طرف چھوڑتے ہوئے اپنی جاب پر چلے جاتے اور میں اپنی ملازمت پر...... واپسی پر مجھے مصطفیٰ کو لینا ہوتا تھا۔ دفتر سے نکل کر میں راستے سے ہی کسی بھی گروسری اسٹور سے اگلے دن کے ناشتے کا سامان لیتی یا کچھ اور ایسی چیز جو خلافِ معمول درکار ہوتی تھی، باقی ساری خریداری ہم مہینے کے پہلے ویک اینڈ پہ کرتے تھے۔ ہفتے کے دن ہم مصطفیٰ کو آنٹی (عابد کی اماں) کی طرف چھوڑتے اور خریداری کا سارا سامان لا کر اسے تہ خانے میں الماریوں میں ترتیب سے رکھتے کہ ہمیں ہر روز اسے ڈھونڈنا نہ پڑے، ساری الماریوں پر عابد اور میں نے مل کر لیبل لگا رکھے تھے اور ایک نوعیت کا سامان ایک الماری میں ہوتا تھا، محنت طلب کام تھا مگر معمول میں ہمارا کافی وقت اس طرح بچ جاتا تھا۔ تہ خانے میں چونکہ ہیٹر نہیں ہوتے اس لیے وہاں کا درجہ حرارت ایسا ہے کہ جیسے فریج ہو، اس لیے ایسی بہت سی چیزیں جو فریج میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی ہم وہاں شیلفوں پر رکھ دیتے تو خراب نہ ہوتیں۔ چھٹی کے دوسرے دن ہم دونوں مل کر کھانے کی کچھ تیاری کر لیتے، گوشت گلا لیتے، پیاز براؤن کر کے رکھ لیتے، کچھ سبزیاں کاٹ کر فریج یا فریزر میں رکھ لیتے تا کہ ہر روز کی میری محنت کم سے کم ہو جائے۔ ساتھ، ساتھ واشنگ مشین میں کپڑے دھلتے رہتے اور سوکھنے پر میں اور عابد اپنے اگلے ہفتے بھر کے کپڑے استری کر کے اپنی، اپنی الماریوں میں لٹکا دیتے تھے...... زندگی بظاہر سہل نظر آتی ہے مگر اس کے لیے جو مشقت اور شب و روز کی دوڑ ہوتی ہے وہ تھکا دیتی ہے، کبھی ایسی فرصت نہ ملتی تھی کہ ہم دونوں بیٹھ کر آپس میں کوئی بات تسلی سے کریں، میوزک سنیں، کوئی فلم دیکھیں یا کسی مسئلے کو زیرِ بحث لائیں۔ میں پراٹھوں کا ناشتا بنا کر فارغ ہوئی تو مصطفیٰ جاگ گیا تھا، اسے فیڈر دے کر دوبارہ سلایا، ابھی اس کی نیند پوری نہ ہوئی تھی، واپس آئی تو عابد میز پر ناشتا رکھ کر میرا انتظار کر رہے تھے۔

''ارے آپ کھا لیتے......'' میں شرمندہ ہوئی، کتنے شوق سے عابد نے فرمائش کی تھی اور وہ کتنے صبر سے بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔

''لو یہ بھی خوب کہی بھئی...... دو لوگ ہیں جو آج مل بیٹھ کر بہترین دیسی ناشتا کرنے والے ہیں، ان میں سے بھی ہم باری، باری کھاتے اچھے لگتے ہیں کیا......؟'' عابد نے ہنس کر کہا۔ ''اکیلے کیسے کھا لیتا...... کبھی کبھار ہی تو موقع ملتا ہے ہمیں ایک ساتھ یوں سکون سے ناشتا کرنے کا......''

''میں گرم کر کے لاتی ہوں پراٹھے......'' میں نے پلیٹ اٹھائی۔

''میں نے ابھی چائے بناتے ہوئے گرم کر لیے تھے جان!'' عابد نے مجھے پکڑ کر واپس بٹھایا۔

''آپ نے چائے کیوں بنائی؟'' میں نے

شرمندگی کا اظہار خفا ہو کر کیا۔

''کیا فرق پڑ گیا اس سے......'' انہوں نے مسکرا کر آملیٹ کاٹ کر آدھا میری پلیٹ میں رکھا۔ ''جب زندگی کی گاڑی کو ہم ہر طرح سے مل کر کھینچ کر چلا رہے ہیں تو میں ان کاموں میں تمہارا ہاتھ کیوں نہیں بٹا سکتا...... اور کتنی بار کہا ہے رانی کہ تم مجھے یوں ٹریٹ نہ کیا کرو...... ہمیں عادت ہے اس طرح کام کرنے کی یار...... میرے بابا بھی تو میری اماں کا ہاتھ بٹاتے ہیں حالانکہ اماں نے عمر بھر ملازمت نہیں کی...... صرف ہم سب کی پرورش کی اور پھر بھی بابا ان کا اتنا خیال کرتے تھے، پردیس میں بھلا کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ جب کبھی وہ تھک جاتی تھیں تو میں نے خود بابا کو اماں کے کندھے اور ٹانگیں دباتے بھی دیکھا ہے اور کبھی وہ بیمار ہوتی تھیں تو بابا گھر کا سارا کام خود کرتے تھے۔ جوں جوں ہم بڑے ہوتے گئے ہم نے ان کی مدد کرنا شروع کردی۔ اسی لیے ہمیں کوئی کام مشکل نہیں لگتا......'' عابد نے وضاحت کی۔

''آپ بہت اچھے ہیں عابد......'' میں نے دل سے اعتراف کیا۔ وہ میری بہت مدد کرتے تھے حالانکہ ہمارے ہاں تو خاوند کو مجازی خدا ہی سمجھا جاتا ہے...... اسے بھلا کوئی گھر کا کام کرنے دیا جائے، یہ تو عورت کے نہایت نکما ہونے کا ثبوت شمار ہوتا ہے۔ مصطفیٰ کی پیدائش پر اماں میرے پاس چند دن ٹھہریں مگر کام سارا عابد اور بابا مل کر کرتے، کھانا پکانا، مشین سے قالین صاف کرنا، سودا سلف لانا اور سنبھالنا، گھر کے باہر سے برف صاف کرنا...... یہاں تو اپنے گھر کے سامنے سے برف خود صاف کرنا پڑتی ہے ورنہ آپ کے گھر کے باہر کے سامنے سے کوئی برف سے پھسل کر گر پڑے تو اس کی سزا آپ کو مل سکتی ہے جو ہرجانے کی صورت میں بھی ہوسکتی اور کوئی ہلکی پھلکی سزا بھی۔

روزمرہ معمول میں بھی بھاری کام ہمیشہ عابد ہی کرتے، انہوں نے مجھے شروع میں بتادیا تھا کہ انکل (عابد کے بابا) ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ بھاری کام مردوں کے کرنے کے ہیں، خواہ پردے دھونا ہوں، بھاری کپڑوں کی استری ہو، وزن اٹھانا، گاڑیوں اور قالینوں کی صفائی وغیرہ...... اسی لیے انہوں نے مجھے کبھی ایسے کام نہ کرنے دیے تھے، بدلے میں، میں انہیں ہر طرح کا آرام دینے کی کوشش کرتی کہ یہی میری ماں کی تربیت تھی اور یہی میں نے اپنے گھر میں ہوتے دیکھا تھا۔

ایسا نہیں کہ میرے اپنے بابا کوئی برے آدمی تھے...... انہیں میں نے بہت اچھا شوہر اور باپ پایا تھا، انہوں نے مما کو ہر طرح کا سکھ دیا تھا مگر اس کے لیے انہیں ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئی تھی۔ انہوں نے اپنے کاروبار میں محنت کی تھی اور خود کو اس قابل بنایا تھا کہ ہم لوگوں کو بہترین اور آسائشوں سے بھرپور خوابوں جیسی زندگی دیں۔ پاکستان میں مردوں میں گھر کے کام کرنے کا رواج نہیں چاہے شوہر کو بیوی سے کتنا بھی پیار ہو، مما کو یوں بھی گھر میں ملازمین کی ریل پیل کے باعث کبھی ایسی مدد کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ میں نے کبھی بابا کو مما کے ساتھ کسی بات پر خفا دیکھا نہ مما کو ناراض...... ان کی یاد آتے ہی دل ہمکنے لگا، میں نے ناشتے کے برتن سمیٹے اور سوچا کہ ابھی مما کا پیغام چیک کر کے جواب دیتی ہوں مگر عابد نے آواز دی، مصطفیٰ جاگ گیا تھا اور ان سے سنبھل نہیں رہا تھا، کافی دنوں سے زکام اور کھانسی نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔

''اماں سے کوئی دیسی نسخہ پوچھنا تھا رانی......'' عابد نے میرے ساتھ مل کر اس کو بہلانا شروع کردیا۔

''آپ اسے پکڑیں، میں اسے غسل دینے کی تیاری کرلوں......'' میں نے مصطفیٰ کو عابد کے حوالے کیا اور غسل خانے میں جا کر بالٹی میں پانی بھرنے لگی، اماں نے کہا تھا کہ پانی میں نمک ملا کر اسے غسل دو تو اس سے فرق پڑے گا، جانتے ہوئے بھی کہ زکام اپنا وقت لے کر ہی ٹھیک ہوگا، میں ہر وہ ٹونا ٹوٹکا آزماتی تھی جو کوئی بھی بتاتا تھا اور بہ آسانی قابلِ عمل بھی ہوتا۔ مصطفیٰ پیدائشی طور پر پھیپھڑوں میں رسولی کے مرض

شگفتہ شفیق کے اعزاز میں تقریب پذیرائی

شگفتہ شفیق ایک معروف شاعرہ ہیں۔ تین شعری مجموعوں کی خالق ہیں۔ ان کے تینوں شعری مجموعے بیرونِ ملک بھی کئی ایوارڈز لے چکے ہیں۔ شگفتہ شفیق کے اعزاز میں میٹرو ون ادبی فورم اور انڈس ادبی فورم کے اشتراک سے انڈس یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں ایک پُروقار تقریب منعقد کی گئی ہے۔ جس کے مہمانِ خصوصی پروفیسر رئیس علوی...... ڈائریکٹر KASBIT تھے جبکہ صدارت چانسلر انڈس یونیورسٹی خالد امین نے کی۔ تقریب میں راشد نور، سلطان مسعود شیخ، ریحانہ روحی...... سبین سیف نے شگفتہ کی شاعری کے حوالے سے نہ صرف اظہارِ خیال کیا بلکہ اپنی شاعری بھی سنائی۔ اس تقریب کی میزبان شگفتہ یاسمین تھیں یہ ایک شاندار تقریب رہی جس میں انڈس یونیورسٹی کے طلباء و طالبات کی بڑی تعداد موجود تھی۔

سبین سیف نے کہا اس میں کوئی شک نہیں کہ شگفتہ شفیق شاعرات میں اپنی ایک الگ جگہ بنا رہی ہیں۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی ایک غزل ترنم کے ساتھ پیش کی۔ ریحانہ روحی نے شگفتہ شفیق کو ٹرسوٹ پیش کیا اور کہا کہ شگفتہ شفیق کے ہاں ایک دھیما پن ہے اور میں چاہتی ہوں کہ وہ کبھی کبھی بولڈ بھی لکھیں۔ انہوں نے کہا میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ شگفتہ شاعر زیادہ اچھی ہیں یا انسان پیاری ہیں۔ ریحانہ روحی نے بھی اپنی خوب صورت شاعری سے سامعین کو محظوظ کیا۔ راشد نور صاحب نے کہا کہ شگفتہ شفیق کی شاعری میں تنہائی اور دھیما پن ہے اور... جمالیات کے ساتھ وہ اپنے اظہار میں اپنے معاشرتی اور جیتے جاگتے کرداروں کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک کیفیت پائی جاتی ہے۔

شگفتہ شفیق نے مائیک پر آکر اللہ کا شکر ادا کرنے کے بعد بہت خوشی کا اظہار کرتے ہوئے میٹرو ون ادبی فورم اور انڈس ادبی فورم کا شکریہ ادا کیا انہوں نے کہا کہ میٹرو ون کا بزم شاعری شاندار پلیٹ فارم ہے جو کہ اردو ادب کے حوالے سے بیش

میں مبتلا تھا اس لیے اسے دوائیں بھی کم سے کم دی جاتی تھیں، ہر ماہ اسے ایک انجکشن لگتا تھا جس سے اس کی رسولی کے درد کو قابو کرنے اور اس کا سائز بڑھنے سے روکنے میں مدد ملتی تھی۔ لاکھ کوشش ہوتی کہ اسے کھانسی اور زکام نہ ہو مگر یہی مسئلہ اسے سب سے زیادہ ہوتا تھا، کبھی ٹھنڈ لگ جاتی اور کبھی کسی چیز کے کھا لینے سے ایسا ہو جاتا تھا، اپنے گھر میں تو ہم نے کولڈ ڈرنک اور آئس کریم کا داخلہ ہی بند کر رکھا تھا اماں اور بابا بھی بہت احتیاط کرتے مگر وہ پھر بھی بیمار پڑ جاتا تھا۔

نمک کی بوتل اٹھاتے ہوئے مجھے اپنا فون نظر آیا، اسے بھی ساتھ ہی اٹھا لیا، گھنٹا بھر تو ہو ہی گیا ہوگا پیغام آئے اور میں اسے دیکھنا بھول ہی گئی، اب تک تو شاید مما جواب سے مایوس ہو کر سو بھی گئی ہوں گی، کیسے ہم مائیں اپنی اور اپنی اولاد کی مصروفیات میں اپنے ماں باپ کی یاد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، مما کا نہ تو دن شروع ہوتا اور نہ ختم ہوتا تھا جب تک کہ وہ مصطفیٰ کی خیریت دریافت نہ کر لیتیں اور مجھے ہر روز وہی نصیحتیں نہ کر لیتیں...... پانی میں نمک ڈالا اور ایک ہاتھ سے مگ کے ساتھ پھینٹ کر اسے ملانے لگی، دوسرے ہاتھ سے میں نے فون کو سلائڈ کر کے مما کا ہی پیغام کھولا۔

”تم جاگ گئی ہوگی بیٹا...... امید ہے کہ تم اور مصطفیٰ بالکل خیریت سے ہو گے...... تمہیں کچھ بتانا تھا رانی...... میں نے تمہارے بابا سے خلع لینے کا فیصلہ کر لیا ہے......“ میرے منہ سے چیخ نما آواز نکلی، میرا دماغ بھک سے اڑ گیا، فون ہاتھ سے چھوٹ کر سیدھا پانی میں گرا...... پورا وجود تھر تھر کانپنے لگا...... پاؤں کے بل بیٹھی تھی وہیں زمین پر جیسے گر سی گئی۔

”کیا ہوا رانی...سلے آؤں مصطفیٰ کو؟“ عابد کی آواز آئی، میں نے جواب دینے کو منہ کھولا مگر میرے منہ سے الفاظ ہی نہ نکلے۔ ”یار اب تو میں نے اس کے کپڑے بھی اتار دیے ہیں۔“ کہتے ہوئے عابد اسے لیے ہوئے غسل خانے میں چلے آئے، میں وہاں ہونقوں کی طرح زمین پر بیٹھی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے رانی؟“ میں نے پھر کچھ بولنا چاہا۔



بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ شگفتہ شفیق نے تسلیم کیا کہ محبت اور حوصلہ افزائی بہت زور آور ہوتے ہیں یہ جہاں اور جس کو مل جائیں تو اس کو آگے جانے سے کوئی نہیں روک سکتا اور مجھے زندگی کے سفر میں محبت اور ستائش دل کھول کے ملے ہیں جس سے ہم کو نکھرنے کا موقع ملا۔ شگفتہ شفیق نے اپنی خوب صورت شاعری سنا کر خوب داد سمیٹی۔

اس موقع پر پروفیسر رئیس علوی نے کہا کہ شگفتہ شفیق کا کلام ان کی نظمیں ان کی غزلیں بہت سادہ اور بہت نرم ہیں۔ یہ سادگی اور نرمی بڑے کمال کی ہے جو کہ عام طور پر نہیں ہوتی ہے۔ شگفتہ شفیق کی نظموں اور غزلوں میں پاکستانی مشرقی معاشرے کا پہلو صاف نظر آتا ہے۔ پروفیسر رئیس علوی نے کہا کہ ہم شگفتہ کو بہت مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ وہ جس طرح لکھ رہی ہیں اللہ انہیں توفیق دے کہ وہ اسی طرح نرمی اور سادگی سے لکھتی رہیں تاکہ تمام لوگ یہ محسوس کریں کہ شاعری میں کوئی نرم آوازیں بھی ہیں جو کہ دل میں اتر جاتی ہیں۔

مہمان خصوصی جناب رئیس علوی نے شگفتہ شفیق کو شیلڈ پیش کی اور سبین سیف نے گولڈ میڈل پہنایا۔ تقریب میں اگلی صفوں پر حیدر حسنین جلیسی، صبیحہ صبا، صغیر احمد جعفری، عظیم حیدر سید، فہمیدہ مقبول، ناصر رضا صاحب موجود تھے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ تقریب کے محرک اور بزم شاعری کے ڈائریکٹر قیصر وجدی نے ایسی تقاریب کو اپنے طرز پر سنوارنے کی جو کوشش کی ہے اس میں ایک ورائٹی پیدا ہوگئی ہے۔ شگفتہ شفیق مبارک باد کی مستحق ہیں ان کے لیے ایک پُروقار تقریب سجائی گئی۔

''تم ٹھیک تو ہو جان؟'' انہوں نے میرے پاس بیٹھ کر میرا ہاتھ تھاما، یقیناً ہاتھ یخ ہوگا۔

''تم اٹھو جلدی سے شال اوڑھو، تم بالکل ٹھنڈی ہو رہی ہو، میں اسے نہلا لیتا ہوں۔'' مصطفیٰ میرے پاس آنے کے لیے ہمکنے لگا، میں نے اسے عابد سے لیا اور اپنے ساتھ لگا لیا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں..... کیا کہوں..... آواز تو نکل ہی نہ رہی تھی۔

''ارے یہ تمہارا فون بالٹی میں گرا ہوا ہے.....''

میں آنسوؤں سے رونے لگی، جی چاہا کہ ان کے ہاتھ سے فون چھین لوں مگر میرا پورا وجود بے طاقت ہو رہا تھا۔

''اس میں رونے کی کیا بات ہے پگلی.....''

انہوں نے فون ہاتھ میں پکڑ کر سامنے کیا تو میرا جسم ہچکیوں کی زد میں آ گیا، اب وہ مما کا پیغام پڑھ لیں گے..... میں نے اس لمحے سے فرار کے لیے آنکھیں سختی سے بند کرلیں۔

''ارے واہ! یہ تو بڑا اچھا صاف ہو گیا ہے، بالکل صاف، دیکھو اس پر کچھ بھی نہیں ہے.....'' میں نے آنکھیں کھولیں، عابد نے اس کی اسکرین کا رخ میری طرف کر رکھا تھا، میں نے گہری سانس لی، کوئی اور صورت حال ہوتی تو میں اپنے فون کا یہ حشر دیکھ کر رو پڑتی مگر اس وقت میں نے دل ہی دل میں اس کے ''دھل'' جانے پر شکر ادا کیا اور میرے آنسو اور بھی تواتر سے بہنے لگے۔ ''یار تم تو بالکل پاگل ہوگئی ہو..... اتنے سے نقصان سے پریشان ہوگئی ہو، اماں کہتی ہیں کہ چھوٹا نقصان بڑے نقصان سے بچاتا ہے.....''

''کہتی تو مما بھی یہی ہیں عابد!'' میں نے دل میں سوچا۔ ''یہ چھوٹا نقصان نہیں ہے عابد.....'' بات نکلی بھی منہ سے تو کیا نکلی۔ اس وقت تو مما سوگئی ہوں گی اور پھر میں ان سے رابطہ کروں بھی کیسے؟ میں سوچ کر رہ گئی، ان سے کیا بات کروں گی، کم از کم آج عابد کے سامنے تو بالکل کال نہیں کر سکتی.....

☆☆☆

میرا نام رانیہ ہے، پیار سے مجھے پہلی بار میرے پپا نے رانی کہا تو یہی میرا نام مشہور ہوا، یہی نام

اسکول، کالج، یونیورسٹی اور پھر سسرال میں بھی پکارا گیا... میں اپنے پاپا اور مما کی دوسری اور لاڈلی اولاد، ان کی آنکھوں کا تارا...... مجھے لگتا تھا کہ مما اور پاپا مجھے سب بہنوں میں زیادہ پیار کرتے تھے۔ اللہ نے ہمیں کوئی بھائی نہیں دیا مگر ہم چاروں بہنوں کو یہ محسوس ہوتا کہ ہم میں سے وہی سب سے زیادہ لاڈلی ہے۔ ہم بہنوں کا آپس میں بے حد پیار تھا، زندگی آسائشوں سے بھرپور اور دن رات خوشیوں کے ہنڈولے میں بسر ہوتے تھے۔ مما کسی وقت کسی بات پر ذرا سی بھی سختی کرتیں تو پاپا ہماری ڈھال بن جاتے، مما سے جھوٹ موٹ کا جھگڑا ہو جاتا۔

میں بی اے کر کے فارغ ہوئی تھی اور دن سو کر، رات کمپیوٹر پر ڈرامے اور فلمیں دیکھ کر گزرتے۔ یونیورسٹی میں نفسیات میں ایم اے کرنے کو داخلہ لیا اور معمول کی کلاسز شروع ہوگئیں۔ میں نے اسکول اور کالج کی طرح یونیورسٹی میں بھی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑنا شروع کر دیے اور اساتذہ کی پسندیدہ طالبہ بن گئی۔ پہلا سال پنکھ لگا کر اڑ گیا، انہی دنوں مما کی بچپن کی ایک سہیلی سعدیہ کینیڈا سے پاکستان آئیں تو انہوں نے اپنے اسکول اور کالج کے وقت کی سہیلیوں کو ملاقات کے لیے اکٹھا کیا، وہیں وہ مما سے بہت عرصے کے بعد ملیں، مما نہ صرف ان کی اسکول اور کالج کی دوست تھیں بلکہ وہ دونوں ایک ہی علاقے میں رہتی تھیں اس لیے اسکول اور کالج جانا آنا بھی اکٹھے ہوتا تھا، سو ان دونوں کی دانت کاٹے کی دوستی تھی......

مما نے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی، جہاں ہماری ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور آنٹی ہم سب کو بہت اچھی لگیں، آنٹی نے بھی مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر بہت پیار کیا اور کہا کہ مجھ میں انہیں مما کی جوانی کی جھلک نظر آئی اور مجھے دیکھ کر انہیں ایسا لگا جیسے وہ ماضی کے اس دور میں پہنچ گئی ہوں جو کالج کا زمانہ تھا اور بے فکری کا دور۔

''مجھے دے دو یہ بیٹی حنا......'' انہوں نے مما سے کہا: ''میری کوئی بیٹی نہیں ہے اور مجھے ایسی ہی بیٹی کی خواہش ہے......'' مذاق میں کی گئی بات جیسے دو سہیلیوں کے درمیان ایک اور تعلق کی سند بن گئی...... اسی بات کو اس نئے رشتے کی بنیاد سمجھ لیا گیا، آنٹی نے اپنے قیام کے دوران ہی اپنے بیٹے کو بلوا لیا اور یوں سب کی عابد سے پہلی ملاقات ہوئی، آنٹی اور انکل تو پہلے ہی پاکستان میں تھے، عابد نے پسندیدگی کی مہر لگائی تو میری رائے پوچھی گئی، دونوں فریقین کی باہمی رضا مندی سے رشتہ طے پا گیا اور ایک سادہ سی تقریب میں ہم دونوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔

نکاح کے بولوں میں کیسا جادو ہوتا ہے، اس کا علم مجھے نکاح کے بعد...... فقط چند ملاقاتوں اور پھر عابد کے واپس کینیڈا چلے جانے پر ہوا۔ چند دن ہی تو ہم مل پائے تھے اور وہ بھی گھر والوں کی موجودگی میں...... جاتے سمے عابد نے رابطہ رکھنے کا کہا اور میں ائرپورٹ پر اپنی دھندلی آنکھوں سے اس شخص کو جاتا ہوا دیکھ رہی تھی جس سے چند دن کی ملاقات نے مجھے اس سے کسی انوکھے محبت کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔

یوں تو وقت تیزی سے گزرتا ہے مگر تب نہیں جب کسی سے جدائی ہو جائے یا کسی کا انتظار ہو...... سال بھر کا عرصہ کیسے گزرا یہ ہم دونوں ہی جانتے تھے۔ ٹیلی فون اور ای میل کے ذریعے رابطے سے ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں اتنا کچھ جان لیا تھا جیسے ہم بچپن سے ساتھ ہی پلے بڑھے ہوں مگر جب والدین کے گھر سے رخصتی کا وقت آیا تو دل بھر آنے لگا، کتنے پیارے، پیارے رشتوں سے دور چلے جانا تھا مجھے...... اپنے اتنے پیارے والدین اور اپنی پیاری، پیاری بہنوں اور سکھیوں سہیلیوں کو چھوڑ کر....

عابد اپنے خاندان کے نزدیکی لوگوں کے ساتھ رخصتی کے لیے آئے تھے، ان کے والدین، بھائیوں، بھابیوں اور قریبی دوستوں کی مختصر بارات تھی مگر پاپا کی طرف سے تو گویا پورا شہر اس تقریب میں اُمڈ آیا تھا۔ میری اور عابد کی جوڑی کو سب نے سراہا تھا، شہزادوں کی

سی آن بان لیے ہوئے، سادہ مزاج سے عابد، دولہا بن کر ان پر کتنا روپ آیا تھا اور کم تو میں بھی نہ تھی۔ شادی کے بعد کا ایک مہینہ دعوتوں کی نذر ہو گیا اور وہ دن آ گیا جب اگلے روز ہمیں کینیڈا جانا تھا۔ گھر والوں سے جدائی کا خیال مار رہا تھا مگر مما اور پاپا نے بہت ہمت کے ساتھ مجھے نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر رخصت کیا، میں جہاز میں بیٹھ کر یوں محسوس کر رہی تھی جیسے میرا آدھا وجود میرے ساتھ تھا اور آدھا میں پیچھے چھوڑ آئی۔

کینیڈا میں شروع کا کچھ عرصہ دل لگانے میں دقت ہوئی مگر عابد کا بڑا خاندان تھا اور پھر مصطفیٰ کی آمد کی خبر نے مجھے مصروف کر دیا۔ پاکستان سے ہر روز کا رابطہ تھا، ٹیلی فون اور لیپ ٹاپ پر دن بھر بھی ہوتا رہتا تھا، میں نے شروع میں مصروف رہنے کے لیے ملازمت ڈھونڈنا شروع کی، میری نفسیات میں ایم اے کی ڈگری کے مطابق تو مجھے وہاں کوئی ملازمت نہ ملی تو ایک کمپنی میں استقبالیہ پر ملازمت کو قبول کر لیا مگر چند ماہ کے بعد ہی یہ ملازمت چھوڑ دی کیونکہ طبیعت بوجھل سی رہنا شروع ہو گئی تھی اور پھر انتہا کی سردی کہ ہڈیوں میں گودا بھی جمنے لگتا تھا۔ اس وقت میں اور عابد ان کے والدین کے ساتھ ہی رہتے تھے اس لیے مجھ پر کام کا بوجھ بھی نہ تھا، آنٹی اور انکل انتہائی شفیق اور خیال رکھنے والے تھے۔

مصطفیٰ کی پیدائش سے دو ماہ قبل ہمیں علم ہوا کہ مصطفیٰ پھیپھڑوں میں پیدائشی نقص کے ساتھ پیدا ہوگا اور اس کی پرورش میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہوگی... تاوقتیکہ وہ اس عمر کو پہنچ جائے کہ اس کے پھیپھڑوں سے آپریشن کے ذریعے رسولی نکال دی جائے۔ اس خبر نے میری راتوں کی نیندیں اڑا دیں، ماں بننے کی خوشی پر یہ دکھ حاوی ہو گیا کہ جانے دنیا میں آنے والا بچہ کیسا ہوگا؟ آنٹی ایسے میں بہت تسلیاں اور دلاسے دیتیں ......انہوں نے مما کو بھی بلانے کا کہا تو عابد نے انہیں کاغذات بھجوا دیے جو ان کے ویزے کے لیے معاون ثابت ہوتے۔ آنٹی کے ہونے سے بھی مجھے بہت تسلی تھی مگر مما کے آنے کا سن کر تو جیسے میں پھر سے جی اٹھی تھی۔ مگر مما کے پہنچنے سے پہلے ہی مجھے ایمرجنسی میں اسپتال لے جانا پڑا اور وقت سے پہلے مصطفیٰ کی پیدائش ہو گئی، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ وہ ٹھیک سے سانس لے رہا تھا مگر اسے دو ہفتے تک انکیوبیٹر میں رکھنا پڑا اور اسپتال سے فارغ کرنے سے پہلے ڈاکٹروں نے میری اور عابد کی مکمل ٹریننگ کی تھی کہ ہمیں اس کے سلسلے میں کیا احتیاطیں روا رکھنا تھیں۔

مصطفیٰ چھ ماہ کا تھا تو اس کا آپریشن کر دیا گیا، الحمدللہ آپریشن کامیاب ہو گیا تھا اور اب اس کی حالت خطرے سے باہر تھی مگر اس کا بہت خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اس سارے وقت میں سعدیہ آنٹی نے میرا اس طرح ساتھ دیا کہ مجھے مما کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ وہ میرے ساتھ راتوں کو بھی جاگتی تھیں، گھر بھی پورا سنبھالتی تھیں اور میرے آرام کی خاطر ساری ذمے داریاں خود نبھاتیں۔ مصطفیٰ سال کا ہوا، میں دوبارہ ملازمت شروع کرنے کے قابل ہو گئی تھی اور یوں بھی مجھے اپنی قابلیت کی بنیاد پر پیشکش ہوئی تو میں نے دوبارہ ملازمت شروع کر دی، اب زندگی کا ایک نیا معمول شروع ہو گیا تھا۔ ہمیں علیحدہ گھر لے دیا گیا تھا، اس کی ابتدائی ادائیگی تو انکل (عابد کے بابا) نے کر دی تھی مگر آسان ماہانہ اقساط اگلے تیس برس تک ہمیں دینا تھیں، اسی لیے میرا ملازمت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ چاہتی تو پاپا سے رقم منگوا سکتی تھی مگر عابد کی عزتِ نفس نے اسے گوارا نہ کیا تھا۔

مما، مصطفیٰ کی قبل از وقت پیدائش کے موقع پر نہ آ سکیں تو پھر وہ منصوبے ہی بناتی رہ گئیں اور آ نہ سکیں کیونکہ اچانک ہی صدف اور احمد کی شادی کا منصوبہ بن گیا...... دونوں ایک ہی کالج میں پڑھ رہے تھے اور ابھی کچھ سال تک ان کی شادی کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر جب صدف کا لندن میں یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا تو مما اور پاپا نے سوچا کہ اس کا نکاح کر کے انہیں اکٹھے بھجوا دیا جائے۔ ان کی شادی انتہائی سادگی سے اور

میری اور عابد کی غیر موجودگی میں ہوئی، مجھے اس دن سب کچھ کھوکھلا، کھوکھلا سا لگ رہا تھا...... زندگی کیسے، کیسے امتحان لیتی ہے۔ مصطفیٰ چند دن کا تھا اور قبل از وقت پیدائش کی وجہ سے کمزور بھی، میں چاہتی بھی تو جا نہ پاتی اس لیے خود کو سمجھا لیا، اپنی مجبوریوں کی خاطر انسان کو بہت سے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ صدف سے بات کرتے، کرتے میں رو دی تھی تو مما نے فون لے لیا تھا اور مجھے یہی کہہ کر تسلی دی تھی کہ اب عابد اور مصطفیٰ میری دنیا تھے، مجھے ان کی خاطر بہت سی قربانیاں دینا ہوں گی...... اور جو مجبوری نہ ہوتی تو بھلا وہ میرے بغیر کہاں صدف کو بیاہ کر رخصت کرتے۔

میں مما کی بہت سمجھ دار بیٹی تھی میں ان کی مجبوری کو سمجھ گئی تھی، صدف کو پردیس بھجوانے میں انہیں کئی اندیشے ہوں گے، اب اس کی احمد کے ساتھ شادی سے ان کی ساری فکریں ختم ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

ٹیوب زمین کی کتنی ہی تہوں کے نیچے، ہوا کی رفتار سے چل رہی تھی۔ ہر اسٹیشن پر وہ رکتی اور چند مسافر اس سے اتر جاتے، ان کے اترنے کے بعد چند مسافر اور سوار ہو جاتے، سیٹ مل جاتی تو بیٹھ جاتے ورنہ کھڑے رہتے اور سہارے کے لیے چھت سے بندھے ہکوں، نزدیکی نشست کی پشت یا فرش میں گڑے پایوں کا سہارا لے لیتے۔ میں اس ٹرین کے سب سے پہلے اسٹیشن سے سوار ہوتی تھی اس لیے مجھے ہمیشہ نشست مل جاتی تھی اور عموماً وہی میری اپنی مخصوص نشست۔ کبھی کبھار کوئی بزرگ، کوئی عمر رسیدہ عورت یا بچوں کے ساتھ کوئی عورت ہوتی تو میں اٹھ کر انہیں اپنی نشست پیش کر دیتی، انتہائی تشکر کے ساتھ وہ میری پیشکش قبول کر لیتے...... ایسا صرف ہمارے ہاں ہی نہیں سکھایا جاتا بلکہ میں نے ان کے اپنے نوجوانوں کو بھی ایسا کرتے دیکھا ہے۔

ہمارے ملک میں تو بلکہ اب بچوں میں ایسی تربیت کا فقدان ہوتا جا رہا ہے...... اپنے ملک میں بیٹھ کر ہم ان گوروں کو جتنا برا سمجھتے ہیں اتنے برے وہ ہیں نہیں۔ میں نے انہیں بہت سے معاملات میں خود سے بہت اچھا پایا ہے، مسکرا کر ملتے ہیں۔ چھوٹی، چھوٹی حمایت پر شکریہ ادا کرتے ہیں، آپ کو دیکھتے ہیں پوچھتے ہیں کہ وہ آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔ میں سوچتی کہ ہمارے لوگوں میں کس قدر تکبر ہے، خود کو ہم اتنا بڑا سمجھتے ہیں، کسی کی خود سے مدد کے لیے تیار رہنا تو کجا ہم تو کسی کے مانگنے پر بھی اس کی مدد نہیں کرتے اور اب تو ملک کے حالات ایسے ہیں کہ ہم کسی کو مصیبت میں پھنسا ہوا دیکھ کر بھی منہ موڑ لیتے ہیں۔

اس روز بھی میں کھڑی ہو کر آئی تھی، ہر طرف مرد کھڑے تھے اور ایک طرف سمٹ کر میں کھڑی تھی کیونکہ ایک انتہائی بوڑھی خاتون، اپنے ایک ننھے سے پلے کو اٹھائے ہوئے سوار ہوئی، بیٹھنے کو کوئی جگہ نہ تھی اس لیے وہ میری نشست سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی...... اس کا وہ بیمار ننھا سا پلا منہ سے جانے کیا ٹپکار رہا تھا، میں سمٹ، سمٹ کر اس کی زد میں آنے سے بچ رہی تھی، تب لاکھ تھکاوٹ کے باوجود بھی حل یہی سوچا کہ کھڑی ہو کر انہیں وہ سیٹ پیش کر دوں، شکریہ کہہ کر فوراً وہ اپنے پلے سمیت بیٹھ گئیں...... ہر جھٹکے کے ساتھ دائیں، بائیں لڑھکتے اور کبھی کسی اور کبھی کسی سے ٹکراتے ہوئے بھی اپنے ملک کے بارے میں ہی سوچے جا رہی تھی، اگر میں یوں اس طرح ٹرین میں مردوں کے درمیان کھڑی جھٹکے کھا، کھا کر گر رہی ہوتی تو کئی اس ''سنہری'' موقع سے فائدہ اٹھاتے، یہاں میں جس سے بھی ٹکراتی الٹا وہ معذرت کر کے ہٹ جاتا۔

میں ٹیوب سے اتری اور جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر پیدل ہی چل پڑی، ارادہ یہی تھا کہ راستے میں فش اور چپس کی دکان سے رات کے کھانے کے لیے کچھ لے لوں گی، اس وقت تھکاوٹ سے حال ایسا تھا کہ گھر جا کر انڈا بنانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا، کانوں میں، میں نے MP3 کے ہیڈ فون لگا رکھے تھے جن سے میں گانے سنتی ہوئی جھومتی ہوئی چل رہی

تھی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ انگلینڈ جیسے ملک میں بھی میرے پاس موبائل فون نہ تھا...... وجہ یہ کہ یونیورسٹی کی فیسوں کی ادائیگی اور اپنا گھر چلانے کے بعد میں اور احمد دو موبائل ٹیلی فونز کے بل ادا نہیں کر سکتے تھے...... پاپا میری فیسیں اور ہمارے دیگر اخراجات کے لیے ہمیں رقم بھجواتے تھے، کچھ احمد کام کرتا تھا، اس لیے ہم غیر ضروری اخراجات سے اجتناب کرتے تھے، اپارٹمنٹ میں فون تھا جس پر میری گھر بات ہو جاتی تھی...... مجھے اب اس کی عادت بھی ہو گئی تھی اور یوں بھی میں موبائل ٹیلی فون کی دیکھ بھال کے معاملے میں خاصی بے پروا ہوں سو احمد کا بھی خیال تھا کہ مجھے موبائل فون کی ضرورت نہیں ہے۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں لیپ ٹاپ پر اسکائپ آن کرتی اور مما کو اپنے دن بھر کی روداد سناتی، ان کی خیریت دریافت کرتی اور پھر اپنا یونیورسٹی کا کام ختم کر کے سو جاتی۔ ویک اینڈ پر ہم دونوں کام کرتے تھے...... ہمیں ویزا میرے یونیورسٹی میں داخلے کی بنیاد پر ملا تھا اس لیے میرا یونیورسٹی جانا نہ صرف میرا شوق تھا بلکہ ضرورت بھی تھی ورنہ ویزا کینسل ہو جاتا۔ معمولات ایسے تھے کہ سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملتی، کئی بار مما نے کہا تھا کہ ان کی ایک کزن میری یونیورسٹی سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر رہتی ہیں مگر کبھی وقت ہی نہ نکال پائے کہ ان سے بھی ملتے...... (یہ بھی لندن میں آ کر معلوم ہوا کہ فاصلے میلوں میں نہیں بلکہ گھنٹوں اور منٹوں میں بھی ناپے جا سکتے ہیں) کھانا لے کر میں پیدل ہی اپنے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوئی۔

کافی میکر آن کیا کہ کافی بنا کر ایک ہی دفعہ بیٹھوں گی، الماری کھول کر اس میں اپنا کوٹ لٹکایا، احمد کے آنے میں کچھ دیر تھی تو میں نے فش اور چپس کا پیکٹ مائیکرو ویو اوون کے اندر رکھ دیا۔ گرمیوں میں، میں اور احمد ٹرین کے اسٹیشن سے اکٹھے ہی سفر کرتے اور باتیں کرتے ہوئے واپس آتے تھے، ہم دونوں کی ٹرینیں اگرچہ دو مختلف سمتوں سے آتیں مگر پہلے پہنچنے والا دوسرے کا انتظار کرتا اور پھر ہم گھر تک کا راستہ ایک دوسرے کو دن بھر کی روداد سناتے ہوئے طے کرتے تھے۔ سردیوں میں اسٹیشن پر کھڑے ہو کر انتظار کرنا مشکل ہو جاتا تو میں گھر کی طرف نکل پڑتی تاکہ پہلے پہنچ کر کچھ بنا لوں۔

میرا داخلہ لندن کے لیے ہوا تو صرف اس شرط کے ساتھ اجازت ملی کہ میں کم از کم منگنی یا نکاح کروا کر جاؤں...... جس قسم کا اندیشہ پہلے پہل والدین کو لڑکوں کی طرف سے ہوتا تھا اب شاید لڑکیوں کی طرف سے بھی ہو گیا ہے اسی لیے ایسی شرط رکھی گئی تھی...... ایک سادہ سی تقریب میں میرا نکاح احمد سے ہو گیا۔ یونیورسٹی میں میرا کورس تین سال کا تھا اس لیے حکم ہوا کہ میں احمد کے لیے شوہر کے طور پر ویزا کی درخواست دے دوں، حکمِ حاکم، مرگِ مفاجات...... میں نے درخواست جمع کروا دی، یوں بھی اس سارے طریقۂ کار میں سالوں کا عرصہ لگ جاتا ہے مگر بھلا ہو قسمت کا کہ میری روانگی سے قبل ہی احمد کا ویزا آ گیا اور ایک اور تقریب میں جو انتہائی ایمرجنسی میں منعقد کی گئی میں رخصت ہو کر احمد کے گھر اور اس کے تین دن کے بعد احمد میرے ساتھ رخصت ہو کر لندن آ گیا۔

نئی جگہ...... نئے لوگ اور نئی زندگی کا آغاز...... میں تو سٹپٹا کر ہی رہ گئی، اللہ کا شکر ہے کہ احمد کا ساتھ تھا اور کئی مسائل کس طرح حل ہوئے مجھے علم تک نہ ہوا۔ احمد اور میں کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے، اس نے ابھی اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور اپنے پاپا کی کمپنی میں نئی، نئی ملازمت شروع کی تھی، اس کا وہاں نوکری کا تجربہ کافی نہ تھا اس لیے اسے بھی لندن میں کسی اچھی ملازمت کی امید نہ تھی مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا کہ آخر زندگی کی گاڑی بھی چلانا تھی۔ اسے ایک بڑے سپر اسٹور میں اکاؤنٹ کے شعبے میں ملازمت مل گئی اور وہیں میرے لیے ویک اینڈ پر بھی کوئی نہ کوئی کام مل جاتا تھا جس کی ادائیگی ظاہر ہے کہ گھنٹوں کے حساب سے ہوتی تھی، ویک اینڈ پر ہم دونوں اپنے ہفتے بھر کے رکے ہوئے کام ختم

کرتے اور دوپہر کو گھر سے نکل کر ایک دن کا پاس خریدتے جو بس، ٹیوب اور ٹرین...... سب پر استعمال ہو جاتا تھا، ہم کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتے تھے جو روز کے معمول میں ممکن نہ ہوتا تھا۔

ابھی ہمیں اپنی زندگی بنانا تھی، اس سے قبل ہی ہمیں ایک دوسرے کا ساتھی بنا کر ذمے داریوں میں الجھا دیا گیا تھا، کبھی کبھی تو گھٹن ہونا شروع ہو جاتی تھی مگر احمد کا پیارا سا ساتھ ایک نعمت محسوس ہوتا، ابھی ہم فیملی بھی شروع نہیں کر سکتے تھے کہ اس سے قبل کے کئی مرحلے تھے جو طے کرنا تھے، احمد بھی اپنا تعلیمی معیار بہتر کرنا چاہتے تھے مگر حالات اس بات کی اجازت نہ دیتے سو وہ ملازمت کر رہے تھے اور میں پڑھ رہی تھی۔ ہم دونوں کے والدین ابھی تک ہماری حتی الامکان مالی مدد کر رہے تھے مگر ایسا کب تک چلتا اور یوں بھی کسی مرد کی انا کب ایسا گوارا کرتی ہے۔ رات کے کھانے کے لیے برتن ٹرے میں لگا کر میں نے کمپیوٹر آن کیا اور اسکائپ پر مما سے رابطہ کیا۔ ''کیا ہو رہا ہے، موسم کیسا ہے......'' جیسے معمول کے سوالات کر کے ہر روز کی طرح مما نے احمد کے متعلق پوچھا۔

''احمد بھی بالکل ٹھیک ہیں مما......'' میں نے حسبِ معمول ان سے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ احمد بیٹے کا تمہارے ساتھ رویہ کیسا ہے، اس کا مزاج کیسا ہے؟'' مما کا سوال مجھے عجیب سا لگا، ایسا تو انہوں نے پچھلے چند ماہ میں کبھی نہیں پوچھا تھا۔

''احمد بہت اچھے ہیں مما...... مگر آپ اس طرح کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''اگر کسی قسم کے حالات خراب ہو جائیں تو وہ تمہارا ساتھ تو نہیں چھوڑے گا ناں؟'' مما کا اگلا سوال اور بھی حیران کن تھا۔

''کس قسم کے حالات مما...... کیا ہو گیا ہے، سب خیریت تو ہے ناں؟'' میں نے تین سوال داغے۔

''اس بات کو چھوڑو کہ کس طرح کے حالات...... تم مجھے بتاؤ کہ تم دونوں کے درمیان رشتہ کیسا ہے، میرا مطلب ہے کہ یہ رشتہ ایسا کمزور تو نہیں کہ کسی بات پر خطرے میں پڑ جائے؟'' ان کے لہجے میں ماؤں کی سی مخصوص تشویش تھی مگر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''آپ تو مجھے پریشان کیے دے رہی ہیں مما...... سچ بات تو یہ ہے کہ ابھی ہمیں عرصہ ہی کتنا ہوا ہے ایک ساتھ...... کیا کچھ غلط ہونے والا ہے مما...... کیا احمد کے گھر والوں نے کچھ کہا ہے؟ پلیز بتائیں مجھے، کن حالات کی بات کر رہی ہیں آپ؟'' میں گھبرا گئی۔

''اگر میں......'' مما کہتے کہتے رکیں۔ ''میرا مطلب ہے کہ میں نے تمہارے بابا سے خلع لینے کا فیصلہ کر لیا ہے......'' کئی آسمان میرے سر پر آ گرے۔

''مما......'' میرے منہ سے بہ مشکل نکلا، باہر سے دروازے کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔

''صدف...... کہاں ہو ڈیئر؟'' میں نے احمد کی آواز سنی، مما نے بھی سنی ہو گی۔ احمد کمرے میں داخل ہوئے اور مما کو سلام کیا، میں گم صم تھی، مما نے احمد کی خیریت پوچھی اور میں نے جلدی سے کھانا گرم کرنے کا بہانہ کر کے اسکائپ بند کر دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی جانے میں کہاں گم تھی...... احمد نوٹ کیے بنا نہ رہ سکے مگر میں نے تھکاوٹ کا بہانہ کر دیا، بستر پر لیٹی تو نیند آنکھوں سے کہیں دور تھی، مما نے ایسا کیوں کہا تھا؟ اتنا بڑا سوالیہ نشان تھا کہ جس کا جواب مجھے سوائے مما کے اور کوئی نہیں دے سکتا تھا۔

مما سے بات کرنے کے لیے مجھے چوبیس گھنٹے اور انتظار کرنا تھا، ممکن ہے کہ مما نے مذاق کیا ہو، میں نے خود کو تسلی دی' مما اور بابا میں تو اتنا پیار ہے...... وہ تو خاندان کی سب سے اچھی جوڑی کہلاتے ہیں اور ان کے پیار کی سب مثالیں دیتے ہیں۔ یقیناً مما نے مذاق کیا ہوگا، میں نے پورے یقین سے سوچا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کسی سے اس بارے میں بات بھی نہیں کر سکتی تھی، احمد سے میری جان پہچان سالوں پرانی

سہی مگر ہمارے درمیان میاں بیوی کا ناتا ابھی بالکل نیا تھا۔ اوہ..... میرے ذہن میں آیا کہ میں کس سے بات کر سکتی ہوں مگر ظاہر ہے کہ اس وقت نہیں، سوچتے، سوچتے جانے کب میں نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

☆☆☆

''فاطش.....'' میں کتاب پڑھتے، پڑھتے سو گئی تھی، چونک کر جاگی۔ عموماً مما اس وقت سو جاتی تھیں۔ مگر اس وقت وہ جاگ رہی تھیں ''کہیں طبیعت خراب نہ ہو'' میں نے سوچا اور کتاب سائڈ ٹیبل پر رکھ کر اٹھی، دروازہ کھولا، مما اپنے سلک کے سیاہ سلیپنگ گاؤن پر سیاہ شال اوڑھے سامنے کھڑی تھیں، ان کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں..... شاید وہ سوتے سے جاگ کر آئی تھیں یا پھر روتی رہی تھیں۔

''کیا بات ہے مما..... سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' میں نے اٹھ کر ان کو تھام لیا، ان کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ ''آپ کو سردی لگ رہی ہے کیا؟'' میں نے انہیں صوفے پر بٹھا کر اپنا کمبل ان کی ٹانگوں پر ڈالا۔

''اسود سو گیا ہے کیا؟'' مما نے سوال کیا۔

''جی مما، کافی دیر پہلے سو گیا تھا، اسے صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے ناں.....'' میں نے انہیں بتایا۔

''تم نہیں سوئیں ابھی تک.....؟''

''سو گئی تھی مما کتاب پڑھتے، پڑھتے.....'' میں نے وضاحت کی۔ ''کل کے ایک لیکچر میں اس کتاب کا حوالہ دینا تھا مجھے مگر پڑھتے، پڑھتے سو گئی تھی.....''

''کیا ضرورت ہے ملازمت کی بیٹا..... کئی دفعہ کہا ہے کہ نہ تھکایا کرو خود کو.....'' انہوں نے پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا، اس لمس سے میرے پورے وجود میں ایک مقناطیسی قوت دوڑ گئی۔

''اچھا ہے مما، مصروف رہتی ہوں تو بہت سی... بے مقصد سوچیں میرے پاس بھی نہیں پھٹکتیں.....''

''پھر بھی خود کو تھکانے کے بجائے یہی وقت اسود کو دیا کرو..... تمہیں ملازمت کی ضرورت تو تب ہو جب ہم اس قابل نہ ہوں..... تمہارے پپا ہیں ناں بیٹا، تمہارا

اور اسود کا خیال رکھ سکتے ہیں اور پھر اسود کا باپ بھی تو ہے...... اس کا خرچہ تو اس کے ذمے ہے ناں!"

"میں خود کو کسی چیز میں مصروف کر کے خود کو یہ یقین دلانا چاہتی ہوں مما کہ میں بیکار نہیں ہوں۔" میں نے آہ بھر کر کہا، میرے دل میں ایک کسک جاگی تھی جب مما نے اسود کے باپ کا حوالہ دیا تھا۔ جن حالات میں اور جس دل سے وہ اسود کا خرچہ دے رہا تھا وہ میں ہی جانتی تھی اور ماں باپ پر خود کو بوجھ نہیں بنانا چاہتی تھی۔ "آپ اس وقت تک کیوں جاگ رہی ہیں مما......؟"

"نیند نہیں آ رہی تھی بیٹا!"

"پاپا میٹنگ اور ڈنر سے واپس لوٹے کہ نہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ابھی نہیں ......" انہوں نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

"کوئی پریشانی ہے مما؟"

"یہی سمجھ لو!" انہوں نے آہستگی سے کہا۔ "یا شاید نہیں بھی۔"

"کیا بات ہے مما؟ مجھے بتائیں کیا مسئلہ ہے، کوئی کاروبار کا مسئلہ ہے پاپا کا یا کچھ اور...... میں کچھ مدد کر سکتی ہوں اس میں؟" میں نے اپنا سر مما کی گود میں رکھ دیا، میری مہربان ماں کی نرم گود، گرم گود......

"مسئلہ......" انہوں نے جیسے بے دھیانی سے کہا، ان کی انگلیاں میرے بالوں میں مساج کرنے لگیں۔ "تم خوش ہو ناں بیٹا..."

"خوش مما......؟" یہ کیسا سوال تھا، خوشی کا یہاں کیا ذکر، میں تو زندگی گزار رہی تھی، زندگی مجھے گزار رہی تھی مگر انہیں پریشان کرنے کا کیا فائدہ تھا کہ اس زندگی کا انتخاب تو میں نے خود کیا تھا مما کی ہزار مخالفت کے باوجود...... "خوش ہی ہوں مما...... جتنا خوش مجھے ہونا چاہیے...... اپنے ہی کیے گئے ایک غلط فیصلے کا انجام بھگت کر۔" مما نے کتنی مخالفت کی تھی میرے انتخاب کی جب میں نے اشعر کو ان کے سامنے اپنا انتخاب بنا کر

پیش کیا تھا، پپا نے مما کو اس بات پر قائل کیا کہ میری بات مان لی جائے۔ حالانکہ مما، اشعر سے تفصیل سے ملی بھی نہ تھیں، میرے یونیورسٹی کے سینئر کی حیثیت سے اسے جانتی تھیں اور اس وقت مما کے خلاف میرے دل میں کدورت تھی اور پپا مجھے دنیا کے سب سے اچھے باپ لگے تھے جنہوں نے مما کو منا کر اس شادی کو عدالتی شادی بننے سے بچا لیا تھا۔

مما نے اگر اس وقت اس شادی کی مخالفت کی تھی تو اس سے بڑھ کر بعد ازاں ...... میرے اشعر کو چھوڑنے کے فیصلے کی مخالفت کی تھی کہ اس وقت تک ہمارا بیٹا اسود دنیا میں آ چکا تھا۔ مگر میں اس وقت بھی تل گئی تھی کہ مجھے ایک بدکردار شخص کے ساتھ زندگی نہیں بتانا تھی، مما نے اس وقت کہا کہ مجھے قربانی دینی چاہیے کہ یہ معصوم اس کا خمیازہ بھگتے گا مگر میرا فیصلہ اٹل تھا، اب بھی کبھی کبھار اس کی کسک باقی ہے کہ مما کہتی تھیں وہ معافی مانگتا ہے تو اسے معاف کر دو اور آئندہ کے لیے وعدہ کرتا ہے تو اس پر یقین کر لو، اسے اصلاح کا ایک موقع دے کر تو دیکھو کہ کل کلاں کو تمہارا بیٹا جوان ہو کر تم سے جواب دہی کرے تو تمہارے پاس اسے بتانے کو کچھ تو ہو کہ اس کا باپ کئی بار کی کوششوں کے بعد بھی نہیں بدل سکا تھا...... مگر میں نے سب در بند کر دیے...... اپنے کان، آنکھیں اور منہ سب کچھ بند کر لیا، ایک ہی اٹل فیصلہ تھا، وہ بھی دماغ کا نہیں دل کا تھا۔ مما کہتی تھیں کہ قصوروار مرد جب اپنا قصور مان لے تو عورت کا دل بڑا ہو جاتا ہے اور وہ اسے معاف کر دیتی ہے مگر میری نہ کسی طور ہاں میں نہ بدلی......

"یوں تو نہ کہو میری جان......" مما نے میرے ماتھے کا بوسہ لیا۔ "یہ شادی ہونا اور اس کے نتیجے میں اس معصوم کا اس دنیا میں آنا تو اللہ کی طرف سے مقرر تھا...... پھر ہزار چاہنے کے باوجود اس شادی کا ٹوٹ جانا بھی امرِ ربی تھا، ہم انسانوں کی کیا مجال کہ خدائی فیصلوں کو بدل سکیں...... اس وقت میں سوچتی تھی کہ تم نے اسود کا بھی نہ سوچا اور بہت غلط فیصلہ کیا مگر اب......" مما نے گہری

سانس لی۔ ''اب سوچتی ہوں کہ تمہارا فیصلہ ٹھیک تھا، تم نے اچھا کیا، عمر بھر کے لیے ایک ناپسندیدہ رشتے کا طوق گلے میں لٹکا کر جینے سے بہتر ہے کہ اس اکلوتی زندگی کو اپنے انداز سے جیا جائے......''

''یہ بات آپ کہہ رہی ہیں مما......؟'' میں نے حیرت سے ان کا چہرہ دیکھا، انہوں نے سختی سے ہونٹ بھینچ رکھے تھے جیسے کسی بات کو منہ سے نکلنے سے روکنا چاہتی ہوں۔ ''آپ کہہ رہی ہیں کہ میں نے ٹھیک کیا، آپ......؟ جنہوں نے اس وقت میری اتنی مخالفت کی تھی کہ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ آپ میری سگی ماں ہی نہیں ہیں......''

''ہاں میری جان...... میں جانتی ہوں کہ نارسائی کا دکھ کیسا ہوتا ہے، میں نے پوری عمر سمجھوتوں میں گزار دی کہ میرے اردگرد اپنی بیٹیوں کی محبت کی زنجیر تھی، تم لوگوں کے مستقبل کے بارے میں سوچتی تھی...... مگر اب میں تھک گئی ہوں، میں نے بھی یہ طوق اتار دینے کا فیصلہ کرلیا ہے، میں نے دیکھا ہے کہ تم بے سکون تو ہوتی ہو...... ناخوش تو ہو مگر تمہیں کسی ناپسندیدہ رشتے کا ساتھ تو نہیں نبھانا پڑ رہا، میں نے بھی تمہاری طرح آزادی کا فیصلہ کرلیا ہے فاطش......'' مما کے چہرے پر اپنی بات پوری کرتے ہی ایک سکون کی کیفیت آ گئی تھی، میں نے ان سے پوچھنا چاہا مگر میرے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا، حیرت کی زیادتی نے میرے منہ کو جکڑ لیا تھا۔ کس رشتے سے آزادی کا فیصلہ کیا ہے مما نے؟ میری ناقص عقل میں یہ بات ہی نہ آئی تھی۔

''تم سو جاؤ اب......'' انہوں نے میرا سر تھپتھپا کر کہا اور میرے کمرے سے نکل گئیں اور میں ان کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

عشق کا جادو جب سر چڑھ کر بولتا ہے تو سارے حواس مختل کر دیتا ہے، یہی میرے ساتھ ہوا تھا اور جب اشعر کے عشق کے جادو نے میرے دماغ میں اپنا سحر پھونکا تو مجھے اپنے سارے برے لگنے لگے تھے...... مما نے خود مجھے سمجھایا، پاپا سے کہا کہ مجھے سمجھائیں، رانیہ اور صدف نے کالیں کر کر کے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ والدین اولاد کا برا نہیں سوچتے، مجھے ان کی بات مان لینی چاہیے مگر میرے سر پر تو اشعر کی محبت کا بھوت سوار تھا اور مجھے اس کے سوا ساری دنیا بری لگتی تھی۔ پاپا نے ہی غالباً مما کو قائل کیا ہوگا کیونکہ میں نے پاپا سے کہا تھا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی سوائے اس کے کہ وہ اپنی خوشی سے میری شادی میں شامل ہو جائیں کیونکہ شادی تو...بہرحال مجھے اشعر سے ہی کرنا تھی...... اشعر کی محبت نے ہی مجھے اتنی ہمت دے دی تھی کہ میں اپنے اتنے پیار کرنے والے باپ کے روبرو کھڑی ہوگئی تھی۔

''میں نے تو کبھی اس انداز سے سوچا بھی نہ تھا کہ میرا کوئی بیٹا نہیں...... ہمیشہ یہی سوچتا تھا کہ بیٹوں اور بیٹیوں میں بھلا کیا فرق ہوتا ہے...... مگر آج علم ہوا ہے کہ جب کوئی بیٹی بغاوت پر اترتی ہے تو وہ اپنے باپ کی پگڑی پیروں تلے رول دیتی ہے......'' پاپا نے بس یہی کہا تھا، میں نے جواُن سے کہہ دیا تھا کہ اگر آپ لوگ نہ مانے تو ہم کورٹ میں شادی کرلیں گے...... پھر پاپا نے مما کو منالیا اور چند ماہ کے بعد کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ رانیہ اور صدف بھی چند دنوں کے لیے آئیں اور میں اپنی خوشی اور والدین کی بادل ناخواستہ رضا مندی کے ساتھ بیاہ کر اشعر کے گھر چلی آئی...... اپنی مرضی سے عشق رچا کر، دھڑلے سے شادی کرنے والی لڑکی کی جو عزت سسرال میں ہو سکتی ہے، اتنی ہی ''عزت افزائی'' میری ہوئی۔ بات بے بات مجھے آوارگی اور بے حیائی کے طعنے ملتے، جلد ہی اشعر کو بھی احساس ہونے لگا کہ اپنے گھر والوں کی خوشی سے شادی نہ کر کے اس نے ان کی عمر بھر کی ناراضی مول لے لی تھی۔

اسے باپ بننے کی نوید نے تو اور بھی پریشان کر دیا...... ''ابھی تو میرے ماں باپ اور بہن بھائی تمہیں ہی قبول نہیں کر پائے اب اس نئے رشتے کو کون خوش آمدید کہے گا...... کچھ ہو نہیں سکتا؟'' اس نے میری

طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور میں نے اس کی طرف، میں سمجھی نہیں تھی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ ''ابھی بچے کی جلدی کیا ہے؟''

''بچے کی جلدی......؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''مجھے کیا جلدی ہے...... جو اللہ کی رضا اور پھر ویسے بھی اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''کچھ نہ کچھ حل تو ہوتا ہوگا ناں......'' اس نے گول مول الفاظ میں کہا۔

''ہرگز نہیں......'' میرا لہجہ اٹل تھا۔ ''یہ ہم دونوں کا بچہ ہے اور ہم شادی شدہ ہیں اور ہر شادی کا مقصد نسلِ انسانی کی افزائش ہی ہوتا ہے اشعر...... مجھے یقین ہے کہ اس بچے کے آنے سے تمہارے گھر والوں کے دلوں میں نہ صرف اس کے لیے بلکہ میرے لیے بھی نرم گوشہ پیدا ہوگا۔''

''تمہاری مرضی......'' اس نے کندھے اچکائے تھے، آنے والے وقتوں نے اسے ایک کمزور ترین شوہر ثابت کر دیا تھا، میں نے یہ سب بھی برداشت کر لیا تھا اس امید پر کہ بچے کی آمد سے سب کے دل پسیج جائیں گے۔ اس کی پیدائش سے ایک ماہ قبل میں مما کے ہاں اٹھ آئی اور اسود کی پیدائش یہیں ہوئی...... اطلاع دینے کے باوجود سسرال سے کوئی اور تو کیا آتا، اشعر ہی چوتھے دن آیا۔ میں نے عہد تو کیا تھا کہ اس سے بات نہ کروں گی مگر اسے کوئی اور بہانہ فراہم نہیں کرنا چاہتی تھی، غلطی تو ہو چکی تھی مگر اپنے ماں باپ کی نظر میں سرخرو رہنے کے لیے اس غلطی کو نبھانے کی پوری کوشش کر رہی تھی...... اب صبر آزمائی بہت ہو چکی تھی۔

اسود ایک ماہ کا ہوا تو میں واپس سسرال لوٹی، سب گھر والوں کے مزاج حسبِ معمول تھے، کوئی اسود کو پیار سے دیکھتا تک نہ تھا، کیسے کٹھور لوگ تھے، کبھی میں اپنی ساس یا نندوں کو اسود کا خیال رکھنے کا کہتی تو وہ اپنی مصروفیت کا بہانہ پیش کر دیتیں۔ ایسے پتھر دل لوگ تھے کہ معصوم بچے پر انہیں پیار نہ آتا تھا، جانتے ہوئے بھی کہ ان کے بیٹے کی اولاد ہے...... میں نے پہلے پہل تو مما اور پاپا سے سب کچھ چھپائے رکھا مگر اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اشعر میری اور اسود کی بنیادی ضروریات کے لیے بھی رقم نہ دیتا، اس پر بھی میں صبر کرتی اور اپنی ہر ضرورت اپنی رقم سے پوری کرتی جو پاپا ہر ماہ میرے اکاؤنٹ میں جمع کرواتے تھے۔ پھر مجھے اس کے بارے میں اڑتی، اڑتی الٹی سیدھی خبریں ملنے لگیں تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا...... میں مما کے سامنے رو پڑی۔

''اب صبر کرو اور برداشت کرو......'' مما نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔ ''اولاد بہت بڑی مجبوری ہوتی ہے، عورت کے پیروں میں بندھی زنجیر...... جس کی لمبائی گھر کی چار دیواری تک ہوتی ہے اس زنجیر میں جکڑی عورت اپنے جوگی نہیں رہتی بیٹا...... اسی محبت نے تمہارے پیروں میں زنجیر باندھ دی ہے۔ تم سے اس کی دوستی تھی...... شادی کی تو اس کا دل بھر گیا، مرد کو جب باہر منہ مارنے کی عادت ہو جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لو...... برداشت کرو اب اسود کی خاطر......''

''ہرگز نہیں مما......'' بلا کی ضدی تو میں تھی ہی جو اپنی ہر ضد منوا لیتی تھی۔ ''میں اسے ناکوں چنے چبوا دوں گی۔'' میں نے کہا تھا۔ جب اسے ہی زندگی سے نکال دینے کا سوچ لیا تھا تو اس سے کوئی ضرورت وابستہ رہی نہ مفاد...... وہ میری زندگی برباد کرے اور میں اسے یوں ہی جانے دیتی ہرگز نہیں...... بھاری رقم کے حق مہر کا مطالبہ اور اسود کے ماہانہ خرچ کے لیے میں نے اس پر مقدمہ کر دیا اور اسے مالی طور پر کنگال کر دیا۔ اس کی ملازمت بھی اچھی تھی... سو اس کی آمدن کے لحاظ سے اسود کا خرچہ مقرر ہوا تھا جسے وہ لاکھ حیلے تاویلیں کر کے دیتا تھا مگر چونکہ عدالتی فیصلہ تھا اس لیے اس کی مجال نہ تھی کہ انکار کر سکتا۔

اسے زندگی سے نکال دیا تو ایک دن بھی ملال نہ ہوا، دکھ تو یہ ہوتا تھا کہ اپنے ماں باپ سے بغاوت کی، ان پر اعتماد نہ کیا، وہ اپنے تجربے کی روشنی میں مجھے سمجھاتے تھے اور میں اس وقت انہیں اپنا دشمن سمجھتی تھی۔

پاپا تو اس حق میں ہی نہ تھے کہ اشعر سے ایک پائی بھی قبول کی جاتی مگر یہ میری ضد تھی کہ میں اسے اس حد تک کنگال کر دیتی کہ اسے اپنی ضروریات کے لیے بھی رقم کم پڑتی پھر میں دیکھتی کہ وہ باہر عورتوں سے دوستیاں کیسے نبھاتا ہے اور اس کے گھر والوں نے اتنا عرصہ جس اذیت میں مجھے رکھا تھا میں انہیں یونہی کیسے جانے دیتی۔ میں نے کم از کم انہیں مالی پریشانی میں مبتلا تو کر دیا تھا ناں...... عورت کو کمزور سمجھ لیا جاتا ہے مگر میں اس رشتے کے ختم ہو جانے پر اور بھی مضبوط ہو گئی تھی۔ مما کی خواہش تھی کہ میں کسی اور سے شادی کر لوں، اسود کو وہ پال لیں گی مگر میرا ذہن اس بات کو قبول ہی نہ کرتا تھا۔ میں نے مما اور پاپا کے منع کرنے کے باوجود کالج میں لیکچرار کی ملازمت کر لی تھی، اب تو اسود بھی اسکول جانے لگا تھا، مما اور پاپا کی ہتھیلیوں کا چھالا اسود......

☆☆☆

''اماں......'' میں نے قرآن پاک سے نظر ہٹا کر سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑی بلی کو دیکھا۔ ''بڑی اماں بلا رہی ہیں آپ کو......'' اس نے میری ساس کا پیغام دیا، میں نے قرآن پاک کو بند کر کے اس کے ہاتھ میں پکڑایا، اس نے اسے سامنے والی الماری کے اوپر رکھ دیا۔

''سب خیریت تو ہے ناں بیٹا؟'' میں نے ان کے اس بے وقت بلاوے پر حیرت سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ پھپو کی کال تھی، میں نے ہی فون ان کو دیا تھا، کال ختم ہوتے ہی انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کو بلا کر لاؤں......''

''چلو......'' میں نے اپنے کپڑوں پر پڑی سلوٹیں ہاتھ سے دور کرنے کی کوشش کی، ابھی تو میں نے رات کا لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا مگر اس وقت بجلی بھی نہ تھی کہ استری کروا کر تبدیل کرتی اور یوں بھی وہ بزرگ تھیں اور ان کے بلاوے پر مجھے فوراً جانا تھا، یہی ہمارے ہاں کا اصول تھا۔ ''کیا بات ہو سکتی ہے...... بڑی اماں کسی پر ناراض تو نہیں تھیں؟'' میں نے راستے میں بلی سے پوچھا۔

''نہیں فون کے بعد تو وہ خوش تھیں اماں!'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''جی اماں؟'' میں نے ان کے سامنے سر جھکایا اور انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''آپ نے بلوایا تھا'' ...... میں ان کے پلنگ کی پائنتی پر بیٹھنے لگی تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

''تم جاؤ بلی یہاں سے......'' انہوں نے بلی سے کہا اور میری خیریت دریافت کی۔

''کچھ کھایا پیا تم نے کہ نہیں؟'' انہوں نے سوال کیا۔ ''عمر کہاں ہے؟''

''جی وہ سو رہے ہیں، جاگیں گے تو ان کے ساتھ ہی ناشتا کریں گے سب لوگ، ابھی تو میں قرآن مجید پڑھ رہی تھی۔''

''ناہید کا فون آیا تھا، وہ اگلے ماہ پاکستان آ رہی ہے اور اس کا ارادہ نبیل (ناہید کا بیٹا) کی شادی کا ہے اور سجاد بھی اس کے ساتھ ہی آئے گا......'' ناہید میری نند اور سجاد چھوٹا دیور تھا جس کی اپنی بیوی سے علیحدگی کے بعد سے وہ امریکا چلا گیا تھا اور اس کے بعد اس نے شادی نہ کی تھی کہ اسے عورت ذات پر اعتبار نہ رہا تھا۔ ناہید نے نبیل کی منگنی اپنی نند کی بیٹی کے ساتھ کر رکھی تھی، ایک بیٹی اور بیٹا اس نے امریکا میں ہی بیاہے تھے، اب نبیل اس کا ایک ہی بیٹا بچا تھا، اس کی شادی طے تھی کیونکہ ناہید ایک بہو پاکستان سے لے کر جانا چاہتی تھی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے اماں......'' میں نے انہیں مبارک باد دی۔

''میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ اس کی نند کی بیٹی نے نبیل سے شادی سے انکار کر دیا ہے کیونکہ وہ اپنے کسی کلاس فیلو سے شادی کرنا چاہتی ہے...... اب ناہید نے مجھ سے بلی کا ہاتھ مانگا ہے......'' انہوں نے جب یہ کہا تو میں حیران رہ گئی۔ ''میں جانتی ہوں کہ عمر کی بڑی خواہش تھی کہ وہ نبیل کو داماد بنائے اور

اسی مقصد کے لیے دو برس پہلے ناہید پاکستان آئی تھی مگر یہاں آ کر نبیل کو اپنی پھوپھی زاد بھا گئی تھی اور ہماری لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ ببلی کے لیے مان کر نہیں دیا تھا......''

''مگر اب......؟'' میں نے ہچکچا کر پوچھا۔

''اب اس نے کال کر کے کہا ہے کہ میں عمر سے بات کروں اور اسے مناؤں......'' اماں نے کہا۔ ''اس کی پہلے بھی بھائی کے ہاں رشتہ جوڑنے کی خواہش تھی اور آج بھی ہے۔''

''آپ کو معلوم ہے اماں کہ عمر نہیں مانیں گے......'' میں نے ہچکچا کر کہا۔ ''نبیل ایک بار ببلی کو ٹھکرا چکا ہے اور اب تو ببلی کا رشتہ تقریباً طے ہو ہی چکا ہے۔''

''سب جانتی ہوں نیلم......'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''اور یہ بھی جانتی ہوں کہ عمر تمہاری ہر بات مانتا ہے......تمہاری کوئی بات نہیں ٹالتا۔''

''وہ بات اپنی جگہ اماں مگر میں نے کبھی ان سے کوئی غلط مطالبہ نہیں کیا آج تک۔'' میں نے وضاحت کی۔

''میں نے تم سے کوئی غلط بات منوانے کو نہیں کہا نیلم......'' اماں نے تحمل سے کہا۔ ''ناہید میری بیٹی ہی نہیں عمر کی اکلوتی بہن بھی ہے اور تم سے بہت پیار کرنے والی نند بھی، عمر نے اس گھر میں جو درجہ اپنی چار بچیوں کی ماں ملیحہ کو نہیں دیا تھا، وہ تمہیں حاصل ہے......بغیر کسی بچے کو جنم دیے تم ان چار بچوں کی ماں کہلاتی ہو۔''

''میں ان بچوں سے ماں کی طرح ہی پیار کرتی ہوں اماں۔'' میں نے سسکی لی۔ ''میں نے انہیں کب ماں کی کمی محسوس ہونے دی ہے؟''

''کیا میں نے اس بات کا شکوہ کبھی کیا؟'' اماں کا لہجہ فوراً بدلا۔ ''میں نے ہی عمر کا جھکاؤ تمہاری طرف دیکھ کر اس سے التجا کی تھی کہ ملیحہ کو فارغ کر دے تاکہ وہ اس رشتے کا بوجھ نبھاتے، نبھاتے خواہ مخواہ ایک...ناپسندیدہ رشتے کی ڈور میں بندھی رہے......اچھا ہے کہ وہ کسی اور کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار رہی ہے اور عمر تمہارے ساتھ۔''

ان کا کہنا تو آسان تھا مگر جس تن لاگے سو تن جانے......

''میں کوشش کروں گی اماں......'' میں نے ہولے سے کہا، میرے دل میں بھی کئی خواہشات تھیں اور کئی ادھورے سپنے، جن میں سے اہم تو یہی تھا کہ میں ان بچوں کی ماں کہلاتی تھی جنہیں میں نے جنم نہیں دیا تھا اور اس کے صلے میں مجھے اپنی اولاد سے محرومی ملی تھی کیونکہ عمر نے اول روز ہی کہہ دیا تھا کہ انہیں مزید اولاد نہیں چاہیے تھی۔

''کوشش نہیں نیلم......تمہیں عمر سے بات منوانے کے سب گُر آتے ہیں، مجھ سے کچھ چھپا نہیں ہے......''

کاش وہ جانتیں کہ میں تو ان سے کچھ نہیں منوا سکتی تھی، وہ مجھ سے سب کچھ منوا لیتے تھے۔ میں مرے، مرے قدموں سے ان کے کمرے سے باہر نکلی تو عمر اپنے کمرے سے نکل رہے تھے۔

''کہاں ہو نیل......یار تمہارے فون پر کال آ رہی ہے آنٹی کی۔'' انہیں اپنی نیند میں فون سے مخل ہونے پر ناراضی تھی۔

''تو آپ اٹھا لیتے ناں فون......'' میں نے فوراً فون پکڑ کر اس کا بٹن دبایا اور مما کو سلام کیا، عمر مڑ کر واپس کمرے میں چلے گئے، اپنے ادھورے سپنوں کا سلسلہ وہیں سے جوڑنے......چھٹی کے روز وہ اسی طرح سست ہو جاتے تھے، دن چڑھے تک سوتے رہتے، کبھی کبھار ناشتا کر کے دوبارہ سو جاتے تھے۔

''کیا حال ہے میری جان نیلی، کہاں تھیں......اتنی دیر سے فون بج رہا ہے اور تم اٹھا ہی نہیں رہی تھیں......'' مما نے شکوہ کیا۔

''وہ میں اماں کے کمرے میں تھی مما اور عمر سو رہے تھے......'' میں نے ہولے سے جواب دیا، دل ابھی تک بھاری سا ہو رہا تھا۔

''صبح سویرے اماں کے کمرے میں کیوں تھیں، خیریت تو ہے ناں میری بیٹی؟'' انہیں تشویش ہوئی۔

''ہاں مما......سب خیریت ہے......'' انہیں کوئی

کام تھا تو انہوں نے بلوایا تھا......‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’آپ سنائیں...... پاپا تو ٹھیک ہیں ناں؟‘‘

’’تمہارے پاپا ٹھیک نہیں ہو سکتے نیلم......‘‘ مما کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا....

’’کیا ہوا پاپا کو مما؟‘‘ میں تقریباً چیخی۔

’’تم تو جانتی ہو نیلم...... جو میں تمہیں کہہ رہی ہوں، اس لیے میں نے ان سے خلع لینے کا فیصلہ کر لیا ہے بیٹی......‘‘ مما نے میرے سر پر بم پھوڑا۔

’’کیوں مما...... اب کیا ہوا؟‘‘ میری آواز بلند ہو گئی۔

’’ناشتے میں کیا دیر ہے نیل؟‘‘ عمر کمرے سے نکل آئے تھے۔ ’’سب خیریت تو ہے ناں؟‘‘ عمر کمرے سے نکلے تو میں گھبرا گئی۔

’’میں آپ کو فارغ ہو کر کال کرتی ہوں مما......‘‘

میں نے فون فوراً بند کیا اور باورچی خانے کی طرف...... چل دی۔ پورا دن گزر گیا اور مجھے تنہائی ہی میسر نہ آئی کہ میں انہیں کال کرتی۔ ’’مجھے مما سے ملنے جانا ہوگا، شاید اداس ہو رہی ہوں گی اس لیے اس طرح کی بات کی ہے......‘‘ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

☆☆☆

میرا نام نیلم ہے، اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد...... ان کی چار بیٹیوں میں سے پہلی بیٹی...... اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا، پُراعتماد، ذہین، استادوں کی پسندیدہ اور ہر میدان میں سب سے آگے۔ اس روز بھی سودی نظام بینکاری کے موضوع پر انٹر کالجز کے ایک تقریری مقابلے میں ایک بھرپور اور پُرزور تقریر کے بعد داد کے ڈونگرے سمیٹتی ہوئی جب میں اپنی ٹرافی لینے کے لیے مہمانِ خصوصی کے سامنے کھڑی تھی تو دودھیا رنگت اور بھورے بالوں اور شربتی آنکھوں والے چیمبر آف کامرس کے صدر کی نظر میں اپنے لیے ستائش دیکھی اپنے عہدے کے حساب سے کافی ینگ تھے۔ ٹرافی وصول کرتے ہوئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، انہوں نے اپنی جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ’’میں واقعی تم سے بہت متاثر ہوا ہوں......‘‘ میں نے مسکرا کر ان کا پھر شکریہ ادا کیا۔

’’آپ یقیناً میری تقریر سے متاثر ہوئے ہیں سر۔‘‘ میں نے اپنے پورے اعتماد سے اس کی تصحیح کی۔

’’میں تم سے متاثر ہوا ہوں نیلم......‘‘ انہوں نے ہولے سے کہا، میں ہولے سے سر جھٹک کر نخوت سے ناک سکوڑ کر اسٹیج سے اتر آئی، شکر ہے کہ ان کی اور میری اس گفتگو کو کسی نے نہیں سنا کہ اتنے ہولے سے سب کچھ ہوا تھا مگر میں صبا سے یہ سب کہے بغیر نہ رہ سکی۔ مقابلے کے اختتام پر چائے کا اہتمام کیا گیا تھا، جہاں پر مہمانِ خصوصی کے کہنے پر سب شرکاء کو خصوصی

طور پر چائے کے لیے بلوا لیا گیا تھا، میں نے خود کو مہمانِ خصوصی سے دانستہ دور رکھا مگر اس کی نظروں سے دور نہ رہ سکی۔

بی کام کا امتحان ختم بھی نہ ہوا تھا کہ مما کی طرف سے مجھے اطلاع ملی کہ کچھ لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ ''مما...... میں ابھی پڑھ رہی ہوں۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''ایک نہ ایک دن تو سب بیٹیوں کو بیاہ کر اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے بیٹا، ابھی کون سا شادی ہو رہی ہے...... جانے ہمیں یہ لوگ پسند آتے بھی ہیں یا نہیں...... یا ہم انہیں پسند نہ آئیں۔'' مما نے مسکرا کر کہا، میرے پیچھے تین اور لائن میں لگی تھیں، سب سال دو سال کے وقفے سے جوانی کی دہلیز کو چھو رہی تھیں۔ جانتی تھی کہ یہ وقت تو آنا ہی تھا، ماں باپ کا گھر چھوڑنے کا خیال دل کو ہولاتا تھا تو نئی زندگی کے خیالات دل کو گدگداتے بھی تھے۔ شام کو جب میں ڈرائنگ روم میں دھڑکتے دل کے ساتھ داخل ہوئی تو مہمانوں کو دیکھ کر چونک گئی، وہی چیمبر آف کامرس کا صدر اور اس کے گھر والے......

''آئیں نیلم......'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے، میرے گھر والوں نے چونک کر اب میری طرف دیکھا تھا۔

''آپ نیلم کو کیسے جانتے ہیں بیٹا؟'' مما پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

''ارے آنٹی...... زیادہ نہیں جانتا، بس ایک بار دیکھا تھا......'' اس کے کہنے پر میں نے اسے دیکھا، اس کے چہرے پر اس وقت لکھا تھا، 'ایک بار دیکھا تھا، بار بار دیکھنے کی ہوس ہے......'

''اچھا...... مگر کہاں؟'' مما نے پوچھا۔

''وہ مما......'' میں نے مداخلت کی۔ ''میرا خیال ہے کہ پچھلے مہینے یہ انٹر کالجز ڈبیٹ مقابلے کے مہمانِ خصوصی تھے۔'' میری وضاحت پر عمر صلاح الدین نے مسکرا کر تائید کی۔

''بہت ذہین ہیں نیلم...... اور آنٹی ذہین لوگ میری کمزوری ہیں......'' عمر میرے چہرے کی طرف دیکھ کر بولے تو میرے گال تمتمانے لگے۔

مما اور پاپا کو کوئی اعتراض نہ تھا، ان سے پہلی ملاقات کے بعد میری بہنیں بھی عمر کی وجیہہ شخصیت سے مرعوب ہو گئی تھیں، رات کھانے کی میز پر بھی انہی کی باتیں ہوتی رہیں، جاتے سمے وہ مما اور پاپا کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے گئے تھے...... وہ مستقبل کے پلان بنا رہے تھے اور میرا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ رات سونے کو بستر پر لیٹی تو ایک انجان نمبر سے پیغام آیا۔

''براہ مہربانی میری کال اٹینڈ کریں اگر آپ تنہا ہیں اور اگر نہیں تو میری کال کو نظر انداز کریں...... عمر!'' میں فون کی اسکرین کو دیکھ رہی تھی...... ساتھ ہی گھنٹی بجنے لگی، میں نے سوچا کہ نظر انداز کر دوں مگر میرے دماغ کو سوچنے کا موقع ہی نہ ملا اور انگلی دل کی تال سے ہم آہنگ ہو کر فون کی اسکرین پر سبز نشان پر جا ٹکی۔

''وہ نیلم......'' اتنے پیار سے کسی نے کب میرا نام پکارا تھا پہلے...... ''آپ جاگ رہی تھیں ناں؟ میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' جواب سوچ ہی رہی تھی کہ سوتی سی آواز نکالوں اور وہ کال بند کر دے...... مگر دل کو کیا ہوا تھا۔ ''لگتا ہے اب سو گئی ہیں، میری آواز نے لوری کا کام تو نہیں کر دیا؟'' مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔ ''میں اسی مقررہ نیلم سے بات کر رہا ہوں ناں جس نے سودی نظام بینکاری کے خشک موضوع پر تقریر کرتے ہوئے بھی میرے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا!''

''جی نیلم بول رہی ہوں۔'' میں نے تھوک نگل کر کہا، میں اتنا گھبرا کیوں رہی تھی، تقریری مقابلوں میں مخالفین کے چھکے چھڑا دینے والی نیلم کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

''نیل......'' میری کئی دھڑکنیں مس ہو گئیں......

''تمہیں برا تو نہیں لگا میرا اپنے گھر والوں کے ساتھ تمہارے گھر آنا؟''

''ہوں......'' میں نے سینے کی گہرائی سے سانس کھینچی۔ ''زیادہ نہیں!''

''تھوڑا سا برا کیوں لگا؟''
''میں توقع نہیں کر رہی تھی......''
''میں کیا توقع کروں اب؟''
''میرے والدین کو علم ہوگا، ہمارے ہاں اہم فیصلے ماں باپ کرتے ہیں۔''
''مگر میں جاننا چاہوں گا کہ جو مجھے اتنا پیاری اور اچھی لگی ہے، اسے میں کیسا لگا ہوں؟''
''میں آپ کو کیوں اچھی لگی ہوں؟''
''کیونکہ تم ہو ہی اچھی۔''
''ایک ادھوری سی ملاقات نے آپ کو بتا دیا کہ میں کتنی اچھی ہوں؟'' میں ہنسی۔
''تم ہنستی بھی بہت اچھا ہو......'' عمر نے کہا۔
''کسی کو جاننے کے لیے بسا اوقات ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے اور کئی بار ساتھ، ساتھ رہتے ہوئے بھی انسان ایک دوسرے سے فاصلوں پر ہوتے ہیں۔'' فلسفہ جھاڑا گیا۔
''اتنی ثقیل گفتگو کرتے ہیں آپ!''
''ہلکی پھلکی گفتگو بھی کر لیتا ہوں......'' ہنس کر کہا گیا۔ ''ہم کہیں مل سکتے ہیں باہر نیل؟''
''ہم گھر پر تو مل لیے ہیں......'' میں نے فوراً کہا۔
''اب آنی ہوناں' اپنی جون میں...... مجھے تم سے باہر ملنا ہے اور کچھ بہت اہم باتیں کرنا ہیں......''
''میں اپنی مما سے بات کروں گی اور اجازت لوں گی۔''
''وہ تمہیں اجازت دے دیں گی؟'' بے تابی سی بے تابی تھی۔
''ممکن ہے کہ ہاں...... اور ہو سکتا ہے کہ نہیں۔'' میں نے غیر مبہم سی بات کی۔
''یہ کیا بات ہوئی......'' وہ جھنجلایا۔ ''بہت ضروری ہے ملنا۔'' وہ رکا۔ ''کیا تم ان سے پوچھے بغیر نہیں مل سکتیں مجھ سے؟''
''نہیں......'' میں نے کہا۔ ''ہرگز نہیں، ان کی اجازت کے بغیر ہرگز نہیں...... اور ڈریں نہیں، ان کی رائے آپ کے بارے میں بہت اچھی ہے۔'' میرے کہنے پر اس کے سینے سے سکون کی سانس خارج ہوئی ہوگی۔

☆☆☆

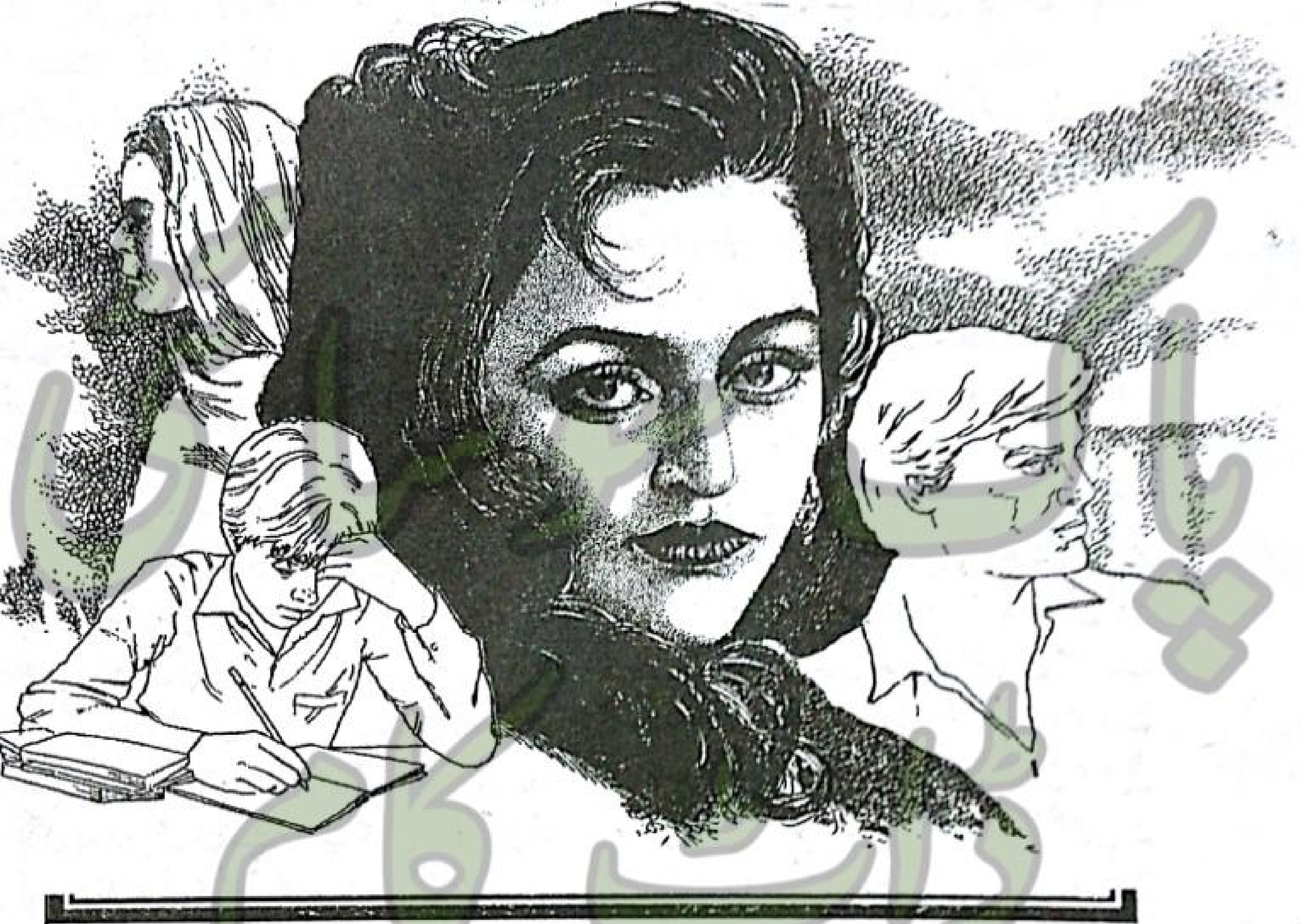
''میں نے کہا تھا ناں نیل کہ کبھی ہم کسی کے ساتھ سالوں اکٹھے رہ کر بھی دور ہوتے ہیں اور کبھی ایک لمحہ ایک دوسرے کو جاننے کے لیے کافی ہوتا ہے......'' جوس کا چھوٹا سا گھونٹ لے کر میں نے اس کے شربتی آنکھوں والے چہرے کو دیکھا۔ ''میں نے تمہیں ایک نظر دیکھا اور مجھے لگا کہ میری تلاش ختم ہوگئی ہے اور ایک وہ ہے......''
''کون وہ؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔
''جس کے ساتھ میں آٹھ سال سے رہ رہا ہوں۔''
اس کی بات واضح نہ تھی۔
''کس کے ساتھ؟'' رہ تو وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی رہا تھا۔ ''میں سمجھی نہیں؟''
''نیل...... میں تمہیں کیسا لگا ہوں؟'' وہ بات کا جواب گول کر گیا، اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔
''جھوٹ نہ بولنا پلیز......!'' میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، ان نظروں میں جانے کیا تھا، دل کی بے ترتیب دھڑکنیں نظروں سے واضح ہو رہی تھیں، کچھ بولنا چاہا مگر بول نہ سکی۔ ''بتاؤ ناں نیل......'' ایسے پیار سے کب کسی کے لبوں سے میرا نام نکلا تھا بھلا۔ ''میرا ساتھ دو گی...... میرا ہاتھ تھامو گی، میرا ساتھ قبول کرو گی؟ زندگی بتانا چاہو گی میرے ساتھ؟'' مجھے لگ رہا تھا کہ میں کوئی انتہائی رومانوی فلم دیکھ رہی تھی مگر وہ سب حقیقت تھی اور میں اس رومانوی کہانی کا ایک کردار...... میرے دل کے دروازوں پر پہلی، پہلی دستک۔
''پلیز......'' میں نے احتجاج کیا، میں اس کے سامنے بیٹھ کر کب اقرار کر سکتی تھی کہ وہ میرے دل کے بند دروازوں کے کواڑ توڑ کر اندر پہنچ گیا تھا۔ ''میں کچھ نہیں کہہ سکتی......''
''شرما رہی ہو یا...... میں اسے انکار سمجھوں؟''
''شرما رہی ہوں......'' میرے کان بھی گرم ہو گئے تھے...... وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا، میں اس کے

انداز سے اور بھی شرما گئی۔
''اگر مجھ میں کوئی کمی ہوگی تو بھی مجھے قبول کرلو گی تم؟'' اس کے کہنے پر میں نے چونک کر اسے دیکھا، بظاہر تو مجھے اس میں کوئی کمی نہیں لگ رہی تھی...... کوئی ایسا عیب بھی نہیں نظر آرہا تھا، اس کے گھنگرالے بال، سرخ وسفید چہرہ، موتیوں جیسے لڑی میں پروئے ہوئے دانت اوران سب پر وہ مسکراتی ہوئی شربتی آنکھیں......
''کیسی کمی؟'' میں نے سوال کیا۔
''پہلی ملاقات کا لطف خراب نہیں کرنا چاہتا......'' کھانا آگیا تھا۔'' اگلی بار ملوں گا تو بتاؤں گا، میں نے تمہارے والدین سے کہا ہے کہ میں پہلے تمہیں جاننا چاہوں گا اور چاہوں گا کہ تم بھی میرے بارے میں بہت کچھ جان لو اس کے بعد ہم اس سے آگے بڑھیں گے۔''
کھانا کھاتے ہوئے بھی میں کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی، مہذب انداز، دلچسپ باتیں...... میں یادوں کے ذخیرے میں کئی موتی سمیٹ کرلے آئی تھی، رات بستر پر لیٹی تو وہ سب موتی جیسے میری مٹھیوں میں تھے اور میں خود کو دنیا کی امیر ترین لڑکی سمجھ رہی تھی۔ چند ملاقاتوں کے بعد اس نے انکشاف کیا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے...... آٹھ سال سے وہ ایک ناپسندیدہ رشتے کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا، خود سے پانچ سال بڑی...... اپنی ایک کزن کے ساتھ...... خاندان کی روایات اور مجبوریوں کا طوق پہنے ہوئے...... میرا وجود زلزلوں کی زد میں آگیا تھا، کتنا بڑا جھوٹ اور کس قدر بڑا دھوکا میرے ساتھ ہونے جارہا تھا۔
''مجبوری کے رشتوں میں چار بچے بھی ہوجاتے ہیں عمر؟'' میرے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔'' جو بات آپ کو مجھے پہلی ملاقات میں بتانا چاہیے تھی وہ آپ مجھے اب بتارہے ہیں؟'' میں پھوٹ، پھوٹ کررو دی...... میرے ہاتھوں سے سارے خواب چھوٹ کر زمیں بوس ہوگئے تھے، ان کی کرچیاں میرے سارے وجود کو زخمی کررہی تھیں۔
''میں عمر بھر اسی رشتے کا طوق گلے میں ڈال کر رہتا...... کبھی کسی اور کی خواہش بھی نہ کرتا نیل...... مگر تم پہلی نظر میں دھڑ دھڑاتی ہوئی میرے دل میں داخل ہوگئی ہو، تم نے مجھے تسخیر کرلیا ہے، تمہارے ساتھ کی خواہش زندگی کی ہر خواہش پر حاوی ہوگئی ہے...... اتنا جانتا ہوں کہ تم نہ ملیں تو تمہیں کسی اور کا ہوتا ہوا بھی نہ دیکھ پاؤں گا اور نہ ہی تمہارے بنا جی پاؤں گا...... دل لگی نہیں چاہتا، تم سے شرعی رشتہ قائم کرنا چاہتا ہوں...... اماں کو انکار ہے نہ ملیحہ کو......'' تو گویا ملیحہ نام تھا اس کا......'' ایک بات سن لو دھیان سے نیل، تم انکار کروگی تو میری زندگی کا مقصد ختم ہوجائے گا...... تم کسی اور کی ہونا چاہوگی تو ایسا بھی نہیں ہونے دوں گا، دھمکی نہیں دے رہا، حقیقت بتارہا ہوں تمہیں...... ہاں ایسی ہی محبت ہوگئی ہے تم سے اور اتنی ہی شدت سے چاہت ہے تمہاری۔'' اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا...... اس میں سے ایک سیاہ مخملیں ڈبیا نکالی، اسے اپنی ہتھیلی پر رکھا، اسے کھولا، اس میں سے نکلنے والی انگوٹھی کے ہیرے کی چمک پر میری نظر مرکوز ہوئی، اس کی چمک سے میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔
اس نے دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈالا، باہر نکالا مگر اس ہاتھ کو اپنی گود میں رکھ لیا۔'' نیل! جتنا میں تمہیں چاہتا ہوں، اگر تم مجھے اس سے کم بھی چاہتی ہو مگر میرا ساتھ قبول کرنے کو تیار ہو تو میرے نام کی یہ انگوٹھی پہن لو...... اگر تمہیں مجھ سے پیار نہیں، تم میری محبت کی پزیرائی نہیں کرسکتیں تو یہ لو اور اپنے ہاتھوں سے ہاں اپنے ہاتھوں سے مجھے ختم کردو......'' اس نے اپنا دوسرا ہاتھ گود سے اٹھا کر میز پر رکھا، اس کی اس ہتھیلی پر سیاہ چمکدار چھوٹا سا ریوالوار تھا، مجھے اپنی چیخ پر اختیار نہ رہا...... ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے کئی لوگوں کی نظریں ہم پر جم گئی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ انشاءاللہ)

آخری پرچہ

بشریٰ گوندل



ثمرہ کو آج پھر کوئی مسئلہ درپیش تھا جیسا کہ اکثر ہی اسے کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا اور وہ سخت کوفت اور ٹینشن کا شکار ہو جاتی...... فریحہ کے پاس آتی اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر جاتی...... محلے میں ایک میلاد کی محفل میں فریحہ کی اور اس کی جان پہچان ہوئی تھی جو بہت جلد دوستی میں ڈھل گئی تھی۔ اسی بلاک کی تیسری گلی میں رہنے والی ثمرہ آج کل بچوں کی پڑھائی کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ اس کا خیال

تھا...... ''اسکول کا معیار اب پہلے جیسا اچھا نہیں رہا، صفائی کا انتظام بھی بہت اچھا نہیں ہے، ٹیچر سارا دن ایک جگہ اکٹھی ہو کر گپیں مارتی ہیں اور پرنسپل صاحب خود ان کے ہمنوا ہیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں، کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں ہے، رزلٹ بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔ سرکاری اسکولوں جیسا حال ہے...... اس سے تو بہتر ہے بندہ سرکاری اسکول میں ایڈمشن کرالے اور لٹنے سے تو بچ جائے......'' وہ خود کو خود ہی مشورہ دیتی۔

پہلے پہل تو فریحہ نے یہ سب ثمرہ کا وہم سمجھا کیونکہ بقول ثمرہ کے یہ اس کے بچوں کا تیسرا اسکول تھا کیونکہ بقول ثمرہ ان اسکولوں کا حال بھی حسبِ حال تھا۔ فریحہ کو اس سے مطلب وغرض نہ تھی کیونکہ ظاہر ہے یہ ثمرہ کے بچوں کا مسئلہ تھا وہ بہتر جانتی ہوگی لیکن اس مرتبہ بات قدرے مختلف یوں تھی اور اسی پر فریحہ کے کان بھی کھڑے ہوگئے کہ ثمرہ کے بچوں کے ساتھ اسی اسکول میں خود فریحہ کے بھی بچے پڑھتے تھے۔

لہٰذا اس مرتبہ اس نے نہایت باریک بینی سے اپنے بچوں کی کارکردگی کا جائزہ لینا شروع کیا تو اسے بھی تدریسی معیار میں کئی نقص نظر آئے۔ فریحہ کا بیٹا علی کلاس ٹو میں اور اریبہ ون کلاس میں تھی جبکہ ریان کا ابھی چند روز قبل ہی پلے گروپ میں ایڈمشن کرایا تھا فقط ڈھائی سال کا گلابی گالوں والا سرخ وسفید اور انتہائی معصوم ریان...... جو ابھی دنیا کے ہر کام کو کھیل اور دنیا کی ہر چیز کو کھلونا سمجھتا تھا اور اسکول بیگ میں کتابوں کی جگہ کھلونے ہی بھر کے لے جانا چاہتا تھا اگرچہ وہ چھوٹا تھا لیکن گھر میں تنگ بہت کرتا تھا اور ثمرہ نے ہی فریحہ کو اسے اسکول بھیجنے کا مشورہ دیا تھا اور اب وہ شکر کرتی تھی۔ جب تینوں بچے اسکول چلے جاتے تو کیسا سکون ہو جاتا، ہر چیز اپنے ٹھکانے پر اور اپنی جگہ پر پُرسکون نظر آتی تھی۔ بچے بھی اسکول والوں کے ہی قابو میں آتے ہیں۔

ماں کی گود میں فیڈر لے کر سونے والا ریان کلاس روم میں بھی روتے، روتے سو جاتا۔ سوتے ہوئے اس کے گلابی گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں واضح ہوتیں اور پلکیں دیر تک نم رہتیں۔

''فریحہ، تمہیں ترس نہیں آتا اتنے چھوٹے سے بچے پر......؟'' وہ جب روتے ہوئے ریان کو اسکول چھوڑنے جا رہی تھی تو اس کی ساس نے اسے احساس دلایا۔

''ترس کیسا امی......؟ اور ترس اگر کرتے رہو تو ہو چکی پڑھائیاں...... پہلے ہی لاڈ پیار نے اس کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ بہت ضدی اور خود سر ہو گیا ہے قابو ہی نہیں آتا اور نہ ہی کوئی بات مانتا ہے۔'' اس نے در پردہ ساس کے بچوں کے ساتھ لاڈ، پیار کے مظاہرے پر چوٹ کی تو وہ جز بز ہو کے رہ گئیں۔

سرہانے رکھا الارم فل والیوم میں چلاتا تو علی الصباح نیند میں ڈوبے نفوس اچھے خاصے بدمزہ ہو جاتے...... امی پہلے ہی مصلّے پر بیٹھی ہوتیں حاشر کو کم از کم دس مرتبہ جگانا پڑتا تو وہ سوتے جاگتے واش روم میں جا پھر دوبارہ نیند کی شدید خواہش دل میں لیے جھومتے جھامتے مسجد روانہ ہوتے۔ فریحہ نماز وتلاوت سے فارغ ہوتے ہی بچوں کو جھنجوڑنا شروع کر دیتی وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتے رہتے مگر آنکھیں نہ کھولتے...... وہ باری، باری تینوں کو واش روم لے جاتی ایک کو ٹوائلٹ سیٹ پر بٹھا کر دوسرے کو لینے آتی تو پہلا وہیں بیٹھا، بیٹھا سو چکا ہوتا اس کو دیکھتی تو پچھلا بستر تان چکا ہوتا چھوٹا ریان..... رو، رو کر پورا گھر سر پر اٹھا چکا ہوتا۔

''اُف توبہ......! ان کی خاندانی نیند...... جو پوری ہی نہیں ہوتی۔''

بچے تو بچے بڑوں کا بھی یہی حال تھا رات دیر تک جاگتے رہتے...... رات گئے تک یہاں وہاں ٹہلتے رہتے اور صبح نشے بازوں کی طرح جھوم رہے

ہوتے۔ بچے تو ناشتے کی ٹیبل پر منہ سی کر بیٹھے رہتے جیسے قسم اٹھائی ہو منہ نہ کھولنے کی اور نہار منہ ہی اسکول روانہ ہو جاتے...... حاشر بچوں سے بھی دو چار ہاتھ آگے تھے جس بے دلی اور اکتاہٹ سے تیار ہوتے، اسی بیزاری سے ناشتا کرتے رہتے اور اونگھتے رہتے جیسے ابھی کسی جگہ لمبے لیٹ جائیں گے۔

''اُف...... سستی اور آلکسی تو ختم ہے اس قوم پر......'' فریحہ مسلسل بڑبڑاتی رہتی۔

اور امی...... نماز وغیرہ سے فارغ ہوتے ہی ان کو ناشتا چاہیے ہوتا پھر وہ یوں فٹافٹ ناشتا کر رہی ہوتیں جیسے سحری کھا رہی ہوں کہ پھرتی سے کھا پی لو کہ سحری کا وقت بس ختم ہونے والا ہے۔

وہ بھوک کی وجہ سے ہڑبونگ نہیں مچاتی تھیں، ان کو دراصل دوبارہ سونے کی جلدی ہوتی تھی پھر ناشتے سے فارغ ہوتے ہی جو سوتیں تو دوپہر کو بھوک کی وجہ سے ہی دوبارہ آنکھ کھلتی تھی...... پھر بچے کس پر پڑنے تھے بھلا...... بچوں کے اسکول سے آئے روز شکایت آئی ہوتی کہ پڑھائی کے دوران سو جاتے ہیں اور چھوٹا ریان تو سامنے والوں کی لڑکی زویا کے پاس ٹیوشن پڑھنے جاتا اور وہاں سے ہر روز فریحہ سوئے ہوئے ریان کو کاندھے پر اٹھا کے لا رہی ہوتی اور دادی کو ابال اٹھتے رہتے۔

''اتنے چھوٹے سے بچے کو ٹیوشن پر لگا دیا، سوئے گا نہیں تو کیا کرے گا۔ نیند جو پوری نہیں ہو رہی۔''

''نیند تو یہاں کسی کی بھی پوری نہیں ہو رہی، یہ خاندانی مسئلہ ہے۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی۔

''اور چھوٹے کی بھی خوب کہی آپ نے امی، اس سے چھوٹے بچے بھی اسکول جاتے ہیں اور فر فر انگلش بولتے ہیں۔''

''کیا...... اس سے بھی چھوٹے بے غضب خدا کا...... پھر لیبر روم سے سیدھے اسکول چلے جاتے ہوں گے، توبہ توبہ......'' امی نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے اور فریحہ کو افسوس ہوا کیا ضرورت تھی امی کو یہ بتانے کی......

''ارے یہ مقابلے بازی ہے، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی ہوس ہو گئی ہے سب کو...... ایک طرف فیشن کے پیچھے بھاگتے، بھاگتے عورتیں پاگل ہو رہی ہیں تو دوسری طرف ان معصوم بچوں کی شامت آئی ہوئی ہے، ذرا دیر گھر میں برداشت نہیں کر سکتیں، بچوں کی دل موہ لینے والی شوخیاں اور معصوم شرارتیں ان کو بدتمیزیاں لگتی ہیں۔ بھلا بتاؤ بچوں کو خود سنبھال نہیں سکتیں اور فیڈر ہاتھ میں پکڑا کر دہاڑیں مار، مار کے روتے بچوں کو اسکول کے دروازے پر چھوڑ آتی ہیں ان کا بس چلے تو شیر خوار بچوں کا جھولا بھی وہیں ڈال آئیں اور پھر خود پرس لٹکا کے شاپنگ کو نکل جائیں......'' وہ مسلسل بولے

جارہی تھیں۔

''ارے اسی لیے تو پرائیویٹ اسکولوں والوں کی چاندی ہوگئی ہے ایک، ایک گلی میں تین، تین شاخیں نکال لی ہیں، کمائی کے اڈے بنالیے ہیں۔ تعلیم کے نام پر ہونہہ...... ہمارے زمانے میں تو ایسا دیکھا نہ سنا کبھی، عجب ہوا چلی ہے۔'' وہ منہ بناتے، بناتے دل کی بھڑاس نکالے جاتیں۔

''وہ اور زمانے تھے امی۔'' فریحہ نے خاصا اکتا کر کہا لیکن امی نے اپنی ساری بھڑاس نکالنی تھی۔ ''اُف توبہ...... ایک تو ان ساسوں کو بھی بس بولنے کا موقع چاہیے ہوتا ہے، ہر چیز میں نقص نکالنے ہوتے ہیں، ہر بات میں اختلاف اور اعتراض...... ایک، ایک بات کے سو، سو معنی و مفہوم...... اب بچوں کو اسکول سے اٹھالیں کیا......؟ جاہل رہنے دیں ان کو......'' وہ کلس رہی ہوتی۔

''بات، بات پر اپنے زمانے کی مثالیں پیش کرنے والوں کو کون سمجھائے کہ اب آپ کے زمانے نہیں رہے...... آپ کے زمانے میں وہ ہوتا تھا اور یہ نہیں ہوتا تھا۔ یقیناً بہت کچھ آج کے زمانے سے مختلف ہوتا ہوگا لیکن اس میں، ان تبدیلیوں میں ہم بیچاروں کا کیا قصور......''

☆☆☆

وہ لوگ گاؤں سے فقط بچوں کی تعلیم کی غرض سے شہر شفٹ ہوئے تھے ورنہ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت بھری پری سسرال سے شوہر کو نکال کے لانا...... وہ ایک الگ کہانی تھی جیسے کوئی نہتا اور تنِ تنہا اپنے زورِ بازو پر محاذِ جنگ جیت کے آئے...... حفظِ ماتقدم کے طور پر ساس بھی ساتھ ہی چلی آئیں کہ شہر میں بچے اکیلے کیسے رہ پائیں گے...... جیسے شہر نہ ہوا کوئی جنگل ہوگیا...... ثمرہ جو کچھ عرصے سے اس اسکول کی کارکردگی سے غیر مطمئن تھی اس نے اپنے بچوں کو ایک بار پھر کسی اور اسکول میں داخل کروادیا

اگرچہ وہ گھر سے کافی دور پڑتا تھا لیکن بقول ثمرہ وہاں کی پڑھائی تسلی بخش تھی پھر بلڈنگ ایسی عالی شان اور خوب صورت کہ دیکھنے والوں کی دور سے ہی توجہ کھینچتی تھی ہائی کوالیفائڈ اسٹاف اور ہائی کلاس ماحول کیونکہ زیادہ تر ہائی کلاس فیملیز کے بچے ہی وہاں زیرِ تعلیم ہیں۔

''اس کا مطلب ہے فیس بھی ہائی کلاس ہوگی......؟'' فریحہ نے نکتہ اٹھایا۔

''ہاں، تو کیا ہوا......'' ثمرہ بے پروائی سے بولی۔ ''بچوں کے لیے ہی تو ہے سب کچھ اور پھر بچوں کے مستقبل سے قیمتی تو کوئی چیز نہیں ناں...... بچوں کا مستقبل بن جائے اور کیا چاہیے آج جب ہم ان کے اوپر خرچ کریں گے تو کل کو وہ سود کے ساتھ ہمیں لوٹائیں گے ناں...... میں تو کہتی ہوں تم بھی اسکول کا ایک وزٹ کر آؤ......'' ثمرہ اسے بھی اپنا ہمنوا بناتے ہوئے نئی راہ دکھا رہی تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن حاشر نہیں مانیں گے۔'' وہ اگرچہ کچھ نہ کچھ مان رہی تھی پھر بھی تذبذب کا شکار تھی کہ ایسے تو حاشر کی پوری کی پوری تنخواہ اسکول والے ہی ہڑپ کر جائیں گے۔

''کوئی نہیں، مان جائیں گے حاشر بھائی...... اور جب اپنے بچوں کی بات ہوتی ہے تو باپ مان ہی جاتے ہیں بالآخر، تم کہہ کر تو دیکھو بلکہ ضد لگالو کہ بچوں کے مستقبل کا سوال ہے آخر...... پھر بھائی کو اس اسکول کا ایک وزٹ کراؤ خود ہی مان جائیں گے کیونکہ بہت فرق ہے یہ تو اُس کے مقابلے میں کسی گاؤں کا سرکاری لگتا ہے۔''

''گاؤں کا سرکاری اسکول......؟'' یہ الفاظ فریحہ کو کسی چابک کی طرح لگے تھے اس کی آنکھوں کے سامنے دور درختوں کے جھنڈ میں گاؤں کے سرکاری اسکول کی سرخ عمارت گھوم گئی جس کے احاطے میں برساتوں نے جوہڑ بنادیا تھا اور اس پر

مکھیاں اور مچھر بھنبھناتے رہتے جہاں پچھلے کئی سالوں سے ایک ہی استانی تعینات تھی اور کئی سالوں سے جس کا ایک ہی مشغلہ تھا، انگلی پر اون کا گولا لپیٹ کر سلائیوں سے سوئیٹر بنتے رہنا۔ اب تک خدا جانے استانی جی نے کتنے سوئیٹرز بُن ڈالے ہوں گے۔ فریحہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

☆☆☆

اگرچہ مشکل سے ہی سہی مگر حاشر مان گئے تھے اور پھر فریحہ نے ان کے سامنے بچوں کے برائٹ فیوچر کا ایسا شاندار اور متاثر کُن نقشہ پیش کیا تھا کہ ان کی آنکھیں حقیقتاً چندھیا گئیں اور اگلے ہی روز وہ متعلقہ اسکول کا وزٹ کر آئے اور فریحہ کی توقع کے عین مطابق مرعوب ہو کر ہی لوٹے...... ساتھ ہی کچھ متفکر بھی تھے شاید چارجز سن کر...... لیکن فریحہ نے ان کو منوا ہی لیا بالآخر پھر کچھ ہی دن لگے لیونگ سرٹیفکیٹ بنے اور داخلے کے تمام مراحل بہ خوبی نمٹ گئے مگر...... ان مراحل کی بہ خوبی تکمیل نے مڈل کلاس سرکاری ملازم حاشر کے ماہانہ بجٹ کی بنیادوں کو اچھا خاصا ہلا ڈالا مگر...... بچوں کا شاندار مستقبل ہر چیز سے اہم اور ضروری تھا۔

بچے اگرچہ اتنے خوش نہیں تھے۔ ظاہر ہے نیا اسکول، نئے لوگ، نیا ماحول، ابھی کنفیوز ہو گئے تھے۔ کیونکہ ایک، ایک کلاس پیچھے چلے گئے تھے مگر کچھ روز تک یقیناً ایڈجسٹ ہو جائیں گے۔ فریحہ اگرچہ مطمئن تھی اور خوش باش بھی...... ظاہر ہے اس علاقے میں اس اسکول کی بہت اچھی ریپوٹیشن تھی۔ اعلیٰ نصاب، پڑھا لکھا اسٹاف، بہترین ماحول، بہت اچھی شہرت کے ساتھ اس اسکول کا بہت رعب اور دبدبہ تھا۔

"ہاں ...... میرے بچے بھی اسی اسکول میں پڑھتے ہیں۔" محلے میں اور ملنے جلنے والوں کو حتیٰ کہ راہ چلتے ہوئے قطعی اجنبی اور غیر خواتین کو یہ

پرائس ٹیگ

آپ کا رویہ اور برتاؤ کسی پرائس ٹیگ کے مانند ہے جو آپ کی شخصیت ...... کے قیمتی یا ارزاں ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

مرسلہ: نزہت جبیں ضیا، کراچی

بہترین بات

رشتوں کو ایسی محبت اور احترام سے نبھایا کرو جیسے شہد کی مکھی پھولوں سے رس اگرچوس بھی لے تب بھی پھولوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں ہونے دیتی۔

دو دن کی زندگی ہے، اسے انہی دو اصولوں پر گزارو۔

ملو تو پھول بن کر
بکھرو تو خوشبو بن کر

از: فضہ بتول، بہارہ کہو

بتاتے ہوئے فریحہ کے لہجے میں ایسا مان اور غرور ہوتا جیسے وہ بذاتِ خود اس اسکول کی ڈائریکٹر ہو۔

ہاں یہ بات بھی سچ تھی کہ اب حلقۂ احباب میں ٹھیک ٹھاک رعب پڑ رہا تھا اور فریحہ کو لگتا تھا جیسے اس کی حیثیت ایک دم سے بدل گئی ہو، شمولیت ایک دم سے مڈل کلاس سے ہائی کلاس میں ہو گئی ہو۔ جیسے راتوں رات کسی کا کروڑوں روپے کی مالیت کا پرائز بانڈ نکل آئے۔

وہ اُڑی، اُڑی ہواؤں کے سنگ تھی اس بات سے قطع نظر کہ گھر کا بجٹ مسلسل خسارے میں جا رہا تھا۔ حاشر کو اب دو، دو جگہ ڈیوٹی کرنا پڑتی اور ساتھ، ساتھ اوور ٹائم بھی...... وہ اگرچہ بہت تھک جاتا، نیند کا رسیا اب نیند کی کمی کا شکار ہو رہا تھا لیکن...... بچوں کا مستقبل ہر بات پر حاوی تھا۔ اسکولوں میں پڑھایا جانے والا مختلف غیر ملکی یونیورسٹیوں کا سلیبس بہت ٹف ہوتا ہے، ٹیوشن ویسے بھی اب بہت لازمی اور ضروری ہو گئی ہے لیکن مہنگے اور بڑے اسکولوں کے

کورسز صرف متعلقہ اسکولوں کا اسٹاف ہی پڑھا سکتا ہے چنانچہ مطلوبہ ٹیچرز اول تو بہ مشکل رضامند ہوتے، دوسرا اُن کی منہ مانگی ٹیوشن فیس سن کر ہاتھ خود بخود اٹھ جاتے...... کانوں کی طرف...... مگر مجبوری اور زمانے کے دیگر تقاضوں کے ساتھ ایک یہ بھی تقاضا......

''تم خود پڑھی لکھی ہو، بچوں کو خود گھر پر پڑھا بھی نہیں سکتی ہو۔'' امی جو پہلے ہی اسکول کی آسمان کو چھوتی ہوئی فیس سن کر اچھی خاصی جز بز تھیں کہ اوپر سے چودہ طبق روشن کرتی فی بچہ ٹیوشن فیس پھر ٹیوٹر کا گھر شہر کے دوسرے کنارے، رکشے میں بچوں کو بھیجنے کو دل نہیں چاہتا تھا اور حاشر کو فرصت نہیں تھی پھر عین ٹیوٹر کا بتایا ہوا ٹائم قاری صاحب کا تھا قاری صاحب بھی اس کے علاوہ کسی دوسرے وقت... فی الحال دستیاب نہ ہو سکتے تھے چنانچہ فریحہ کی پریشانی سوا تھی۔

''میں کیسے پڑھا سکتی ہوں امی......؟''

''کیوں، کیوں نہیں پڑھا سکتی ہو پوری چودہ جماعتیں پڑھی ہوئی ہو پھر ابتدائی کلاسوں کے بچوں کو سبق دینا بھلا کون سا مشکل کام ہے؟''

''اتنا ٹف سلیبس ہے امی کہ میرا آدھا ادھورا اسمپل سا بی اے تو پہلے صفحے پر ہی اٹک جائے گا پھر مجھے کہاں فرصت ہے گھر کے کاموں سے...... دوسرے یہ میرے پاس ٹک کر بیٹھتے بھی تو نہیں ہیں۔ سب لوگ بچوں کو ٹیوشنز پڑھاتے ہیں تو ہی پوزیشنز آتی ہیں۔''

''اللہ جانے کون سا مقابلے بازی کا دور آ گیا ہے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دُھن میں ہر کوئی اندھا دھند بھاگ رہا ہے اور خود کو ہی تھکا رہا ہے۔ کام کر کر کے خود کو مشین بنا لیا ہے لیکن حاصل حصول پوچھو تو کچھ بھی نہیں۔ حرص و ہوس، لالچ اور طمع ہے کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور برکت ہر چیز سے اٹھ گئی ہے حتیٰ کہ زندگی سے بھی۔ خواہشیں، خواب اور تقاضے بے شمار ہیں اور مقصدِ حیات پوچھو تو معلوم نہیں۔ جب آنے جانے کا مقصد ہی معلوم نہیں تو اس بے مقصد تھکن کا فائدہ؟''

''اُف توبہ...... امی کو تو بس بولنے کا موقع چاہیے۔'' فریحہ نہایت کوفت و بیزاری سے کچن میں چیزوں کی اٹھا پٹخ کر رہی تھی جبکہ امی لاؤنج میں دیوان پر بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھیں اپنے آپ سے ہی کیونکہ بچے تو نہایت انہماک سے ٹی وی پر کارٹون چینل دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا حسبِ صورتِ حال قاری صاحب کی غیر معینہ مدت تک کے لیے چھٹی کروا دی گئی جب تک کہ گھر کے نزدیک کوئی قابل ٹیوٹر نہ مل جائے...... ظاہر ہے اب قاری صاحب کے لیے ٹیوشن کو ملتوی تو نہیں کیا جا سکتا تھا امی اگرچہ مسلسل کانوں کو ہاتھ لگا، لگا کر لاحول ولاقوۃ پڑھتی رہیں اور قیامت کے قریب آنے کی پیش گوئیاں دیتی رہیں۔

''اُف...... پرانے زمانے کے پرانے لوگ۔ ایسے لوگ ہی ہوتے ہیں جو ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اور روشن مستقبل کے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔''

قاری صاحب سے تو کسی وقت بھی سبق لیا جا سکتا ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں یا اور کسی وقت لیکن اب بچوں کے ایگزام قریب تھے چنانچہ ٹیوشن از حد ضروری تھی۔

بچوں کی بھی اور خود فریحہ کی بھی ٹینشن بڑھ گئی تھی ٹینشن بھی اور مصروفیت بھی۔ پیپرز ہونے والے ہیں...... یہ پیپرز کا ڈراوا ہے جو پورا سال بچوں کے پیچھے لگا رہتا ہے لیکن ایگزامز کے دنوں میں تو اللہ کرے کوئی اور گھریلو ٹینشن نہ ہو بچوں سے زیادہ

بچوں کی مائیں بوکھلائی ہوئی ہوتی ہیں اور پورے دل سے چاہتی ہیں کہ بچے بھی لازمی اس بوکھلاہٹ کا شکار ہوں۔

اسکول سے آتے ہی فریحہ بچوں کے بیگ جھپٹ لیتی اور روزانہ کی کارکردگی چیک کرتی...... صرف چند منٹ ہی بچوں کو آرام کرنے کے لیے ملتے پھر ٹیوشن روانہ ہوجاتے وہاں سے شام ڈھلے واپسی ہوتی...... تھکے، تھکے نڈھال بچے آتے ہی سونے کے شدید خواہش مند ہوتے مگر فریحہ ایک بار پھر ان کے سامنے بیگ کھول کر رکھ دیتی اور زبردستی ان کو دیر تک جگائے رکھتی۔

''اس طرح تو یہ اکتاہٹ کا شکار ہوجائیں گے...... پڑھ لیں گے کہیں بھاگے نہیں جارہے۔ تم کیسی جنونی ہورہی ہو فریحہ۔'' امی ٹوکنے سے باز نہ آتیں کہ بچوں کے مرجھائے، کملائے ہوئے تھکے، تھکے چہرے ان کو اداس کردیتے۔

''جنونی ہونا پڑتا ہے امی...... اگر میں ان کی پڑھائی کی فکر نہ کروں تو پڑھ چکے یہ گھر میں اور تو کسی کو فکر ہے نہیں ان کے ابا نے کبھی سنڈے کو بھی ان کے بستے چیک کرنے کی زحمت نہیں کی۔''

''وہ بیچارہ بھی کولہو کا بیل ہوگیا ہے آہ......''

اماں نے یہ دکھ دل ہی دل میں کہا پھر نرمی سے بولیں۔''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تھوڑا سا ٹائم ان کو کھیلنے کے لیے بھی دو بیٹی۔''

''واہ...... کیا خوب کہی آپ نے امی...... کھیلنا ہی اگر ہوتا تو اُدھر گاؤں میں ہی کھیلتے رہتے، ان کی پڑھائی کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کے یہاں اس دڑبے میں بند ہوگئے ہیں اور یہاں بھی ان کو کھیل کود میں لگائے رکھیں اور کھیل کود کے گاؤں واپس۔''

''ان کو کہیں گھمانے پھرانے کے لیے باہر لے جایا کرو'اس طرح تو یہ تنگ پڑجائیں گے جیسے تم ڈنڈا لے کر ان کے پیچھے لگ گئی ہو۔''

نظم

نہ تو چاند مجھ کو چاہیے
نہ ستاروں کی ضرورت ہے
نہیں جھوٹ بولو میرے لیے
مجھے بھی ادراک حقیقت ہے
گر ملے وفا دوستی
پھر دنیا بھی خوب صورت ہے
نہیں بدگمان کسی سے بھی
نہ کسی سے کوئی عداوت ہے
جو ہے تو شکوہ ذرا سا ہے
مجھے اپنے پن کی حسرت ہے

زمر نعیم:اجرہ، لاہور

سمجھنے کی باتیں

ہر لفظ میں مطلب ہوتا ہے اور ہر مطلب میں فرق ہوتا ہے۔

زندگی میں دو چیزیں ٹوٹنے کے لیے ہوتی ہیں۔ سانس اور ساتھ...... ''سانس'' ٹوٹنے سے انسان ایک بار مرتا ہے اور ''ساتھ'' ٹوٹنے سے بار، بار مرتا ہے۔

وقت اور محبت دونوں زندگی میں اہم ہوتے ہیں...... ''وقت'' کسی کا نہیں ہوتا اور ''محبت'' ہر کسی سے نہیں ہوتی۔

نیند اور موت...... ''نیند'' آدھی موت ہے اور ''موت'' مکمل نیند......

وقت اور سمجھ ایک ساتھ خوش قسمت لوگوں کو ملتے ہیں...... ''وقت'' پر اکثر سمجھ نہیں ہوتی اور ''سمجھ'' آنے تک وقت نہیں بچتا۔

''یقین اور دعا''...... دونوں نظر نہیں آتے لیکن ناممکن کو ممکن بنادیتے ہیں۔

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور

''ابھی ان کے امتحان سر پر ہیں امی، ابھی تو کہیں گھومنے پھرنے کا سوچیں بھی مت اور پھر میں ان کی دشمن تھوڑی ہوں ان کے بہترین مستقبل کے لیے ہی تو فکر مند ہوں...... یہ کچھ بن جائیں گے کسی مقام پر پہنچ جائیں تو انہی کے لیے اچھا ہوگا۔''

''بس اللہ کرے ایگزامز کے دنوں میں تو بچے بیمار نہ ہوں۔'' یہ اگرچہ ہر ماں کی طرح فریحہ نے بھی دعا مانگی تھی پھر بھی اریبہ کو ایگزام سے دو دن پہلے بخار ہوگیا ہر تدبیر کر ڈالی مگر بخار کا زور نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ صبح اس کا انگلش کا پیپر تھا اور فریحہ بخار میں کمی کی مسلسل دعائیں مانگ رہی تھی۔

''اس بخار میں تپتی بچی کو اسکول بھیجوگی؟ کچھ تو خدا کا خوف کرو فریحہ۔'' امی کو غصہ آگیا تھا۔

''اس کا انگلش کا پیپر ہے امی۔'' فریحہ کو رونا ہی تو آگیا پورے سال کی محنت، بھاگ دوڑ اور اب عین امتحانوں کے دنوں میں یہ بیمار پڑ گئی۔

''اسے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ۔'' کچھ امی کا لہجہ انتہائی سخت تھا اور کچھ اریبہ کی حالت تشویش ناک سو اس نے بے سدھ ہوتی اریبہ کا یونیفارم اتار دیا۔

☆☆☆

''یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے اور زندگی ایک پرچہ ہے جو مشکل ترین بھی ہے اور لازمی بھی اور ہم پوری زندگی اسے حل کرنے میں ہی گزار دیتے ہیں، کامیابی کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ بھاگ دوڑ کر کے خود کو تھکا دیتے ہیں کہیں فیل نہ ہو جائیں، کہیں ناکام نہ ہو جائیں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائیں ہماری حیثیت کم تر نہ ہو جائے، ہماری شہرت کو زوال نہ آجائے، ہمارا حال بہتر ہو، ہمارا مستقبل بہترین ہونا چاہیے سب سے بہترین اور اس بہترین کے چکر میں ہم ہر حربہ آزماتے ہیں، جائز بھی اور ناجائز بھی ہر ٹوٹکا کرتے ہیں حلال بھی اور حرام بھی۔ راتوں کو سونا چھوڑ دیتے ہیں دن کا سکون تیاگ دیتے ہیں کامیابی کے حصول کے لیے۔ اور زندگی بھر یہ جنگ لڑتے لڑتے بالآخر قبر کی مٹی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ ہمیں اُس امتحان کی فکر ہی نہیں ہے۔ جس کے لیے ہمیں اِس امتحان گاہ میں بھیجا گیا ہے اور جس کا نتیجہ روزِ محشر سنایا جائے گا کسی کو دائیں ہاتھ میں، کسی کو بائیں ہاتھ میں...... وہ امتحان جس میں پاسنگ مارکس لے کر پاس ہونے کی بھی ہمیں جستجو نہیں ہے جس میں فیل ہونے کا ہمیں خوف ہی نہیں ہے۔ دنیاوی کامیابیوں کے بنڈل، اسناد، سرٹیفکیٹس، شیلڈز، تمغے، ناموری کی چوٹیاں، ریکارڈ، کامیابیوں کے سہرے، انمٹ نقوش اور سنہرے حروف میں لکھا گیا نام جو صدیوں لکھا رہے گا...... کیا یہی اصل کامیابی ہے؟ کیا دنیا کے مشکل ترین امتحان میں پاس ہونے کے بعد بھی ہم لوگ کامیاب قرار دیے جائیں گے؟ بے شمار تگ و دو، ان تھک محنت، سرتوڑ کوشش اور تھکن آمیز شفقت کے عوض ہمیں بغیر حساب کتاب پاس کر دیا جائے گا کیا؟''

یہ ایک پُر سکون صبح تھی۔ بچوں کے اسکول جاچکنے کے بعد والی صبح کام والی بھی آج جلدی اپنا کام ختم کر کے جاچکی تھی، امی لاؤنج میں ٹی وی کھول کر بیٹھی تھیں۔ روٹین کے کاموں سے فراغت کے بعد فریحہ بھی وہیں آکر بیٹھ گئی کسی اسلامی چینل پر ایک معروف مذہبی اسکالر کا پُر اثر بیان جاری تھا۔

ویسے تو یہ ایک روٹین کی صبح تھی حسبِ معمول صورتِ حال......بس غیر معمولی وہ آنسو تھے جو فریحہ کی آنکھوں سے جاری تھے اور مسلسل دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے اور امی ریموٹ ہاتھ میں پکڑے حق دق اسی کو دیکھ رہی تھیں جو آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوبی جارہی تھی ندامت کے آنسو، خوف کے آنسو...... غفلت کے آنسو اور آنکھ کا پانی گناہوں کو دھو دیتا ہے اور آنکھ کا پانی یقیناً سچی گواہی دے گا۔



بخشش کا در کھلا

حمیرا نوشین

''امی خدا کے لیے اپنے حال پر رحم کریں، کیوں خواہ مخواہ گناہ گار ہوتی ہیں۔ اس مقدس اور بخشش والے مہینے میں کیوں اپنے گناہوں کی گٹھری کو بھاری کر رہی ہیں۔ یہ نماز، روزہ، تہجد کے نفل، تسبیحات سب بیکار ہیں، کوئی فائدہ نہیں ہوگا ذکر و اذکار اور عبادات کا اگر آپ روزے کی حالت میں اسی طرح دوسروں کی غیبت سنتی اور کرتی رہیں۔''

''اے لڑکی خبردار! کیا اول فول بکے جا رہی ہے زبان کو لگام دے۔ ماں کے ساتھ زبان درازی کیا تجھے جنت میں لے جائے گی؟'' اس سے قبل کہ میں کچھ اور بولتی ... امی نے ہاتھ اٹھا کر غصے سے مجھے خاموش کرانا چاہا لیکن میں نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ اب میں خاموش نہیں

رہوں گی چاہے مجھے ان سے کتنی بھی صلواتیں سننے کو ملیں اگر جوتے کھانے پڑے تو وہ بھی خوشی سے کھالوں گی مگر اپنی ماں کی اس عادت کو ختم کر کے رہوں گی۔

آج پھر امی اور راشدہ خالہ (پڑوسن) سر جوڑے بیٹھی تھیں اور موضوع وہی خاص الخاص تھا...... پورے محلے کی رپورٹ راشدہ خالہ کے پاس ہوتی تھی جسے وہ بارہ مسالے لگا کر پیش کرتیں اور امی بھی ان کی زبان کے خوب چٹخارے لیتیں۔

''نادرہ کی بہو کا سناؤ، کیسی ہے...... سنا ہے بڑا دان لے کر آئی ہے۔'' امی جوڑوں کے درد کی وجہ سے محلے میں کم ہی آتی جاتی تھیں اس لیے ان سے ہی سب رپورٹ لے لیتی تھیں۔

''کیا پوچھتی ہو نادرہ کی بہو کا...... ساس کی کنجوسی تو محلے میں مشہور تھی۔ بہو ساس سے بھی سوا سیر نکلی...... مجال ہے جو کبھی جھوٹے منہ چائے پانی کا پوچھ لے...... نادرہ نے ایک دن بہو کو میرے لیے چائے لانے کو کہا اور ساتھ ہی آنکھ کے اشارے سے منع بھی کر دیا میں دیکھ تو چکی تھی مگر صبر کیے بیٹھی رہی، گھنٹا گزر گیا مگر چائے آنی تھی اور نہ آئی اس دن سے میں نے تو اس کے ہاں جانا ہی چھوڑ دیا۔'' انہوں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''اچھا کیا تم نے...... ایسی عورت سے کیا ملنا جس کو اخلاق کا پتا نہ مہمان نوازی کا...... مجھے دیکھ لو تمہاری شکل دیکھتے ہی رافعہ کو آواز دیتی ہوں اور وہ بھی جو کچھ گھر میں ہوتا ہے لا کے تمہارے سامنے ڈھیر کر دیتی ہے۔'' امی نے اپنی تعریف کے ساتھ احسان بھی جتلا دیا اور راشدہ خالہ گردن ہلانے لگیں۔

''فریدہ کی بیٹی کا تمہیں کچھ پتا چلا؟'' وہ امی کے قریب ہو کر سرگوشی میں بولیں۔

امی نے نفی میں سر ہلایا اور متجسس ہو کر اُن سے اس بابت پوچھنے لگیں۔

''ہائے کیسا زمانہ آگیا دیدوں کا پانی ڈھل گیا، ماں، باپ کی عزت کا جنازہ نکال کر اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہوگئی۔'' راشدہ خالہ نے ہاتھ رگڑے اور میرے پورے وجود پہ لرزہ طاری ہوگیا میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

''خالہ...... گوشت آپ کی مرغوب غذا ہے، آج میں آپ کو افطاری میں مرے ہوئے جانور کا گوشت پکا کر بھیجوں گی۔'' کپڑے پریس کرنا چھوڑ کر میں ان کے پاس آبیٹھی اور میری بات سن کر ان کو پتنگے لگ گئے۔

''شہناز تمہاری بیٹی کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا...... یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہے۔'' ان کے ماتھے کی تیوریاں چڑھ گئیں اور امی مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگیں۔

''کیوں...... میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی ہے جو آپ برا مان گئیں۔ مرے ہوئے جانور کا گوشت آپ کو اچھا نہیں لگتا تو پھر آپ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کیسے کھائیں گی؟ یہ جو آپ اتنی دیر سے سر جوڑے دوسروں کی غیبت کر رہی ہیں تو اس کا تو انجام یہی ہے ناں کیا آپ نے وہ حدیث پاک نہیں سنی۔

''ایک دوسرے کی غیبت مت کرو کیونکہ یہ ایسا برا عمل ہے جیسے اپنے مردار بھائی کا گوشت کھانا۔'' میں نے صاف بات منہ پر کہہ ڈالی۔

''شہناز...... ذرا اپنی بیٹی کو سمجھاؤ، میرے منہ نہ لگے حد ہوگئی۔ بڑے چھوٹے سے بات کرنے کی تمیز ہی نہیں رہی...... ماں اتنی خوش اخلاق، ملنسار اور بیٹی اتنی ہی منہ پھٹ اور بد اخلاق...... آئندہ میں نہیں آنے کی اس گھر میں......'' وہ اپنی چادر سنبھالتی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ امی ان کو روکتی رہ گئیں مگر وہ مجھے بکتی جھکتی گھر کے دروازے سے باہر نکل گئیں۔ اس کے بعد امی نے مجھے وہ بے نقط سنائیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

''اس گھر میں کسی کا آنا تجھے برداشت نہیں ہوتا، میں جوڑوں کی مریض اس گھر میں اکیلی پڑی سڑتی رہوں کوئی دو گھڑی کو میرے پاس آکر بیٹھ جائے تو اسے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیتی ہے۔ تف ہے ایسی

اولاد پر جسے نہ ماں کا خیال نہ پڑوسیوں سے حسنِ سلوک کا پتا۔'' امی سناتی رہیں اور میں کان لپیٹے سنتی رہی...... اس دن کے بعد سے انہوں نے مجھ سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ میں نے بھی انہیں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ راشدہ خالہ نے بھی اب ہمارے گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ امی کا اب زیادہ تر وقت نماز، تسبیح اور قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے گزرتا جب وہ فارغ لیٹی ہوتیں تو میں کمپیوٹر پر کوئی اصلاحی خطبے کی سی ڈی لگا دیتی اور وہ خاموشی سے سنتی رہتیں۔ اس دن عصر کی نماز پڑھ کر میں افطاری بنا رہی تھی جب امی نے خود مجھ سے بیان کی سی ڈی لگانے کو کہا اور میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

''حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک حدیث میں رسول ﷺ اللہ نے ارشاد فرمایا۔ جس رات معراج میں مجھے اوپر لے جایا گیا تو وہاں میرا گزر ایسے لوگوں پر سے ہوا جو اپنے ناخنوں سے اپنے چہرے نوچ رہے تھے۔ میں نے حضرت جبرائیلؑ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں انہوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی غیبت کیا کرتے تھے، مردہ گوشت کھاتے تھے اور لوگوں کی آبروؤں پر حملے کرتے تھے۔'' مولانا صاحب کا بیان جاری تھا اور میں کن انکھیوں سے امی کو دیکھ رہی تھی ان کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمایاں تھے، میں کچن سے نکل کر ان کے پاس آگئی اور کمپیوٹر کا بٹن آف کر دیا۔

''یہ راشدہ بھی ناں ہر وقت دوسروں کی غیبت کرتی رہتی تھی اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور بات ہی نہیں ہوتی تھی۔'' انہوں نے خود کلامی کی۔

''نہیں امی، آپ ان اکیلی کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں وہ اگر دوسروں کی غیبت کرتی تھیں تو آپ بھی تو ذوق شوق سے سنتی تھیں ناں...... یہ جان لیں غیبت کرنے اور سننے والا دونوں ہی سخت گناہ گار ہیں۔ آپ ان کے اس گناہ میں برابر کی شریک رہی ہیں، نہ آپ دلچسپی اور توجہ سے ان کی باتیں سنتیں اور نہ وہ کسی کی بات یوں آگے پہنچاتیں۔''

''لو کیا اب گھر آئے کسی شخص کی بات بھی نہ سنوں؟'' وہ ناراضی سے بولیں۔

''باتیں سنیں...... ضرور سنیں مگر باتیں کسی اور نوعیت کی بھی تو ہو سکتی ہیں، اپنی ذات کے متعلق بات کریں، اپنے گھر، اپنے بچوں کے بارے میں بات کریں، اپنی خامیوں کا ذکر کریں، دوسروں کی خوبیاں ڈھونڈ کر ان کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ کیا بات کرنے کے لیے غیبت کرنا ضروری ہے؟'' میں نے نرمی سے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''آپ کو وہ واقعہ پتا ہے امی کہ حضور ﷺ کے زمانے میں دو خواتین تھیں جنہوں نے روزہ رکھا اور آپس میں بات چیت کرنے لگیں اور ہوتے، ہوتے باتیں غیبت تک جا پہنچیں۔ تھوڑی دیر گزری تو ایک شخص آپؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ دو خواتین نے روزہ رکھا مگر اب ان کی حالت خراب ہے قریب المرگ ہیں پیاس سے جان نکلی جا رہی ہے حضور ﷺ نے ان کو بلوایا اور حکم دیا کہ ایک بڑا تسلا لے کر آؤ ان میں سے ایک خاتون کو کہا کہ اس میں قے کرو اس نے قے کرنی شروع کی تو وہ پیپ، خون اور گوشت کے لوتھڑوں سے بھر گیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تمہارے ان بہن بھائیوں کا خون، پیپ اور مردہ گوشت ہے جو تم دونوں نے روزے کی حالت میں کھایا تھا افسوس! تم دونوں نے روزے کی حالت میں جائز کھانے سے تو اجتناب کر لیا مگر جو حرام تھا وہ تم نے کھا لیا۔ غیبت کرنے والوں کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔''

میں نے پورا واقعہ امی کے سامنے گوش گزار کیا تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی میں نے انہیں تسلی دی۔

''میری پیاری امی اللہ کو آپ کی ندامت کے یہ آنسو قیمتی موتی سے زیادہ عزیز ہیں اگر آپ سچے دل سے اپنے رب سے معافی مانگ لیں تو اللہ آپ کے سابقہ گناہوں کو معاف فرما دے گا۔'' میں نے انہیں مزید

حوصلہ دیا اور افطاری کے لیے دستر خوان بچھانے لگی۔

☆☆☆

''خالہ کہاں گم ہوگئی ہیں آپ۔ ہمارا گھر تو آپ کے بغیر بالکل ہی سُونا ہوگیا ہے۔'' میں ان کے گھر جا کر راشدہ خالہ سے لپٹ گئی مگر انہوں نے مجھے خود سے جدا کر دیا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''ابھی تک ناراض ہیں مجھ سے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے ان کی گردن میں بازو حمائل کر دیے۔

''اچھا بات سنیں، یہ جو آپ کا لاڈلا پوتا معید جو آپ کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے اگر یہ اپنے آپ کو آگ لگالے تو کیا آپ اسے بچانے کے لیے آگے نہیں بڑھیں گی؟'' میں نے معید کو ان کے سامنے کیا۔

خالہ نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور معید کو اپنے سینے سے لگالیا۔

''اللہ نہ کرے جو میرے بچے کو کچھ ہو۔''

''دیکھا کسی اپنے کی تکلیف کا تصور ہی کتنا سوہانِ روح ہے۔ یہی بات مجھے سخت اذیت میں مبتلا رکھتی تھی۔ آپ اور امی مجھے بے حد عزیز ہیں، آپ کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے ضروری تھا کہ میں آپ کو اس کام سے روکوں جو آپ کو جہنم کی طرف لے جا رہا تھا۔ آپ کے سارے اعمال اکارت جا رہے تھے۔'' میں بڑے نرم لہجے میں بتا رہی تھی کہ انہیں یہ سب کچھ برا نہ لگے۔

''خالہ ہم دوسروں کے عیوب کھوجنے، ڈھونڈنے کے بجائے اپنے گریبان میں کیوں نہیں جھانکتے اگر ہم اپنی برائیوں سے واقف ہو جائیں تو دنیا میں سب لوگ ہمیں اچھے لگنے لگیں گے۔'' یہ بات نہیں تھی کہ امی اور خالہ ان باتوں سے واقف نہیں تھیں۔ واقف تو ضرور تھیں مگر ان پر عمل پیرا نہیں تھیں...... میں نے بھی اپنا مشن جاری رکھا۔

''خالہ کسی کی عیب جوئی کرنا...... کردار کشی کرنا گناہِ کبیرہ ہے آپ کو پتا ہے کہ غیبت کرنے والے کو پل صراط پر چلنے سے روک دیا جائے گا جب تک کہ وہ ان لوگوں سے معافی نہ مانگ لے جن کی اس نے غیبت کی ہے۔''

میری باتوں سے خالہ کے چہرے کا تناؤ کم ہونے لگا تھا اور وہ میری باتوں کو دلچسپی و توجہ سے سننے لگیں اور پھر میری باتوں کے اختتام تک ان کے دل کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔

''میری نیک سیرت بچی تم نے تو ہمیں جہنم کے گڑھے میں.... گرنے سے بچالیا۔ ہم دن میں نیکیاں کرتے ہی کتنی ہیں، قسمت سے جو ایک آدھی نیکی ہو جاتی ہے تو وہ بھی کسی کی برائی کر کے اس کو دے دیتے ہیں۔ سچ کہا تم نے، اپنے عیوب کا استحضار (آگاہی، یاد) اگر ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے تو دنیا میں سب ہی لوگ ہمیں نیک لگیں۔'' وہ جھلملاتی آنکھوں سے بولیں اور میں خوشی سے ان کے گلے لگ گئی۔

''چلیں تو پھر اٹھیں، امی کتنے دنوں سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آج میں نے وعدہ کیا تھا کہ ستائیسویں رات کو ہم سب مل کر اپنے خدا کے حضور اشکبار ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگیں گے۔ نادرہ خالہ ان کی بہو اور محلے کی بیشتر خواتین ہمارے گھر پر جمع ہیں۔ آج کی رات، ہم جیسے گناہ گاروں کے لیے بہترین موقع ہے۔ سبھی خواتین ایک دوسرے سے اپنے کیے کی معافی مانگ لیں گی، اس طرح سب کا پردہ بھی رہ جائے گا۔'' میں نے انہیں سمجھایا۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو، ہم اپنے رب کو خوب راضی کریں گے ندامت کے آنسو بہائیں گے، وہ غفور الرحیم ہے، وہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ یقیناً ہماری سچے دل سے کی گئی توبہ کو وہ قبولیت کی سند ضرور بخشے گا۔'' راشدہ خالہ خوشی سے سرشار لہجے میں بولیں اور چادر اوڑھ کر میرے ساتھ گھر کی جانب قدم بڑھا دیے اور میں ان کے ساتھ چلتی ہوئی سوچ رہی تھی کہ کیا پتا میرا یہ عمل میری بخشش کا باعث بن جائے، یہ تو بے شک میرا رب ہی جانتا ہے۔



موسمِ گل

تسنیم منیر علوی

"ایک بار مسکرادو...... ایک بار مسکرادو......"
ہم ہینڈ فری لگا کے اپنی پسندیدہ غزل سننے میں مصروف تھے کہ اچانک ننھی سدرہ بھاگتی ہوئی داخل ہوئی۔
"دیکھیں...... دیکھیں یہ مجھے تنگ کر رہا ہے وہ مجھے کہتا ہے......" اس کی ہنگامہ آرائی سے موبائل

کہیں دور جا پڑا......اور ہم بستر پر لڑھک سے گئے۔
''بری بات عفی، بہن کو تنگ نہیں کرتے، بہن سے تو پیار کیا جاتا ہے۔'' ہم نے رسانیت سے سمجھایا۔
''دادو یہ مجھے کہتا ہے کہ ٹوٹے دانت والی، تمہارے دانت چوہے لے گئے۔'' وہ روہانسی سی ہوگئی۔
''دیکھو عفی، جب تم سدرہ جتنے ہو گے تو تمہارے دانت بھی ایسے ہی گر جائیں گے۔'' جب ایک چیز ہمارے پاس سے جاتی ہے تو اللہ ہمیں اس سے اچھی چیز انعام میں دے دیتا ہے۔'' پھر وہ دونوں ہم سے لپٹ گئے......سدرہ نے ہمارے ہاتھ پکڑ لیے پھر اچانک ہاتھ کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی۔
''دادو یہ کیا ہے؟'' اس کا اشارہ ہاتھ کی ابھری نسوں کے جال کی طرف تھا۔
''کیا یہ بھی چلی جائیں گی اور اچھی والی اسکن آجائے گی؟'' لاجواب ہونے کی باری تو ہماری ہی بنتی تھی۔ اس معصومانہ سوال نے ہمیں تو بوکھلا دیا۔

☆☆☆

کتنا شوق تھا ارسل کو کہ ہر وقت تک سک سے تیار رہیں، اپنی فٹنس کا پورا خیال رکھیں، اس مقصد کے لیے وہ ٹریڈمل بھی لے آئے تھے۔ ہم صبح شام اس پر طبع آزمائی فرماتے stapper کے پیڈل پر تیز، تیز پیر مارتے، جب سانس پھول جاتی تو جوس کا ایک گلاس نوشِ جاں کرتے۔ مارننگ واک پر تو ارسل بھی ساتھ ہوتے...... ہاتھ میں ہاتھ قدم بہ قدم چلتے کبھی وہ بھاگنا شروع کر دیتے۔ کبھی ہماری خاطر آہستہ روی اختیار کرتے...... وہ پھولی ہوئی سانس میں کہتے۔ ''یار تیز چلو......ابھی تو دوسرا راؤنڈ باقی ہے۔'' اور ہم پھر ایک نئے عزم کے ساتھ جاگنگ میں مصروف ہو جاتے۔
''جانو کل کی پارٹی کے لیے خوب اچھا سا ڈریس اپ ہونا۔ یوں تو ہماری بیگم لاکھوں میں ایک ہیں، کیا بات ہو جو تم وہ والی بلیک ساڑی زیب تن کر لو سچی یار جگنو بھی ٹھہر کے دیکھیں گے بھئی ہمارے خیال میں فراز نے کہیں تمہاری جھلک تو نہیں دیکھ لی تھی۔'' ہم اب اپنی واک ختم کر کے گھر کی جانب جا رہے تھے ارسل کو شاعری سوجھ رہی تھی......انہیں تو قطرے کو سمندر کرنا خوب آتا ہے ہماری اتنی تعریف کرتے کہ اکثر تو ہم چڑ جاتے۔ ہماری زلفوں کی طرف دیکھتے تو کہتے کہ ان گھٹاؤں میں کھو جانے کو جی چاہتا ہے، ہم بھی جواب آں غزل کرتے۔
''روز گرجتے ہو برس جاؤ کسی دن...... بس بھئی اتنا بھی مبالغہ اچھا نہیں...... ہمیں اپنا آپ پتا ہے، ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، شادی کے اتنے سال بیت گئے۔ بچے جوان ہو رہے ہیں آپ کو ہماری اسمارٹنس کی پڑی ہے......آپ جیسی فٹنس تو ہم لا نہیں سکتے......اور یوں بھی تین بچے آپ نے جنم نہیں دیے۔''
''بھئی اتنا غصہ، یہ بھی تمہاری صحت کے لیے نقصان دہ ہے اور پھر دیکھو اس طرح چہرے کی اسکن پر لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ تیوری پر بل آ جاتے ہیں آپ تو ہماری پیاری بیگم ہیں، سراپا قیامت ہیں۔'' اور بڑی دلیری سے بانہوں کے ہالے میں سمیٹ لیا ہم نے کسمسا کر حلقے سے باہر نکلنے کی کوشش کی اور وہ حیا سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر بولے۔
''ایسی قیامت جو حیا سے آتی ہو وہ کسی غریب کی جاں بھی لے سکتی ہے۔''
''دیکھیں کوئی اِدھر ہی آ رہا ہے۔'' ہم نے اپنا دامن چھڑا لیا تو بڑی ادا سے بولے۔
''نہ چھڑا سکو گے دامن......''
''اچھا جناب بڑا پرانا گانا یاد آیا۔'' ہم نے حیرت کا اظہار کیا۔
''آپ کیا جانیں ماضی کے مدھر گیت رشید عطرے اور ماسٹر منظور کی دھنیں ہوش اڑا دیتی تھیں۔ کاگ منڈیروں پر آ بیٹھتے تھے۔'' وہ شاید ماضی میں چلے گئے تھے۔
''چلیں پھر کبھی سنیں گے، پرانے گیت ابھی تو ردا کو ہوم ورک کرانا ہے۔'' ہم نے اپنی رہائی چاہی......

ارسل ہم کو ہمیشہ سے ایک نازک دبلی پتلی سی دوشیزہ کے روپ میں دیکھنا چاہتے۔ ردا کی پیدائش کے بعد سے جسم فربہی کی طرف مائل ہوگیا تھا...... اب آپ خود فیصلہ کریں ایمان سے ایک ہاؤس وائف تین بچوں کی ماں اور پھر بننے سنورنے کے لیے پورا وقت روز صبح اٹھ کر ویٹ کرتے مگر کیا مجال جو ذرا بھی فرق آیا ہو......

ارسل کے کولیگ کے بھائی کی شادی تھی اصرار تھا ریشم کی مرمریں ساڑی پہنو...... پچھلے برس شادی کی سالگرہ پر گفٹ کی تھی۔ اب بلاؤز کہاں آتا مگر جناب...... صاحب بہادر کا اصرار پہلے تو بلاؤز چیک کیا......

''واؤ!'' ہم تو خوشی سے اچھل ہی پڑے۔

''ونڈرفل یہ فٹ آگیا۔''

مارچ کی راتیں بڑی مہک آفرین ہوتی ہیں بہار دستک دے رہی تھی شگوفے سر نکال رہے تھے، موسم اچھا ہو تو سنورنے کا اپنا الگ لطف ہوتا ہے۔ ہم بڑے اہتمام سے تیار ہوئے، کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر تھا۔

''ارے وا، یہ اپسرائی دیوی ہمارے دل میں مہمان بن کے اتر آئی۔'' انہوں نے ریشم کی لہراتی ساڑی کا پلو ایک ہاتھ سے تھام لیا۔ ''تم تو اِک مرمریں مجسمہ لگ رہی ہو میری جان......''

''اچھا، اچھا...... میرے ہینڈسم ہزبینڈ اب زیادہ ترنگ میں نہ آئیں، ہوٹل کی تقریب میں ٹائم کی پابندی ہوتی ہے۔''

''بھئی آج تو تمہاری رقصندہ نگاہوں میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔'' وہ بڑے وجد میں آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

''سنیے شاعری پھر ہوتی رہے گی۔'' ہم نے قدرے تحمل سے کہا۔

''تم تو شعلہ جوالہ، لپکتا، جھپکتا اپنی تابانی کے ساتھ فروزاں ایسے میں ہمارا کیا بنے گا کہیں لوگ جملے نہ کسیں پہلوئے حور میں لنگور۔''

ہم نے آئینے میں دیکھ کر آخری ٹچ دیا خوشبو کے اسپرے سے خود کو بسایا۔

''کس لیے دیکھتی ہو آئینہ...... تم تو خود سے بھی خوب صورت ہو۔'' اور ہم ان کو زبردستی ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئے۔

ہوٹل میں محفل تو جیسے ہمارے لیے ہی سجی تھی۔ ہم دونوں کے انداز میں وقار اور تمکنت عود کر آیا تھا۔ شاید اسی کو غرورِ عشق کا بانکپن کہتے ہیں، ہمیں یوں لگا جیسے ساری محفل ہم ہی سے مخاطب ہے شخصیت میں عجب چمک اور جاذبیت اجاگر ہوگئی۔ سرگوشیاں، سرمستیاں...... وہ ہی مغربی اور مشرقی اقدار کا حسین امتزاج...... بیروں کی گردش کرتی سرویں مختلف مشروبات، نیپکن سے نوک پلک درست کرتی نازک اندام حسینائیں، لب و رخسار کو سنوارتیں ادھیڑ عمر کی خواتین جذبۂ خود نمائی سے سرشار، ہیجان آمیز جوش ہلکورے لے رہا تھا۔ کچھ کے شہد آگیں لب بلوریں گلاسوں سے ٹکراتے تو شرارے پھوٹتے...... ہم ارسل کے ساتھ ہال میں ہاتھ ڈالے فخر سے جھومتے، جھولتے تھوڑا اترائے کچھ لہرا کے کسی کو وِش کی کو گردن کو خم دے کر کسی کو آنکھوں سے مسمار کرتے محفل لوٹ رہے تھے۔ اب ہم دونوں کی چال میں ایک غرور باتوں سے خوشبو آئے جیسی صورتِ حال تھی۔ لوگ بناوٹی نقابوں سے ڈھکے ملنے کے لیے بے تاب، کوئی کارڈز کوئی وزیٹنگ کارڈز کے بہانے قربت کے بہانے مانگے، کوئی، کوئی ارسل کے ساتھ ساتھ ہماری طرف بھی بے باکانہ مسکراہٹ اچھال دیتا...... تب ہی ایک نہایت فٹنگ والے شوخ لباس میں ملبوس، صراحی دار گردن، سچے موتی سے سجی جو سانس کے زیر و بم ہلکورے لے رہی تھی۔ وحشت زدہ حسینہ جو غزالی آنکھوں سے بھی کام لے رہی تھی۔ ''پائن ایپل جوس......'' اور ارسل نے تھینکس کہہ کر بلوریں گلاس کو تھام لیا...... ہم نے دیکھا کہ دونوں کی انگلیاں ملیں اور پھر جدا

ہوگئیں...... ایسے میں ہم نے بھی چپکے سے اپنی کیوٹکس سے سجی مخروطی انگلیوں کا موازنہ کیا...... اونہہ...... یہ ایک نوعمر طرح دار تازہ بہ تازہ نوخیز کلی تھی اور ہم جواں ہوتے بچوں کی ماں...... وہ تو خیر ہوئی، اس کو گل کہہ کر کسی نے آواز دی تو وہ دوسری طرف گھوم گئی...... ارسل جو ابھی تک اس کے جاتے قدموں کے نشاں دیکھ رہے تھے ہم نے آگے بڑھ کر ان کو سحر سے آزاد کیا......

''کیوں ارسل، اب ہمیں چلنا نہیں چاہیے۔ رات زیادہ ہوگئی ہے۔'' ہم نے ایک ادا سے چہار جانب نگاہ دوڑائی میزبان کا تو دور، دور پتا نہیں...... مگر ارسل ابھی تک حشر سامانی لیے حُسن کے جلوے میں گم تھے۔ ہم نے گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا اور اس طلسم کدے سے باہر نکلے کیونکہ ان کو پتھر سا دیکھنا ہمارے لیے آسان نہ تھا...... گزری رات کا فسوں ابھی تک ہمیں گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ وہ تو شکر ہوا...... واپسی پر ارسل خود محفل کے ناز و انداز سے پریشان تھے۔ لاحول پڑھ رہے تھے۔

''توبہ...... کیا طوفانِ بدتمیزی تھی۔ آج کل نوجوان نسل کتنی بے باک ہوگئی ہے......'' پھر ہم سے مخاطب ہوئے۔ ''اس گستاخ لڑکی کو دیکھا تھا نہ جان نہ پہچان خواہ مخواہ فری ہو رہی تھیں محترمہ...... نہ عمر کا خیال، کیسا قابلِ اعتراض حلیہ تھا......'' ہم نے ان کی برہمی پر صد شکر کیا...... ارسل آفس جا چکے تھے اور ہم جاتی سردی کی پہلی دھوپ میں بیٹھے موسم انجوائے کر رہے تھے...... ارسل کا حکم ہے شام کو تیار رہنا، پھولوں کی نمائش ہے یہ نمائش ہر سال سجتی ہے اور ہم لوگ یوں ہی سراپا بہار بنے پھولوں کا استقبال کرتے ہیں۔

بقول عطا شاد، رات پھولوں کی نمائش میں وہ خوش فہم سے لوگ...... آپ تو خواب ہوئے اور ہمیں بیدار کیا...... ارسل کے سنگ رنگ برنگے پھولوں کے تختے سجے دلفریب نظارہ پیش کر رہے تھے...... ہم تو نمائش میں محو تھے ارسل کو کچھ مہ جبینوں نے گھیر رکھا تھا، ہماری نگاہ میں ہوٹل والی تقریب گھوم گئی۔ جب گل اندام پری وش کی گہری آنکھوں پر سجی خم دار پلکوں نے قیامت ڈھادی تھی آج بھی جانے یہ ماہ وشیں کیوں ہوش اڑانے چلی آتی ہیں، بے شک ارسل بہت ہینڈسم اور اسمارٹ ہیں لیکن ان کو عمر نہیں نظر آتی...... ہم بیزار سے ہوگئے جب ہی وہ کافی کا مگ اٹھائے ہماری طرف بڑھے۔

''تم کہاں غائب ہوگئیں...... کچھ لڑکیاں آرٹ گیلری کی ساتھی ہماری مسز سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں......'' ارسل ایسے ہی بالکل اچانک وار کرتے اور...... اور ہمارے ہوائی قلعے لمحوں میں مسمار ہو جاتے۔ ہاں یہ تو ہم بتانا ہی بھول گئے موصوف اب معروف پینٹر بھی ہیں۔ پچھلے سال تصویروں کی نمائش میں ایوارڈ بھی جیت چکے ہیں۔ انہوں نے بڑے غور سے ہمیں اوپر سے نیچے تک دیکھا......

''بھئی پھولوں کے درمیان آپ تو خود کھلتا گلاب لگ رہی ہیں۔ مستیِ غزالہ، شوخیِ قد نگاراں سب آپ کے حسنِ تاباں کے آگے ہیچ ہیں۔'' شاید وہ ہمارا چہرہ پڑھ چکے تھے۔

''ارسل بس رہنے بھی دیں آخر اس قدر قلابے ملا کر آپ کیا جتانا چاہ رہے ہیں۔'' ہم نے تنک کر جواب دیا......

''اچھا چلو اب اس موسم اور ایسے ماحول میں جب ہمارے پہلو میں سمن گلاب کھل رہے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔''

ارسل کی طویل قامتی اور اس پُراعتماد سے... پُرجادوئی شخصیت اور بقول ان کے تمہارا ساتھ...... سب نے مل کر جانِ جہاں بنا دیا تھا۔

اب ہم دونوں ہر جگہ جانِ من و تو ہوتے مگر ارسل جانِ محفل بھی بن جاتے...... اب اس عمر میں آکر ہمیں بھی معلوم ہو چکا تھا کہ عورت کے ناز و ادا اور عشق و

غمزہ کیا ہوتے ہیں...... گو کہ اندر سے ہمیں اپنا آپ کچھ بجتا نہ تھا لیکن ان کی خاطر سجتے بنتے سنورتے اور اپنی اسمارٹنس اور فٹنس کا پورا خیال رکھتے...... لیکن کسی کو کیا خبر...... کہ کل کیا ہو جائے گا...... سب اتنی جلدی ختم ہو جائے گا خواب ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ قدرت ہمارے لیے کچھ اور ہی اسکرپٹ لکھ رہی تھی۔ ایک قیامت کی آندھی آئی سب کچھ خس و خاشاک کر گئی۔ سائرن بجاتی ایمبولینس ہمارے گیٹ پر کھڑی دہاڑ رہی تھی ہمارے سارے ملازم، گارڈ سب گیٹ پر کھڑے تھے پیچھے پولیس وین وارد ہوتی...... اور سب کچھ پل میں ختم ہو گیا''کسی نامراد نے سینے میں گولی اتار دی۔ سنا ہے موقع پر ہی دم توڑ دیا......'' ہمارے سارے خواب بکھر گئے ریزہ، ریزہ ہو گئے خواب تھا جو دیکھا...... اب تو لگتا ہے ہماری بھی عمر کی نقدی کم ہونے کو ہے...... عمر اب کیا جینا...... ننھے پوتے اور پوتیاں ہمارے عمر رسیدہ جھریوں زدہ ہاتھ کو دیکھ کر سوال کر رہے ہیں......

''میری پیاری فیری نے اسپائڈر کا ہوم دیکھا ہے؟'' ہم نے اس سے سوال کیا۔

''یس دادو...... آئی سی یو فیس ویب......'' اس نے حیرت سے بھوری، بھوری آنکھیں جھپکائیں......

''بھئی جب اولڈ ہو جاتے ہیں تو ایسے جال میں انسان بند ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی اسکن لوز ہو جاتی ہے'' ہم نے اس کو مطمئن کرنا چاہا۔ بیٹے صاحب فرما رہے ہیں۔

''ماما آپ نے اپنے آپ کو بالکل چھوڑ دیا ہے۔ ذرا ایکٹو ہوں، پاپا کیسا آپ کو دیکھنا چاہتے تھے پلیز ان کی خاطر...... ان کو کتنی تکلیف ہو گی جب آپ اس طرح رہیں گی۔ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے کہ آپ روزانہ واک کریں...... ٹریڈ مل پر ہی ایکسر سائز کر لیں۔ قریب پارک ہے وہاں چلی جائیں۔ پلیز اس طرح تو نہ کریں...... اگر آپ نے چلنا پھرنا چھوڑ

رشید احمد صدیقی

ممتاز حیدر صاحبہ پرنسپل گرلز کالج علی گڑھ نے رشید صاحب کو خط لکھا کہ گرلز کالج کی میٹنگ کے لیے تاریخ مقرر کر دیں۔ رشید صاحب نے جواب میں لکھا۔

''تاریخ تو لڑکی والوں کی طرف سے مقرر کی جاتی ہے۔ آپ مجھ سے تاریخ کے تعین کا اصرار کر رہی ہیں۔''

مرسلہ: صبا سجاد، دبئی

دیا تو گھٹنوں میں گیپ آ جائے گا۔ آپ کے لیے چلنا بہت ضروری ہے۔'' (ہمیں لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو ہمارے لیے بہت ضروری ہے) ذہن نے ایک انگڑائی لی واقعی کہیں ہم ان پر بوجھ ہی نہ بن جائیں...... اولادوں کے لیے کوئی پرابلم نہ پیدا کریں...... یہ سوچ کر ہم نے دوبارہ ہمت کی اور اپنے ٹوٹے وجود کو جوڑنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے...... اب صراحی دار گردن پر پڑی ان گنت گرہیں تو نہیں کھل سکتیں۔ چہرے کے خدوخال پر پڑا جال جو اَن مٹ نشان چھوڑ گیا۔ کیسے ختم ہو گا اور ہاتھوں پر ابھری رگیں...... اُف خدایا۔ ہم بھی کیا سوچنے لگے۔ ہمیں تو اپنے کو فٹ ہی رکھنا ہے کوئی اس عمر میں مقابلہ حسن میں تو شریک نہیں ہونا۔

شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے، ہم نے جو گرز پہنے اپنے گرد چادر کو لپیٹا اور گھر کے قریب پارک سے مہم جوئی کا آغاز کر دیا...... دورانِ واک ماضی کی دہلیز پر جیسے ہم قدم بہ قدم ساتھ چل رہے تھے...... وہ وقت جب ہاتھ سے پھسل کر کرچی، کرچی ہو جاتا تو اس وقت کتنا یاد آتا ہے مگر افسوس ہم اس وقت کی قدر نہیں کرتے...... ہمیں یاد ہے جب ارسل ہماری

پنہاں تعریفیں کرتے تو ہم کتنے چڑ جاتے تھے، منہ بسور لیتے تھے کہ کیوں اتنا مبالغہ کرتے ہیں مگر اب کوئی تتلی، جگنو، بادل، بارش کی بات کرنے والا نہیں۔

☆☆☆

نہ منزل کا پتا نہ ساحل معلوم...... واک کو جاتے ایک ہفتہ تو ہو چکا ہے مگر یہ سوئی، سوئی راہیں...... ویران ہے میکدہ اور ساغر اداس ہیں مگر یہ اب ضرور فرق پڑا ہے کہ فیلنگ پہلے سے فریش ہوگئی ہے۔

آج ہمارے پاس ذرا وقت تھا سوچا مشین پر پیڈل ہی مارلیں بچے اس وقت اسکول جاتے ہیں...... ابھی ہم نے پیڈل پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ زارا نے ٹوک دیا۔

”ارے ماما اب آپ یہ بھی کریں گی روز واک تو کرتی ہیں۔ کہیں یہ اوور نہ ہوجائے کہ اس عمر میں لینے کے دینے پڑجائیں۔ آپ کی عمر میں مسلز ویک ہوجاتے ہیں۔“ اور بے اختیار گہری سانس لے کر کندھے اچکائے جیسے کہنا چاہ رہی ہو آگیا بڑھاپا اب سدھر جانا چاہیے اور ہم نے اپنے کمرے میں آنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ موسم گل بدل رہا تھا۔ خزاں رخصت ہورہی تھی پارک میں جگہ، جگہ خشک پتوں کے ڈھیر لگنا شروع ہو چکے تھے اور ننگی ٹہنیاں نئے لباس زیب تن کرنے کو بے چین نئی کونپلیں اپنا سر نکال رہی تھیں۔ پارک میں لوگ آج کم تھے شاید یہ موسم کا اثر تھا اکا دکا افراد واک کررہے تھے...... مگر ایک شخص جو بڑی مستقل مزاجی سے ہمیں پہلے دن سے نظر آرہا تھا۔ آج دیکھا کہ اپنی کرولا سے اتر کر اندر ہمارے ساتھ، ساتھ داخل ہوا۔ شاید کہیں دور سے آتا ہے...... لاتعلق سا اکھڑا، اکھڑا سا...... بلیو اینڈ وائٹ ٹریک سوٹ میں ملبوس گہری کھوجتی آنکھیں، کاندھوں پر ایک بیگ ہمیشہ کی طرح لیے تقریباً ہمارے ساتھ، ساتھ چلنے لگا۔ عمر کا تو ہمیں کبھی کسی کی اندازہ نہیں ہوتا کبھی سوچتے تیس پینتس کا ہوگا کہ پھر اس کی تیز رفتاری اور چاق و چوبند ایکسر سائز دیکھ کر ارادہ بدلنا پڑتا اونہہ کوئی پچیس سالہ نوجوان ہے اوہ ہم بھی ناں کس چکر میں پڑ گئے ہماری بلا سے چالیس کا ہو پچیس کا...... ہمیں اپنے راؤنڈ مکمل کرنے چاہئیں مگر یہ کیا آج وہ چوتھے راؤنڈ پر بینچ پر آبیٹھا۔ ہم سامنے سے گزرے تو دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھا...... ہمارے آخری راؤنڈ پر وہ اپنے فلاکس سے منہ لگائے پانی پی رہا تھا۔ اب کی دفعہ جب ہم مقابل ہوئے تو اس نے بڑے معنی خیز انداز سے نگاہیں اٹھائیں اور ہولے سے مسکرایا۔ جواب میں ہم نے بھی ہلکا سا ہونٹوں کو خم دیا۔ گویا اس کی وش کا جواب دیا۔

☆☆☆

دن گزر رہے تھے، نرم گرم آسان و کٹھن، ہم نے سوچا وہ پارک والا اجنبی شخص بھلا ایک ادھیڑ عمر عورت کو دیکھ کر کیوں مسکرا رہا تھا۔ ہم نے آئینے میں اپنا آپ دیکھا، جلد مرجھا کر لٹک گئی تھی آنکھوں کے نیچے پھولے بکٹ ہماری عمر کی چغلی کھا رہے تھے...... آج عرصے کے بعد نائٹ کریم age miracle کا ہولے، ہولے مساج کرتے ہوئے ہم سوچ رہے تھے کہ کیا گیا وقت بھی کبھی لوٹ سکتا ہے...... آج جب ہم واک پر جانے کے لیے تیار ہوئے تو بے اختیار دل نے کہا کہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی میک اپ کٹ کو یوز کرلیں...... پھر کچھ سوچ کر ہلکی سی لپ اسٹک کا ٹچ دیا اور پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔

”دادو جانی آپ کہیں پارٹی میں جارہی ہیں بہت سوئٹ لگ رہی ہیں۔ پنک لپ اسٹک سوٹ کررہی ہے۔“ وہ معصومیت سے بولی۔ ہم گڑبڑا گئے۔

”نہیں بیٹا، ہم تو روز اس وقت جاتے ہیں...... ابھی گئے اور ابھی آئے پھر اپنی فیری سے خوب باتیں کریں گے۔“

پارک میں آج خلافِ معمول خاموشی تھی تناور درخت بھی ساکت تھے، ہوا بھی ہلکی تھی پرندے

شاخوں پر بیٹھے نئی آشیانہ بندی میں مصروف تھے......

"اوہ ہاں آج کل شہر میں امتحان کا سیزن چل رہا ہے اس لیے پلے ایریا خالی ہے......" دور بینچوں پر کچھ پڑھا کو افلاطون ثابت لوگ پوسٹ لیمپ روشن ہوئے بغیر ملگجے ماحول میں آنکھیں کتابوں پر گاڑھے عرق ریزی میں مصروف تھے۔ ہم نے بڑی امید کے ساتھ ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالی...... آج ابھی تک وہ...... ہمارا مطلب اجنبی شخص...... ہاں کل کچھ تھکا ہوا لگ رہا تھا شاید...... اپنے دھیان کو جھٹکا اور اپنے راؤنڈ مکمل کرنے میں مصروف ہوگئے...... چوتھے راؤنڈ پر بے اختیار گیٹ پر نظر اٹھی...... وہ خراماں، خراماں آرہا تھا...... آج وہ... برمودا اور شرٹ میں اور بھی نوخیز لگ رہا تھا پانچویں چکر میں وہ ہمارے ساتھ، ساتھ ٹریک پر تیز قدم چلنے لگا۔ جانے کیوں ہمیں لگا یا شاید ہماری خام خیالی ہی ہو وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر بولتے لب خاموش تھے بھئی کچھ بولو...... بول کہ لب آزاد ہیں۔ ہمارے راؤنڈ پورے ہونے سے پہلے ہی وہ (جانے کیا نام ہوگا) بینچ پر بیٹھ کر شوز کے لیس باندھنے لگا جو کسی وجہ سے کھل گئے تھے۔ جب ہم باہر جانے کے لیے قریب سے گزرے تو پھر وہ ہولے سے مسکرایا۔ اب کی ہم نے تجاہلِ عارفانہ برتا جیسے ہم نے کچھ نہیں دیکھا اور اب واپس جانے کے لیے مڑ گئے تو ایک آواز نے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

"سنیے...... محترمہ......" اور پیچھے آتے قدموں کی آواز قریب محسوس کی...... "میرا مطلب میڈم ذرا ایک بات سنیں......" اب ہم اداکاری چھوڑ کر واپس پلٹ گئے۔

"جی آپ نے کچھ ہم سے کہا؟"

"جی...... جی وہ ہے ناں......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بہ مشکل گویا ہوا۔ "آپ روز اتنی مشقت کیوں کرتی ہیں...... آپ کو تو کسی فٹنس کی ضرورت نہیں...... میرا مطلب آپ تو اتنی اسمارٹ ہیں یہ تو سب محنت ہم جیسے لوگوں کے لیے ہے۔" اس نے اپنے قدرے بڑھے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرا...... اگلا جملہ اس نے آہستگی سے کہا...... ہم تو اس کی بے تکلفی پر ٹپٹا کر رہ گئے۔ "وہ کیا ہے ناں انسان کو اس عمر میں اپنے آپ کو مصروف رکھنا ضروری ہے۔ آپ نے سنا ہوگا حرکت میں برکت ہے۔ (سمجھ میں نہیں آرہا، یہ آپ ہے کہ تم) تو جناب مصروف چل پھر کر ہی رہا جاسکتا ہے اس خزاں زدہ زندگی میں......" اب وہ بڑے اطمینان سے ہمارے ساتھ گیٹ تک آگیا......

"کیا مطلب آپ اپنی اس خوب صورت اور اسمارٹ لُک کو خزاں زدہ عمر سے تشبیہ دے رہی ہیں؟" اس وقت وہ بڑا سوفٹ اسپوکن، بے حد تہذیب وشائستگی سے بات کرنے والا خوش مزاج شخص لگ رہا تھا۔ ہم نے بھی لاجواب ہونا سیکھا نہیں۔

"عمر کا کیا بھروسا اور ہم تو یوں بھی چراغِ سحری ہیں کب جلے کب بجھے...... کچھ پتا نہیں، اس لیے چلتے رہنا چاہیے۔" وہ کچھ بے کل ہوا سامنے اس کی کرولا نے ہارن دیا وہ تیزی سے اس جانب لپکا......

"اچھا پھر ملیں گے۔" "چلتے، چلتے...... ہم نے دیکھا اس کا باوردی ڈرائیور اس کے لیے دروازہ کھول رہا تھا۔

"ہاں تو بیگم ارسل زماں...... آپ تو اس عمر میں بھی کسی کو بلکہ کسی نوجوان کو متوجہ کرسکتی ہیں۔" ہم نے ایک تفاخر سے دل میں حفیظ جالندھری کو گنگنایا۔ "ابھی تو میں جوان ہوں......" اچانک بادل زور سے گرجے اور بجلی کی چمک نے ماحول کو روشن کردیا اور ہم نے واقعی اپنی عمر کی پروا نہ کرتے ہوئے دوڑ لگادی...... جب گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو سب حیران پریشان برآمدے میں کھڑے تھے۔

"آپ کو معلوم تھا کہ آج بادل ہیں اتنا حبس ہے، کسی وقت بھی بارش ہوچکی ہے اگر ایک دن کا

ناغہ ہوجاتا تو آپ کی فٹنیس یا اسمارٹنس پر کوئی فرق نہیں پڑتا...... اگر آپ اس دوڑ بھاگ میں کہیں سلپ ہوجاتیں تو؟ اس عمر میں فریکچر ہوجاتا......'' ہم نے اس لن ترانی کا کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا' اپنے گیلے جوتے باہر چھوڑے...... بارش تو تھوڑی دیر میں تھم گئی مگر اچانک ہی اندر کا موسم خوشگوار ہوگیا...... لگا ملال کا موسم جانے کتنا پیچھے رہ گیا...... ہم نے جوانوں کی طرح ہینڈ فری لگایا اور افتخار عارف کو سننے لگے۔

''بدل گئے تو بدلنے پر اتنی حیرت کیا ہے !''

آج ہمیں لگ رہا ہے جیسے کسی دیرینہ دوست ہمدم سے ملنے چلے ہیں۔ بڑے اہتمام سے تیار ہوئے دل نے کہا آج موبائل بھی ساتھ لے جانا چاہیے ذرا زیادہ اچھا اثر پڑے گا اور بڑے طمطراق سے سوئے منزل چلے۔

''اوہ......'' آج گیٹ پر وہ پہلے سے سراپا مشتاق بنا کھڑا تھا ہم اس کے قریب ہوئے ہم نے دیکھا وہ سنہرے روئیں والے سفید بازو میں لگی گھڑی کو تک رہا ہے...... ہمیں دیکھتے ہی مخصوص مسکان اس کے لبوں پر آئی پھر پھسل گئی۔

''میڈم آج آپ اتنا لیٹ......؟''

''موسم کے تیور دیکھ کر ذرا احتیاط لازم تھی۔'' ہم نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''تو آپ ڈرتی بھی ہیں۔'' پھر ہمارے سراپا پہ نظر ڈالی۔ ''لگتا تو نہیں کہ آپ کو کسی کا ڈر بھی ہوگا موسم...... یا کوئی اور......'' اس کے معنی خیز چہرے پر خوشیوں کا عکس تھا۔ ہم نے پھولی ہوئی سانس کو قابو میں رکھتے ہوئے اس کی بات سے صاف دامن بچالیا...... پھر ہلکی سی سرزنش کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور بے پروائی سے کان میں ہینڈ فری لگا لیا...... اس نے قدرے حیرت سے ہماری طرف دیکھا...... پھر کندھے اچکائے...... کہ بہ زبان حال یہ کہہ رہا ہو...... کہ کیا بات ہوئی...... بالکل ہی نظر انداز......(یعنی ہم سے کوئی بات نہ کرو ہم مصروف ہیں......) مگر شاید اب وہ بے باک ہوچلا تھا۔ جب ہی اس نے آگے بڑھ کر ہمارے ہاتھ سے فون کھینچ لیا وہ ''یہ فاؤل ہے......'' (ہم ہیں بے تاب اور وہ بیزار یا الہٰی یہ ماجرا کیا ہے) اب ہم کو اس کے اس جملے پر واقعی ایک نمبر کا غصہ آگیا۔

''کیوں مسٹر...... یہاں آپ ہم سے کوئی گیم کررہے ہیں...... یہ فاؤل وغیرہ سے آپ کا کیا مطلب ہے......؟'' وہ کچھ شرمسار سا ہوگیا۔

''وہ میرا یہ مطلب نہ تھا آج مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنا تھیں اور یوں بھی آج آپ پورے بیس منٹ لیٹ آئی تھیں پھر آپ نے آتے ہی موبائل...... میرا مطلب میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' وہ لاچاری سے بولا۔ اب ہمیں بھی ترس آگیا۔

''ہاں...... تو آپ بولیں...... کون روکتا ہے...... آپ کو......'' ہم نے بے پروائی سے کندھے اچکائے...... ''آپ باتیں کریں ہم ہمہ تن گوش ہیں۔''

''وہ کیا ہے ناں...... مجھے پتا نہیں کہنا چاہیے یا نہیں...... کہیں آپ میری بے تکلفی مائنڈ ہی نہ کرجائیں۔'' لہجے میں کافی بے بسی تھی۔

''ڈونٹ وری بوائے...... ہمارے پاس مائنڈ ہی نہیں...... اس لیے برا یا اچھا کیسا......؟'' ہم نے اپنی بوکھلاہٹ پر کافی حد تک قابو پالیا تھا اور سرخوشی سے مست ہوئے جارہے تھے۔ جانے...... یہ کیا کہنے والا ہے...... پھر کہہ کیوں نہیں دیتا' جانے کیوں اتنی دیر لگا رہا ہے...... یہ اتنا اپ سیٹ کیوں لگ رہا ہے۔ بڑا گھاگ لگتا ہے۔ چہرے سے کچھ نہیں عیاں ہورہا کہ ماجرا کیا ہے' ہم سے عمر میں تو کافی کم لگ رہا ہے لیکن اس کو ہماری عمر تو یقیناً نظر آرہی ہوگی...... اب کہہ بھی چکے...... وہ خاموش ہمارے سنگ سنگ چلتا رہا پھر اچانک ہی ہمارا ہاتھ پکڑ

لیا...... ہم تو جیسے ہراساں ہو گئے۔

''یہ کیا حرکت ہے چھوڑیں ہمارا ہاتھ۔'' (اب شاید وہ رومانی ہیرو کی طرح کہے...... یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے تو نہیں پکڑا) ہمیں راہ چلتے بڑا عجیب لگ رہا تھا......

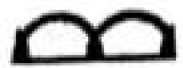
''وہ یہ بات ہے کہ آپ بہت اچھی ہیں...... بہت خوب صورت، آپ کی چال ڈھال اور بھونرے جیسی بڑی، بڑی کالی آنکھیں سب مجھے بہت اٹریکٹو کرتا ہے......'' ہم گھبرا کر سامنے پڑی بینچ پر بیٹھ کر اپنی سانسوں کو ترتیب دینے کی کوشش کرنے لگے...... وہ بھی ہمارے پہلو میں بیٹھ گیا اور ہمارے گود میں رکھے سرد ہوتے ہاتھوں کو تھام کر بولا۔

''دراصل آپ بالکل مجھے اپنی ماما جیسی لگتی ہیں جن کا ابھی حال ہی میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا...... میں ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان کو بھی آپ کی طرح اپنے کو بنک ٹھنک سے تیار کرنے اور اسمارٹ رہنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بالکل ہو بہو آپ جیسی ہی تھیں آپ کو جب سے دیکھا، لگا ماما میرے اردگرد اطراف میں میرے ساتھ، ساتھ ہیں۔ مجھے اپنی ماما کا پرتو نظر آیا۔'' وہ جانے کیا، کیا کہہ رہا تھا۔ ہمارے تو کان سائیں، سائیں کر رہے تھے آس پاس درخت پیڑ پودے جیسے ہمارا تمسخر اڑا رہے تھے۔ ہوا آہ و بکا کر رہی تھی...... ایک بیوہ ادھیڑ عمر دادی...... کیا سوچ رہی تھی...... ہم شرمسار سے اپنے پر لعنت ملامت کرتے گھر کی جانب چل دیے...وہ بھی آہستہ، آہستہ ہمارے ساتھ چلنے لگا اور اس نے ہولے سے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا...... اب کی ہم نے اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ جب ہم گھر پہنچے تو یہ سمجھ آیا۔ لاکھ جتن کر لیں دائمی زندگی کے لالچ میں عارضی زندگی تباہ نہیں کرنی چاہیے...... آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے اور گھر لوٹ آئے وضو کیا اور اللہ سے رجوع کیا کچھ سکون سا محسوس ہوا۔

آج ذرا ذہن و جسم کو یکسوئی محسوس ہوئی تو نظر اٹھا کر اپنے کمرے کو دیکھا...... مگر لگا اس گھر کے ہر کمرے میں...... تو تم رہتے ہو...... ارسل کی الماری جوں کی توں موجود تھی ان کے بعد ہم نے اس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ہماری تو ساری زندگی اسی کی کتاب میں گزری...... ارسل کو اچھے کپڑوں کا بہت شوق تھا لاتعداد سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ ہم نے سوچا کسی چیرٹی میں ہی دے دینا چاہئیں پھر ان کی درازیں کھولیں۔ گھڑیاں، موبائل، کارڈز، سوکھے پھول، کوٹ پر کھلے اور مرجھا گئے...... ایک رومال سب پوٹلی کی صورت کچھ بندھا ہوا...... ہم نے بے دلی سے کھولا...... ان کا والٹ ایک کارڈ بک جس میں ضروری فون پیغام وغیرہ نوٹ بک بھی تھی...... حادثے والے دن تو لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مارنے کے بعد بھی لوگ نہیں چھوڑتے شقی القلب لوگ تھے، والٹ موبائل رقم تک نہ چھوڑی...... مگر یہ تو یہاں موجود ہے۔ پھر ہم نے پرس میں لگے کارڈز دیکھے تو حیرت سے دیکھتے ہی رہ گئے۔ کارڈز کے ساتھ ایک تصویر بھی ہاتھ میں آکر ٹھہر گئی...... ''گل آفریں......'' ذہن کی اسکرین پر ''گل'' کی حشر سامانی گھوم گئی۔ تصویر کے پیچھے لکھا تھا ''تم جیسا کوئی نہیں ...موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام'' ارسل کی ہینڈ رائٹنگ ہم لاکھوں میں پہچان سکتے تھے...... ہمیں لگا سر پر آسمان آپڑے گا...... تو کیا ارسل نے ساری عمر ہمارے سامنے اداکاری کی بقول شیکسپئر دنیا ایک اسٹیج ہے جہاں ہر فرد اپنی اداکاری کر کے رخصت ہو جائے گا۔

پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ...... کسی اسٹیج ڈرامے کا آغاز یاد آیا تو ستم گر کا ستم بھی یاد آیا...... آنکھوں سے پردہ تو اٹھ گیا تھا...... مگر بہت دیر کے بعد، بہت دیر...... زندگی میری تھی بس اس نے کی۔

بھری بہار میں اب کے عجب پھول کھلے
نہ اپنے زخم ہی مہکے نہ دل کے چاک سلے



شمع ہدایت

اختر شجاعت

خشیتِ الٰہی

اے اللہ تمام حمد و ثنا تیرے لیے ہے...... اے اللہ تو وہ ہے کہ جس کی رحمت اس کے غضب سے آگے چلتی ہے اور تو وہ ہے کہ جس کی عطائیں فیض و عطا کے روک لینے سے زیادہ ہیں۔ اے اللہ! تو نے مجھ پر وہ احسانات کیے ہیں جن کے شکر سے میں عاجز ہوں اگر تیری نعمتیں تمام نہ ہوتیں اور تیرے احسانات نہ ہوتے تو میں اپنے نفس کی اصلاح نہ کر سکتا تھا...... تو بے حد بلند مقام والا ہے تو نے فرمایا ہے کہ جو نیکی لے کر آئے گا اسے اس کا اجر ملے گا...... اے رب تیرے ہی لیے حمد و ستائش ہے۔

اے اللہ! حضور اقدس ﷺ پر اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما......

خشیت کے لغوی معنی ڈر اور خوف کے ہیں۔

آج کے دور میں سب سے زیادہ افسوس ناک بات خوفِ الٰہی کی عدم موجودگی ہے...... آج ہم حضور اکرم ﷺ، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، اولیائے اکرام اور دوسرے برگزیدہ لوگوں کی زندگیوں میں خوفِ الٰہی کا مطالعہ کریں تو شرم و ندامت سے پانی، پانی ہو جائیں کہ اس قدر عظیم ہستیاں جن کی زندگی کا ہر، ہر لمحہ یادِ الٰہی اور ذکرِ الٰہی میں گزرا مگر پھر بھی وہ مخلوق کے سامنے خدا کے سب سے بڑے مجرم کی طرح رہتے ہیں اور اپنی حالت کو لوگوں سے چھپا کر رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس ہم کس قدر بد بخت ہیں کہ ہر وقت یادِ الٰہی سے گریز کرتے ہوئے اپنی تمام تر تفریحات میں مشغول ہو کر ذرہ بھر خوفِ الٰہی نہیں رکھتے۔ حالانکہ ہم اس وقت سرکشی، بغاوت اور گناہوں کی دنیا میں مشغول ہیں۔

☆☆☆

اگر ہم آقائے دو جہاں ﷺ کی عبادات اور اطاعت کی کیفیت کا مطالعہ کریں تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں...... آپ ﷺ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہر گناہ سے معصوم پیدا فرمایا...... آپ کی حیاتِ مقدسہ میں خوفِ الٰہی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جب اذان کا وقت قریب آتا تو حضور ﷺ کے چہرۂ پاک کا رنگ متغیر ہو جاتا اور آپ ﷺ سہم جاتے۔ خشیت کا عالم طاری ہو جاتا اور جب نماز کی حالت میں داخل ہوتے تو اس وقت تک ان کی یہ کیفیت ہو جاتی کہ جیسے آپ ﷺ کا دنیا میں کسی سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ آپ ﷺ خوفِ الٰہی کے باعث سب کچھ بھول جاتے۔

آپ ﷺ رات کو اٹھتے تو اللہ کی یاد میں اس قدر روتے کہ اکثر ہچکی بندھ جاتی۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ

''جب کوئی بندہ خوفِ الٰہی سے کانپتا ہے تو اس کے گناہ اس کے بدن سے اس طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے درخت کو ہلانے سے اس کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔''

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ جتنا ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی رحمتوں اور مہربانیوں کا انعام و اکرام ہوتا ہے اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔''

☆☆☆

حضرت یحییٰؑ اللہ کے برگزیدہ نبی...... اپنی ابتدائی زندگی میں جب آپ معصوم بچہ تھے...... پہاڑوں اور جنگلوں میں نکل جاتے اور یادِ الٰہی میں بے حد روتے۔ ایک مرتبہ آپ ایک پہاڑ پر مصروف عبادت تھے اور خوفِ الٰہی سے زار و قطار رو رہے تھے کہ آپ کی والدہ پریشانی کے عالم میں آپ کو تلاش کرتی ہوئی آ پہنچیں...... قدموں کی آہٹ پر حضرت یحییٰؑ نے سجدے سے سر اٹھایا لیکن موت کا اس قدر دھیان تھا کہ آپؑ نے سمجھا شاید ملک الموت روح قبض کرنے کے لیے آ گئے ہیں...... آپؑ اپنی حالت میں فرمانے لگے...... ”اے ملک الموت تھوڑی دیر ٹھہر، میں اپنی والدہ کو مل آؤں وہ میری وجہ سے پریشان ہوں گی۔“

تب آپؑ کی والدہ نے فرمایا...... ”بیٹا میں تمہاری ماں ہی تو ہوں......“ پھر آپ ممتا سے مجبور ہو کر فرمانے لگیں...... ”بیٹا تم اتنا کیوں روتے ہو حالانکہ تم ابھی معصوم بچے ہو اس عمر میں اللہ کے خوف میں اس قدر رونے کی کیا وجہ ہے؟“

تب حضرت یحییٰؑ نے فرمایا...... ”مادرِ گرامی! اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہو جائے اور مجھے مستحقِ عذاب قرار دیتے ہوئے جہنم میں ڈالنے کا فیصلہ فرما دے تو کیا آپ مجھے اس عذابِ الٰہی سے بچالیں گی؟“

ان کی والدہ نے فرمایا۔ ”نہیں بیٹا...... ! میں تو نہیں بچا سکوں گی۔“ تو حضرت یحییٰؑ نے فرمایا...... ”مادرِ محترم اگر اس دن اللہ کے عذاب سے بچانے کی طاقت نہیں ہے تو آج مجھے اللہ کے خوف میں رونے سے کیوں روکتی ہیں؟“

☆☆☆

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں...... ”عام لوگوں کا اللہ سے ڈرنا اتنا ہی کافی ہے کہ ان تمام باتوں سے بچتے رہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا“ پھر فرمایا......

”اے کاش میں بھی ان ہی میں سے ہوتا۔“

ایک حدیث شریف کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا......

”اللہ تعالیٰ ہر غمگین دل کو پسند فرماتا ہے۔“

مراد یہ ہے کہ وہ دل جو آخرت کے خوف اور اللہ کے ڈر کی وجہ سے غمگین و پریشان رہتا ہے۔ وہ اللہ کا پسندیدہ دل ہے...... اس لیے حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں......

”بخدا مومن کے لیے دنیا میں حُزن کے سوا کچھ نہیں ہوتا......“

حضرت امام ابو حنیفہؒ جس طرح فقہ کے امام ہیں اسی طرح تقویٰ اور خوفِ الٰہی میں اپنی مثال آپ ہیں...... آپؒ چالیس سال تک متواتر صبح کی نماز عشا کے وضو سے ادا فرماتے رہے...... پوری رات خوفِ الٰہی میں روتے رہتے...... عذابِ الٰہی کے متعلق کوئی آیت سن لیتے تو بے ہوش ہو جاتے...... اور کبھی اپنی داڑھی پکڑ کر ایک مجرم کی طرح بارگاہِ الٰہی میں معافی مانگتے کہ الٰہی! اپنے مجرم ابو حنیفہ کو معاف کر دے، جب روتے، روتے کہیں آنسو ذرا تھمتے تو فرماتے...... اگر قیامت کے دن... ابو حنیفہ کو معاف کر دیا گیا اور رہا کر دیا گیا تو یہ بڑی حیرت اور تعجب کی بات ہوگی۔

اللہ اکبر...... ! یہ ان عبادت گزار لوگوں کی حالت ہے...... جن کی ساری زندگی اللہ کی فرمانبرداری میں گزری...... لیکن ہم کیا کر رہے ہیں؟ نہ بندگی کا حق ادا کرنے کی پُرخلوص کوشش اور نہ خوفِ خدا کا احساس ہے...... درحقیقت ہم بہت غافل اور گناہ گار لوگ ہیں...... ہماری زندگیاں شیطانی پھندوں میں الجھی ہوئی ہیں...... ہم اپنے نفس کے اسیر ہیں۔

☆☆☆

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے سوال کیا کہ سب سے بڑھ کر بے عیب کون ہے؟ آپ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا جس نے عقل کو اپنا امیر...... صبر کو اپنا قائد، تقویٰ کو اپنا نگہبان، خوفِ خدا کو اپنا جلیس اور موت و مصیبت کو اپنا دوست بنایا......

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا رنگ نماز کا وقت داخل ہوتے ہی متغیر ہوجاتا اور کانپنے لگتے۔ ایسی حالت میں جب آپ سے اس کا سبب پوچھا جاتا تو فرماتے اس امانت کو لوٹانے کا وقت آن پہنچا ہے۔ جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ ''بے شک...... ہم نے امانت پیش کی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈر گئے...... اور آدمی نے اٹھالی۔''

آپ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا...... بھلائی چار چیزوں میں ہے، گویائی، خاموشی، بینائی اور حرکت...... ہر ایسی گفتگو جو ذکرِ خدا سے خالی ہو لغو ہے...... ہر وہ خاموشی جو فکر کے لیے اختیار نہیں کی گئی ہو لہو ہے...... ہر وہ نگاہ جس میں عبرت نہ ہو غفلت ہے اور ہر وہ حرکت جو اللہ کی عبادت کے لیے نہ ہو سستی اور کمزوری ہے۔

حضرت امام زین العابدینؓ کا دل خشیتِ الٰہی سے لبریز رہتا تھا۔ اکثر آپ خوفِ الٰہی سے بے ہوش ہوجاتے تھے۔ ایک بار جب امام زین العابدینؓ حج کے لیے احرام باندھنے کے بعد سواری پر بیٹھے تو خوف سے آپؓ کا رنگ زرد پڑ گیا اور ایسا لرزہ طاری ہوا کہ زبان سے لبیک تک نہ نکل سکا۔ لوگوں نے پوچھا...... آپؓ لبیک کیوں نہیں کہتے......؟ فرمایا...... ڈر لگتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ میں لبیک کہوں اور اُدھر سے جواب ملے لا لبیک...... تیری حاضری قبول نہیں...... لوگوں نے کہا کہ لبیک کہنا تو بہت ضروری ہے۔ لوگوں کے اصرار پر آپؓ نے جیسے ہی لبیک کہا...... بے ہوش ہو کر سواری سے گر پڑے...... اور حج کے دن تک یہی کیفیت طاری رہی...... آپؓ ہر روز ایک ہزار رکعت نوافل ادا کرتے تھے اور وفات تک اس معمول میں فرق نہ آیا...... اس عبادت کے باعث آپ کا لقب زین العابدین پڑا...... کہ کسی بھی حالت میں آپ کے نوافل کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔

عبادت کے وقت خشیتِ الٰہی کا یہ حال تھا کہ حضوری کے وقت سارے بدن میں لرزہ طاری ہوجاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلیمانؓ کا بیان ہے کہ جب آپؓ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو سارے بدن پر لرزہ طاری ہوجاتا...... لوگوں نے پوچھا...... آپؓ کو یہ کیا ہوجاتا ہے؟ آپؓ نے فرمایا...... تم لوگ کیا جانو......؟ میں کس کے حضور میں کھڑا ہوتا ہوں اور کس سے سرگوشی کرتا ہوں۔

☆☆☆

حضرت عمر فاروقؓ جب قرآن کریم کی کوئی آیت سنتے تو خوف سے بے ہوش ہوجاتے تھے۔ ایک دن آپؓ نے ایک تنکا لے کر ہاتھ میں کہا...... ''کاش میں ایک تنکا ہوتا دوسری کوئی قابلِ ذکر چیز نہ ہوتا کاش میری ماں مجھے نہ پیدا کرتی......'' آپؓ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اس قدر روتے تھے کہ آنسوؤں کے مسلسل بہنے کی وجہ سے آپ کے چہرے پر دو سیاہ نشان پڑ گئے تھے......

آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''میں اپنے کسی بھی بندے پر دُہرا خوف دُہرا امن جمع نہیں کرتا...... جو شخص دنیا میں میرے عذاب سے ڈرتا ہے اسے میں آخرت میں عذاب سے بے خوف کردیتا ہوں لیکن جو دنیا میں میرے عذاب سے بے خوف رہ کر رنگ رلیاں مناتا ہے۔ میں اسے آخرت میں خوفزدہ کر کے عذاب نازل کروں گا۔'' اپنی حیات دنیوی میں حضور ﷺ نے دعا فرمائی۔

"اے اللہ! مجھے ایسی آنکھیں عطا فرما جو تیرے خوف سے رونے والی ہوں۔"

☆☆☆

ایک بار ایک عورت حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے پاس حاضر ہوئی اور اپنا ایک مسئلہ دریافت کیا کہ میں اپنی چھت پر سوت کات رہی تھی کہ راستے میں خلیفہ کی مشعل کی روشنی پڑی اور میں نے اس روشنی میں تھوڑا سا سوت کات لیا...... اب بتائیں کہ وہ سوت جائز ہے یا ناجائز...... امام صاحب یہ مسئلہ سن کر حیران رہ گئے اور انہوں نے کہا اس کا جواب تو بعد میں دوں گا پہلے آپ خاتون یہ بتائیں کہ آپ کون ہیں؟

اس عورت نے جواب دیا کہ میں بشر حافیؒ کی بہن ہوں۔ امام احمد بن حنبلؒ رو پڑے اور فرمایا...... وہ سوت تمہارے لیے جائز نہیں...... تم حضرت بشر حافیؒ کی بہن ہو جو اہلِ تقویٰ ہیں اور تمہیں اپنے بھائی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے جو مشتبہ کھانے پر اگر ہاتھ بڑھاتے تو ہاتھ بھی ان کی پیروی نہیں کرتا تھا......

حضور اکرم ﷺ نے سات اشخاص کا ذکر کیا جن کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا...... جس دن کہ اس کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے...... گناہ اور نافرمانی کے باعث ڈرتے ہوئے اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا......" اس آنکھ کو آگ نہیں چھوئے گی جو رات کے حصے میں اللہ تعالیٰ کے ڈر سے روئی ہو۔"

حضرت بابا مسعود گنج شکرؒ ایک صالح متقی نوجوان کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ نوجوان ساری زندگی اللہ کی یاد اور اس کے خوف میں روتا رہا بالآخر اس کی حالت ایک سوکھی خشک لکڑی کے مانند ہوگئی اس کی زندگی کا ہر لمحہ یادِ الٰہی میں بسر ہوتا...... وہ

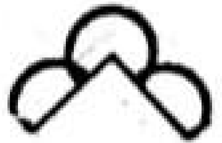
زیادہ تر وقت روتے ہوئے گزارتا اور رات کو جب اپنے حجرے میں جاتا تو ساری رات اپنے گلے میں چھت سے لٹکی ہوئی رسی کا پھندا ڈال کر عبادت و گریہ کرتا رہتا...... جب وہ سجدے میں جاتا تو رو، رو کر عرض کرتا۔'' باری تعالیٰ ! تو مجھے معاف فرمادے کیونکہ میرے گناہ اتنے زیادہ ہیں کہ تو نے اگر ان کا حساب لے لیا تو میں مخلوق کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا......'' بالآخر جب اس کا سفرِ زندگی ختم ہونے لگا تو اس نے اپنی والدہ سے بے حد ادب واحترام سے کہا۔'' امی جان! میرا وقتِ نزع قریب آگیا ہے۔ اب آپ سے جدائی کا وقت آن پہنچا ہے لیکن اس وقت میں آپ سے تین درخواستیں کرتا ہوں، آپ وعدہ کریں کہ آپ انہیں پورا کریں گی...... درحقیقت میں بہت زیادہ گناہ گار ہوں لہٰذا پہلی درخواست تو یہ ہے کہ جب میں مرنے لگوں تو میرے ساتھ پہلا سلوک یہ کرنا کہ میرے گلے میں رسی ڈال کر مجھے گھر کے چاروں طرف گھمانا اور زمین پر گھسیٹتے ہوئے کہنا کہ یہ وہ شخص ہے جو اللہ کی بندگی سے بھاگا...... لوگو! دیکھ لو ایسے نافرمان باغیوں کا حشر اسی طرح ہوتا ہے۔ دوسری درخواست امی جان! میرا جنازہ رات کے وقت اٹھانا تاکہ میرے گناہوں کا پردہ بھی رہے اور دیکھنے والے یہ نہ کہیں کہ اب دیکھیے اس کے ساتھ کیا حشر ہوتا ہے...... تیسری درخواست یہ ہے کہ جب لوگ مجھے دفنا کر واپس آجائیں تو امی جان! خدا کے لیے آپ میری قبر پر کچھ دیر کے لیے ٹھہری رہنا تاکہ منکر نکیر جب آکر مجھے عذاب دینا چاہیں تو شاید آپ کے قدموں کی برکت اور آپ کی ممتا کے سبب مجھ سے درگزر کریں یا میرے عذاب میں کچھ کمی ہو جائے۔''

چنانچہ جب اس نوجوان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی...... تو ماں نے ایفائے عہد کے پیش نظر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے گلے میں رسی ڈالنا چاہی...... اس سے پہلے کہ وہ اس کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر اس کو کھینچتی...... کہ عالمِ غیب سے، رب العزت کی بارگاہ سے آواز آئی...... '' اے نوجوان کی ماں! اپنے ہاتھ روک لے خبردار، تمہیں معلوم نہیں، یہ ہمارے دوستوں اور عاشقوں میں سے ہیں۔ اور اللہ اپنے دوستوں سے کہاں ایسا برتاؤ ہوتا دیکھ سکتا ہے؟ تجھے کیا معلوم کہ اس موت نے اس جوان کی روح کو کتنی بلندیاں عطا کیں ...... تیرے ہاتھ بڑھانے سے قبل اس کی روح کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔''

اس واقعہ کو پڑھ کر ہمارے اندر کہیں یہ احساس جاگتا ہے کہ ہمیں بھی گناہوں پر شرمندگی اور اطاعتِ الٰہی کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے!

اس قدر عبادت گزار...... اطاعت گزار لوگ اپنے انجام سے متعلق اتنے پریشان اور غمگین ہو سکتے ہیں تو ہم بھی تو اپنے اللہ کی بارگاہ میں جواب دہ ہیں۔ ہم کون سی سہانی دنیا میں کھوئے ہوئے چل رہے ہیں...... ہم نے کبھی اس طرف سوچا ہے؟ دنیا کی ہوس میں اس کی لالچ میں ہماری حالت تو کتوں سے بھی بدتر ہے۔ اس لیے کہ ایک کتا... بھی اپنے مالک کا فرمانبردار ہوتا ہے۔ وہ اپنے مالک کے در پر رات بھر جاگتا ہے اور چوکیداری کرتا ہے۔ چاہے اس کا مالک اسے کچھ کھانے پینے کے لیے دے یا نہ دے...... مگر افسوس صد افسوس ہم انسان ہو کر اپنے مالکِ حقیقی کی بندگی اور اس کی بارگاہ کی جواب دہی سے بے خبر ہیں...... ہمارا رب ہمارا خالق ہمارا مالک جاگتا ہے اور ہم رات بھر سکون سے سوتے ہیں......

کس قدر غافل ہیں ہم لوگ...... اللہ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی اطاعت اور خوف کی دولت سے نوازے اور اپنے محبوب ﷺ کا عشق عطا فرمائے، آمین۔



رمضان کا مہینہ بڑی برکتوں کا ہے

شائستہ زریں

رمضان المبارک نعمتِ الٰہی ہے جو ہمیں نیکیوں کی جانب مائل کرتا ہے۔ اس ایک ماہ کی عبادت اور اعمالِ صالح ہمارے لیے ذریعہ نجات ہیں۔

روزہ وہ عبادت ہے جس میں وقت کی پابندی کا احساس نقطۂ کمال پر نظر آتا ہے۔ روزے میں مسلمان کی مصروفیت کی نوعیت یکسر بدل جاتی ہے۔ روزہ... دار پابندیٔ وقت کے ساتھ دینی و دنیوی امور کی ادائیگی میں سرگرم عمل رہتا ہے۔ اس طرح روزے دار وقت کا غلام نہیں بلکہ وقت اس کا غلام بن جاتا ہے جس کو وہ اپنے معبود کی رضامندی میں جس طرح چاہتا ہے صرف کرتا ہے اور تنگیٔ وقت اور تضیع اوقات کا شکوہ اس کی زبان پر کبھی نہیں آتا۔ اس طرح عبادت کی لگن کے ساتھ وقت کی پابندی سے روزہ... دار کی زندگی میں ایک حسن، توازن اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

گویا وقت کی منصفانہ تقسیم کے تحت عبادت اور روزمرہ امور میں توازن روزہ... دار کے لیے انعامِ الٰہی ہے۔ سحری اور افطار کی بھی برکتیں ہیں۔ سحری کھانے والوں کے لیے فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں اور روزہ... دار کو افطار کرانا بھی رمضان المبارک کی عبادت کا ایک جز ہے۔ آج کیا پکائیں؟ روزانہ کا یہ سوال خاتونِ خانہ کو الجھن میں مبتلا کر دیتا ہے ماہِ رمضان میں یہ الجھن کئی گنا بڑھ جاتی ہے کہ سحری، افطار اور رات کے کھانے کے اہتمام میں بیک وقت گھر والوں کی انفرادی پسند اور ذوق کے پیشِ نظر اہتمام کارِ محال ہے لیکن چونکہ ہر گھرانے کی اپنی غذائی عادات اور رسم و رواج ہوتے ہیں اور ان ہی کے مطابق سحری و افطاری کا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن خاتونِ خانہ کی ''آزمائش اور دوگنے ثواب'' کے لیے گاہے گاہے ''غذائی فرمائشوں'' کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔

ان ہی امور کے پیشِ نظر ہم نے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کیا اور سروے کے شرکاء سے معلوم کیا کہ

۱: رمضان میں عبادت کے ساتھ ساتھ روزمرہ کے امور میں کس طرح توازن برقرار رکھتی ہیں؟

۲: عموماً سحری و افطاری میں آپ کیا اہتمام کرتی ہیں؟

فوزیہ زبیری

(سماجی کارکن)

۱: ماشاء اللہ رمضان میں اللہ تعالیٰ وقت میں بہت برکت دے دیتا ہے اور اس وقت کو بہت اچھی طرح سے استعمال کر کے میں اس کا بہت فائدہ اٹھاتی ہوں۔ اکثر لوگ روزہ ہے کہہ کر کافی وقت سو کر گزار دیتے ہیں۔ مجھے اس سوچ پر بہت حیرت ہوتی ہے۔ رمضان میں' میں تہجد کے وقت اٹھ جاتی ہوں جو عبادت کا بہترین وقت ہے۔ سحری کی تیاری میں مجھے پندرہ منٹ لگتے ہیں۔ سحری کے بعد فجر کی



فوزیہ زبیری

نماز سے فارغ ہو کر ایک گھنٹا تلاوت کرتی ہوں اس کے بعد ظہر تک گھریلو اور بیرونی کام نمٹاتی ہوں۔ ظہر کے بعد دو گھنٹے سو جاتی ہوں، عصر کی نماز کے بعد افطار کی تیاری کرتی ہوں اور افطار سے آدھے گھنٹے پہلے ہی تمام کاموں سے فراغت پا کر تسبیح اور دعائیں پڑھتی ہوں کہ یہ وقت اذکار اور دعاؤں کے لیے نہایت موزوں ہے اور مقبول بھی۔

۲: سحری میں انڈا پراٹھا یا کباب اور قیمہ پراٹھا، افطار میں فروٹ چاٹ، پکوڑے، دہی بڑے کبھی کبھی چھولے چاٹ وغیرہ اور مشروب میں دودھ اور روح افزا۔

مہناز حسن زیدی

(ڈائریکٹر انفارمیشن سندھ پریس)

۱: سحری کے جن کاموں میں وقت درکار ہو وہ میں رات ہی کو کر لیتی ہوں مثلاً اگر پراٹھا بنانا ہے تو آٹا رات ہی کو گوندھ کر رکھ دیا۔ کھجلا یا پھینی دودھ میں رات ہی کو بھگو کر رکھ دی۔ فجر کی نماز کے بعد گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا عبادت کرتی ہوں اس کے بعد افطار کے ابتدائی کام نمٹا لیتی ہوں۔ کام والی آجاتی ہے اس سے کام کروا کے دفتر چلی جاتی ہوں دوپہر کو دفتر سے آکر بہ مشکل ایک گھنٹا آرام کر کے گھر کے کام نمٹاتی ہوں اور بازار سے جو بھی خریداری کرنی ہے وہ بھی اسی دوران کرتی ہوں۔ چونکہ عید کی تیاری رمضان ہی میں کرتی ہوں اس لیے عید کی شاپنگ کے لیے بھی یہی وقت موزوں ہے۔ عشا کے بعد کچھ وقت عبادت کے لیے مختص



مہناز حسن زیدی

ہوتا ہے اس کے بعد سحری کے کچھ کام نمٹا کر جلد ہی سو جاتی ہوں۔

۲: میں خود ہلکی اور سادہ سحری کرتی ہوں دودھ ڈبل روٹی، دودھ دلیہ، دہی یا کبھی انڈا ڈبل روٹی اور چائے ضرور پیتی ہوں۔ اپنے میاں کی سحری ان کی مرضی کے مطابق بناتی ہوں قیمہ پراٹھا، یخنی پلاؤ، کھجلا یا پھینی وغیرہ افطار میں روزہ تو میں چائے سے ہی کھولتی ہوں۔ روزہ کھولتے ہی مجھے چائے چاہیے ہوتی ہے فروٹ چاٹ اور کوئی ایک آئٹم روز ہوتا ہے۔

تلی ہوئی چیزیں کم سے کم بناتی ہوں۔

عصمت زیدی
(ٹی وی آرٹسٹ)

۱: سحری کے بعد سکون سے عبادت ہو جاتی ہے۔ رمضان میں عبادت کا بہترین وقت فجر اور عشا



عصمت زیدی

کے بعد ہے اگر دن میں ریکارڈنگ ہوتی ہے تو گھر آ کر میں افطار کے انتظامات میں حصہ لیتی ہوں اور روزمرہ کے بیشتر کام افطار کے بعد نمٹاتی ہوں۔

۲: سحری میں پھینی دودھ، چائے لازمی ہے۔ انڈا پراٹھا یا انڈا سلائس ہوتا ہے اور افطار میں پکوڑے تو روز ہی بنتے ہیں اور ایک دہی کا آئٹم بھی ضرور ہوتا ہے۔ شربت روح افزا اور شدید گرمی میں کیری کا شربت اور ایک پھل خاص طور پر ٹھنڈا تربوز یا خربوزہ۔

عشرت اقبال
(نعت خواں)

۱: اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اللہ نے اپنے حبیب



عشرت اقبال

صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی بنایا اور ہمارا لمحہ لمحہ عبادت سے معمور کیا۔ رمضان کی عبادات میں نماز اور تلاوت کے علاوہ نفلی عبادات اور بہت سے اذکار ہیں۔

گھر کے کام کے دوران اذکار مثلاً، سبحان اللہ، کلمۂ طیبہ، استغفار اور درود شریف میں مشغول رہتی ہوں، اس طرح میں رمضان کے ایک ایک پل سے فیضیاب ہوتی ہوں۔ سال کے گیارہ مہینے تہجد نہیں پڑھتی لیکن رمضان کی با برکت ساعتوں میں اللہ کی توفیق سے میں تہجد پابندی سے پڑھتی ہوں۔ سحری کی تیاری رات ہی کو کر لیتی ہوں۔ تہجد کے بعد بہت تھوڑی سی سحری کھاتی ہوں تاکہ سارا دن مستعد رہوں۔ گھر کے کام کے لیے ماسیاں ہیں لیکن ان کو بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ تمام کام مینج کر کے گھر سے نکلتی ہوں تو روزمرہ کے امور بھی منظم طریقے سے ہو جاتے ہیں اور اذکار کا ورد بھی جاری رہتا ہے یوں توازن برقرار رہتا ہے۔

۲: دہی اور کوئی ایک پھل سحری میں کھا کر عبادت میں مصروف ہو جاتی ہوں۔ گھر والے سادہ

سالن اور روٹی کھاتے ہیں۔ افطار میں دہی بڑے چاٹ اور رات کا کھانا۔

اختر شجاعت

(مصنفہ)

ا: رمضان المبارک کا مہینہ ہم مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ ہم رمضان کے تمام لمحات کو قیمتی بنائیں، یعنی سال بھر کے گناہوں کو بخشوائیں، اپنے دلوں سے غفلت کے حجاب اٹھا کے تقویٰ بیدار کریں۔ درحقیقت رمضان کے روزے تربیت ہے تقویٰ کی، گیارہ مہینے زندگی کے دوسرے معاملات میں الجھے رہے مگر اب یہ مہینہ اپنے مقصدِ تخلیق کی طرف لوٹنے کا ہے یعنی اس مہینے کے تمام تر اوقات ہم عبادت میں رہ کر گزاریں مگر آج ہم دنیاوی معاملات میں، اس قدر الجھ کر رہ گئے ہیں کہ رمضان کے اس ایک مہینے میں بھی اس کا حق نہیں ادا کر پاتے۔ روزہ جو علمِ تقویٰ اختیار کرنے کے لیے عطا کیا گیا ہے۔ اس میں ہم بھوکے پیاسے رہ کر اپنے نفس کو قابو کر سکیں اور اُس بھوک و پیاس کا احساس کر سکیں۔ ہمارے دوسرے مسلمان بہن بھائی اس رزق سے محروم ہیں اور فاقوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں مگر افسوس رمضان تو لگتا ہے صرف کھانے پینے کا مہینہ بن گیا ہے۔ مجھے خود افسوس ہے کہ میں اس عبادت کا حق ادا نہیں کر پاتی جو مجھے کرنی چاہیے کیونکہ زیادہ تر وقت سحری و افطار کے اہتمام میں گزر جاتا ہے۔ گھر کے مرد حضرات افطار پہ خاص اہتمام چاہتے ہیں اور اس میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے اور یہ اس قدر تکلیف دہ صورتِ حال ہے کہ بیان سے باہر ہے اور یہ تصور بھی محال ہے کہ ایک کھجور اور ایک گلاس شربت سے روزہ افطار کر لیا جائے۔

۲: سحری میں پراٹھے دہی یا کوئی سالن اور چائے۔ افطار میں تو بس نہ پوچھیے کہ جو کچھ بھی بنے لگتا ہے کچھ نہ بنا۔ تقریباً ہر گھر کا ایک سا حال ہے میرا گھر بھی اس سے مختلف نہیں سو افطار پر دہی پکوڑے (رمضان کا خاص آئٹم) چھولے، دہی بڑے، فروٹ چاٹ، چکن رولز اور سموسے، بس لگتا ہے کہ رمضان میں کھانے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ صورتِ حال کوئی خوش کُن نہیں تکلیف دہ ہے۔ ہم کو رمضان کو رمضان کی طرح منانا چاہیے مگر افسوس ہم اس کا حق ادا نہیں کر رہے۔

ناز ظفر کاظمی

(معلمہ، ذاکرہ)

ا: اس امر سے تو ہم سب ہی واقف ہیں کہ حالتِ روزہ میں نماز اور تلاوتِ قرآن مجید کے ساتھ ساتھ ہم جتنے بھی اچھے امور انجام دیتے ہیں ان کا شمار بھی عبادت میں ہوتا ہے مثلاً روزے میں نیند بھی عبادت ہے۔ روزہ نام ہے صبر، برداشت اور نفس پر قابو پانے کا اور میری انتہائی کوشش یہی ہوتی ہے کہ روزہ اسی اصول کے



ناز ظفر کاظمی

مطابق گزاروں اور خوش اسلوبی سے روزمرہ کے کاموں میں مصروف رہوں۔ میرے بچے ابھی چھوٹے ہیں ان کے ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنا، ان کو پڑھانا لکھانا۔ گھر والوں کی خدمت کرنا مجھے روزے میں کبھی نہیں کھلتا، نیک نیتی سے ذمے داریاں نبھاتی ہوں تو میرے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔ عبادت سحری کے بعد کرتی ہوں اس کی برکت سے دن بھر غیبی مدد ہوتی ہے معمول کے کام بھی بخوبی نمٹا لیتی ہوں۔ اس طرح حقوق اللہ کے ساتھ، ساتھ حقوق العباد بھی ادا ہو جاتے ہیں اور دین و دنیا میں توازن بھی برقرار رہتا ہے۔

۲: سحری میں کوشش کرتی ہوں کہ ایسی غذا لی جائے جس سے دن بھر بھوک اور پیاس کا احساس نہ ہو اس کے لیے میں سحری میں دہی اور روٹی کھاتی ہوں اور میرے شوہر کباب پراٹھا یا کوئی سالن کھانا پسند کرتے ہیں سوجی کا حلوا یا انڈے کا میٹھا بھی سحری میں ضرور کھاتے ہیں۔ ہاں دن بھر چاق و چوبند رہنے کے لیے چائے بھی بہت ضروری ہے افطار میں تلی ہوئی چیزیں بہت کم رکھتی ہوں۔ آلو کے پکوڑے بہت مختصر تعداد میں روز بنتے ہیں فروٹ چاٹ، چھولے، اور جام شیریں یا روح افزا کے ساتھ لیموں کا شربت ضرور ہوتا ہے کہ اس سے بہت تسکین ملتی ہے۔ کبھی، کبھی ماش کی دال کے دہی بڑے بھی بنا لیتی ہوں۔

روبینہ ریاض

(بینکر)

۱: ورکنگ وومن ہونے کی وجہ سے رمضان میں مصروفیت اور بڑھ جاتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ثواب سمیٹیں اس لیے عبادت کے لیے سحری کے بعد اور ظہر کے بعد سونے کے بجائے عبادت کو ترجیح دیتی ہوں اور شام کو افطار کی تیاری۔ اس طرح عبادت، گھر اور دفتر سب کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

۲: سحری میں سادہ روٹی سالن، دہی اور کچھ میٹھا

بناتی ہوں۔ افطار میں بازار کی چیزوں کے بجائے گھر میں فروٹ چاٹ، چنا چاٹ روزانہ اور پکوڑے، سموسے آلٹرنیٹ دنوں میں بناتی ہوں۔



روبینہ ریاض

فرزانہ شارق

(ماہر حسن و زیبائش)

۱: حالانکہ رمضان میں کام بڑھ جاتا ہے لیکن چونکہ رمضان بڑی برکتوں والا مہینہ ہے اس لیے اس کی برکت سے اللہ ہمت دے دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے آسانی ہو جاتی ہے اور میں عبادت اور روزمرہ کے امور میں توازن برقرار رکھتی ہوں۔ تلاوتِ کلام پاک کے لیے سب سے بہترین وقت فجر کی نماز کے بعد کا ہے، کچھ دیر سوتی ہوں اٹھنے کے بعد روزمرہ کے امور میں مصروف ہو جاتی ہوں۔ رمضان کے چودہ روزے تک میں شام چھ بجے گھر آجاتی ہوں لیکن پندرھویں روزے کے بعد سے چونکہ پارلر کا کام بڑھ جاتا ہے اس لیے پندرھویں روزے سے چاندرات تک دوپہر تین بجے پارلر جاتی ہوں تو اس سے پہلے ہی افطار اور کھانے کا انتظام و اہتمام کر لیتی ہوں اور اللہ کے کرم سے تمام کام بخوبی نمٹا لیتی ہوں۔



فرزانہ شارق

۲: سحری میں ہمارے یہاں جو رات کو پکاتی ہوں وہی کھانا ہی کھایا جاتا ہے۔ کبھی پھینی بھی بنا لیتی ہوں، بڑے چائے بھی پیتے ہیں مگر بچے نہیں۔ افطار میں دو یا تین چیزیں بنائی جاتی ہیں تلی ہوئی چیز ضرور ہوتی ہے۔ کبھی پکوڑے، کبھی سموسے اور کبھی کباب وغیرہ اس کے ساتھ فروٹ چاٹ، چھولے اور دہی بڑے میں سے ایک چیز بناتی ہوں۔

نزہت جہاں

(ریڈیو اناؤنسر، شاعرہ)

ا: ماہِ رمضان میں دینی و دنیاوی فرائض کے درمیان توازن برقرار رکھنا گو کہ آسان نہیں مگر ناممکن بھی نہیں ذرا سی توجہ اور لگن سے ہم اس میں نہایت خوش اسلوبی سے تناسب اور ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں اور نہ صرف عبادات وادائیگی فرائض کے ذریعے نیکیاں سمیٹ سکتے ہیں بلکہ اپنی گھریلو اور دفتری ذمے داریاں بھی پوری کر سکتے ہیں۔ میں عموماً سحری کر کے سوتی ہوں پھر دس بجے اٹھ کر جس روز ریڈیو کی ڈیوٹی ہوتی ہے، ریڈیو چلی جاتی ہوں ورنہ کچھ وقت لکھنے لکھانے، پڑھنے پڑھانے اور شاعری کے لیے مختص کر دیتی ہوں اور چونکہ میرے شوہر دل، شوگر اور بلڈ پریشر کے مریض ہیں اور روزے نہیں رکھتے لہٰذا ان کا کھانا بناتی ہوں۔ ظہر پڑھ کر تھوڑی دیر آرام کے بعد افطار اور کھانے کی تیاری جو عصر کے وقفے کے علاوہ مغرب تک چلتی ہے۔ افطار کے بعد کچھ وقت گھر والوں کے ساتھ گزرتا ہے عشا کے بعد کچھ دیر آرام کرتی ہوں پھر سحری سے پہلے تک



نزہت جہاں

تلاوت اور تہجد کے لیے خاصا وقت نکل آتا ہے۔ یوں دینی و دنیاوی ذمے داریاں پوری کرنے اور رمضان کی برکات حاصل کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

۲: سحری میں انڈا یا دہی پراٹھا اور کچھ فروٹ اور افطار میں پکوڑے، فروٹ چاٹ اور دودھ کا شربت لازمی ہوتا ہے باقی مختلف چیزیں کبھی چاٹ کبھی دہی بڑے، کبھی رول سموسے اور کبھی کباب، کٹلس کچھ نہ کچھ بنتا ہی رہتا ہے۔

ڈاکٹر جویریہ

(کینیڈا)

ا: رمضان میں کوشش یہی ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارا جائے اور اس معمول کو

قائم رکھنے کے لیے بہت سی اشیائے خورد و نوش پہلے سے تیار کر کے فریز کر لیتی ہوں تاکہ رمضان میں سارا وقت کچن کی نذر نہ ہو جائے۔ گرمیوں کے روزے ویسے بھی طویل ہوتے ہیں۔ جاب سے گھر آنے کے بعد کچھ دیر آرام اور بیشتر وقت عبادت ہی میں گزرتا ہے۔ افطار کی تیاری عموماً عصر کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ اور روزے دار کو افطار کرانا بھی عبادت ہی ہے۔

۲: سحری میں بذاتِ خود ہمیشہ بہت ہلکی کرتی ہوں عموماً میری سحری ایک گلاس اسموتھی۔ (گاڑھا جوس فروٹ یا پھر تھوڑی سی دودھ پھینی، دو سے تین گلاس پانی اور ایک کھانے کا چمچہ دہی پر مشتمل ہوتی ہے گھر والوں کی سحری میں دودھ اور چائے کے علاوہ پراٹھوں کے ساتھ



ڈاکٹر جویریہ

کباب، قیمہ، میٹھا دہی، آملیٹ یا کوئی اور سالن شامل ہوتا ہے۔ افطار میری فیملی میں ہمیشہ سے ہی پُر تکلف ہوتا ہے۔ کریمی فروٹ چاٹ، ہر قسم کے پکوڑے، سموسے، اسپرنگ رولز، شربت روح افزاء اور تازہ پھلوں کا جوس افطار ٹیبل کا لازمی حصہ ہیں جن کے بغیر ہماری افطاری نا مکمل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ روز مختلف ڈشز کا اضافہ ہوتا ہے تاکہ یکسانیت نہ رہے۔ وقتاً فوقتاً چکن ایگ سینڈوچز، wontons, wraps میٹھے دہی بڑے، کٹلس، چنا چاٹ، کباب، پلاؤ، بریانی، روسٹ چکن، bread cones, bread pizza اور میرے دیگر کوکنگ کے تجربات دسترخوان کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ ہاہاہا۔ پچھلے سال سے کوشش کی ہے کہ ایسی چیزیں افطار مینیو کا حصہ بنیں جن میں نہ صرف ذائقہ ہو بلکہ وہ صحت بخش اور غذائیت سے بھرپور بھی ہوں اس لیے تلے ہوئے اسنیکس کی جگہ بیکڈ اسنیکس لیے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

قارئینِ کرام!

آپ نے پڑھا کہ عام دنوں کی بہ نسبت نظام الاوقات میں تبدیلی کے باوجود خواتین کیسے اعتدال کے ساتھ دین و دنیا کا حق ادا کرتی ہیں۔ یقیناً یہ ماہ صیام کی برکتیں ہی ہیں۔ عشرت اقبال نے کیسی پیاری بات کہی کہ ''گھر کے کام کے دوران اذکار مثلاً، سبحان اللہ، کلمۂ طیبہ، استغفار اور درود شریف میں مشغول رہتی ہوں، اس طرح میں رمضان کے ایک، ایک پل سے فیضیاب ہوتی ہوں'' کیا ہی اچھا ہے کہ ماہِ صیام کی مقدس ساعتوں میں ہم بھی اپنا یہ معمول بنالیں۔ سحری و افطار کی تیاری کے دوران بھی اذکار سے اپنے قلب و روح کو منور و معطر کرتے رہیں اور سحری و افطار کی نعمتوں سے لطف اندوز بھی ہوتے رہیں مگر خیال رہے کہ دن بھر نفس پر قابو پانے کے لیے سحری و افطار میں نفس بے قابو نہیں ہونا چاہیے بلکہ عبادت اور روزمرہ کے معمولات میں توازن کے ساتھ ساتھ سحری و افطار میں بھی اعتدال ہو تو کیا ہی اچھی بات ہے۔ اور مختلف کھانوں کی تیاری کے ساتھ ساتھ خوش خلقی، تحمل برداشت، رواداری اقربا پروری اور حسنِ سلوک کا بھی مکمل اہتمام کیا جائے تو اس سے بڑھ کر کہ اس ماہ کے فیضان و برکات اور کیا ہوں گے۔

دعا ہے کہ ہم سب کے با خلوص اہتمام سارا سال جاری و ساری رہیں۔

(الٰہی آمین)

اتنی سی بات

ڈاکٹر زاہدہ پروین

گزشتہ دنوں ایک خاتون میرے پاس اپنی بیٹی کو لے کر آئیں۔ بچی یونیورسٹی کی طالبہ تھی اور لیکوریا کی شکایت کے ساتھ آئی تھی۔ والدہ کا خیال تھا کہ اسی وجہ سے اسے بھوک کم لگتی ہے۔ جسم کمزور ہوتا جارہا ہے اور کمر میں درد ہوتا ہے۔ میں نے ان ماں، بیٹی کو صرف آدھا گھنٹا دیا اور جب وہ جانے لگیں تو بغیر کسی دوائی کے بھی بہت مطمئن تھیں۔ انہیں دوائی کی ضرورت نہیں تھی۔ بے شمار خواتین اس شکایت کے ساتھ بہت سے بے بنیاد خدشات پالے ہوئے ہیں۔ جو باتیں ان ماں، بیٹی کو سمجھائیں وہ آپ کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ واضح رہے کہ آج کا یہ مضمون غیر شادی شدہ خواتین میں لیکوریا کی شکایت کے متعلق ہے۔

انسانی جسم ایک انتہائی پیچیدہ مشین ہے۔ اس میں ہزار ہا پرزے بے شمار کام انجام دے رہے ہیں انہی میں سے ایک اہم قسم غدود (glands) کی ہے جو جسم کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ غدود مختلف کیمیائی اجزا harmones/ enzymes پیدا کرتے ہیں جو اپنا مخصوص کام سر انجام دیتے ہیں۔ مثلاً ہمارے دماغ میں pituatory gland ہے جسے master gland بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ باقی جسم کے اہم غدود کی فعالیت پر اثر انداز ہوتا ہے، اس کے علاوہ آنکھوں کے بیرونی اطراف میں آنسو پیدا کرنے والے غدود ہیں (tear glands) جب ہم دکھی یا غمگین ہوتے ہیں تو دماغ ان غدود کو پیغام دیتا ہے کہ آنسو پیدا کرو۔ اسی طرح منہ میں لعاب پیدا کرنے والے غدود ہیں (salivary glands) عام حالات میں بھی یہ لعاب پیدا کرتے رہتے ہیں تاکہ ہمارا منہ اور حلق خشک نہ ہو مگر جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو منہ میں چبانے کی وجہ سے ان کو تحریک ملتی ہے اور یہ زیادہ مقدار میں لعاب (تھوک) پیدا کرتے ہیں۔ یہ قدرت کا نظام ہے، اس تھوک میں ایسے enzymes موجود ہوتے ہیں جو خوراک کو ہضم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ”منہ میں پانی بھر آنا۔“ یہ محاورہ آپ نے یقیناً سن رکھا ہوگا یہ بھی دراصل ہمارے salivary glands کا ہی کمال ہے۔ جب اشتہا انگیز کھانا سامنے نظر آئے یا اس کی خوشبو آئے، حتیٰ کہ ہم لذیذ کھانے کا تصور بھی کریں تو یہ غدود زیادہ مقدار میں لعاب پیدا کرنا شروع کردیتے ہیں یعنی ان کے کام کے لیے خوراک کا منہ میں جانا ہی ضروری نہیں.....

اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ کو اپنے جسم کے بارے میں آگاہی ہو۔ بچیوں میں بلوغت (puberty) کی عمر نو سے تیرہ سال ہے، اس دوران وہ بہت سی تبدیلیوں سے گزرتی ہیں، ان جسمانی تبدیلیوں کی بابت انہیں ماؤں اور بڑی بہنوں کو آگاہ کرنا چاہیے۔ قد بھی بڑھتا ہے اور ایام ماہواری کا آغاز ہوتا ہے اور ان سب تبدیلیوں کا محرک بھی ایک غدود ہے جسے بیضہ دانی، انڈا دانی یا ovary کہتے ہیں۔ دو بیضہ دانیاں بچیوں میں ان کی پیدائش کے وقت سے ہی موجود ہوتی ہیں لیکن ان کا کام عموماً نو سال کے بعد ہی شروع ہوتا ہے اور یہ بھی pituatory gland کے زیر اثر ہیں۔ بیضہ دانی

دو اہم ہارمون پیدا کرتی ہیں جنہیں نسواں ہارمون بھی کہا جاتا ہے۔

Estrogen-1

Progesterone-2

یہی estrogen جب ceriv پر اثر پذیر ہوتا ہے تو اس کے غدود سے سفید پانی کا اخراج ہوتا ہے۔ یہی لیکوریا ہے، estrogen کے زیر اثر پانی پتلا ہوتا ہے، بے رنگ یا سفید رنگ کا حامل، بے بو اور بہتا ہے۔ عام طور پر یہ زیادہ شکایت 2 سے 3 دن تک رہتی ہے اور ماہواری شروع ہونے سے تقریباً 2 ہفتے قبل یہ واقعہ ہوتا ہے۔

اب ذکر ہو جائے bartholin glands کا...... یہ بہت حساس غدود ہیں یہ بصارت، سماعت حتیٰ کہ ہماری سوچوں سے بھی متحرک ہو جاتے ہیں۔ ایسی گفتگو، شاعری، موسیقی، تصاویر یا لٹریچر جو شہوانی جذبات کو ابھارے اور جذباتی ہیجان میں مبتلا کرے وہ ان غدود پر ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں اثر پزیر ہوتا ہے۔ ان سے نکلنے والا پانی بھی بے رنگ یا سفید ہوتا ہے مگر لیس دار......

ماؤں سے گزارش ہے کہ وہ بچیوں کو بلوغت کے عمل کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔ انہیں اعتماد دیں، یہ سب افعال نارمل ہیں اگر لیکوریا کی بہت زیادہ شکایت ہو رہی ہے تو ذرا بچی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں ایسا نہ ہو کہ یہ اخراج bartholin glands سے ہو رہا ہو۔ بچی کو اچھا، صاف ستھرا لٹریچر فراہم کریں، قرآن و حدیث کے مطالعے کی طرف راغب کریں۔ شادی شدہ خواتین کنواری بچیوں کے سامنے محتاط گفتگو کریں۔ یوں بھی بچیوں کی دوستی ہم عمروں سے ہی ہونی چاہیے۔

لیجیے جناب بات ختم ہوئی امید ہے بہت سی بہنیں مطمئن ہو گئی ہوں گی اور یہ ضرور سوچیں گی......

بس اتنی سی بات تھی۔

بچوں کی نفسیات

غلطی تو ہر کوئی کرتا ہے، نظر انداز کر دیں

جس قدر ممکن ہو بچے کے غلط کاموں کو نظر انداز کریں اور ایسے بن جائیں جیسے آپ کو پتا ہی نہیں کہ بچے نے کوئی غلط کام کیا ہے تاہم جب بچے کو غلط کام پر پکڑ لیں یا منع کریں تو پھر اپنے اصولی موقف پر جم جائیں اور بچے کے مختلف حربوں کے سامنے اس سے نہ ہٹیں۔

بچے میں خود مختاری پیدا کریں

بچے کے زیادہ سے زیادہ کام اسے کرنے دیں اور خود کم سے کم کریں۔ کپڑے استری کرنا، جوتے پالش کرنا، برتن میز پر لگانا، کھانا کھانا، اپنا بستر خود لگانا اور ایسے ہی مزید کام بچے سے کرائیں۔

آزادی کی خواہش بچے کی جائز ضرورت ہے

بچے کو مناسب حد میں زیادہ سے زیادہ آزادی دیں، اسے اپنی نظروں سے دور رکھیں۔ اس دوران ان تک پیچھے جا کر بار بار چیک نہ کریں اور اگر کرنا ہی ہو تو ایسے طریقے سے کریں کہ بچے کو پتا نہ چلے۔

جوش کے بجائے ہوش سے کام لیں

کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ مواقع پر جوش کے بجائے ہوش سے کام لیں، خصوصاً ماؤں کے لیے اپنے دل کو سنبھالنا اور عقل (دماغ) سے کام لینا ضروری ہے۔

از: نگہت زیدی، بہارہ کہو

(بہنو! ڈاکٹر صاحبہ نے نہایت تفصیل سے مضمون لکھا تھا مگر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ہم مکمل شائع نہیں کر سکتے۔ آج کے اس کیبل کے اور انٹرنیٹ کے دور میں بچیوں کی دوست بن کر انہیں صحت مندانہ چینلز، لٹریچر اور پروگرامز کی طرف راغب کریں کہ یہ بھی آپ کی تربیت کا لازمی جزو ہے)

☆☆☆

شادی میرے شہزادے کی

نزہت جبیں ضیا



ابھی کل کی ہی بات لگتی ہے جب میں نے منہاج کا ایڈمشن اسکول میں کروایا تھا اور منہاج کلاس میں چیئر پر کم بیٹھتا اور ٹیچر کی گودوں میں زیادہ رہتا کیونکہ الحمدللہ بچپن سے ہی کیوٹ تھا۔

اور کل تک ہماری گود میں ہمکنے والا منا سا گڈے جیسا بیٹا آج اتنا بڑا ہو گیا کہ ہمیں اپنی بانہوں میں بھر لیتا ہے۔ منہاج کی منگنی کا احوال تو آپ لوگ پڑھ ہی چکے ہیں۔ اب شادی کا احوال لے کر حاضر ہوئی ہوں۔

شادی کی تاریخ مقرر ہوتے ہی میں اور میری تینوں بیٹیاں طیبہ عبید، صوفیہ مظہر اور جویریہ ضیا ہم چاروں گھن چکر بن کر رہ گئے۔

ساتھ، ساتھ ہم نے اپنی تیاریاں بھی اسٹارٹ کر دی تھیں۔ بیٹیوں کی پسند کے مطابق بھی چیزیں ملنا خاصا دشوار کن مرحلہ تھا۔ تینوں یہ کہتیں کہ ہمارا ایک ہی تو بھائی ہے اور نواسیاں بھی کچھ کم نہیں تھیں ان دونوں کو ہر چیز دلہن مامی کے جیسی چاہیے تھی۔

تقریباً ایک ماہ پہلے سے گھر میں بھانجیاں، بھتیجیاں، جیٹھانیاں، میری امی اور بہنیں...... جمع ہونے لگی تھیں۔

ڈھولک پر گیت گائے جاتے اور بچیاں لڈیاں ڈال رہی تھیں۔ ٹیلرز اور مارکیٹوں کے چکر ہنوز برقرار تھے۔ 22 مارچ کو نکاح کی رسم ادا ہوئی۔ نکاح کی رسم اریبہ کے گھر پر تھی۔ آج منہاج نے کلف کا وائٹ کرتا شلوار پہنا تھا جبکہ اریبہ نے میرون کلر کا جارجٹ کا ہلکے کام کا سوٹ پہنا تھا۔ نکاح کی رسم کے بعد میں نے اریبہ کو وہ دوپٹا اوڑھایا جو میں نے اپنے نکاح کے بعد اوڑھا تھا۔ پھر ہمارے یہاں کالے موتیوں کا گولڈ کا ہار پہنایا جاتا ہے جسے ہم کالی پوت کہتے ہیں۔ میں نے وہ ہار پہنایا۔ اریبہ کی امی نے ریفریشمنٹ کا انتظام کیا تھا۔ ہم نے چھوارے تقسیم کیے۔ اریبہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ماشاء اللہ منہاج بھی بہت پیارا لگ رہا تھا۔ 23 مارچ کو ہم نے اریبہ کے گھر مہندی لے کر جانا تھا اور اسی دن اریبہ نے مایوں بھی بیٹھنا تھا۔ ایک رات پہلے ہمارے گھر پر میری بہنیں، جیٹھانیاں، نند، بھانجیاں، بھتیجیاں اور منہاج کے دوست جمع ہو گئے تھے کیونکہ ہم نے اریبہ کے سارے جوڑے بجائے یہ کہ پیک کرتے ڈمیز پر لگانے تھے۔ ہر سوٹ اور ساڑی کے ساتھ جیولری، چوڑیاں اور چپل، جیولری اور سوٹس ڈمیز پر سیٹ کیے ان ساری ڈمیز کو

لے جانا بھی ایک مسئلہ تھا سو اس کے لیے خاص طور پر ایک الگ سوزوکی کا بندوبست کیا گیا جس نے دو چکر لگائے۔

آج میرے شوہر صاحب نے بلو کاٹن کا کلف والا شلوار قمیص پہنا تھا۔ میں نے بلو جارجٹ کی ملٹی کلر سیکوئنس کی ساڑی پہنی تھی اور ملٹی کلر گارنٹ کا جیولری سیٹ تھا۔ دولہا کی بہنوں اور بھانجیوں کی تیاریاں قابل دید تھیں۔

اریبہ کے مایوں کا انتظام اس کی بڑی بہن نوشین کے گھر کی چھت پر کیا گیا تھا جو ان کے پڑوس میں ہی رہتی ہیں۔ چھت کافی بڑی تھی ایک طرف چھوٹا سا جھولے والا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ پوری چھت کو لائٹوں سے سجایا گیا تھا۔ وہاں پر ہم سب کو پھولوں کے کنگن دیے گئے۔ اریبہ کو رسم کے لیے لایا گیا مایوں کے پیلے اور گرین سوٹ میں میک اپ کے بغیر اریبہ اچھی لگ رہی تھی۔ پھر میں نے اریبہ کی مہندی کی رسم کی اور جویریہ نے اپنی کزنز کے ساتھ مل کر ڈانڈیاں ڈالیں۔

کھانے میں کباب، پراٹھا، بریانی، کچوریاں اور گلاب جامن اور لاسٹ میں کولڈ ڈرنک پیش کی گئی۔ تقریباً 12 بجے ہم گھر واپس آئے..... اگلے دن منہاج کے مایوں کی رسم تھی اور اریبہ کے گھر والوں نے بھی مہندی لے کر آنا تھا۔ ہم نے مایوں کی رسم جونا گڑھ مسلم کھانچی ہال ملیر میں رکھی تھی۔ ہم وقتِ مقررہ سے پہلے پہنچ گئے تھے۔ منہاج اور ضیا دونوں ہی ٹائم کے معاملے میں بہت پنکچوئل ہیں۔

دلہن والوں کو ریسیپشن پر ہم نے ڈیری ملک چاکلیٹ اور پھولوں کی کلیاں پیش کیں۔ آج منہاج نے لائٹ گرین کرتا اور وائٹ شلوار پہنی تھی، کرتے کے گلے پر ڈارک گرین اور لائٹ گرین ایمبرائڈری تھی اسی کی مناسبت سے لائٹ اور ڈارک گرین چنری گلے میں ڈالی تھی۔ منہاج ماشاء اللہ بہت فریش لگ رہا تھا۔ رسم کے لیے جب منہاج ہال میں داخل ہوا تو ساری بہنیں اور بھانجیاں ساتھ تھیں۔ جب دولہا داخل ہوا تو منہاج کے دوستوں نے خوب شور کیا۔ پہلے میں نے منہاج کو پھول پہنا کر مایوں کی رسم کی پھر بہنوں اور دیگر رشتے داروں نے پھول پہنائے اور اس کے بعد اریبہ کی والدہ اور بہنیں اس کی رسم کرنے اسٹیج پر آئیں اس وقت منہاج کے دوستوں نے ڈانس اسٹارٹ کر دیا اور خوب، خوب بھنگڑے ڈالے ساتھ ہی منہاج کو بھی گھسیٹ لیا، عبید کو کھینچ لائے، حتیٰ کہ ضیا کو گھسیٹ کر بھنگڑے میں شامل کر لیا پورے ہال میں ہنگامہ مچ گیا اب

بھلا لڑکیاں کہاں پیچھے رہتیں...... جویریہ بھی اپنی کزنز کے ساتھ میدان میں آ گئی اور ڈانڈیاں ڈالیں تو نتھی اشنہ، ماہا اور ہانیہ کو بھی جوش آ گیا۔ انہوں نے بھی اپنی پسند کے گانے پر ڈانس کیا۔ یہ ہنگامہ یونہی جاری رہتا اگر ضیا کھانا اسٹارٹ نہ کروا دیتے۔

کھانے میں ہم نے حلیم، قیمہ، پراٹھا، دہی بڑے، آلو کی ترکاری، مختلف چٹنیاں، سلاد اور میٹھے میں گلاب جامن رکھا تھا۔ کھانا الحمدللہ بہت مزے دار تھا۔

26 کو گیپ تھا اور 27 مارچ کو شادی تھی سو 26 کو سب نے بیوٹی پارلر کا رخ کیا۔ کیونکہ مہندی تو سب کو ہی لگوانی تھی۔ اس کے ساتھ کسی کے ہیئر کٹنگ ہونی تھی تو کسی نے بال ڈائی کروانے تھے، سارا دن گھر میں بھگدڑ مچی رہی اور سارا دن پارلر کے چکروں میں گزر گیا۔ اسی رات بچوں نے گھر میں رت جگے کا پروگرام بھی رکھا تھا۔

ہماری فیملی کمبائنڈ ہے۔ ضیا کے بڑے دو بھائی بھی ساتھ رہتے ہیں۔ فرسٹ اور گراؤنڈ فلور پر اس رات میں نے اور میری چھوٹی بہن نے مل کر ڈھیر سارے گلگلے بنائے جس پر میرے چھوٹے بہنوئی ڈاکٹر عبداللہ نے ہم دونوں کو پانچ، پانچ سو روپے نیگ دیے پھر تو تمام بچیوں نے شور مچا دیا۔ عبداللہ نے وہاں پر موجود تمام بچیوں میں پیسے تقسیم کیے۔ بچیوں نے ابٹن کھیلنا شروع کیا...... اُف کیا طوفان مچایا کہ اللہ کی پناہ...... میں بھی اس افتاد سے بچ نہ پائی۔ ہمارے گھر کا چھوٹا سا برآمدہ بھینسوں کے باڑے کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ یہ ہلا گلا نمازِ فجر تک جاری رہا فجر کے وقت سب نہا کر نماز پڑھ کر سوئے۔ 27 مارچ کی صبح سے تیاریاں عروج پر تھیں کیونکہ آج میرے شہزادے کی بارات جو تھی۔ ہمیں لگتا تھا جتنی تیاریاں کی جائیں کم ہیں کیونکہ گزشتہ کئی سالوں سے میرا ارمان تھا کہ کب میرا بچہ بڑا ہوگا اور کب میں اس کی دلہن لاؤں......! بہنوں کا وہ لاڈلا اور چہیتا بھائی تو میرا اور ضیا کا قابلِ فخر بیٹا الحمدللہ صرف ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ اس کے دوست، رشتے دار، حتیٰ کے محلے والے تک منہاج کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے...... اللہ پاک میرے بچوں کو سدا سلامت اور شاد و آباد رکھے (آمین) آج بیٹیوں نے بیوٹیشن لڑکی کو گھر پر بلوا لیا تھا۔ میں میک اپ بالکل نہیں کرتی۔ فرسٹ ٹائم منہاج کی منگنی پر کروایا تھا تو اس کے بعد آج پبلک کے بے حد اصرار پر کروا رہی تھی۔ ضیا نے آج لائٹ براؤن کلف والا شلوار قمیص پہنا تھا جس پر اسی کلر

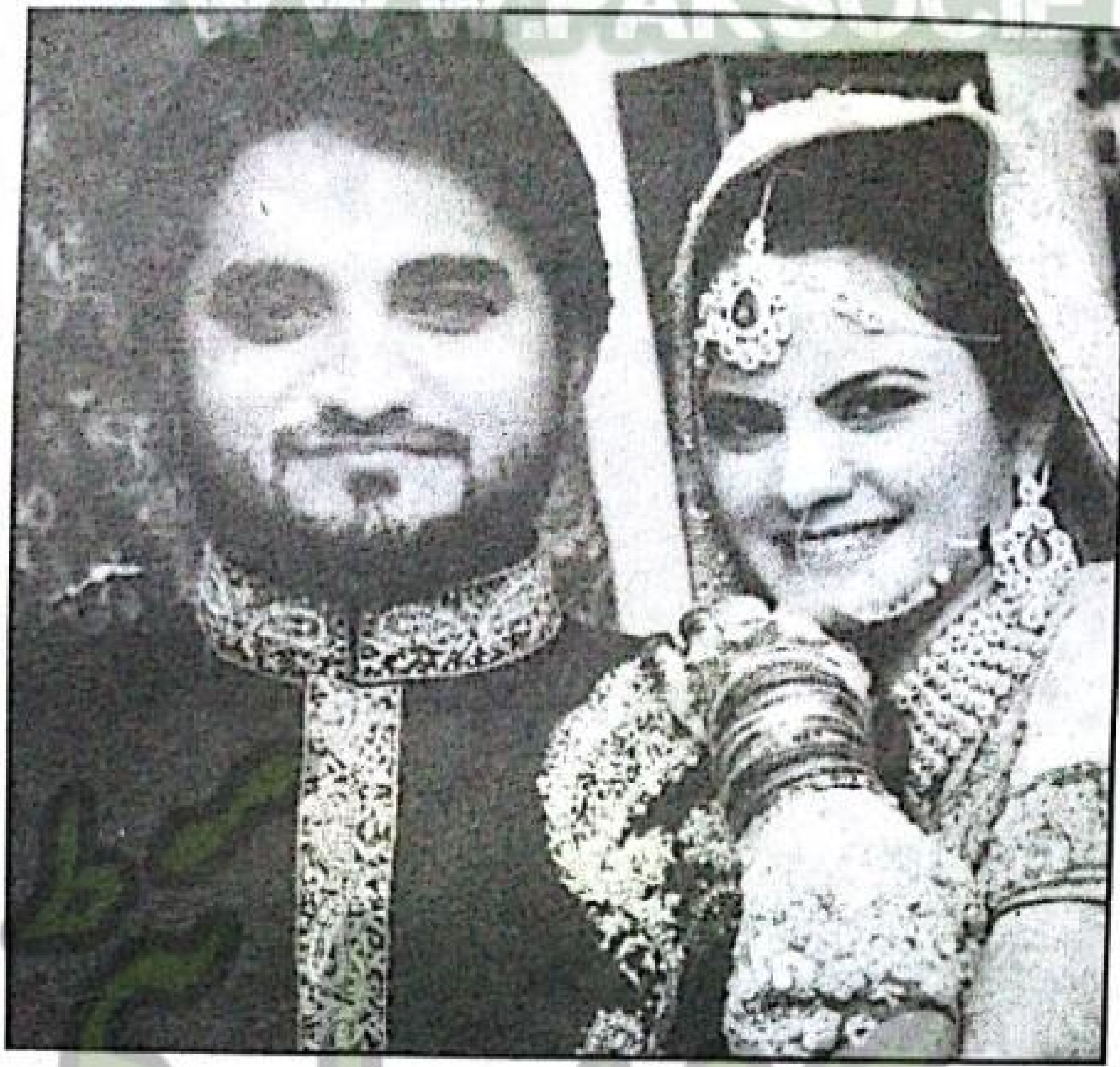
کی ڈارک واسکٹ تھی۔ ضیا آج فریش اور زیادہ ینگ لگ رہے تھے۔ عبید نے گرے اور بلیک شیروانی پاجامے کے ساتھ پہنی تھی اور ہمیشہ کی طرح اسمارٹ لگ رہے تھے۔ میں نے کاپر، مہندی اور وائٹ کامبینیشن کی نیٹ اور بروشیے کی ڈیزائنر ساڑی پہنی تھی۔ سوفٹ میک کے ساتھ کاپر اسٹون کی جیولری میں مجھے اچھا تو لگنا ہی تھا (آہم آہم) طیبہ نے اپنے ولیمے کا لائٹ اور ڈارک پرپل ڈبل اسٹائل بھاری دبکے کے کام کا شرارہ پہنا تھا۔ صوفیہ نے اپنی شادی کا ریڈ اور فان بھاری بنارسی فل اسٹون کے کام والا شرارہ پہنا تھا جویریہ نے انڈین نیٹ اور بنارسی شاکنگ پنک اور گرین کومبینیشن والا لہنگا اور چولی پہنی تھی۔ بڑے سے دوپٹے کو اسٹائل سے سیٹ کیا تھا تینوں بیٹیاں بھاری جیولری اور ماتھا پٹی کے ساتھ میچنگ میک اپ میں بہت حسین لگ رہی تھیں۔ (الحمدللہ) میری شہزادیوں اشنہ اور ہانیہ نے بھی سیم جویریہ کے جیسا شرارہ سلوایا تھا۔ چھوٹے، چھوٹے ٹیکے لگائے میری دونوں شہزادیاں بہت حسین لگ رہی تھیں۔ میرے ننھے شہزادوں ارحم اور صہیب نے اپنے ماموں جانی کے جیسی شیروانیاں، چوڑی دار پاجامے اور گولڈن کھسے پہنے تھے اور بالکل شہزادے لگ رہے تھے (ماشاءاللہ) منہاج جب تیار ہوکر باہر آیا تو بے ساختہ میرے منہ سے ماشاءاللہ نکلا۔ الحمدللہ میرا بیٹا مجھے دنیا کا سب سے حسین دولہا لگ رہا تھا۔ ڈارک مہندی کلر کی سلک کی شیروانی جس پر سلور دبکے اور نگینوں سے گلے، شولڈر اور سلیوز پر نفیس کام کیا گیا تھا۔ آف وائٹ پاجامہ، میچنگ نگینوں سے سجا کھسا، سر پر آف وائٹ اور میرون پگڑی پہنے وہ اپنے دراز قد کے ساتھ واقعی شہزادہ لگ رہا تھا۔ میں نے نظر کی دعا پڑھ کر اس پر دم کیا۔ منہاج کے دونوں تایا، ضیا اور عبید نے مل کر منہاج کو تیار کیا۔ اس موقع پر ہم سب کو مظہر اپنے چھوٹے داماد کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ طیبہ اور صوفیہ نے منہاج کو سرمہ لگایا۔ جب سے شادی اسٹارٹ ہوئی تھی میں روزانہ کچھ نہ کچھ صدقے کے طور پر دے رہی تھی۔ آج بھی گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے صدقات دیے...... ہم نیچے اترے تو منہاج کے دوستوں نے ڈھول والے کو بلوا رکھا تھا۔ بس پھر تو ڈھما، ڈھم، ڈھول بجنے لگا اور منہاج کے دوستوں کو جوش آگیا۔ افسر، سعادت، فہد، نوروز، فرحان، اطہر، فہد، (نگہت غفار کا بیٹا) اطہر...... (میرا بھتیجا) یہ سب بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ منہاج پر نوٹوں کی بارش بھی کر رہے تھے۔ اللہ پاک میرے بچوں کی خوشیاں سلامت رکھے۔ (آمین)

شادی ہال پر اتر کر بھی لڑکوں نے بھنگڑے ڈالے اور اسی طرح اسٹیج تک منہاج کے آگے، آگے بھنگڑے ڈالتے ہوئے پہنچے۔ اریبہ کے گھر والوں نے ہم سب کو بوکے دیے۔ اریبہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ہمیشہ سیدھی سادی رہنے والی تھی۔ ڈل ریڈ اور فان بھاری شرارے میں بھاری میک اپ، جیولری...... ''ماشاءاللہ'' میں نے اسے دیکھ کر کہا۔ فوٹو سیشن ہوا، رسمیں ہوئیں اریبہ کی کزنز اور بہنوں نے منہاج کا ناگرہ اتروا کر بھاری رقم کا مطالبہ کر ڈالا۔ دونوں جانب سے سوال جواب ہونے لگے۔ آخر کار منہاج نے ایک لفافہ ان کو تھما کر اپنا ناگرہ واپس لیا۔ کھانا اسٹارٹ ہوا کھانے میں چکن کڑاہی، بیف بریانی، بروسٹ، سلاد اور ربڑی کھیر تھی ساتھ کولڈ ڈرنک بھی تھی۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ کھانے کے بعد اریبہ کا چھوٹا بھائی احتشام اور اریبہ کی والدہ اسٹیج پر آئیں۔ رسومات کی گئیں۔ منہاج کو گھڑی اور گولڈ رنگ پہنائی...... پھر رخصتی کا مرحلہ آگیا۔ قرآن پاک کے سائے میں اریبہ رخصت ہوکر گاڑی میں آبیٹھی۔ دولہا دلہن کے ساتھ گاڑی میں...... جویریہ اور میں، بیٹھے تھے۔ باقی لوگ دوسری گاڑیوں میں سوار ہوگئے۔ منہاج کے سارے دوست بائیکس پر تھے جو ہماری گاڑی کے آس پاس ہی چل رہے تھے۔

ہم گھر پہنچے تب تک بچیاں گھر پہنچ چکی تھیں اور بھابی کی منتظر تھیں...... گھر میں قدم رکھنے سے پہلے منہاج اور اریبہ پر سے بکروں کا صدقہ دیا گیا پھر تینوں بہنیں اریبہ اور منہاج کو اوپر ہمارے پورشن میں لے گئیں۔ بہنوں نے دروازہ روک کر منہاج کی جیب ہلکی کروائی پھر کھیر کھلانے کی رسم ہوئی۔

دوسرے دن ولیمہ تھا۔ صبح سے ہی خوب ہنگامہ تھا۔

''آج بھی بیوٹیشن گھر پر آئی تھیں۔ سب سے پہلے مجھے تیار ہوکر اریبہ کے پارلر جانا تھا کیونکہ مجھے اریبہ کا چھ گز کا کھڑا دوپٹا سیٹ کرنا تھا کیونکہ پارلر والوں سے یہ دوپٹا سیٹ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں تیار ہوگئی۔ میں نے آج ریڈ، بلو، اور آف وائٹ کومبینیشن کی ڈیزائنر بنارسی آنچل اور بنارسی بلاوز والی ساڑی پہنی تھی۔ میچنگ چوڑیاں اور وہ کندن کا انڈین سیٹ پہنا جو منہاج اور طیبہ کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد خرید کر لائے تھے۔ وہ پہنا تھا۔ ضیا نے ڈارک براؤن ہلکی لائنگ والا تھری پیس سوٹ پہنا تھا جس کے ساتھ فان



شرٹ اور میچنگ ٹائی تھی۔ بڑے داماد عبید نے ڈارک براؤن سوٹ پہنا تھا۔ طیبہ، صوفیہ، جویریہ، اشنہ، ماہا اور ہانیہ ان تمام بچیوں نے ایک جیسے مختلف کلر کے کپڑے پہنے تھے۔ طیبہ نے ریڈ، صوفیہ نے مجینٹا، جویریہ نے فیروزی فل نگینوں کے کام والے جارجٹ کے گاؤن پہنے تھے اندر سلور بنارسی میکسیاں تھیں۔ بھاری سلور نگینوں والی جیولری جھومر کے ساتھ پہنے بالوں کو اسٹائل میں سیٹ کیے سوفٹ میک اپ میں بچیاں اچھی لگ رہی تھیں۔

منہاج نے آج آف وائٹ تھری پیس سوٹ پہنا تھا جس پر پرپل شرٹ تھی اور آف وائٹ ٹائی کے ساتھ بہت پیارا لگ رہا تھا جبکہ اریبہ نے اسی میچنگ کی آف وائٹ کرتی بنارسی پرپل پاجامہ چھ گز کا حیدر آبادی اسٹائل سے سیٹ کیا ہوا دوپٹا جس پر چاروں طرف پاجامے والی ایپلک کے ساتھ فل نگینوں سے کام کیا گیا تھا۔ اوپر سے اوڑھا ہوا دوپٹا بھی اسی کپڑے کا تھا جسے پرپل ٹائی اینڈ ڈائی سے شیڈ دیا گیا تھا اس پر آگے کی طرف ڈبل چوڑی ماتھا پٹی کے ساتھ تھا۔ کرتی کے گلے پر پاجامے کی ایپلک کے ساتھ فل کام تھا سلیوز اور شولڈر پر نگینوں سے بھرا کام تھا جبکہ کرتی کی کلیوں اور دامن کے آگے پیچھے بھی ایپلک کے ساتھ نگینوں سے کام کیا ہوا تھا۔ میچنگ جیولری اور سوفٹ میک میں اریبہ آج بہت پیاری لگ رہی تھی۔

یوں تو میں نے اپنے لکھنے لکھانے کے حوالے سے کچھ دوستوں کو انوائٹ کیا تھا لیکن میری تقریب اس وقت دوچند ہوگئی کہ جب طاہر قریشی بھائی (آنچل) اور محترمہ عذرا رسول باجی (پاکیزہ) نزہت اصغر (دلکش) مع اپنی صاحبزادی کے تشریف لائے۔ عذرا باجی اور نزہت سے کئی بار ملاقات ہو چکی ہے اور ان سے مل کر ہر بار اتنی ہی خوشی ہوتی ہے عذرا باجی دلفریب شخصیت کے ساتھ، ساتھ حسن و اخلاق کا مکمل پیکر ہیں۔ میرے گھر بھی آچکی ہیں، مجھے ان کے آنے سے دلی خوشی ہوئی۔ اس کے علاوہ طاہر بھائی سے میں پہلی بار ملی تھی۔ طاہر بھائی کو جیسا سوچا تھا اس سے کہیں زیادہ ملنسار، شفیق اور پُرخلوص ہیں۔ اللہ پاک ان لوگوں کو سلامت رکھے (آمین) طاہر بھائی اور عذرا باجی نے خاص طور پر دولہا، دلہن، پروگرام کی تعریف کی تو مجھے دلی خوشی ہوئی۔ اس کے علاوہ احمد علی عاقل، اور ایم اے راحت کی صاحبزادی شگفتہ اقبال بھی اپنے بچوں کے ساتھ آئیں۔ نزہت اصغر سے مل کر بھی ہمیشہ دلی خوشی ہوتی ہے۔ دھیمے لہجے میں بات کرتی ہوئی ہمیشہ اپنی، اپنی سی لگتی ہیں۔ دولہا دلہن کے فوٹو سیشن ہوتے رہے مووی بنتی رہی۔

پھر کھانا اسٹارٹ ہوا کھانے میں بیف بریانی، چکن قورمہ، چکن تکہ، چائنیز رائس، چکن چلی، مرچوں کا سالن، بگھارے بیگن، سلاد، رائتہ اور مختلف چٹنیاں تھیں۔ میٹھے میں لب شیریں اور پھر کولڈ ڈرنک الحمدللہ کھانا بہت بہترین تھا۔ ہر شخص نے دل کھول کر تعریف کی۔ کھانے کے بعد رسمیں ہوئیں۔ ضیا نے منہاج اور اریبہ کو گولڈ پلیٹڈ واچز کا سیٹ دیا۔ میں نے اریبہ کو رنگ دی، طیبہ نے گولڈ کا سیٹ، صوفیہ نے گولڈ کا سیٹ، جویریہ نے گولڈ کی رنگ اور آخر میں اشنہ نے اپنی مامی کو گولڈ کی نوز پن گفٹ کی۔

جب جاتے، جاتے مہمانوں نے پروگرام کی کھانے کی ہماری تعریفیں کیں تو ساری تھکن دور ہوگئی۔ اس طرح یہ خوب صورت اور یادگار شادی کی تقاریب اختتام کو پہنچیں۔ آپ تمام دعا کیجیے گا کہ ہمارے گھر کی رونقیں یونہی قائم رہیں۔ (آمین)



بہنوں کی محفل

مدیرہ

✖ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

✖ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

✖ پیاری بہنو! الحمد للہ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ مجھے بہت پرانی، پرانی باتیں یاد رہ جاتی ہیں...... مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرے والد نے مجھ سے کہا تھا۔ ”جب دوسروں کے دکھ اپنے سکھ لگنے لگیں تو یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ ہم دین سے کتنے دور ہو چکے ہیں اور ہمارے دل و دماغ میں منفی مافیا کا سو فی صد قبضہ کیوں ہو چکا ہے؟“ چالیس پینتالیس سال پرانی بات ہے...... آج کتنی عام سی ہو گئی ہے یہ لمحہ فکریہ ہے...... اسی طرح بہت سی پڑھی ہوئی چیزیں میرے ذہن میں چپکی ہوئی ہیں...... میں نے کہیں پڑھا تھا...... ”ایک شخص نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا وہ ایک بہت بڑے کمرے میں ہے، جہاں ایک بڑی سی میز پر طرح، طرح کے نہایت لذیذ کھانے چُنے ہوئے ہیں۔ میز کے اطراف لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہیں مگر کرسیاں میز سے اتنی دور ہیں کہ ان کے ہاتھ میز تک نہیں پہنچ سکتے...... وہ لوگ اپنی کرسیوں سے بھی نہیں اٹھ سکتے۔ ان کے سامنے صرف ایک چمچ ہے جو اتنا لمبا ہے کہ اس سے کھانا نکالا جا سکتا ہے۔ ایک شخص وہ چمچ لے کر کھانا نکال لیتا ہے اور کھانے کی کوشش کرتا ہے مگر ظاہر ہے چونکہ چمچ بہت لمبا ہے وہ اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکتا اور سب اسی طرح بھوکے بیٹھے کھانے کو تکتے رہتے ہیں...... پھر کسی کو خیال آتا ہے کہ وہ اس چمچ سے کھانا نکال کر اپنے سے دور بیٹھے ہوئے شخص کے منہ میں ڈال دیتا ہے اور پھر باری، باری سب لوگ اسی طرح کرتے ہیں اور یوں سب لوگ ایک دوسرے کو کھانا کھلا دیتے ہیں ان کی بھوک مٹ جاتی ہے اور سب خوش ہو جاتے ہیں“۔ پیاری بہنو...... ! یہ خواب دراصل ایک اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اگر مل جل کر کام کیا جائے اور ایک دوسرے کے کام آیا جائے تو بڑی سے بڑی مشکل پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے اور ایک دوسرے کو سکھ پہنچایا جا سکتا ہے...... گویا دائمی مسرت کا حصول ہمارے اپنے بس میں ہے جس کے بعد ہم ایک پُرسکون اور مطمئن زندگی گزار سکتے ہیں...... تو رمضان کی ان مبارک ساعتوں میں ہم سب کو ایسے کام ضرور کرنے ہیں...... جن سے لوگوں میں آسانیاں بانٹ سکیں...... ہے ناں...... !

☆ پیاری بہنو...... ! جیسا کہ آپ جانتی ہیں کہ...... میں ہمیشہ آپ کی تجاویز اور مشوروں پر عمل پیرا ہوتی ہوں...... آپ سب کی یہ خواہش ہے کہ انعامی سلسلے شروع کیے جائیں تو انشاء اللہ آئندہ ماہ سے شروع کر رہے ہیں...... آپ سب کا یہ بھی مشورہ ہے کہ سندیسے کو ختم کر کے دوبارہ بزم پاکیزہ شروع کر دیا جائے...... ٹھیک ہے...... جیسی آپ کی مرضی...... اب بزم پاکیزہ میں ہم ایک بہترین سوال پر انعام بھی دیں گے...... مگر خیال یہ رہے کہ وہ انعامی سوال کسی رسالے سے چوری کر کے نہ بھیجا گیا ہو...... (یوں تو میرے پاس پاکستان میں شائع ہونے والے کم و بیش تمام رسائل بھی آتے ہیں) مگر اس کے ساتھ، ساتھ ہماری بہنیں...... ہمیں فوراً اطلاع دیتی ہیں بلکہ یہاں تک دیتی ہیں کہ کس نے کس کے ناول سے کہاں، کہاں کے صفحات اپنی تحریروں میں شامل کیے ہیں وغیرہ، وغیرہ...... (یہ خیر دوسرا مسئلہ ہے...... اس پر پھر کبھی بات ہو گی)

اب اصل مدعا یہ ہے کہ انشاء اللہ آئندہ ماہ سے بزم پاکیزہ شروع کیا جا رہا ہے...... تو آپ جھٹ پٹ دلچسپ ترین سوالات ارسال کیجیے اپنے مکمل ایڈریس کے ساتھ...... ایک ساتھ ڈھیر سارے سوالات بھی بھیج سکتی ہیں...... پاکیزہ ڈائری میں بھی کسی بھی ایک خوب صورت اور منفرد مراسلے پر بھی انعام دیا جائے گا...... یہ کوئی حکایت بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی خوب صورت نظم بھی...... کوئی دلچسپ لطیفہ بھی...... مگر اس میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہو کہ وہ انعام یافتہ کہلائے...... اسی طرح ہر ماہ ایک انعام...... میں اکثر گنگناتی ہوں میں بہترین شعر بھیجنے والے کے نام ہو گا...... تو...... خوش ہو جائیں اور خوب محنت سے اپنی تحریریں، مراسلات

بھیجیں......انشاء اللہ میں بہت جلد یہ بھی بتاؤں گی......کہ ہم نئی مصنفات کے لیے......کیا کچھ سوچ رہے ہیں......جس سے ان کی مزید حوصلہ افزائی ہو......

اب آیئے اس سے پہلے کہ ہم خطوط کی بزم میں جائیں ہمیشہ کی طرح پہلے ایک بار درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں اور ماہ رمضان میں ہر روز یہ دعا لازمی مانگیں کہ ہم سب کا شمار ان لوگوں میں ہو جن کے روزے قبول کر لیے گئے ہوں، آمین ثم آمین۔ یاالٰہی دونوں جہانوں میں ہم سب کو خیر عطا فرمانا اور اب سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

- مصنفہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی اپنے بیٹے کے پاس ان دنوں سعودی عرب گئی ہوئی ہیں۔(ماشاء اللہ)
- پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا کی ہونہار بیٹی حور عین فیصل نے آل پاکستان IKMC میں 2012ء میں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا اور 2014ء میں سلور میڈل حاصل کیا تھا اور اب سرگودھا ڈسٹرکٹ میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے اور 2015ء کا انٹرنیشنل کینگرو میتھ ایوارڈ حاصل کیا ہے۔ ماشاء اللہ مسلسل تین سال سے ہماری حور عین یہ نمایاں کامیابیاں حاصل کر رہی ہیں۔(بے حد مبارک باد)
- پاکیزہ کی مستقل قاری صوفیہ، کراچی کی پیاری بیٹی سمیعہ اختر نے این ای ڈی آرکیٹیکچر ڈیپارٹمنٹ سے پرائم منسٹر اسکیم کے تحت لیپ ٹاپ حاصل کیا ہے۔(ماشاء اللہ)
- مصنفہ اور ریڈیو پروڈیوسر سیمار ضا ردا، کراچی کو اس ماہ بھی ایک زبردست ایوارڈ ان کی کارکردگی کے حوالے سے دیا گیا ہے۔(ماشاء اللہ)
- شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار شگفتہ شفیق کے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب میں انہیں زبردست داد و تحسین کے ساتھ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔
- شاعرہ، مصنفہ فریدہ جاوید فری، لاہور کا گن پوائنٹ پر موبائل چھین لیا گیا......(افسوس) ان کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ایک ڈائجسٹ کی جانب سے انہیں آٹھواں ایوارڈ ملا ہے۔(واؤ......مبارک باد)
- پاکیزہ کی مستقل قاری فریحہ، کراچی کا گن پوائنٹ پر پرس چھین لیا گیا۔ اس وقت وہ ایک شاپ پر چیزوں کی ادائیگی کر رہی تھیں۔

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

- مصنفہ سیما یاسمین مجتبیٰ، کراچی کے پیروں میں تکلیف ہے۔
- پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ شعیب، سوات علیل ہیں۔
- پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی ہنوز بسترِ علالت پر ہیں۔
- شاعرہ مصنفہ فریدہ جاوید فری، لاہور بیمار ہیں۔
- پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راول پنڈی بیمار ہیں۔
- مصنفہ خالدہ نسیم، لندن کی طبیعت ناساز ہے۔
- مصنفہ رفاقت جاوید، اسلام آباد کے پیروں میں تکلیف ہے۔
- پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ امینہ عندلیب، سلانوالی کو ابھی آپ کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔ اس ماہ بھی انہیں اسپتال جا کر ایڈمٹ ہونا پڑا۔

انتقالِ پُر ملال

- پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ گلشاد نذیر، مری کی بڑی بہن راول پنڈی میں انتقال کر گئیں۔
- مستقل تبصرہ نگار صفیہ بیگم لالہ موسیٰ کی بڑی بہن مغیرہ اصغر بیگ کا انتقال ہو گیا ہے۔

- پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ سمیرا مجاہد، ٹنڈو محمد خان کی دادی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔
- مصنفہ تسنیم منیر علوی، دبئی کی جواں سال بھتیجی، نادیہ علوی سوئمنگ کرتے ہوئے انتقال کر گئیں۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

آیئے اب ایک نظر اپنے کھٹے میٹھے خطوط پر ڈالتے ہیں

شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ ''انجم...... اداریہ زبردست تھا لیکن جب ایک بہت کم عمر بندہ بغیر کسی وجہ کے دل میں ناراضی پال لے تو...... اتنی بڑی عمر کی ہو کر کیسے اس سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ رشتے داریاں مجھے بہت عزیز ہیں لیکن...... انا بھی تو کوئی چیز ہے...... کیا کروں...... آپ سمجھائیں ناں...... (صرف اللہ کی رضا کے لیے کیجیے) نگہت سیما کا ناول اچھا جا رہا ہے...... متاعِ دل کا یہ حصہ خاصا دردناک تھا۔ جیسے کوئی ٹریجڈی فلم چل رہی ہو...... صائمہ قیصر ہاشمی کا افسانہ اسے آزاد کردو کا اینڈ توقع کے خلاف تھا...... حیا بخاری کا مکمل ناول ابرِ رحمت ایک اچھی لو اسٹوری تھی لیکن عام سی تھی۔ رنگ خلش، رفاقت جاوید کے ناول کی آخری قسط بڑی عجلت میں ختم ہو گئی تھی...... اینڈ توقع کے خلاف بھی تھا...... اور اس میں کوئی اچھا سبق بھی نہیں دیا گیا تھا، یہ اچھی زبردستی ہے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں تو تمہیں بھی مجھ سے محبت کرنی ہوگی...... محبت تو دو دلوں کے میل کا نام ہے زبردستی کسی سے بھی محبت نہیں کی جا سکتی...... (یہ اکھڑ لوگوں کی محبت کا انداز تھا ایسے لوگ بھی تو ہیں) نزہت جبین ضیا کا افسانہ کانچ کے خواب بہت اچھا لگا...... واقعی کبھی کبھی بڑا ہونا بہت گھاٹے کا سودا ہوتا ہے جیسے کہ فروہ کے لیے ثابت ہوا۔ گھنٹی، شیریں حیدر کا زبردست ناولٹ تھا...... وہ میری پسندیدہ رائٹر ہیں اور میں فہرست میں ان کا نام دیکھ کر خوش ہو جاتی ہوں۔ جلترنگ میں ہائے اللہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے، پڑھ کر ہنستے، ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی...... کیا غضب کی تحریر تھی...... مزہ آ گیا پڑھ کر دوسرے نمبر پر گود تھی...... طنز میں بھی کتنی بڑی بات کہہ گئیں کہ رشتے دار زندگی کا اٹوٹ انگ ہوتے ہیں۔ ہاں تمام بہنوں کے دکھ سکھ میں، میں شریک ہوں۔'' (تبصرے کا شکریہ آپ کی آرا پہنچائی جا رہی ہے)

شوکت، کراچی سے۔ ''پاکیزہ پڑھا اور بہنوں کی محفل میں اپنا خط دیکھا تو یقین آ گیا...... سعدیہ ہما شیخ اور دیگر بہنوں نے آپ کے بارے میں بالکل صحیح لکھا تھا...... آپ سب کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔ مجھے بہنوں کی محفل بہت اچھی لگتی ہے...... سب بہنوں کی خیریت کا پتا چلتا رہتا ہے۔ جلترنگ تو ہوتا ہی بہت اچھا ہے مگر ہمیں عظمیٰ آفاق کی چٹ پٹی تحریریں بھی بہت اچھی لگتی ہیں...... اب ان کے ڈرائنگ روم کا کیا احوال ہے...... میرا مطلب ہے دھوپ نے پردوں کا رنگ کس رنگ کا کر دیا (ان کی تحریر کی پھلجھڑیوں کے حوالے سے بات کر رہی ہوں) اور وہ جالوں میں جھولا جھولنے کی بات بھی کر رہی تھیں جس کو پڑھ کر میری ہنسی نہیں رکی تھی۔ اس ماہ شیریں حیدر کی کہانی مجھے سب سے زیادہ پسند آئی۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ اس کو کہتے ہیں تجربے کی بات...... انجم بہن اب آپ سے میری دوستی ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ نہ صرف میں بلکہ اب میری کمیونٹی کی بہت ساری بہنیں اس محفل میں شرکت کیا کریں گی۔'' (میں آپ کا اور آپ کی سب سہیلیوں کا انتظار کروں گی کہ اپنی رائے سے مجھے آگاہ کریں)

صوفیہ اختر، سمیعہ اختر، کراچی سے۔ '' ٹائٹل اچھا لگا۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ ذیشان کی دلہن کی تصویریں ڈھیر ساری دیکھیں...... شیریں حیدر کی گھنٹی زبردست رہی...... پاکیزہ میں فیشن کے حوالے سے ماڈلز کی تصاویر ضرور ہونی چاہیے۔ بہنوں کی محفل ٹاپ پر رہی...... جلترنگ تو ہمارا پسندیدہ سلسلہ ہے اور اس کے ساتھ ایک سبق آموز اور دلچسپ ناول کا انتظار ہے...... انجم آنٹی آپ کو کب فرصت ملے گی۔'' (انشاء اللہ)

مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ''ذیشان کی شادی کے احوال کی منتظر ہوں...... کہ ہمیں دولہا اور دلہن سے محبت ہے...... رمضان کے حوالے سے اچھی تحریر دی۔ اختر شجاعت بھی اچھی مصنفہ ہیں توبہ کے بارے میں بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں...... جلترنگ کے خاکے اچھے تھے اور بہنوں کی محفل بھی...... دیگر افسانے بھی اچھے تھے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ''انجم باجی نہ صرف میں بلکہ میری پوری فیملی پاکیزہ پڑھتی ہے اور آپ ہماری فیملی میں

سب کی باجی ہیں، آپ کی باتیں، آپ کی تحریریں سب شوق سے دہراتے ہیں۔ آپ کے سکھ اور دکھ ہمیں اپنے لگتے ہیں۔'' (صفیہ تم بہنوں کے سکھ دکھ بھی تو میرے ہیں۔ تم سب میری اپنی ہی تو ہو)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''نگہت سیما کا اعتبار وفا بہت اچھا لگا۔ ماضی اور حال ساتھ، ساتھ چل رہے ہیں مگر بور نہیں کر رہے...... شمیم فضل خالق کی خواب اور سراب میں دو سہیلیوں کی داستان مگر ایک جیسی رہی...... نبیلہ ابر راجا کا متاع دل بھی انسانی رویوں کی نشان دہی کرتا ہوا پیسے کی اہمیت ہی جتاتا رہا...... صائمہ قیصر ہاشمی کی اچھی کہانی تھی۔ حیا بخاری نے بھی بہت اچھا لکھا خاص طور پر ایک بیوہ کے بارے میں...... ماہ نور کی زندگی میں شہریار کا ابر رحمت بن کر برسنا پسند نہیں آیا۔ رفاقت جاوید کے ناول کے اختتام سے میں متفق نہیں ہوں...... سائرہ کے لیے ایک امتحان ہی رہا...... نزہت جبیں ضیا اور صدف آصف کی تحریریں بھی ٹھیک رہیں۔ ہم پاکیزہ اس لیے بھی پڑھتے ہیں کہ ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی پیغام بھی ضرور ہوتا ہے۔ شیریں حیدر نے بھی گھنٹی خوب بجائی اور اختتام بھی بہت عمدہ رہا۔ صائمہ اکرم کی ہنستی، مسکراتی تحریر میں دادا، پوتے کی نوک جھوک پسند آئی۔ اسیر وفا بھی اچھا تھا مگر اس کا ایک جملہ بہت گہرا تھا کہ کشتی جلا کر لہروں پر سفر نہیں کر سکتے...... واہ...... اختر شجاعت خوش رہو...... توبہ کے موضوع پر بہت اچھا لکھا تم نے۔ انجم پتا نہیں تم کب اپنے قلم کو حرکت میں لاؤ گی...... لکھ ڈالو...... ہم انتظار کر رہے ہیں۔ (جی ضرور) نیلم احمد بشیر سے نزہت نے اچھی ملاقات کروائی۔ نیلم کی باتیں خوب صورت تھیں شائستہ زرین کا سروے بہت عمدہ رہا...... بہنوں کی محفل میں جو تم نے اپنی امی کے لیے جو احساسات رقم کیے ہیں وہ ہر بیٹی کی دل کی آواز ہیں...... جلترنگ میں بشارت بھائی کی گاڑی میں ممانی کا بیٹھنا اور پھر اترنا...... کا نقشہ لبوں پر پھول کھلا گیا...... ان سطور کے توسط سے سب بہنوں کو رمضان کی مبارک باد...... اللہ تعالیٰ یہ پاک مہینہ ہم سب کے لیے خیر و عافیت لائے......'' (تبصرے کا شکریہ...... آپ کو بھی رمضان کی دلی مبارک باد)

سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا سے۔ ''سب سے پہلے میں اپنی بیٹی ماورا اور انشراح کو مبارک باد دوں گی کہ ان دونوں کی اس ماہ سالگرہ ہے۔ (ہماری جانب سے بھی دلی مبارک باد اور دعائیں) پاکیزہ میں جن بہنوں کو میرا انٹرویو پسند آیا ان کا بے حد شکریہ......'' (تمہارا انٹرویو واقعی بہت پسند کیا گیا تھا...... خطوط جو آئے وہ اپنی جگہ اور فون اس کے علاوہ آئے تھے بلکہ یہاں تک کہا گیا تھا...... سعدیہ تسی تو چھا گئے ہو پاکیزہ میں)

سیما مناف، کراچی سے۔ ''انجم تم نے اپنی امی کی وفات کے بارے میں جو لکھا ہے اسے پڑھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں بھی سب کچھ اپنی مرحومہ ماں کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔'' (سب مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں...... محبتیں نچھاور کرنے والی اور دعائیں دینے والیاں......)

فرحانہ ناز، لاہور سے۔ ''مجھے آپ کی تحریریں بہت اچھی لگتی ہیں اور ناہید سلطانہ کی بھی ایک بات آپ سے پوچھنی ہے کہ میں نے سنا ہے کہ مشہور لوگوں کے دشمن بہت ہوتے ہیں، میرا مطلب دشمن سے مراد جیلسی کرنے والے لوگ ہیں...... تو پھر آپ کیا کرتی ہیں...... اس ماہ کا جلترنگ میں نے اپنے گھر میں آنے والے ہر کزن کو سنایا اور سب خوب ہنسے۔'' (پیاری فرحانہ پہلے تو میں بتا دوں کہ میرا شمار ان رائٹرز میں نہیں ہے جو بہت مشہور ہیں...... دوسری بات یہ کہ الحمد للہ میرے کوئی دشمن یا جیلسی کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو میں انہیں جانتی نہیں ہوں اور نہ ہی جاننے کی خواہش مند ہوں بفضلِ اللہ تعالیٰ مجھ سے محبت کرنے والی بہنیں بہت زیادہ ہیں جو صبح شام مجھے اپنی دعاؤں کے حصار میں بھی رکھتی ہیں...... میں تو اس کے لیے بھی اللہ کا شکر ادا کروں تو نہیں کر سکتی...... ہاں ناہید سلطانہ اختر مشہور بھی ہیں اور معروف بھی...... تو آپ کو ان جیسی کیٹیگری کی مصنفات سے ہی پوچھنا چاہیے تھا)

شبنم کنول، گاؤں پاپا نگری سے۔ میری والدہ کی تعزیت کے بعد لکھتی ہیں ''ذیشان بھائی کی شادی کا احوال زبردست تھا...... ہم سب کچھ پڑھنا چاہتے ہیں...... پاکیزہ کے بارے میں اس بارے میں کچھ نہیں لکھا مگر مجھے یقین ہے سب کچھ اچھا ہی ہوگا......'' (پیاری شبنم اب تو ٹھیک ہیں ناں...... ویسے مجھے بھی یقین ہے کہ تم بالکل ٹھیک ہو، ہے ناں......)

نگینہ ضیا بنگش، کراچی سے۔ ''نیلم احمد بشیر کا انٹرویو اچھا لگا...... اس ماہ سارے کے سارے افسانے ٹاپ کے

رہے۔ شائستہ زریں کا سروے تو ہمیشہ ہی منفرد اور بہت بہترین ہوتا ہے۔ اختر شجاعت کے خوب صورت فقروں کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی...... روحانی مشورے میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں...... دعا مانگنے کا قرینہ تو بہنوں کی محفل کے اختتام سے سب بہنوں نے سیکھ لیا ہوگا...... میں نے کئی جگہ بہنوں کو ان ہی الفاظ میں دعائیں مانگتے دیکھا ہے......(یہ تو بہت اچھی بات ہے) پاکیزہ ڈائری تو اس مرتبہ نگینوں سے بجی تھی۔ ذکیہ بلگرامی کی نعت بہت اچھی لگی......اور جلترنگ اس ماہ بھی شاندار رہا۔'' (پُرمحبت تبصرے کا شکریہ)

★ گلشاد نذیر، کوہ مری سے۔'' اپنی بہن کے انتقال کے باعث بہت رنجیدہ ہوں مگر اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے پاکیزہ کی ورق گردانی ضرور کی...... مجھے اس میں سب سے اچھے روحانی مشورے لگتے ہیں۔ انجم باجی آپ پیاری، پیاری دعائیں بتاتی ہیں اس کے لیے جزاک اللہ...... جلترنگ پڑھ کر اپنے غم اور دکھ کو چند منٹوں کے لیے واقعی بھول جاتے ہیں۔ اس ماہ میں مجھے شیریں حیدر، شمیم فضل خالق، صائمہ اکرم کی کہانیاں خصوصی طور پر پسند آئیں۔'' (کیوں نہ آتیں یہ سب ہماری مایہ ناز مصنفات ہیں اور دیگر کہانیاں اگر تم پڑھتیں تو وہ بھی تمہیں ضرور اچھی لگتیں)

☆ گوہر سلطانہ، گارڈن کراچی۔ اس محفل میں خوش آمدید...... آپ کا گرامی نامہ پڑھا اور حیرت اس لیے نہیں ہوئی کہ آج کل بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو بہت اچھا اور دوسروں کو بہت برا سمجھتے ہیں...... بلکہ یہاں تک تاویلیں دیتے ہیں کہ دوسرا یقیناً دوزخ میں جائے گا...... اور اگر خود ایسے لوگوں کے بارے میں کوئی منفی بات کہہ دی جائے تو تنگ کر یہاں تک کہہ دیا جاتا ہے۔ ہونہہ بکنے دو...... ہم تو بہت اچھے ہیں اور ایسا ہی کچھ آپ کا حال ہے...... نہ آپ نے بڑے کو چھوڑا اور نہ چھوٹے کو...... کہ اس طرح آپ کو ایک طمانیت آمیز خوشی بھی ہوئی ہوگی...... جس کا میں نام نہیں لینا چاہتی...... بہر حال آپ کا شکریہ کہ آپ نے کڑوا کسیلا ہی سہی مجھے خط تو لکھا...... مگر میں آپ کا خط اس وجہ سے شائع نہیں کرسکتی کہ میرے قارئین اور میری تبصرہ نگار بہنوں نے سختی سے منع کیا ہے کہ اس محفل میں ذاتیات پر مبنی خطوط شائع نہ کیے جائیں' اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کی مزید تشفی کردوں تو آپ پتا لکھا جوابی لفافہ بھیجیں...... میں آپ کو ضرور جواب دوں گی...... ہاں اگر آپ ہمارے ہاں شائع ہونے والی تحریروں پر اپنا تبصرہ بھیجیں گی تو وہ ضرور شائع ہوگا...... مگر شائستہ انداز میں...... کہ میں اپنی کسی سینئر مصنفہ تو کیا اپنی نئی مصنفہ کی بھی تذلیل گوارا نہیں کرسکتی۔

★ سیما یاسمین مجتبیٰ، ڈیفنس کراچی سے۔'' جون کا پاکیزہ اچھا لگا...... سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھی اپنی والدہ کے لیے آپ کے محبت بھرے کلمات پر بیٹی کی آواز میں آپ نے بے حد مختصر لکھا مگر بہت اچھا......(مجھ سے لکھا گیا ہی نہیں) اس کے بعد اختر شجاعت کا مضمون پڑھا اور منہ سے بے اختیار واہ نکلا...... اختر بے حد تحقیق کے بعد لکھتی ہیں اور دل سے لکھتی ہیں۔'' (جب ہی تو ان کے مضامین پڑھ کر سب کے دلوں پر اثر ہوتا ہے)

★ نصرت، لاہور سے۔'' باجی میں آپ سے پہلی بار بات کررہی ہوں...... پاکیزہ تو عرصہ دراز سے پڑھ رہی ہوں...... مگر آج آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کی بتائی ہوئی باتوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے...... سب بچوں کی شادیاں کرچکی ہوں بہوئیں بھی میرے گھر میں آگئی ہیں الحمدللہ میرا بھی ان کے ساتھ اچھا وقت گزر رہا ہے اور وہ بھی بہت اچھی ہیں......'' (پیاری بہن ہماری دلی خواہش یہی ہے کہ ہماری بہنیں پاکیزہ سے مثبت باتیں، رویے اور سلوک سیکھیں جو حقیقی زندگی کو طمانیت آمیز بنائے رکھے۔ پاکیزہ کے صفحات آپ کے لیے حاضر ہیں، آپ اپنی آرا سے آگاہ رکھیں تو خوشی ہوگی)

☆ ایک بہن، پنجاب سے۔'' آنٹی میرا شدید دل چاہتا ہے کہ میں ٹی وی کے ڈراموں میں کام کروں...... مجھے معلوم ہے کہ مجھ میں ٹیلنٹ ہے۔ میری امی بھی کئی ڈراموں میں کام کرچکی ہیں...... مگر مجھے وہ اس کی اجازت نہیں دیتیں...... نہ وہ، نہ پاپا اور نہ بھائی...... اور اگر میں نے اپنی اس خواہش پر عمل نہیں کیا تو میں مرجاؤں گی...... وغیرہ، وغیرہ۔'' (پیاری بٹی میں نے صرف اصل مسئلے کا ہی ذکر کیا ہے۔ پہلے کا تو مجھے نہیں معلوم مگر اب ٹی وی کے ڈراموں میں اچھے گھروں کی لڑکیوں کا کام کرنا بہت زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا...... جبکہ آپ کی والدہ بھی اپنا یہ شوق پورا کرچکی ہیں...... مگر بیٹا...... والدین کے حکم کو ماننا اچھی اولاد کے لیے ضروری تو ہوتا ہے ناں...... تم اپنا یہ شوق اپنی سہیلیوں کو بلا کر چھوٹے پیمانے کی تقریب میں بھی پورا

کر سکتی ہو...... مجھے معلوم ہے کہ اس وقت تمہیں اس شوق کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا...... بعد میں شادی کے بعد اپنے بچوں میں مصروف ہونے کے بعد تم خود اپنی ان باتوں کو یاد کر کے ہنسا کرو گی اور کہو گی کہ میں بھی ان دنوں کتنی پاگل تھی...... ارے یاد آیا...... آج کل کچھ لڑکیوں اور لڑکوں کو میں نے اپنی اداکاری سے خود محظوظ ہوتے ہوئے اس طرح بھی دیکھا ہے کہ وہ اپنے موبائل پر فلموں کے ڈائیلاگز کٹ کر کے اپنی تصویر کے ساتھ اس طرح ڈال رہے ہیں جیسے تم ہیروئن کا مکالمہ بول رہی ہو پھر آواز کسی دوسرے کی پھر تمہارے چہرے کے ایکسپریشن اور جب تک دل چاہے خود اپنی اداکاری اور صداکاری دیکھو بلکہ دن میں بار، بار دیکھو اور جب دل بھر جائے تو مزے سے ڈیلیٹ کر دو...... اب جب اپنا یہ شوق پورا کرنا اتنا آسان ہو گیا ہے تو کیا ضرورت پڑی ہے اِدھر اُدھر خوار ہونے کی...... ٹھیک ہے ناں.....!)

☆ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ ''تمام چھوٹے بڑے سلسلے پڑھ لیے...... ہالہ احمد کے ابا اور رفیعہ ابدالی کی ماں کا پڑھ کر ان کے جذبات اچھے لگے۔ پچھلی بار ایک بہن نے انگریزی کے کیچر کے ساتھ خط لکھا اور آپ نے بھی اس کے انداز میں جواب دیا اور مجھے اس لیے اچھا لگا کہ آپ کرتی ہیں سب کی حوصلہ افزائی۔ (گڑیا یہ تو میرا فرض ہے) آپ نے کٹنگ کے ساتھ میری شاعری شائع کی شکریہ...... مگر دیگر تحریروں کا کیا ہوا......'' (کوثر تم ماشاء اللہ بہت ٹیلنٹڈ ہو مگر تمہاری غزلوں میں سکتے اور جھٹکے تھے...... میرا مشورہ ہے کہ پہلے تم نظم لکھو اور مطالعہ زیادہ سے زیادہ کرو...... انشاء اللہ غزلیں بھی ضرور لکھو گی...... ہاں میری اس بات کو دل پر مت لے لینا)

☆ تابندہ جبیں، کراچی پُرمحبت دعاؤں کا شکریہ...... ہاں تبصرہ کب سے نہیں بھیجا...... بہت آرام کر لیا...... آجاؤ اس محفل میں...... اور یہی بات مجھے زینت عبدالصمد، میرپورساکرو سے بھی کہنی ہے۔

☆ پروین ناز، پنجاب۔ گڑیا آپ کا افسانہ پڑھا...... آپ کو ماشاء اللہ لکھنا آتا ہے مگر ابھی آپ کو مطالعے کی بہت ضرورت ہے پاکیزہ میں اس طرح کے افسانے شائع نہیں ہوتے...... ابھی آپ کی تحریروں میں ایک واقعاتی تاثر سا ملتا ہے اور مکالموں میں ہم آہنگی بھی نہیں ہے مگر انشاء اللہ آپ جلد سیکھ جائیں گی۔

☆ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ''کیا پاکیزہ کے ٹائٹل پر صرف حسینوں ماہ جبینوں کا ہی حق ہے؟ کیا ہم جیسے آہم سینئر سٹیزن بزرگ سوبر، بالخصوص لکھاری بہنوں، بیٹیوں کی تصاویر بطور ٹائٹل گرل لگانے میں کوئی حرج ہے؟ (شکر ہے آئٹم گرل نہیں لکھا...... اللہ معاف کرے) لکھاری بہنوں کی تصاویر لگی دیکھ کر بے حد خوشی ہوگی بشمول آپ کے...... (ہاں اکثر لگی بھی ہیں، آئندہ بھی لگ سکتی ہیں مگر تصاویر بہت اچھی ہونی چاہئیں ہر لحاظ سے) رہی بات عظمیٰ بٹی کی سیر یعنی سفرنامے کی کاش اتنا خوب صورت میں اپنے سفر کا احوال لکھ سکتی...... ویل ڈن عظمیٰ خوش رہو......'' (پسندیدگی کا شکریہ)

☆ روبا وسیم گل، ضلع لودھراں سے۔ ''مئی کے شمارے میں میرا نام آیا بے حد خوشی ہوئی اپنی دوستوں کو دکھایا۔ اپنی ٹیچر مسز طاہرہ ڈوگر کو رسالہ گفٹ کیا اور وہ بہت خوش ہوئیں کیونکہ وہ بھی پاکیزہ کی لیجنڈ قاری ہیں۔ اس شمارے میں ساری باتیں ہی ماں کے حوالے سے تھیں جنہیں پڑھ کر بہت سکون ملا...... اے خدا ہمیں بھی نیک و صابر مائیں بنا...... تاکہ ہمارے بچے بھی ہماری آئیڈیل شخصیات کی طرح سورج کی طرح چمکتے اور چاند کی طرح دمکتے رہیں۔ آپ نے بہنوں کی محفل میں لکھا کہ ایک بیٹی اپنی میرڈ سسٹر کو میکے نہیں آنے دیتی تو ماں اپنی جگہ پر درست ہے لیکن حقیقت میں اس کیبل کی وجہ سے بہنوئی اور سالی والا رشتہ پامال ہو چکا ہے۔ ڈائجسٹ کے سارے اداریے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ دین کی باتیں، جلترنگ، سندیسے، انٹرویو، سب ہی بیسٹ...... (شکریہ) میری دعا ہے کہ ہمارے پاکستان کو قائم و دائم رکھے...... خصوصاً ان ماؤں، بہنوں، بیویوں جن کے بیٹے بھائی، خاوند اس مادر وطن پر قربان ہو رہے ہیں۔ ان تمام عورتوں کو ہمت دے۔ ہم سب ان کے ساتھ ہیں وہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔'' (بے شک آمین ثم آمین)

☆ رابعہ، کوٹ چھٹہ سے۔ ''خط لکھنے کے لیے پہلی دفعہ قلم اٹھایا ہے۔ امید ہے حوصلہ افزائی کریں گی۔ پاکیزہ سے تعارف میری دوست شگفتہ کنول (مرحومہ) کے توسط سے ہوا، وہ آپ کی بہت تعریفیں کرتی تھی اور اب آپ کی شفقت اور محبت کا پتا مجھے اپنی بہن ام ایمان قاضی سے چلتا رہتا ہے جو کہ پاکیزہ کی مصنفہ ہیں۔ اس خط میں رسالے سے متعلق کوئی بات

نہیں لکھوں گی۔ میں نے یہ خط آپ کو اپنی پریشانی سے متعلق مشورہ لینے کے لیے لکھا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ مجھے کوئی بہتر مشورہ دیں گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' (خوش آمدید اپنے خط میں اپنا موبائل نمبر تو لکھا ہی نہیں ہے۔ تو بتاؤ میں تم سے رابطہ کیسے کروں؟ ہاں پریشان مت ہو...... کہ جو لوگ اپنا کام ایمانداری سے کرتے ہیں...... ان کی تمام پریشانیاں اللہ تعالیٰ جلد حل کرتا ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں)

خولہ عرفان، کراچی سے۔'' سرورق اور اداریے کو سراہتے ہوئے آگے بڑھی تو محترمہ عذرا رسول صاحبہ کے صاحبزادے کی شادی کا مختصر احوال زیرِ مطالعہ آیا۔ نیند غالب تھی۔ جاگنے پر ایسا محسوس ہوا کہ شاید ابھی تقریب سے ہی ہو کر آئی ہوں۔ نبیلہ ابر راجا، متاعِ دل کو بہت خوب صورتی سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ البتہ ناول اسیر وفا، زمر نعیم صاحبہ کا تھوڑا ساٹھہرا ہوا محسوس ہوا۔ مئی کی تمام تحریریں اس عظیم ہستی کی محبتوں کا عکس ہیں جس کا حق ہم مر کر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ عقیلہ حق نے افسانہ دیوار میں اپنی تحریر کا جادو جگایا ہے۔ بہت شاندار...... ہاں اپنی غزل پر نظر پڑتے ہی وہ مطالعہ ادھورا رہ گیا کیونکہ خوشی آنکھوں کو سیراب کر گئی تھی۔ فوراً محفل کا مطالعہ کیا تو آپ کی حوصلہ افزا باتوں نے اور عزائم جواں کر دیے اور آپ کے خوب صورت الفاظ سے دل میں پیدا ہوا احساس سالوں...... جاگتا رہے گا۔'' (انشاء اللہ ہاں پُرخلوص دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

فرحت احمد، کراچی گلشن حدید سے۔'' ماڈل پسند آئی مگر یہ کیا...... گلے کا ہار سر پر لٹکا لیا...... واہ بھئی واہ...... عذرا رسول صاحبہ کے بیٹے کی تصاویر اور مختصری تفصیل اچھی لگی۔ باقی کا انتظار ہے۔ ام ایمان کا ناولٹ، نارسائی پسند آیا۔ سبق آموز ہے خصوصاً والدین کے لیے کہ ان کے رویے اور تقدیر کے لکھے کو خوشی سے قبول نہ کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اعتبار وفا اچھا جا رہا ہے۔ رنگ خلش نے ایک اندوہ ناک موڑ لیا ہے۔ خدا خیر کرے...... متاعِ دل اور چلو ہم ساتھ چلتے ہیں بھی اچھے لگے ہیں۔ محبت رنگ ہے ایسا...... تحریر سے زیادہ انجام اچھا لگا۔ اسیر وفا نے اسیر کر رکھا ہے۔ افسانوں میں ابا کا گھر اور میں بہت اچھا لگا۔ عقیلہ حق کا دیوار پسند آیا۔ اماں سوگوار تھا...... پرندہ اچھا لگا۔ حوا زادی حقیقت پر مبنی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے نیلم احمد بشیر نے پردہ اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ تمام مستقل سلسلے سالگرہ مبارک، سفرِ محبت اور خاص الخاص بہنوں کی محفل بہت پسند آئی یہ محفل تو رسالے کی جان ہے۔'' (شکریہ)

فرخندہ جعفری، گجرات سے۔'' میں بہنوں کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں مگر میں پاکیزہ ڈائجسٹ عرصہ دراز کافی سالوں سے پڑھ رہی ہوں۔ اس ماہنامے میں زندگی کے عین قریب کہانیاں ہوتی ہیں...... اس میں ہر آئٹم لاجواب ہوتا ہے۔ میں شوگر اور جوڑوں کے درد کی مریضہ ہوں۔ پلیز میری قاری بہنوں سے التماس ہے کہ میری صحت کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے گا، آمین۔'' (اس محفل میں خوش آمدید، آپ پریشان نہ ہوں ہماری بہنیں آپ کے لیے ضرور دعا کریں گی)

انیسہ زینب، فاروق آباد سے۔'' عذرا آنٹی کے بیٹے کی شادی کا احوال اچھا لگا اور ان کی بہو تو مجھے بہت پسند آئیں۔ ماشاء اللہ...... باپردہ اور خوب صورت بیک وقت مبارک ہو آنٹی' ایسی بہو آج کل کے دور میں کہاں ملتی ہے۔ افسانے سب ہی اچھے لگے اور ناول بھی ٹھیک تھے۔ جلترنگ ہمیشہ کی طرح بہت پسند آیا۔ سروے بھی اچھا لگا۔ ماں کے حوالے سے جس نے جو جو کچھ لکھا بہت اچھا لکھا۔'' (شکریہ)

عظمیٰ زہری، اوستہ محمد، بلوچستان سے۔'' اس بار محفل میں عذرا آنٹی کے بیٹے اور بہو نے حقیقت میں میدان مار لیا تھا سب کے قلم سے ان کے لیے مبارک باد اور منہ سے خوشیاں پھوٹ رہی تھیں۔ مجھے تو خود انتظار تھا پوری شادی کے احوال کا وہ کہتے ہیں نہ صبر کا پھل میٹھا تو انشاء اللہ اس بار رمضان المبارک کا ماہ ہو گا ذکر واذکار ہوں گے عبادتیں ہوں گی اور پھر ذیشان بھائی اور فاطمہ بھابی کی شادی کے احوال ہوں گے۔ عذرا آنٹی دل کی گہرائیوں سے مبارک باد قبول کیجیے۔ رفاقت جاوید آنٹی یہ کیا، کیا آپ نے جس بھرپور انداز سے رنگ خلش کو شروع کیا ختم کرنے میں اتنی جلدی کچھ خاص مزہ نہیں آیا۔ البتہ اعتبار وفا اپنے پورے جوبن پر تھا۔ نگہت سیما ہر قسط میں ہمارے چھکے چھڑا دیتی ہیں۔ نبیلہ ابر راجا۔ واہ واہ زبردست دل خوش کر دیا آپ کی لکھی اس قسط نے متاعِ دل نے ہمارا دل ہی تو لوٹ لیا۔ چلو ہم ساتھ چلتے ہیں اور اسیر وفا کو صائمہ اکرم اور

زمر نعیم نے جس شان و شوکت سے مسند پر بٹھایا تھا اس سے بڑھ کر شان سے رخصت بھی کیا۔ دل میں ہے درد بہت ہالہ احمد کو البتہ صبر دے ماں تو ماں ہوتی ہے پر باپ بھی ٹھنڈی چھاؤں ہوتے ہیں۔ نیلم احمد بشیر آنٹی سے ملاقات زبردست رہی بہت کچھ ان کے بارے میں کچھ آج کل کی نوجوان نسل کے بارے میں' مجھے تو زبردست قسم کا جھٹکا لگا یہ دیکھ کر کہ وہ بشریٰ انصاری کی بہن ہیں۔ شکریہ نزہت اصغر آپی ان سے ملوانے کا۔ خصوصی مضامین میں سب ہمیشہ کی طرح چم چم کر رہے تھے تو مستقل عنوانات کا پارہ بھی اپنے عروج پر تھا کوئی چیز کسی سے کم نہیں تھی۔'' (پسندیدگی کا شکریہ...... اور جو بات آپ نے آخر میں پوچھی ہے تو پروین صاحبہ افضل شاہین کی بیگم ہیں)

ارم خان، ڈی جی خان سے۔ ''خوب صورت سے ٹائٹل کے ساتھ جون کا پاکیزہ سامنے ہے۔ پاکیزہ ملتے ہی بہنوں کی محفل کی طرف دوڑ لگائی جہاں کئی بہنوں کے ساتھ خود کو بھی معصوم سے خط کے ساتھ شامل پایا۔ شکریہ۔ پھر اس کے بعد جلدی سے اپنے پسندیدہ ناولٹ پر پہنچی۔ متاع دل جسے پڑھ کر دکھ ہوا، خون کے رشتوں نے ایسی سفاکی دکھائی جس پر دل بھی، بھی یقین نہیں کرتا۔ پتا نہیں کیوں پیسے کی خاطر لوگ اپنے خون کے رشتوں میں زہر گھول دیتے ہیں...... متاع دل حقیقت کے بہت قریب ہے۔ اسیر وفا کا اختتام شاندار طریقے سے ہوا۔ زمر نعیم ویری گڈ...... باقی خواب سراب، اسے آزاد کردو...... ابر رحمت کانچ کے خواب، گھنٹی بھی خوب رہی۔'' (آپ کا خط بھی خوب رہا...... ہاں اگر مفصل تبصرہ کرتیں تو خوب ترین رہتا)

نازنین آفریدی، پشاور سے۔ ''میں پاکیزہ کا آغاز بہنوں کی محفل سے کرتی ہوں پھر پاکیزہ ڈائری، جلترنگ، میں اکثر گنگناتی ہوں، خوش ذائقہ اور سندیسے بھی بہت زبردست رہے مگر یہ سندیسے کو اگر ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ کوئی نیا سلسلہ لے' لے تو اچھا ہوگا۔ کہانیوں میں اعتبار وفا کچھ آگے بڑھی۔ رنگ خلش کے تو مجھے اینڈ سے شدید اختلاف ہے۔ جب عادل سے ہی شادی کرنی تھی تو پہلے ہی کر لیتی۔ ہاں رفاقت جاوید آنٹی کے ایک جملے نے بہت خوش کیا کہ جس کا کاجل بہت بہتا ہے وہ شوہر کی چہیتی ہوتی ہے۔ کاجل تو پھر میرا بھی بہت بہتا ہے آنٹی تو کیا میں بھی......؟ (جی ہاں) صائمہ اکرم چوہدری کا ناول مکمل ہو گیا مگر کچھ خاص متاثر کن نہیں رہا۔ متاع دل پڑھ کر دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا جو سب سے زبردست تحریریں تھیں۔ اس ماہ کی وہ شیریں حیدر کی گھنٹی اور شمیم فضل خالق کی خواب سراب، دونوں بہت زبردست رہیں۔ کانچ کے خواب بھی نزہت جبین کی اچھی کاوش رہی...... ابر رحمت بے جا طویل رہی...... اسے ناولٹ کی صورت میں بھی لکھا جا سکتا تھا۔ رشتوں کی ڈوری البتہ بور رہی۔ اسیر وفا کا اینڈ پسند آیا۔ شمع ہدایت سے واقعی ہدایت ملی...... روحانی مشورے میں کچھ شب برات کی مناسبت سے بھی دے دیا جاتا تو اچھا تھا۔'' (بہت بہتر)

ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ''سالگرہ نمبر دو بروقت ملا...... پاکیزہ ہاتھ میں آتے ہی دل چین اور سکون سے بھر جاتا ہے۔ ماڈل کی آنکھوں کا آئی میک اپ زبردست اور جیولری دل چاہا چرالوں...... اور یہ ہمیشہ کی طرح ذہن کے زنگ اتار گیا۔ اس شمارے کی اسپیشل انٹری ذیشان اور فاطمہ کے فوٹو گرافس، ماشاء اللہ فاطمہ دلہن بن کے بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ ہمارے ذیشان بھی ڈیسنٹ لُک دے رہے تھے اور عذرا باجی تو ہر کلر میں ہمیشہ انسپائر کرتی ہیں۔ بقیہ احوال عظمٰی کے قلم سے ہوگا ابھی سے سوچ کر گدگدی ہو رہی ہے۔ سلسلے وار ناول اعتبار وفا میں ابھی تک ماضی کی گتھیاں کھل رہی ہیں جبکہ رنگ خلش میں عادل کا بیڑا غرق ہو نمرہ بیچاری کو روگ لگا دیا جی چاہ رہا ہے کہ عادل کے سینے میں گولیوں کا پورا راؤنڈ اتار دوں۔ خدارا نمرہ کے ساتھ کچھ برا نہیں کیجیے گا۔ کہانیوں میں ابا کا گھر اور میں تنزیلا زہرہ نے بہت ہی حساس موضوع پر قلم اٹھایا یہ ہمارے گھروں کی عام بات ہے ہم مذاق میں بھی اپنی بیٹیوں سے کہتے ہیں کہ یہ تمہارا گھر نہیں، اپنے گھر جاؤ گی تو اپنی من مانی کرنا...... متاع دل بہت دلکشی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ مائرہ، شاہ زیب کو خوب نچا رہی ہے۔ دیوار، عقیلہ حق کی ایک بہت پُراثر تحریر رہی جس میں اپنے مرد کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔ چلو ہم ساتھ چلتے ہیں، صائمہ اکرم خوب خاصے کی چیز لاتی ہیں۔ رفعت شبانہ نے ماں میں ماں کی عظمت اور اس کے دل میں اولاد کے لیے قربان ہونے کا جذبہ بڑی خوب صورتی سے دکھایا ہے۔ نیلم احمد بشیر کا حوا زادی، آبدیدہ کر گیا۔ امی جان، پڑھ کر مجھے اپنی امی جان (ساس) یاد آگئیں۔ واقعی ایسی امی جان اللہ تعالیٰ ہر لڑکی کو عطا کرے۔ اسیر وفا کا دوسرا حصہ بہت ہی پُرلطف رہا۔ وانیہ تو آتے ہی چھا گئیں۔ شائستہ زریں کا سروے بہت دلچسپ رہا۔

بہنوں کی محفل میں پہنچ کر دل میں ڈھیروں جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ انجم باجی کو جاتا ہے وہ اتنے پیار اور محبت سے پیش آتی ہیں کہ گویا ہم سے اہم کوئی نہیں ...... جلترنگ ہمیشہ کی طرح گدگدیاں کرتا گیا۔ اچھا باجی آپ سب کو رمضان مبارک ہو۔'' (اور آپ سب کو بھی)

پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''شادی میرے بیٹے کی ...... عذرا رسول نے اتنا اچھا لکھا کہ ہمیں ایسا لگا کہ جیسے ہم بھی اس شادی میں شریک ہوں...... دلہن واقعی پریوں جیسی پسند کی ہے آپ نے ...... سلسلے وار ناولز تو ہیں ہی زبردست باقی ناولز اور افسانوں میں چلو ہم ساتھ چلتے ہیں۔ اسیر وفا، اماں، ابا کا گھر اور میں حوا زادی پسند آئے۔ خصوصی مضامین سالگرہ مبارک، سروے پڑھ کر ہمارا بھی دل چاہا کہ ہم بھی کاش اس میں اپنی انٹری ڈال سکتے۔ سعدیہ ہما شیخ دونوں مضامین میں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔'' (آپ اپنا موبائل نمبر دے دیں۔ آئندہ کسی سروے میں شامل کرلیں گے)

فرحین عثمان، کراچی سے۔ ''خط لکھنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ میری سادہ زبان اردو، پختہ لکھائی اور انداز بیان بھی میرا کچھ خاص نہیں اردو ابھی لکھنے میں بھی بے شمار غلطیاں کرتی ہوں پھر بھی ...... پھر بھی آپ نے میری تحریر کو اپنے رسالے میں جگہ دی۔ (ہم ہر بہن کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ وہ بہت کچھ سیکھے بھی اور سکھائے بھی) حیرت خوشی اور بے انتہا خوشی میں ہوں۔ اب تک یقین نہیں ہو رہا۔ (آپ کی خوشی ہماری خوشی ہے) میری شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں دو بے حد شرارتی بیٹے ہیں۔ میں نے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا تھا اب ڈگریاں ایک طرف رکھ کر بس گھرداری سنبھال رہی ہوں۔ بچے بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے نہیں دیتے ...... سارا دن بھاگتے دوڑتے گزرتا ہے اور میری واحد انٹرٹینمنٹ ایسے میں رسالے پڑھنا ہی ہے۔'' (جب بچے چھوٹے ہوتے ہیں تو ہر ماں کو تارزن بننا پڑتا ہے۔ یہ ہر عورت کی زندگی کا سب سے خوب صورت حصہ ہوتا ہے۔ اپنے بچوں پر بھرپور توجہ دو ...... اور جب وقت ملے تو اپنے تبصرے بھی ہمیں ارسال کرنا)

ظل شاہین، رحیم یار خان سے۔ ''انجم باجی آپ کی والدہ ہمارے لیے بھی ماں کا درجہ رکھتی تھیں۔ جس قدر آپ ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں اس سے بڑھ کر وہ تھیں اور ہیں ...... ہم نے انہیں دیکھا نہیں مگر مائیں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ شفیق اور محبت سے گندھی، ان کے دنیا سے جانے کا دکھ ہم نے بھی شدت سے محسوس کیا کہ آپ کے دکھ ہمارے دکھ ہیں اور آپ کی خوشیاں ہم سب کی خوشیاں ہیں۔ اللہ کریم ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے ان کے درجات بلند کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے، (آمین)۔ الحمد للہ میں روزانہ کلام پاک کا کچھ حصہ پڑھتی ہوں اور ان کو ایصال ثواب بھی کرتی ہوں اللہ پاک قبول فرمائے، آمین۔ (جزاک اللہ) سب سے پہلے اداریہ پڑھا اس بار بھی آپ ایک اصلاحی اور دلچسپ گفتگو کے ساتھ موجود تھیں دیکھنے میں عام فہم سی بات کو آپ کا قلم جب برنگ قرطاس پر بکھیرتا ہے تو وہ خاص بن جاتی ہے اور ہم کوشش کرتے ہیں کہ آپ کے بتائے ہوئے اصولوں پر جہاں تک ممکن ہو عمل پیرا ہوں۔ جی ہاں ہمارا شمار بھی تھکان کے باوجود چلتے رہنے والوں میں سے ہے ...... الحمد للہ ...... پھر ذیشان اور فاطمہ اور عذرا آپا کی تصاویر میں گم ہو گئے۔ عذرا آپا کے قلم سے شادی کا کچھ احوال پڑھا اور لبوں پر ماشاء اللہ ہی زبان سے نکلتا رہا اللہ پاک دولہا دلہن کو ہمیشہ خوش رکھے اور ہماری عذرا آپا کو ڈھیروں خوشیاں دیکھنی نصیب فرمائے آمین۔ مزید احوال کا انتظار ہے وہ بھی عظمیٰ کے قلم سے۔ اعتبار وفا میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے بلکہ مجھے تو یہ شروع سے ہی دلچسپ لگا۔ سب سے قابلِ رحم کردار ثمر حیات کا ہے۔ نگہت سیما جی ان کا اینڈ مزید خراب نہیں ہونا چاہیے۔ نگہت سیما کے ناول میں کہیں بھی دلچسپی کا فقدان محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ افسانوں میں ابا کا گھر، سب سے پہلے پڑھا۔ صرف ایک جملے پر کہانی کی بنیاد رکھی گئی اچھا لگا۔ قرض، ناہید فاطمہ کا اندازِ تحریر لفظوں کا چناؤ اچھا رہا۔ مگر اینڈ کچھ حقیقت سے دور ...... کیا جو جوانی میں ٹھکرا دیں وہ بڑھاپے کا سہارا بن جاتے ہیں؟ نیلم احمد بشیر نے اپنی تحریر میں صحیح عکاسی کی کہ تمام عمر ہم جن کے لیے قربانیاں دیتے ہیں وہ پل میں آنکھیں بدل لیتے ہیں۔ امی جان، ایک مشفق ساس کی کہانی ہے واقعی اچھی ساسیں بھی دنیا میں ہوتی ہیں۔ انجم باجی میری ماں بھی بہت نرم دل اور سیدھی سادی معصوم سی ہیں۔ میرے بھائی کی شادی کو تین سال ہو گئے آج تک بہو کے ساتھ ان کی یا ہماری کوئی معمولی بدمزگی بھی نہیں ہوئی گھر کا ماحول خوشگوار ہے الحمد للہ ...... اور پوتی زینب میری ماں کی جان ہے اور ہم سب کی بھی ...... اماں، رفعت شبانہ کی تحریر پُراثر ہے۔ آنکھوں میں آنسو

آ گئے پڑھ کر، ماں تیری عظمت کو سلام...... بس یہ کہہ سکتے ہیں۔ صائمہ اکرم کے ناولٹ کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ صائمہ نے تجسس پیدا کرنے کی پوری کوشش کی مگر بسمہ خالہ کا کردار زیادہ پیچیدہ نہیں نکلا۔ ہاں ایک بات کچھ ہضم نہیں ہوئی کہ آج کے اس دور میں داجی اور بسمہ کے پاس ایک دوسرے کا کانٹیکٹ نمبر نہیں تھا جبکہ تعلق اس قدر گہرا......؟ اینی وے اگلی قسط کا انتظار ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

☆ ملالہ اسلم، خانیوال سے۔ ''سب سے پہلے عذرا رسول کی زبانی ان کے بیٹے کی شادی کا مختصر احوال پڑھا۔ بہت اچھا لگا خصوصاً فاطمہ ذیشان کی فرنٹ پر Yellow ڈریس میں دلہن بنی وہ معصومیت بھری مسکراہٹ دل کو بھا گئی۔ مدیرہ کی باتیں سننے کے بعد نبیلہ ابر راجا کی متاع دل پر پہنچے...... شاہ زیب نے عمر زیب کو دکھی کر کے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری ہے پلیز نبیلہ آپی در یکتا کے ساتھ تو کچھ برا مت کیجیے گا۔ اسیر وفا میں ثعلب کی تبدیلی اچھی لگی بلاشبہ وانیہ نے ایک اچھی بیٹی بیوی اور بہو بن کر دکھایا ہے۔ تنزیلہ زاہرہ نے اپنی تحریر میں بیٹیوں کی فیلنگز کو اچھی طرح بیان کیا ہے۔ ناہید فاطمہ حسنین اِن فیکٹ آپ نے قلم کا حق ادا کر دیا ہے۔ کاش سارہ جیسی نادان لڑکیاں اس طرح کی پہلی چوری کرنے کی حماقت نہ کریں تو بعد میں ان کے والدین کو دکھوں اور انہیں پچھتاؤں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ عقیلہ حق نے بھی اچھا لکھا۔ عورت کی چادر اس کی عزت اور زینت ہوتی ہے اگر یہی چھین لی جائے تو عزت نہیں رہتی۔ 'چلو ہم ساتھ چلتے ہیں' اجیان نائس نیم، اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ رفعت شبانہ کی اماں بھی تعریف کے قابل ہے۔ ام ایمان کا ناولٹ نارسائی پڑھا ویلڈن جی...... عورت کو اپنا گھر بنانے کے لیے خود کو مٹانا پڑتا ہے یہ خدیجہ نے ثابت کر دیا...... نیلم احمد کی حوازادی اچھی لگی۔ ٹاپ آف دی لسٹ سعدیہ رئیس کا ناولٹ زبردست عورت کی مجبوریاں، محرومیاں آپ نے اچھے طریقے سے ترجمانی کی۔ سالگرہ مبارک، پاکیزہ بہنوں سے مل کر اچھا لگا۔'' (آپ کا خط پڑھ کر ہمیں بھی بہت اچھا لگا)

☆ اسما سیف، واہ کینٹ سے۔ ''میں پاکیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں۔ مجھے اس میں شامل سلسلے بہت پسند ہیں۔ میں نے اس سے پہلے ایک ناول بھیجا تھا وہ تو ناقابلِ اشاعت ہوگیا تھا اب بتائیں میں کس طرح سے لکھوں...... کیا کوئی اور کہانی بھیج سکتی ہوں۔ میں عرصہ پانچ سال سے شاعری بھی کر رہی ہوں۔ آپ کے رسالے میں مستقل شامل ہونا چاہتی ہوں۔'' (گڑیا آپ کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ آپ اپنے مراسلات نثر میں بھی بھیجیں اور اپنی شاعری بھی ضرور ارسال کریں)

☆ عائشہ یوسف، لاہور سے۔ ''میں نے پہلے بھی اپنی شاعری بھیجی تھی اب بھی بھیج رہی ہوں کہانی لکھنے کے لیے کیا شرائط ہوتی ہیں۔ آپ کا رسالہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔'' (اچھی تحریریں تو اپنا تعارف خود ہوتی ہیں۔ آپ کو اس محفل میں جواب مل جائے گا کہ کمزور تحریریں کیسی ہوتی ہیں۔ ہاں اپنی شاعری ضرور بھیجو)

☆ معظمہ رؤف، پشاور سے۔ ''پہلی بار آپ کی محفل میں خط ارسال ہے۔ میری امی ہر ماہ پڑھتی ہیں، میں ایم بی اے کی طالبہ ہوں، اب میں بھی شوق سے پڑھتی ہوں۔ (خوش آمدید) لیکن خط اس وجہ سے لکھ رہی ہوں۔ میں نے پہلی بار آپ کو اپنی پیاری پھپو کی کہانی بھیجی جن کو فوت ہوئے ایک برس ہوگیا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ کے ادارے سے منسلک رہوں۔ یہی تو ایک ذریعہ ہے پاکیزہ جس نے ہم تمام خواتین کو خیبر تو کراچی ایک زنجیر سے جکڑ رکھا ہے۔'' (پیاری معظمہ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ تمہاری کہانی کیسی تھی مگر تمہاری یہ بات بہت پسند آئی ہے کہ خیبر سے کراچی تک ایک زنجیر بن کر رہنا چاہیے۔ آپ کی حوصلہ افزائی انشاء اللہ ضرور ہوگی)

☆ زمر نعیم، لاہور سے۔ ''میری تحریر اسیر وفا کے حوالے سے الحمدللہ قارئین پاکیزہ کو میری یہ کاوش پسند آئی۔ امید کرتی ہوں آئندہ بھی میری تحریریں جب بھی مقدر سے زینتِ پاکیزہ بنیں، قارئین سے پسندیدگی کی سند پائیں گی۔ قارئین پاکیزہ سے اپنے تعارف کے تحت اتنا کہنا چاہوں گی کہ گو کہ میری اشاعت کی دنیا سے وابستگی کو پندرہ سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے۔ میں عذرا رسول صاحبہ کو بے حد مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فرائض سے سبکدوش ہونا نصیب کیا۔ میں پاکیزہ قارئین کی بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے نہ صرف میری تحریر کو پڑھا بلکہ اپنی رائے سے بھی نوازا...... خصوصاً پاکیزہ کی قلمکار بہنوں کا شکریہ۔ پاکیزہ کے بھی سلسلے خصوصاً جلترنگ، پاکیزہ ڈائری اور وہ

آئے بزم میں لاجواب ہیں۔ بہترین اسلوب اور معلومات کا ماخذ سلسلے ہیں۔ انہیں بھی بندمت کیجیے گا۔'' (جی ضرور، پُرمحبت خط لکھنے کا شکریہ)

سنبل ملک اعوان، شاہدرہ سے۔ ''سب سے پہلے ذیشان بھائی کی شادی کا حال پڑھا اور مزید حال آپی عظمیٰ آفاق کے قلم سے پڑھیں گے اور انشاء اللہ لطف اندوز بھی ہوں گے۔ مجھے کچھ کہنا ہے، میں آنٹی انجم نے ایک جوش و ولولہ سا بھر دیا کہ بیکار نہیں خود کو کارآمد بنانا ہے۔ آنٹی میں نے اب اکثریت ان لوگوں کی دیکھی ہے کہ خود ہیں بالکل بیکار اور کچھ نہیں کرتے مگر وہ لوگ اپنے آپ کو بڑا۔۔۔ ہی کارآمد سمجھتے ہیں۔ (ایسے لوگ باتیں بنانے میں ماہر ہوا کرتے ہیں) اب بات ہوجائے اعتبار وفا کی میری بہت ہی سویٹ، محنتی اور پسندیدہ رائٹر نگہت سیما فرام چکوال کی۔ بہت ہی خوب صورت ادب، ہمیں پڑھنے کو ملا...... لفظوں کی بُنت، منظر کشی، کرداروں کا آپس میں میل ملاپ، رشتے کی نزاکت، بہت خوب صورت اور ہنر مند۔ یونیورسٹی لائف میں سب میچورڈ ہو چکے ہوتے ہیں۔ جبکہ یہاں عظام اور رواحہ کو بہت ہی معصوم دکھایا گیا ہے یہ بات سچ ہے مگر ہر لیول کے لوگ یونیورسٹی تک پہنچ جاتے ہیں مگر اتنے، اتنے معصوم کوئی بھی نہیں ہوتے کہ کچھ پتا ہی نہیں ہو...... جیسے عظام کے والد ثمر حیات اور فری کے ساتھ ہوگیا۔ بے شک رشتے دار اتنے خود غرض ہوجاتے ہیں جیسے ثمر حیات کے ماموں بھی نکل آئے۔ اللہ کرے رواحہ کو اس کے دل کی مراد مل جائے۔ ابا کا گھر اور میں، تنزیلہ زاہرہ نے ایک سنجیدہ موضوع کو لکھا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ متاع دل، نبیلہ ابر راجا، کا ناول زبردست جارہا ہے۔ مگر عمرزیب کی مشکلات ہی ختم نہیں ہوئیں۔ ڈریکتا، سیانی عورتوں کی طرح گھر کو بھی دیکھ رہی ہے اور کالج کو بھی...... مائرہ حالانکہ گاؤں کی ہے اور کالج میں ہونے کے باوجود ڈریکتا سے کئی گنا تیز اور چالاک نکلی کہ ایک لڑکے کو ٹریپ کرلیا۔ قرض، ناہید فاطمہ حسنین کی اچھی کاوش کو کہ یہ حقیقت ہے کہ لڑکیاں ہمیشہ والدین کا گھر چھوڑ دیتی ہیں مگر کچھ لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے کردار کی پختگی، سمجھداری، خوب صورتی کے باوجود بارات کا انتظار رہتا ہے کہ کوئی آئے گا۔ لوگوں کی موجودگی میں مہندی رچے گی۔ دیوار، عقیلہ حق لڑکیوں کو سبق دیتی ہوئی کہانی کہ سر پر سائبان جو کہ شوہر کی صورت ہوتا ہے۔ بہت بڑی نعمت ہے۔ چلو ہم ساتھ چلتے ہیں، صائمہ اکرم چوہدری نے اچھا لکھا۔ اماں، رفعت شبانہ، یہ کوئی نئی لکھاری بہن ہیں؟ معاف کیجیے گا، یاد نہیں آرہا کہ انہیں پہلے بھی پڑھا ہے؟ مگر انہوں نے ایک اہم مسئلے کو خوب صورتی سے اجاگر کیا...... رنگ خلش، رفاقت جاوید کا اچھا ناول مگر قدرے مشکل رہا۔ پرندہ، فرح طاہر کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ ویسے ایک بات کہوں......؟ کیا کوئی افسانہ برا بھی ہوسکتا ہے جو پاکیزہ میں لگے کیونکہ یہاں ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ ہر بات کو مدنظر رکھ کر پھر ہی ڈائجسٹ میں کہانیاں ترتیب دی جاتی ہیں۔'' (بھرپور تبصرے کا شکریہ...... تمہاری اس بات سے میں اتفاق کرتی ہوں کہ پاکیزہ میں شائع ہونے والی ہر تحریر بہت جانچ پڑتال کے بعد لگائی جاتی ہے)

ماہ نور خان، بہارہ کہو سے۔ ''آپ نے میری چیزیں لگائیں، میں اور میری امی بہت شوق سے پاکیزہ پڑھتے ہیں۔ کھانے کی ترکیبوں کا سلسلہ اچھا ہے۔ اگر بیوٹیشن یا حسن نکھارنے کے نسخے یا ترکیبیں دیں تو اچھا ہوگا۔ مئی کے پاکیزہ میں ذیشان رسول صاحب کی شادی کی تصویریں بہت اچھی لگیں۔ تفصیل پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور منہ سے ماشاء اللہ بھی نکلا...... جہاں تک ناول اور افسانوں کی بات ہے تو مئی میں دونوں ناول کی اقساط بہترین تھیں۔ نگہت سیما سے گزارش ہے کہ تھوڑی اسٹوری اوپن بھی کریں بے انتہا سسپنس ہے۔ اب تو کلائمکس ہونا چاہیے۔ جنگل کا پھول سادہ سی کہانی تھی کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ اس دفعہ ماں کے عنوان پر اچھی کہانیاں تھیں...... عقیلہ حق نے گھروں میں کام کرنے والی ملازماؤں کے بارے میں خوب لکھا۔ واقعی صاحب لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ سالگرہ مبارک میں سب کو پڑھ کر اچھا لگا۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کے رسالے میں باقاعدگی سے حاضری دیتی رہوں آپ کا بے حد شکریہ کہ تمام قارئین کو برابر سے جگہ دیتی ہیں۔'' (گڑیا اب باقاعدگی سے تبصرہ بھیجیں گی تو شرکت لازمی ہوگی...... ہاں پسندیدگی کا شکریہ)

نیلوفر خان، بہارہ کہو سے۔ ''جون کا پاکیزہ اگرچہ پورا پڑھا نہیں پھر بھی ناول پڑھ لیے ہیں۔ یہ کیا کہ رنگ خلش کا اتنا اچانک اینڈ بالکل اچھا نہیں لگا...... حسنات کے پاگل بیٹے کو تو سزا ملنی چاہیے تھی۔ ویسے بھی عجیب نفسیاتی کہانی تھی۔ دنیا میں کیسے، کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ رائٹر نیلم احمد بشیر کو ہم نے کم، کم پڑھا ہے ان کی باتیں بہت اچھی لگیں آپ ان کی بہنوں کے ساتھ بھی تصویریں دے

دیے۔ یہ اچھا کیا کہ شمع ہدایت میں اختر شجاعت کا مضمون دے دیا۔ واقعی آج کل کے زمانے میں ایسے دینی مضامین ہم سب کے لیے ہدایت کی قندیلیں ہیں۔ میں نے بھی ایک چھوٹا سا دینی مراسلہ بھیجا ہے امید ہے لگا دیں گی۔'' (جی ضرور)

☆ صبا خان، ڈی جی خان سے۔ ''پاکیزہ ہاتھ میں تھام کر دل باغ، باغ ہو گیا سب سے پہلے ٹائٹل دیکھا، اچھا لگا، اس کے بعد نگہت سیما کا اعتبار وفا بہت اچھا جا رہا ہے۔ صائمہ اکرم جی کی کیا بات ہے۔ چلو ہم ساتھ چلتے ہیں کا آخری حصہ پڑھ کر میں بھی ان کے ساتھ چل پڑی۔ متاع دل بھی اچھا چل رہا ہے، ناولٹ میں شیریں حیدر کی گھنٹی بھی خوب بجی...... حیا بخاری کا ابر رحمت بہت اچھا لگا، میری طرف سے مصنفہ کو ویل ڈن کہہ دیجیے گا اس کے بعد افسانوں کی باری آتی ہے۔ سارے افسانوں میں مجھے صدف آصف کا رشتوں کی ڈوری بہت پسند آیا، یہ سچ ہے کہ لڑکیاں تتلیاں نہیں ہوتیں، اگر ماں، باپ کا اعتبار حاصل ہو تو وہ معنوعی سہاروں کی جانب نہیں دوڑتی...... بہت زبردست لکھا ہے۔ شمیم فضل خالق کا خواب سراب بھی بہت پسند آیا۔ ناز و اور نجمہ کی کہانی اچھی تھی۔ دیگر سلسلے بھی اچھے تھے۔ خوش ذائقہ میں شربت آم موقع کی مناسبت سے لگایا گیا۔ آخر میں کہنا چاہوں گی کہ مجھے کچھ کہنا ہے میں انجم انصار نے بالکل سچ بات کہی...... اس دور میں رنجشوں کو بھلا کر دوستی کی شاہراہ قدم رکھنا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔'' (اس محفل میں خوش آمدید پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ......امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اپنی آرا سے ہمیں آگاہ کرتی رہیں گی)

☆ نفیسہ آرا، راس الخیمہ سے۔ ''بہت شکریہ کہ میرے مراسلے اور تراکیب قارئین کو پسند آتی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو کہانیاں نہ لکھ پائے وہ ایسے سلسلوں کے ذریعے پاکیزہ کے صفحات میں اپنی حاضری لگائے کیونکہ بعض کہانیاں معذرت کے ساتھ کچھ عجیب ناپختہ بھی ہوتی ہیں..... اگر چہ ایڈیٹر صاحبان اسے تنقیدی نظروں سے تو ضرور دیکھتے ہوں گے مگر باجی آج کل شاید ایسا ہی لکھا جا رہا ہے۔ آپ بھی زیادہ سے زیادہ کہانیاں دیا کریں اور انٹرویو مشہور لوگوں کے بھی کبھی، کبھی دے دیا کریں۔ اچھا کیا ساون نمبر کے حساب سے کوئی مزاحیہ شاعری بھیج سکتی ہوں ضرور بتائیے گا۔'' (جی ضرور کیجیے...... ہم جن مصنفات کے انٹرویو شائع کر رہے ہیں ماشاء اللہ وہ مشہور بھی ہیں اور محبوب بھی)

☆ پیاری بہنو! رمضان المبارک کی پُر مبارک ساعتوں میں اپنی دعاؤں میں مجھے اور ادارہ پاکیزہ کے تمام اراکین کو ضرور شامل رکھیے گا۔ اور خصوصی طور پر اپنے ملک کو بھی...... یہاں کے رہنے والے امن و امان میں رہیں...... رزق کی فراوانی ہو...... اور ہر برائی سے بچے رہیں اور سب آپس میں پیار و محبت اور یک جہتی کے ساتھ رہیں...... آمین۔ آئیں اب درود پاک پڑھ کر دعا مانگتے ہیں...... یا اللہ...... یا رحمٰن...... یا رحیم...... میرے جسم کو شفا اور دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین مجھ سے میری اولاد سے اور میرے تمام عزیز و اقارب سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا۔ اپنی نظر میں چھوٹا مگر دوسروں کی نظر میں بڑا بنا دینا اور دونوں جہان میں مجھے خیر عطا کرنا کہ بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور تیری ثنا سب سے بڑی اور تیری پناہ عزت والی۔ اس لیے صرف اپنا محتاج رکھنا اور ہمیشہ، ہمیشہ اپنی شان کے حساب سے ہم سب پر اپنا رحم و کرم اور فضل کرنا۔ ازل سے ابد تک سب کو معاف کرنا کہ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیبُ

دعا گو

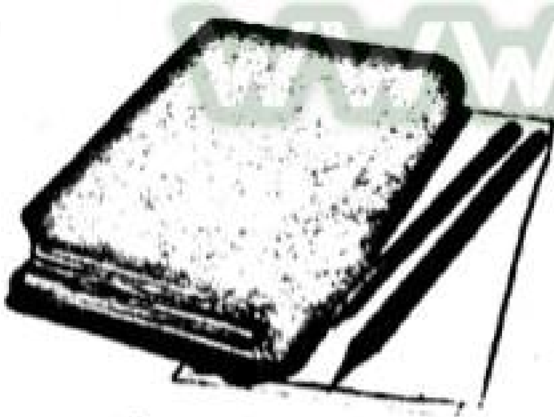
آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35895313 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری
عظمیٰ آفاق سعید

حمد ربّ ذو الجلال

تعریف اس کی ذات کی خاطر ہے جب تمام
دن رات اس کا ذکر کریں چشم ولب تمام
حق اس کی ذات پاک کا پھر بھی ادا نہ ہو
کرتے رہیں جو حمد بھی روز و شب تمام
لہجہ ترے حضور بھی میرا ہو منفرد
جس طرح چاہیں ذکر کریں اور سب تمام
ایسے عمل کروں کہ خدا مجھ سے خوش رہے
وقفہ یہ میری عمر کا ہو جائے جب تمام
تیرے سوا کسی کو بھی یارب خبر نہیں
قصہ میری حیات کا ہوتا ہے کب تمام
پلکوں پہ جتنے اشک ہیں روشن تیرے حضور
بن جائیں مغفرت کا ہماری سبب تمام
اس کے ہی ذکرِ پاک میں گزرے تمام عمر
محسن اسی کا ذکر کریں روز و شب تمام

شاعر: محسن علوی

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

نعت بحضور سرور کائنات ﷺ

وجہ تخلیقِ کائنات ہیں محمد ﷺ
رحمتوں کی دائمی برسات ہیں محمد ﷺ
جس نے توڑ ڈالیں رنگ و نسل کی سبھی رسمیں
ایسی عظیم الشان ذات ہیں محمد ﷺ
جس کے وِرد سے پوری ہوتی ہیں حاجتیں
ایسا حرفِ مناجات ہیں محمد
جس کے سننے سے مل جاتا ہے سکونِ قلب
ایسی حسین و خوشنما بات ہیں محمد ﷺ
اُن ﷺ جیسا حسیں نہ تھا، نہ ہے، نہ ہوگا کوئی
کامل منبعِ حُسنِ کائنات ہیں محمد ﷺ

از: سامعہ ملک پرویز، بھیرہ خان پور ہزارہ

اے ختم رسل ﷺ

اے صلّی علیٰ دل کی دنیا کچھ اور ہی پائی جاتی ہے
سرکار دو عالم ﷺ کی صورت آنکھوں میں سمائی جاتی ہے
اے سرورِ دیں ﷺ، اے ہادیِ کل، اے ماہ مبیں، اے ختم رسل ﷺ
وہ آپ ﷺ کا در ہے جس در پر تقدیر بنائی جاتی ہے
ہوتا ہے کرم کے وعدوں سے دردِ غم فرقت اور ہوا
اِک آگ بجھائی جاتی ہے، اِک آگ لگائی جاتی ہے

مرسلہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

اِک دن

حرم کے سامنے ہوں گی میں اِک دن
حالِ دل اپنا کہوں گی سب میں اِک دن
تیری چوکھٹ پہ رکھ دوں گی جبیں اپنی
تجھے رو کر منالوں گی میں اِک دن
تو میرا رب ہے، مجھ کو چاہتا ہے
کرے گا نور سے روشن جیون مرا اِک دن
تو مجھ سے ہوگا راضی، اتنا یقیں ہے
اسی امید پر آؤں گی ترے گھر میں اِک دن
بخش دے گا تو مجھے روزِ محشر
یہ وعدہ تجھ سے لینے آؤں گی اک دن
تیری حمد و ثنا لکھتی ہوں مولا
سناؤں گی حرم میں آکے اِک دن

کلام: عالیہ ضیا

مرسلہ: نور افشاں، شکارپور

ذکرِ اللہ

حضرت سلیمانؑ ایک عابد سے ملنے گئے اس نے کہا۔

''اے ابنِ داوٴدؑ، خداوندِ کریم نے آپ کو ایک بڑی سلطنت دی ہے۔''

آپؑ نے فرمایا......''مومن کے نامۂ اعمال میں ایک دفعہ سبحان اللہ کہنا اس تمام سلطنت سے بہتر ہے کیونکہ یہ جو کچھ ملا ہے سب فانی ہے ذکرِ اللہ لافانی ہے۔''

از: حمیرا نوشین منڈی، بہاوٴالدین

رزق کی تنگی ہو

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جب تم دنیا کی مفلسی سے تنگ آجاوٴ اور رزق کا کوئی رستہ نہ نکلے تو صدقہ دے کر اللہ تعالیٰ سے تجارت کرلیا کرو۔

مرسلہ: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

رمضان المبارک

رسولِ مقبول ﷺ کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ جس نے رمضان کے آنے کی خوشی منائی اللہ تعالیٰ اسے ایک سال تک خوشیاں نصیب فرماتا ہے اور جس نے رمضان المبارک کے جانے کا غم منایا اس سے ایک سال تک غم دور رہتا ہے۔

مرسلہ: صوفیہ اختر، نارتھ کراچی

فضائلِ شب قدر

☆ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جو شخص لیلۃُ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے (عبادت کے لیے) کھڑا ہو، اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔

☆ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رمضان المبارک کا مہینہ آیا تو حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے اوپر ایک مہینہ آیا جس میں ایک رات جو ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا تو گویا ساری ہی خیر سے محروم رہ گیا۔

☆☆☆

☆ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ شبِ قدر میں حضرت جبریلؑ ملائکہ کی ایک جماعت کے ساتھ آتے ہیں اور اس شخص کے لیے جو کھڑے یا بیٹھے اللہ کا ذکر کررہا ہے (اور عبادت میں مشغول ہے) دعائے رحمت کرتے ہیں اور جب عیدالفطر کا دن ہوتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ اپنے فرشتوں کے سامنے بندوں کی عبادت پر فخر فرماتے ہیں اور ان سے دریافت فرماتے ہیں۔

اے فرشتو......! اس مزدور کا جو اپنی خدمت پوری، پوری ادا کردے کیا بدلہ ہے......؟ وہ عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب! اس کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی اجرت پوری دے دی جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ فرشتو! میرے غلاموں نے اور باندیوں نے میرے فریضے کو پورا کردیا پھر دعا کے ساتھ چلاتے ہوئے (عیدگاہ کی طرف) نکلے ہیں......میری عزت کی قسم، میرے جلال کی قسم، میری بخشش کی قسم، میری اعلیٰ شان کی قسم، میرے بلند مرتبے کی قسم! میں ان لوگوں کی دعا ضرور قبول کروں گا پھر ان لوگوں کو خطاب فرما کر ارشاد ہوتا ہے کہ جاوٴ تمہارے گناہ معاف کردیے ہیں اور تمہاری برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیا گیا ہے۔

مرسلہ: مسز خان، کراچی

آخری رات میں بخشش

☆ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔ رمضان کی آخری رات میں امتِ محمدیہؐ کی مغفرت کردی جاتی ہے۔ عرض کیا گیا۔ یارسول اللہ کیا اس سے شبِ قدر مراد ہے، فرمایا نہیں......(یہ فضیلت آخری رات کی ہے شبِ قدر کی فضیلتیں اس کے

علاوہ ہیں) بات یہ ہے کہ عمل کرنے والے کا اجر اس وقت پورا دے دیا جاتا ہے جب کام پورا کر دیتا ہے اور آخری شب میں عمل پورا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بخشش ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: مسز قیصر قدیر، ٹورنٹو

نصیب اور محنت

امام غزالیؒ فرماتے ہیں اگر رزق، عقل اور دانشوری سے ملتا تو جانور اور بے وقوف بھوکے مرجاتے' انسان کی تمام پریشانیوں کی وجہ مقدر سے زیادہ چاہنا ہے اور قناعت پسندی کی کمی ہے۔ دنیا نصیب سے اور آخرت محنت سے ملتی ہے لیکن لوگ محنت دنیا کے لیے کرتے ہیں اور آخرت کو نصیب پر چھوڑ دیتے ہیں۔

مرسلہ: نرگس نسیم، صابہ موہڑہ چکوال

آیت الکرسی کی فضیلت

1۔ گھر سے جاتے وقت پڑھو تو ستر ہزار فرشتے آپ کی حفاظت کریں گے۔

2۔ گھر میں داخل ہوتے وقت پڑھو تو گھر سے محتاجی (غربت) دور ہو جائے گی۔

3۔ وضو کے بعد پڑھو تو ستر درجے بلند ہوں گے۔

4۔ رات کو سوتے وقت پڑھو تو ساری رات شیطان پاس نہیں آتا۔

5۔ ہر نمازِ فریضہ کے بعد پڑھو کبھی کسی کے محتاج نہ ہو گے۔

از: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

عیدی

''امی میں راشد سے شادی نہیں کروں گی...... آپ منگنی فوراً توڑ دیں۔'' مونا نے اپنی انگلی سے منگنی کی انگوٹھی اتار کر ماں کے سامنے پٹختے ہوئے کہا۔

''ارے کوئی وجہ بھی تو ہو، اتنا نیک لڑکا ہے وہ......''

''اماں سب سے بڑی بات' وہ میرے خوابوں کے شہزادے جیسا بالکل نہیں ہے...... چھوٹے قد کا، کالے، موٹے سے لڑکے سے میں شادی نہیں کر سکتی۔''

''کم شکل شوہر اپنی بیوی سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔'' اماں نے رازداری سے سمجھایا۔

''میری سہیلیاں اسے دیکھ کر میرا مذاق اڑائیں گی۔''

''اڑانے دے...... انہیں تو کالا بھی نہیں مل رہا۔''

مگر جب راشد کے گھر سے عیدی آئی سارے گھر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... کون سی چیز تھی جو نہ آئی ہو...... چار لان کے سوٹ، پانچ سلک کے...... سونے کی چین، انگوٹھی دیگر میچنگ علیحدہ...... پھر چینی، کھجلا دہبی ٹوکروں میں...... مٹھائی کے دو ٹوکرے، پھلوں کے ٹوکرے...... پوری سوزوکی اس کی عیدی سے بھری تھی۔

تب مونا نے اپنی سب چیزوں کی تصویریں موبائل پر ڈالتے ہوئے کہا...... ''اماں...... ایسی عیدی تو قسمت والیوں کی آتی ہے...... آپ ٹھیک کہتی ہیں...... کم شکل دولہا اپنی خوب صورت بیوی کا خیال زیادہ رکھے گا۔''

انجم انصار کے جلترنگ سے اقتباس
مرسلہ: شگفتہ شفیق، کراچی

ڈر

مجھے ڈر لگتا ہے
ہر اداس شام سے
یادوں کے کہرام سے
وفا کے الزام سے
وقت کی چال سے

بچھڑنے کے خیال سے
اپنے ہی اِک سوال سے
"کیا وہ میرا ہے؟"
شاعرہ: عنبرین اقبال، گاؤں بدر مرجان

مطابق

نکاح کے بعد ناصر نے مولوی صاحب سے پوچھا۔

"آپ نکاح پڑھانے کی فیس کیا لیں گے۔"

مولوی صاحب نے سر جھکائے گھونگٹ میں شرمیلی سی دلہن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔" اپنی بیوی کی خوب صورتی کے مطابق دے دو۔"

ناصر نے مولوی صاحب کو پانچ سو روپے دے دیے۔

مولوی صاحب کو ناصر کی چالاکی پر بڑا غصہ آیا۔

کسی مہمان خاتون کے آنے پر دلہن کا گھونگٹ اٹھایا گیا...... تو اچانک ہی مولوی صاحب کی نظر بھی دلہن کی جانب اٹھ گئی اور وہ شاکڈ رہ گئے۔

مگر فوراً چار سو روپے ناصر کے ہاتھ پر رکھ کر بولے بیٹا اپنے بقایا پیسے تو لے لو......

مرسلہ: رابیل شاہ، کراچی

چاند رات

تمہیں کچھ یاد ہے جاناں
وہ چاند رات
سجی تھی فلک پہ تاروں کی بارات
تکتے، تکتے اِک دوجے کو
تھام کے میرا ہاتھ
صبح دم جب کہا تھا تم نے
مدھم، مدھر سرگوشیوں میں
عید مبارک
چلے آؤ کہ آ گئی ہے پھر چاند رات

دل میں ہے اداسیوں کا راج
نہ کٹ سکے گی یہ شب
بن تیرے کیسے دیکھیں تاروں کی بارات
پلٹ آؤ تم رنگ و حُسن کی اس وادی میں
منائیں ہم بھی چاند رات
تھام کے تیرا ہاتھ
شاعرہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

دوست ملنے لگے

اجنبی چہرے اجنبی ترین در و دیوار لیکن پھر برف پگھلنے لگی۔ پھوار پڑنے لگی...... دھوپ چمکنے لگی۔ چاندنی چھٹنے لگی۔ معطر ہوا چلنے لگی، پھول کھلنے لگے۔ دوست ملنے لگے۔

دوستی

بلندی میں ہمالیہ سے بھی اونچی، سمندر سے بھی گہری اور بڑی ہے یقیناً شہد سے بھی بڑھ کر ہے میٹھی ہماری چین سے جو دوستی ہے۔

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کاش ایسا ہو

ٹوٹے ہوئے خوابوں کو دریچوں میں سجائے
یادوں کے جزیروں میں بھٹکتی رہوں کب تک
ایک بار پلٹ آؤ فلک سے میری خاطر
اللہ کی قسم تنہا پھر جانے نہ دوں گی
دلہن کی طرح خود کو میں پھر سے سجالوں گی
اس کالے لبادے کو کہیں دور چھپا دوں گی
بادل جو برس جائے پھر مرے آنگن میں
مل بیٹھ کے ہم گزری ہوئی باتیں کریں گے
تم روٹھی ہوئی چاندنی راتوں کو منانا
میں ٹوٹے ہوئے تاروں کو پلکوں سے چنوں گی
شاعرہ: نجمہ ناز اصغر، کراچی

☆☆☆



مشکلیں

اُف خدایا جاتے سے کس قدر تیاریاں کی گئی تھیں، ٹخنوں تک کی اونچی شلواریں ڈھونڈ ڈھانڈ کر پہنی گئیں، کمر تک کے چاک والی قمیص، پیروں میں پائلیں، گلے میں پازیب (کہ پیر سے زیادہ گلے میں سج رہی تھی) اور پھر وھانسو قسم کے بالوں کے اسٹائل جو بالوں کو الجھا، الجھا کر بنائے گئے تھے، گھر کی تمام لڑکیوں کا یہ پورا خیال تھا کہ امریکا سے آئے ہوئے عزم الحق کا عزم انہیں دیکھتے ہی پارہ، پارہ ہوجائے گا۔ (میک اپ میں چھ گھنٹے مزید خرچ ہوئے) ان کے لباس اور ان کی اسٹائلش جیولری کو دیکھ کر ان کی ماں بہنوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے کہ کیا انتخاب ہے ہمارا (یہ سب کی الگ الگ ذاتی رائے تھی)

اور وہاں جاکر، سب حیرت زدہ سی رہ گئیں۔ عزم، ان کے تصورات سے زیادہ حسین تھے، چہرے پر شائستگی اور وقار ان کی شخصیت کو مزید نکھار بخش رہا تھا۔ تعلیم کی ڈگریاں بہت زیادہ تھیں اور اب وہ مستقل طور پر پاکستان آگئے تھے (ہم سب کے چہروں کی سرخی مزید بڑھ گئی)

''کیا اب آپ، دوبارہ امریکا نہیں جائیں گے؟'' فرحت کے دل کی امیدیں، کچھ ٹوٹ سی گئی تھیں (اسے امریکا جانے کا شوق بھی بہت تھا)

''نہیں بھئی، ہر گز نہیں...... بہت رہ لیا وہاں اب اپنے وطن میں رہوں گا......!'' (چلو فرحت کی چھٹی ہوئی سطوت دل میں خوب ہنسی)

''یہاں تو آپ کو بہت پریشانی ہوگی۔'' سلمیٰ نے اپنے چہرے پر قصداً بال گرا کر پوچھا تھا۔

''کیسی پریشانی؟ میں تو ترس رہا تھا، یہاں آنے کے لیے، یہاں آکر تو مجھے ایسا لگا ہے کہ کسی جنت میں آگیا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، اتنی قابلیت پر تو پاکستان میں بھی آپ کو بہت اچھی جاب مل جائے گی۔ پھر یقیناً آپ شادی کے بعد خوش وخرم رہیں گے۔'' سطوت آرا نے زبردست شرماکر ان کی تائید کی تھی۔

''ہاں بھئی، اب شادی تو کرنا ہوگی، امریکا میں اسی وجہ سے نہیں کی کہ وہاں کی لڑکیاں مجھے بالکل نہیں بھائیں۔'' عزم آنکھیں بند کر کے سرشاری سے بولے۔

''ہائے اللہ آپ کتنے شریر ہیں۔'' (ہم سب دل میں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں)

''ارے لڑکیوں، اب اپنے بھائی کے لیے، کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈو۔'' عزم کی اماں، محبت بھرے لہجے میں گویا تھیں۔

''بھائی کے لیے....؟'' (ہم سب کے ذہنوں پر سنگ باری ہورہی تھی اور متوحش نظریں عزم کے چہرے کو پڑھنے کی ناکام کوششیں کررہی تھیں)

''اماں، ٹھیک کہہ رہی ہیں، آپ سب بہنوں کو ہی میرے لیے آئیڈیل مشرقی لڑکی کا انتخاب کرنا ہوگا۔'' عزم مسکرا رہے تھے (یا تمسخر اڑا رہے تھے)

''آپ کی آئیڈیل کی کیا صفات ہیں؟'' صاعقہ نے جھٹ دوپٹا سر پر منڈھ کر شرمیلی نظریں عزم کے پیروں میں رکھ کر پوچھا...... (چالاک تو وہ

ہمیشہ کی تھی)

"جو میری ماں کی خدمت کرے، میری بہنوں کے ساتھ چاہت سے رہے اور میری ذات سے وابستہ ہر کام خود کرنے میں فخر سمجھے، اور سب سے بڑی بات کہ سادگی سے رہے۔ یہ میک اپ، یہ فیشن دیکھ، دیکھ کر تو مجھے گھن آتی ہے۔ امریکا میں اتنے دن گزار کر، وہاں کی رنگ آمیزی سے دل میں کراہیت سی آگئی ہے، بس اب حسنِ سادہ کی تمنا ہے، جو اپنے حقیقی انداز میں میرے دل میں طمطراق سے بیٹھے......!" عزم الحق اب سب کی چاہتوں کا گلا خود ہی گھونٹ رہے تھے۔ (خبیث کہیں کے)

گھر آکر، سب کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔ جیولری اتار کر پٹخی جا رہی تھی، الجھے ہوئے بالوں کو سلجھانا الگ عذاب تھا۔

"توبہ ہے! خواہ مخواہ جا کر اس منحوس کی شکل دیکھ کر خوار ہوئے۔" سطوت آرا اپنے گلے سے گلوبند اتار کر اپنی گردن کو سہلا رہی تھیں، جو یہ بھاری بوجھ لاد کر سرخ سی ہوگئی تھی۔

"اُف گھر کتنا خراب تھا، ان کا، بڑا سا قالین...... بڑے، بڑے سے جہازی صوفے بڑا سا بے ڈول کمرا اور پر سے سب کے لمبے لمبے قد، ذرا بھی تو کبھی نیشن نہیں تھا۔" چھوٹے قد کی رقیہ، اپنا دو انچ اونچا جوڑا گدی سے نوچتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

"اوہو...... سادگی چاہیے موصوف کو، میک اپ سے نفرت ہے، بھائی کے لیے دلہن تلاش کرو، بھاڑ میں جائے، ایسا بھائی اور چولھے میں جلے سادگی۔" سلمیٰ، ان کی اماں کی نقلیں کرتے ہوئے نفرت سے بولی۔

"دیکھ لینا نہیں ملنے کی، موصوف کو پاکستان میں نوکری، دو چار مہینوں کے بعد امریکا بھاگتے نظر آئیں گے۔ پھر پوچھوں گی کہ اب حسنِ سادہ پسند ہے؟ یا فیشن کے سجے دلربا چہرے، جو تمہاری ذہنی

ٹینشن کو ختم کریں گے۔"

"اگر عزم از خود مجھ سے شادی کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کرتے تو میں ایمان سے صاف منع کر دیتی۔" فرحت کا غصہ دیدنی تھا۔

"اے ہے، اب ایسی بات بھی نہیں ہے، سب سے زیادہ بن ٹھن کے تو تم ہی گئی تھیں۔" بڑی آپا نے تمسخر سے کہا۔

"بالکل صحیح کہہ رہی ہیں بڑی آپا، عزم کے گیت سب سے زیادہ تم نے گائے تھے، ہم تو شاید جاتے بھی نہیں صرف تمہاری بیان بازیوں کی وجہ سے وہاں بیکار میں چلے گئے اور خوار ہوئے۔" وجیہہ نے تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے، عزم اچھے ہیں اور اچھے رہیں گے مگر......" فرحت نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنے ہاتھ پر دوسرا گھونسا مارا۔

"مگر کیا......؟" (ہم سب ایک کورس کی آواز میں چیخے)

"مگر مجھے عزم کی اماں پسند نہیں آئیں، بڑی تیز طرار اور سلیقہ مند خاتون ہیں، ایسی نک سک سے درست عورتیں اپنی بہوؤں کا ناطقہ بند کر دیا کرتی ہیں۔"

"پاگل ہو تم ان کی اماں سے کیا واسطہ....؟ بکواس کر رہی ہو تم۔" (ہم سب پھر چیخے) جیسے کہہ رہے ہوں کہ اپنی شکست کا اعتراف تم بھی کر لو، بیکار کی بکواس نہ کرو)

"پاگل میں نہیں، تم سب ہو، ہمارے یہاں آدھی زندگی شوہر کے ساتھ اور آدھی سے زیادہ شوہر کے گھر والوں کے ساتھ گزرتی ہے اور میں تو ایسی سسرال دیکھوں گی جو ہر حال میں مجھ سے کم تر ہو تاکہ میاں میری قابلیت کے گن بہ آسانی گا سکیں اور عزم صاحب مغربی معاشرے میں رہنے کے باوجود، ایک دبو قسم کے بیٹے تھے جن کو زن مرید شوہر بنانا خاصا مشکل مسئلہ تھا اور ایسی مشکلیں مجھے کبھی پسند نہیں رہیں، جنہیں

آسان کرنے میں زندگی بسر ہو جائے۔''

تماشا

میں شگفتہ کے ہاں نہیں جاتی، رشتے داری گو خاصی قریبی ہے اس کے باوجود بھی کم، کم ہی جاتی ہوں جبکہ وہ میرے ہاں خاصی لپک، لپک کر آتی ہے۔ جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میرے پانچ دیور اور سات بھائی ابھی غیر شادی شدہ ہیں۔

شگفتہ اس ٹائپ کی لڑکی ہے جسے مردانہ محفلوں میں بیٹھ کر خوب لطف آتا ہے۔ جہاں اس کے قہقہے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ اس کے ناز و ادائیں اٹھانے کے لیے سب ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے لگتے ہیں۔ تب اس کا لہجہ میٹھا اور دلنشیں ہوتا ہے۔ وہ کوئی جملہ بولنے سے پہلے ہونٹوں پر نچا کر ادا کرتی ہے۔ ہنسنے سے پہلے مسکراہٹ کی توپیں داغتی ہے۔ جبکہ خواتین سے بات کرتے ہوئے وہ اکثر کنی کتراتی ہے، بعض سے جھینپ کر ایک آدھ جملہ ادا کر کے رفو چکر ہونے کی تاویلیں ڈھونڈتی ہے اور جو کسی کھاتے کی نہیں ہوتیں، انہیں چیرتی نگاہوں اور پھنکارتی سانسوں سے ایسے دھکے دیتی ہے کہ خاندان کی بہتیری عورتیں اسی کی وجہ سے لنگڑی لولی ہوئیں اور جو بچ گئیں ان پر ایسا دہکتا ہوا لاوا اپنے منہ سے مارا کہ سب کے جسموں پر آبلے پڑ جائیں۔ اب شگفتہ اپنی شگفتہ بیانی سے پورے خاندان میں ''اِن'' سمجھی جاتی ہے کہ خواتین سیکشن اس کے خلاف کچھ بول ہی نہیں سکتا......اور جو بولنا چاہتا ہے وہ پہلے اپنے آبلے سہلاتا ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ سچائی کے ہاتھوں دردناک چرکے سہنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ خاموش ہو کر تماشا دیکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب شگفتہ کو دیکھ کر ناقدین کی نہیں تماش بین خواتین کی بھیڑ زیادہ لگتی ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے

سارا گھر ہکا بکا تھا کہ آخر مجھے ہو کیا گیا ہے میں جو منہ تک گھر والوں کے اصرار پر دھویا کرتی تھی، ملامتیں سن کر کپڑے تبدیل کرتی تھی اور پھٹکاریں کھا کر بال بنایا کرتی تھی اچانک اتنی برق رفتاری کہاں سے آگئی تھی کہ نہا دھو کر فرشی غرارہ پہن لیا تھا بالوں کا بڑا سا جوڑا بنا لیا تھا۔

آپا سے مانگ کر ان کا جڑاؤ سیٹ پہن لیا تھا، بھابی کی خوشامد کر کے اپنا میک اپ کروا لیا تھا (کہ وہ بہترین بیوٹیشن بھی تھیں)

''کہاں جا رہی ہو، تم......؟'' سب سے پہلے منجھلی بھابی نے اپنی حیرانی چھپا کر پوچھا تھا۔

''کسی نے بلایا ہے......؟'' جیسا سوال گہرا تھا، اسی طرح کا جواب بھی کھائی نما تھا۔

''ہوں، کسی سہیلی کی شادی ہوگی......اسی میں سج سجا کر جایا جا رہا ہے۔'' بڑی آپا نے منجھلی بھابی کے سوال کی گہرائی بھرنے کی کوشش کی۔

''نہیں، تو، میری سہیلیوں کے ایسے بھاگ کہاں جو ان کی شادیاں اتنی جلدی ہو جائیں گی......'' میں نے بھابی کو کلس کر دیکھتے ہوئے آپا کو پریم سے جواب دیا۔

''تو پھر کہاں جا رہی ہے اس طرح......؟'' اماں کے حواس معطل ہونے لگے (کہ خدانخواستہ میں ان کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہوں)

''افوہ، مشاعرے میں شرکت کرنے جا رہی ہوں تو کیا سلیقے سے بھی نہ جاؤں، تم ہی لوگ باتیں بناؤ گے جب مجھے سر جھاڑ، منہ پھاڑ، ٹی وی کے مشاعرے میں غزل پڑھتے دیکھو گے۔'' میں نے اترا کر کہا۔

''ہائیں، کیا تو مشاعرے میں غزل بھی پڑھے گی؟'' اب سب کورس میں چیخ کر پوچھ رہے تھے۔

''جی ہاں، پڑھ رہی ہوں، میں ایک

غزل......!"

"ابھی تو مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ کیا پڑھوں گی، ذرا تیار ہو جاؤں تو غزل لکھتی ہوں۔" میں تھوڑا اترائی۔

"بیلا، کیوں اپنا مذاق اڑائے جا رہی ہو اردو لکھنا تو درکنار، تمہیں تو صحیح طرح سے پڑھنا تک نہیں آتا۔" آپا نے غصے سے کہا۔

"ہونہہ، آپ کو کیا پتا کہ مجھے کیا آتا ہے اور کیا نہیں آتا اب مجھے مشاعرے میں مدعو کیا گیا ہے تو کیا میں انکار کر دیتی۔ اچھے، اچھے لوگ ٹی وی پر اپنا چہرہ دکھانے کے لیے بلکتے ہیں اب مجھے خود یہ موقع مل رہا تھا تو کیا منع کر دیتی؟" میں نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"اگر شاعرہ ہوتیں تو ٹھیک تھا، اب مذاق اڑانے سے بہتر نہیں کہ تم اسٹیج پر بیٹھنے کے بجائے سامعین میں جا کر بیٹھ جاؤ ورنہ اس قدر ہوٹنگ ہوگی کہ ساری زندگی نہیں بھلا پاؤ گی۔" بھابیوں نے دہلایا۔

"حیرت ہے، آپ لوگ ایسی باتیں کر رہی ہیں مشاعروں میں 75 فیصد نمبر صرف ترنم کے ہوتے ہیں اور 25 فیصد شخصیت کے، جب میں اپنی خوب صورت آواز میں کچھ بھی پڑھوں گی تو سامعین اور ناظرین سوائے میرے چہرے کی بلائیں لینے کے کچھ اور نہیں کر سکیں گے آپ دیکھیے گا کہ میری غزل یا نظم جو کہ ابھی مجھے لکھنی ہے سن کر کس قدر مکرر، مکرر کے نعرے لگیں گے۔"

"ایمان سے......!" بھابیوں کے چہرے بجھ سے گئے۔

"ہوسکتا ہے مجھ سے آٹو گراف لینے والوں کا بھی تانتا بندھ جائے۔" میں نے آنکھ دبا کر کہا۔

"اب ایسی بھی کمی نہیں شاعرات کی کہ تمہیں یوں بھاگ لگیں گے۔" منجھلی بھابی نے کمر توڑنے کی ہمت کی۔

"مجھ جیسی شاعرات تو ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں کہ وہ کمیاب پائی جاتی ہیں کہ آخر لوگ ٹی وی پر چہرہ بھی دیکھتے ہیں۔"

پہچانیے

بعض مرتبہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے......مگر پہچان پر ہے ناز تو پہچان جایئے......خاتون کوئی بھی ہوں جوان ہوں یا مڈل ایج والی مگر بال بناتے ہوئے وہ یہ خیال رکھیں کہ ان کے سینے اور چہرے پر آ رہے ہوں۔ دوپٹا اوڑھتے ہوئے یہ خیال رکھا جائے کہ وہ سینے پر نہ آنے پائے۔ مہمان سے بات خلیمی سے شروع ہو......مگر پھر اس کو اچھا خاصا تپایا جائے......اگر وہ گفتگو کرنے میں محتاط ہو تو وہ محترمہ ان کے منہ میں خود سوال ڈالیں تو......آپ پہچان کیوں نہیں رہے......ایسی خواتین ہمارے ٹی وی چینلو کی اینکرز ہیں...جن کی چبھتی ہوئی آوازیں برملا اپنے ناظرین سے یہی کہتی ہیں......کہ ریموٹ کا استعمال کرو......اور اپنا چینل تبدیل کرلو......کہ اب اتنی برداشت کہاں رہی ہے ہماری کہ زیادہ تر......ایسی ہی ہیں۔

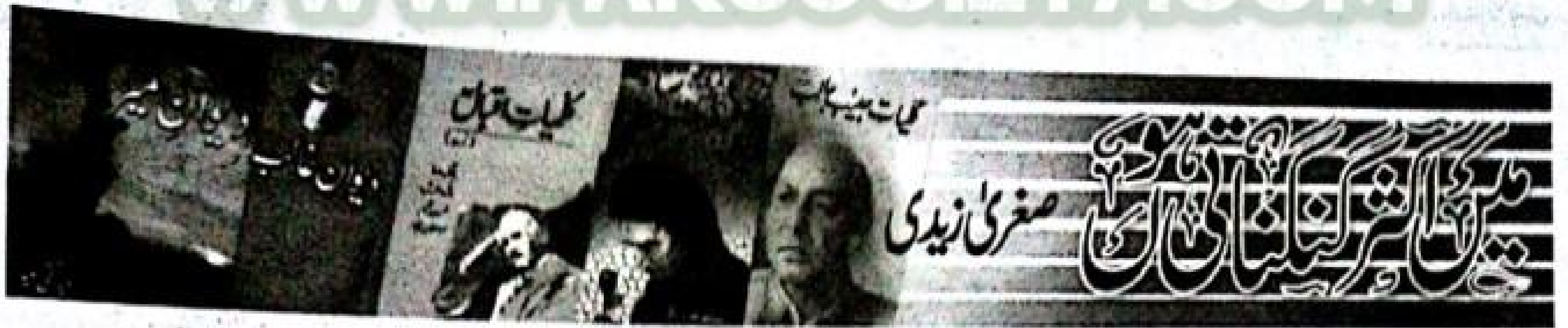
فری

"کیا آپ کے میاں ہمیشہ چیخ کر بات کرتے ہیں؟ آپ کی بات، آپ کا موقف سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے......؟

دورانِ گفتگو ان کی آنکھوں سے نفرتوں کے شرارے بھی ابلنے لگتے ہیں......اور میں نہ مانوں کی تفسیر بھی بن جاتے ہیں۔

اپنی بات کو وزن دار بنانے کے لیے وہ میز پر ہاتھ بھی مارتے ہیں......تو آپ انہیں کسی بھی ٹی وی چینل میں بھرتی کروادیں...... وہ کسی بھی ٹاک شو میں شرکت کر کے پروگرام کی ریٹنگ بڑھا دیں گے اور آپ کو فری میں اپنے میاں جی کی شہرت مل جائے گی۔ ایک پنتھ اور دو کاج اسی کو تو کہتے ہیں۔

☆☆☆



☆نازنین آفریدی......پشاور

اپنے سامان کو باندھے میں اسی سوچ میں ہوں
جو کہیں کے نہیں رہتے، وہ کہاں جاتے ہیں

☆صائمہ سجاد بنگش......کوہاٹ

بکھرتی جاتی ہوں اپنے وجود میں ایسے
کہ جب بھی سانس لیتی ہوں تو بے آواز روتی ہوں

☆کوثر خالد......جڑانوالہ

شاید شبِ وصال کی منزل قریب ہے
کانوں میں آرہی ہے کسی کی صدا مجھے

☆جبین ناز......ملتان

شہر کچھ درد کے آباد کروگے تم بھی
ہم نہ ہوں گے پہ ہمیں یاد کروگے تم بھی

☆ماہم مشاہد......کراچی

دیکھے گا ہر اِک شخص محبت کی نظر سے
اب رنگِ وفا شہر میں پھیلا ہوا یوں ہے

☆عروبہ ناز......کوٹلی

میرے ہم سفر تری نذر ہیں مرے جذبۂ دل کی یہ شدتیں
میرے خواب میری بصارتیں میری دھڑکنیں میری چاہتیں
میرے روز وشب کے نصاب ہیں میرے پاس اپنا تو کچھ نہیں
تیرا قرض ہے میری زندگی میری سانسیں تیری امانتیں

☆شہلا محمود......واہ کینٹ

مرے مزاج میں شامل نہ تھا یہ روکھا پن
کسی نے چھین لیں مجھ سے شیرینیاں میری
سکھا رہے ہیں مجھے جھوٹ بولنا کچھ لوگ
انہیں پسند ہی نہیں نکتہ چینیاں میری

☆نفیسہ نہال......لاہور

تعبیروں کی حسرت میں کیسے، کیسے خواب رہے
دولت اِک دن برسے گی اب تو اپنی باری ہے
اللہ جب بھی دیتا ہے، چھپر پھاڑ کے دیتا ہے
اس امید پہ ساری عمر چھپر تلے گزاری ہے

☆کائنات عبدالحلیم......میرپور خاص

اُڑا کے لاتی ہے شاید خیال کی خوشبو
تمہاری سمت ضرورت سے میں نہیں آیا
ترے قریب بھی یاد آرہے ہیں کارِ جہاں
بہت قلق ہے کہ فرصت سے میں نہیں آیا

☆نیلوفر خان......بہارہ کہو

مجھے بچوں کی آنکھوں میں وہ سارے رنگ ملتے ہیں
جنہیں چھونے سے آئے زندگی کی خواہشیں کرنا

☆بشریٰ رضوی......کراچی

کوئی کسی کے کہے سے کبھی رکا ہی نہیں
وہاں رکا ہے جہاں آب و دانہ پڑتا ہے
بگڑ رہا ہے کچھ ایسا توازنِ ہستی
کسی کا بوجھ کسی کو اٹھانا پڑتا ہے

☆ارم کمال......فیصل آباد

احساسِ ندامت ،اِک سجدہ اور چشم تر
اے خدا کتنا آساں ہے منانا تجھ کو

☆ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک

میرے سر پر کبھی افسوس کا سایہ نہ رہا
رنج تھا جس کی جگہ میں نے شکایت لکھا
اتنے دعووں سے گزر کر یہ خیال آتا ہے
عزم کیا تم نے کبھی حرفِ ندامت لکھا

☆ گل شاہین...... رحیم یار خان
نماز پڑھ کر ترے غم گلے لگاؤں گا
اکیلے عید منانا مری سرشت نہیں
☆ نرگس نسیم...... صابہ موہڑہ
کسی کے آنچل میں کھو گئے تم بتاؤ کیوں دور ہو گئے تم
کہ جان دے کر بھی حق وفا کا ادا کریں یہ طے ہوا تھا
☆ انیقہ انا...... چکوال
دل میں اترے گی تو پوچھے گی جنوں کتنا ہے
نوکِ خنجر ہی بتائے گی کہ خوں کتنا ہے
آندھیاں آئیں تو سب لوگوں کو معلوم ہوا
پرچم خواب زمانے میں نگوں کتنا ہے
☆ عنبر وسیم...... گوجرانوالہ
خفا ہے ایک جہاں اہلِ شوق سے یارو
رخِ حیات نئی سمت کو جو موڑا ہے
کسی افق پہ نہ جب روشنی نظر آئی
مری نگاہ نے رشتہ خلا سے جوڑا ہے
☆ ارم خان...... ڈی جی خان
میری اک تمنا چھوٹی سی
وہ بھی لگتی ہے اب ٹوٹی سی
ایک چبھن سی دل میں ہوتی ہے
رہتی ہے محبت کیوں روٹھی سی
☆ حمیرا نوشین...... منڈی بہاؤالدین
میرا ملنا مشکل نہیں ہے
تو جب چاہے مجھے زنجیر کرلے
کوئی جادو نہیں چلتا ہے مجھ پر
محبت سے مجھے تسخیر کرلے
☆ فردوس شاہی...... لاڑکانہ
میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمیں کو کھود کر فرہاد بن گئے
☆ نگینہ ضیا بنگش...... کراچی
کوئی کنکر بھی جمود نہ توڑ سکا
دل کے سمندر میں سناٹے ایسے تھے

☆ پروین افضل شاہین...... بہاول نگر
میری مصروفیت کے غار سے بھاگے ہوئے لمحے
تری یادوں کی ٹھنڈی بستیوں میں قید رہتے ہیں
☆ ارم طاہر...... راول پنڈی
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
☆ زرینہ خان...... بہارہ کہو
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
☆ ثوبیہ نذیر...... فیصل آباد
منافقت کا نصاب پڑھ کر محبتوں کی کتاب لکھنا
بہت کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پر داستانِ بہار لکھنا
☆ انجم طاہر...... کراچی
تنہا سمجھ رہے ہیں مرے دل کو چارہ گر
دنیا بسی ہے اس میں کسی کے خیال کی
☆ ماہ نور قیصر...... راول پنڈی
اس کی بلا سے ڈوبنے والا کوئی بھی ہو
دریا کو تو بس اپنی روانی سے کام ہے
☆ شبانہ ملک...... ڈی جی خان
وقت یونہی سب کو آئینہ دکھاتا ہے
کوئی یاد رکھتا ہے کوئی بھول جاتا ہے
☆ رابعہ شاہد...... دبئی
خوشی یہ تھی کہ طوفانوں سے بچ کر آ گئی کشتی
الم یہ ہے کہ ٹکڑے ہو گئی ساحل سے ٹکرا کر
☆ نگہت اعوان...... سرگودھا
اس شہرِ بے مثال میں اک مجھ کو چھوڑ کر
ہر شخص لاجواب ہے، ہر شخص باکمال
☆ غزالہ طارق...... سرگودھا
آج پلکوں کی منڈیروں پہ بہت رونق ہے
دیکھ سکتے ہو تو اشکوں کا چراغاں دیکھو

☆☆☆





آم کی بہار

پیاری اور خوش ذائقوں کی رسیا بہنو! اس مرتبہ آپ آم، کیری، اور امبی کے مختلف مشروبات، چٹنیاں اور ڈشز سے لطف اندوز ہوں کیونکہ موسمی پھل و سبزی سے فائدہ اٹھانا ہمارا حق ہے۔ سب سے پہلے نورتن چٹنی ہے جو بے حد آسان ہے۔

اجزا: کیریاں ایک کلو، لہسن، ادرک باریک کٹا ہوا۔ دونوں ملا کر آدھا کپ۔ بادام، چھوارے اگر پسند ہوں تو دونوں ملا کر آدھا کپ باریک کاٹ لیں۔ لال ثابت مرچ پندرہ سے بیس عدد...... گہرے رنگ کا سرکہ...... تین کپ، نمک حسب ذائقہ، کلونجی دو کھانے کے چمچ...... (چن کر صاف کرلیں) سوکھا پودینہ، دو کھانے کے چمچ، گڑ ایک کلو...... گاڑھا شیرہ بنا کر چھان لیں یا ایک کلو سے ایک کپ کم شکر استعمال کر سکتی ہیں۔ وہ ڈائریکٹ بھی ڈال سکتی ہیں۔ پانی، دو کپ، زردے کا رنگ ایک چائے کا چمچ۔

ترکیب: کیریوں کو دھو کر چھیل لیں اور گٹھلیاں نکال کر کاٹ لیں۔ ایک اسٹیل کی پتیلی میں پانی اور کیریاں چڑھا دیں۔ پانی زیادہ نہ ہو جائے۔ تھوڑی ادھ گلی ہوں تو کلونجی کے سوا تمام اجزا ڈال دیں۔ جب کیریاں اچھی طرح نرم ہو جائیں اور ایک یکجان آمیزہ لگنے لگے تو ہلکا سا چکھیں، کھٹاس زیادہ لگے تو چینی یا گڑ مزید ڈال سکتی ہیں۔ نمک بھی چیک کرلیں پھر اچھی طرح ملا کر اور کلونجی بھی ڈال کر اتارلیں اور ٹھنڈا کر کے خشک کی ہوئی شیشے کی بوتلوں میں بھرلیں۔ یہ چٹنی ایک سیال آمیزے کی صورت ہوگی۔

آم کا جیم یا مربہ

اجزا: کیری آدھا کلو، چینی آدھا کلو۔ سرکہ ایک کپ، پانی 1/2 کپ۔ زردے کا رنگ، آدھا چائے کا چمچ۔ پسند ہوں تو چہار مغز یا خربوزے کے بیج چھیل کر ملا سکتی ہیں۔

ترکیب: کیریوں کو دھو کر چھیل کر ثابت ہی سرکے اور پانی کے ساتھ گلا لیں پھر ٹھنڈا ہونے پر ہاتھ کی مدد سے گٹھلی سے تمام گودا الگ کرلیں اور چینی اور زردے کے رنگ کے ساتھ خوب پکائیں کہ گاڑھا ہو جائے۔ حسب پسند چار مغز اور چاندی کے ورق بھی ملا سکتی ہیں۔ ٹھنڈا ہونے پر جیم کی بوتلوں میں بھرلیں...... سحری میں بالائی اور پراٹھوں کے ساتھ کھائیں بہت مزیدار لگے گا۔

رباب نقوی، کراچی

کیری کی لونجی یا لہسن اچار

اجزا: کیری، دو عدد۔ لہسن پیسٹ آدھی پیالی، سرخ کٹی مرچیں، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، حسب پسند۔ تیل سرسوں کا اگر نہ ہو تو کوئی بھی کوکنگ آئل لے لیں۔

ترکیب: کیریوں کو دھو کر بیچ میں سے گٹھلی الگ کرلیں اور باریک پیاز کی صورت کیری کاٹ لیں۔ اب اس میں لہسن، مرچ، نمک اور تیل اچھی طرح ملا کر اس برتن کو دھوپ میں رکھ دیں۔ دو دن دھوپ میں رکھیں۔ نرم پڑ جائیں گی...... اب اسے سادی روٹی دال چاول، کھچڑی، حتیٰ کہ بریانی کے ساتھ بھی مزے لے لے کر کھائیں۔

ماہ نور خان، بہارہ کہو

کیری کا شربت

اجزا: کیری، ایک کلو۔ چینی، ایک کلو۔ یا ضرورت کے حساب سے۔ برف کچلی ہوئی۔ پانی حسب ضرورت

ترکیب: کیریوں کو دھو کر چھیل کر بڑے بڑے ٹکڑوں کی شکل میں کاٹ لیں گٹھلی الگ کرلیں۔ اب بلینڈر جگ میں کیری، چینی اور پانی ایک اندازے سے کر کے ڈالیں اور خوب باریک بلینڈ کرلیں۔ ایک جگ میں نکال کر اس میں کچلی ہوئی برف ڈالیں اور چکھ کر دیکھیں۔ کتنا کھٹا میٹھا ہے۔ کھٹا زیادہ ہو تو چینی کا شیرہ بنا کر اس میں ڈالیں اور حسب ضرورت شربت بنائیں۔

یہ آمیزہ بنا کر فریزر میں بھی رکھ سکتی ہیں۔ استعمال کے وقت دو ڈش والے چمچ بھر کے ایک گلاس کے لیے نکالیں ٹھنڈا یخ پانی یا کچلی ہوئی برف ڈالیں۔ ضرورت ہو تو تھوڑا شیرہ ڈالیں اور پیش کریں...... اس میں چونکہ چینی زیادہ پڑتی ہے اس لیے شیرہ الگ سے بنا کر ضرور تیار رکھ لیں۔ بہت آسان اور سستا مشروب ہے۔ بوتلوں میں بنا کر فریج یا فریزر میں بھی رکھ سکتی ہیں۔ افطار میں استعمال کریں بچوں کو سوفٹ ڈرنکس کی یلغار سے بچائیں۔

ثمنہ بتول، بہارہ کہو

آم کا رائتہ

اجزا: پکے ہوئے تیار آم، آدھا کلو۔ دہی، آدھا کلو۔ نمک، حسب ذائقہ۔ زیرہ سفید پسا ہوا، دو کھانے کے چمچ۔ کالی مرچ، حسب ذائقہ۔ سرخ کٹی مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ پودینے کے پتے دس سے بارہ باریک کاٹ لیں۔

ترکیب: آم کا گودا نکال کر دہی کے ساتھ خوب پھینٹیں۔ اب اس میں دیے گئے مسالے بھی ملائیں اور پودینے کے پتے بھی جب کوئی سالن کھانے کا دل نہ چاہے تو اس رائتے سے لطف اندوز ہوں۔ مقوی بھی ہے زود ہضم بھی اور مزیدار بھی...... روٹی یا چاول کے ساتھ بھی کھا سکتے ہیں۔

نفیسہ آرا، راس الخیمہ

آم یوگرٹ

یوں تو آج کل یوگرٹ ہر فلیور میں دستیاب ہے مگر آم کا یوگرٹ آپ خود بنا سکتی ہیں۔

اگر آپ خود گھر میں دہی جماتی ہوں تو اس مرتبہ دودھ میں آم بلینڈ کر کے شامل کریں اور دہی جمائیں ورنہ بازار کے دہی میں آم کا گودا شامل کریں اور لطف اندوز ہوں۔ اس میں چینی ملانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح دہی آم کی لسی سے بھی فیض اٹھائیں۔ یہ چیزیں کم خرچ ہیں، ایک آم سے بھی یہ بن سکتا ہے۔ سحری کے لیے بھی بہت اچھا رہے گا۔

فرزانہ نگہت، راول پنڈی

چکن پالک پکوڑے

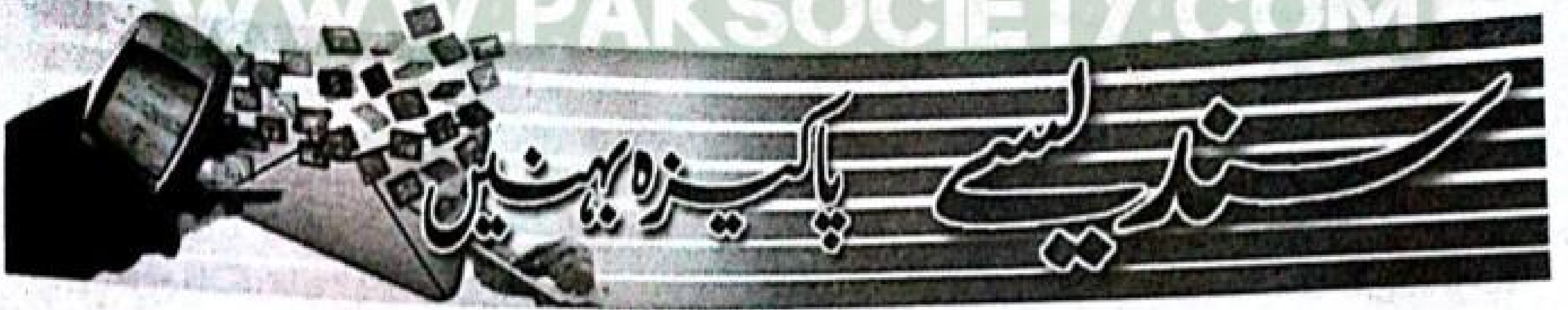
اشیا: چکن بون لیس، آدھا کلو۔ بیسن پاؤ، کھانے کا سوڈا، چٹکی بھر۔ پالک، ایک پاؤ۔ نمک، سرخ کٹی مرچ، حسب ضرورت۔ زیرہ سفید، ایک کھانے کا چمچ۔ انار دانہ، کٹا ہوا ایک کھانے کا چمچ۔ تیل، فرائی کے لیے۔ ہری مرچ، آٹھ سے دس کاٹ لیں۔

ترکیب: چکن بھاپ دے کر گلالیں۔ بیسن نمک، زیرہ، مرچ اور سوڈا ڈال کر تھوڑا گاڑھا پھینٹ لیں...... اب اس میں باریک کٹی پالک، ہری مرچ اور انار دانہ ڈال کر ملائیں اور پھر نرم کی ہوئی بوٹیاں ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

وقت ضرورت کڑاہی میں تیل گرم کر کے ہاتھ سے یا چمچ سے ایک، ایک بوٹی اس آمیزے سے پکوڑے کی صورت لے کر کڑاہی میں ڈالیں اور گولڈن فرائی کرتی جائیں اور سنہری ہو جائیں تو خاکی کاغذ پر اتار لیں۔ کیچپ یا ہری چٹنی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

صبا سجاد، دبئی





منگیتر کے نام

سنو
پچھلے سال جیسی
عیدی مت لانا
ورنہ میری بھابیاں
میرا مذاق اڑائیں گی

از: فرحانہ ناز، لاہور

میاں جی کے نام

تمہارے ہونٹوں پر ہنسی
ہوتی ہے اور
دل میں زہر
میرے میکے میں جب
تم آیا کرو
تو زہر کی پوٹلی باہر
پھینک کر آیا کرو

از: عزت بیگم، سندھ

نمائش

ہم سے محبتوں کی نمائش نہ ہو سکی
ہاں اتنا جانتے ہیں، تجھے چاہتے ہیں ہم

از: منور شہزادی، گوجرانوالہ

مشورہ

اتنی مہنگائی کے بعد
تمہاری وہی عیدی
صرف پانچ سو روپے
اب بہت کم لگتے ہیں
جانو یا تو عیدی بڑھا دو
ورنہ اپنی بہنوں کی عیدی

کم کردو

مرسلہ: ایس، این، لاہور

وہ سب

گم ہوئے وہ دن سارے
کھو گئے وہ سب دوست ہمارے
تارے، جگنو، پھول اور خوشبو
سب ہوئی پرانی باتیں
اے خدا تو وہ دن لوٹا دے
مجھ کو وہ سب دوست ملا دے

مرسلہ: نورین شہزاد، کراچی

کیسے ہو سکتا ہے

میں چپ رہوں کبھی بے وجہ ہنس پڑوں محسن
اسے گنوا کے عجب حوصلے تلاش کروں

از: فرح ناز، ملکوال

ممکن

یقین اور دعا نظر نہیں آتے...... مگر ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔

از: ممتاز خانم، کراچی

اس برس

اس برس کچھ کہہ دو تم بھی
اس برس کچھ سوچو تم بھی
جیون کی تجارت میں
اب اور خسارہ کیا دو گے
تم لفظوں کے سوداگر تھے
مہکتے جذبوں کے پیامبر تھے
کچھ لفظ اب ہم کو دان کرو
اس ہجر سے اب آزاد کرو

شاعرہ: ظل شاہین، رحیم یار خان

ایک پیار بھرا پیغام

اپنی پاکیزہ بہنوں کے نام

یہ نہ سمجھ کہ بچھڑا ہوں تو بھول گیا ہوں تجھے
تیرے ہاتھوں کی خوشبو میرے ہاتھوں میں آج بھی ہے
یہ اور بات مجبوریوں نے نبھانے نہ دی دوستی
ورنہ شامل تو میری وفاؤں میں آج بھی ہے

از: نرگس نسیم، صابہ موہڑہ

انتظار

کتنے انمول ہوتے ہیں یہ خلوص کے رشتے بھی
کوئی یاد نہیں بھی کرے انتظار پھر بھی رہتا ہے

مہرین ضیا بنگش، کراچی

پتھر مزاج

پتھروں کے تو مزاج نہیں ہوتے مگر پتا نہیں
لوگ کیوں پتھر مزاج ہوتے ہیں

مینا آفریدی، کلفٹن کراچی

پاس

دل میں رہنے والے رستے
کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں
وہ کہیں بھی نہیں جاتے
ہمارے پاس رہتے ہیں

شاعرہ: صائمہ بنگش، کوہاٹ

ایسا بھی ہوتا ہے

☆ایک اسٹائلش بوائے ہماری کلاس میں آیا۔ بہروپیا تھا۔ ساری لڑکیاں دیکھتے ہی دیوانی ہو گئیں۔ لڑکے نے آتے ہی کچھ کہا تو ساری لڑکیاں بے ہوش ہو گئیں۔ سوچیں کیا کہا ہو گا اس نے......

ذرا اور سوچیں...... تھوڑا سا اور سوچیں......چلیں ہم بتاتے ہیں......اس لڑکے نے کہا تھا۔ باجی! جگہ دینا جھاڑو لگانا ہے۔

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

بہت پیاری بہن نور آپی کے نام

کچھ اپنی فکر نہ اپنا خیال کرتی ہوں
تو کیا یہ کم ہے کہ تیری دیکھ بھال کرتی ہوں
میری جگہ پہ کوئی اور ہو تو چیخ اٹھے
میں اپنے آپ سے اتنے سوال کرتی ہوں
اگر ملال کسی کو نہیں میرا نہ سہی
میں خود بھی کون سا اپنا ملال کرتی ہوں
یہ چاند اور رات رفیق ہیں میرے
میں روز ان سے بیاں اپنا حال کرتی ہوں
تمہاری یاد بھی آتی ہے اب مجھے کم کم
تمہارا ذکر بھی اب خال خال کرتی ہوں

از: کائنات ارشد، شورکوٹ کینٹ

نظم

وہ تمہارے وجود کی گرمی
وہ تمہاری بانہوں کی گرفت
وہ تمہارے لبوں کی مٹھاس
وہ تمہاری باتوں کی خوشبو
وہ تمہاری آنکھوں سے چھلکتا پیار
وہ تمہارا جذباتی والہانہ پن
وہ تمہارا میرے ڈگمگاتے وجود کو سنبھالنا
وہ تمہاری آغوش کا اپنا پن
وہ سرد راتوں میں
میرے ٹھنڈے کپکپاتے وجود کو
اپنی گود میں بھر کر
شدتِ جذبات سے مجھے لپٹا لینا
اس پیار میں کیسی طمانیت تھی
آخر میں کس، کس چیز کو یاد کروں
آج اتنی شدت سے تمہاری یاد آ رہی ہے
کیوں نہ یاد آئے گی
آج دن ہی ایسا ہے
آج عید ہے میری ماں......

شاعرہ: مسز نگہت غفار، کراچی



روحانی مشورے

ادارہ

دعا کی قبولیت اور شیطان کی گرفتاری

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ جب رمضان شریف کی پہلی رات ہوئی تو سرکار دو عالم ﷺ (لوگوں سے خطاب کرنے کے لیے) کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کر کے ارشاد فرمایا۔

اے لوگو! تمہاری طرف سے تمہارے دشمن جنات کے لیے خداوند تعالیٰ کافی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے تم سے دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے چنانچہ کلام پاک میں ارشاد ہے۔ مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ خوب سن لو! خداوند قدوس نے ہر سرکش شیطان پر سات فرشتے نگرانی کے لیے مقرر فرمادیے ہیں، لہٰذا اب وہ ماہ رمضان گزرنے تک چھوٹنے والے نہیں ہیں اور یہ بھی سن لو! کہ رمضان شریف کی پہلی رات سے اخیر رات تک کے لیے آسمان کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور اس مہینے میں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

(خوب دعائیں مانگیں، کیا معلوم اگلا رمضان نصیب میں ہوگا بھی یا نہیں)

فائدہ: اس ماہ کو اللہ پاک نے اپنی عبادت کے لیے خاص فرمایا ہے جس کے لیے خصوصی انتظام بھی فرمایا ہے کہ بڑے، بڑے شیاطین جو عبادت سے روکتے یا اس میں خلل ڈالتے ہیں، انہیں اس ماہ میں بند کردیا جاتا ہے تاکہ وہ مسلمان کی عبادتوں کو خراب نہ کریں یا ان کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ اور حضور اکرم ﷺ کی سنت بھی اس ماہ میں عبادت کے خاص اہتمام کی ہے اس لیے اس ماہ میں ذکر وتلاوت اور دیگر عبادات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ اور دل وجان سے دعائیں کرنی چاہئیں کیونکہ ان کی قبولیت کا خاص وعدہ ہے۔

شب وروز لاکھوں کی تعداد میں مغفرت

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جب رمضان شریف کے مہینے کی پہلی شب ہوتی ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں (اور پورے مہینے یہ دروازے کھلے رہتے ہیں) ان میں سے کوئی ایک دروازہ بھی پورے مہینے بند نہیں ہوتا اور دوزخ کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں (اور تمام مہینے دروازے بند رہتے ہیں) اس دوران کوئی ایک دروازہ بھی نہیں کھلتا اور سرکش جنات قید کردیے جاتے ہیں۔

اور رمضان شریف کی ہر رات میں ایک آواز لگانے والا تمام رات صبح صادق تک یہ آواز لگاتا رہتا ہے کہ اے بھلائی اور نیکی کے تلاش کرنے والے (نیکی کا ارادہ کر اور) خوش ہوجا اور اے بدی کا قصد کرنے والے (بدی سے) رک جا اور اپنے حالات پر غور کر اور ان کا جائزہ لے۔ اور یہ بھی آواز لگاتا ہے۔

☆ ہے کوئی گناہ کی معافی چاہنے والا کہ اس کے گناہ معاف کردیے جائیں؟

☆ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ اس کی توبہ قبول کرلی جائے؟

☆ ہے کوئی دعا مانگنے والا ہے کہ اس کی دعا قبول کی جائے؟

☆ ہے کوئی ہم سے کسی چیز کے متعلق سوال کرنے والا؟ کہ اس کا سوال پورا کردیا جائے۔ یہ ندا پندرھویں شب ماہِ شعبان میں بھی بلند ہوتی ہے۔ لہٰذا ان مبارک ساعتوں کو ضائع کرنا بدقسمتی ہے۔

حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کہ اللہ جل شانہ رمضان المبارک کی ہر شب میں چھ لاکھ آدمیوں کو دوزخ سے بری فرماتا ہے اور جب رمضان المبارک کی آخری شب ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ (اتنی ہی تعداد میں آدمیوں کو دوزخ سے) بری فرماتا ہے۔

(الترغیب والترہیب)

حضرت ابنِ عباسؓ سے رمضان المبارک کی فضیلت کے متعلق ایک بہت طویل اور جامع روایت منقول ہے اس میں یہ بھی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔ حق تعالیٰ شانہ رمضان شریف میں روزانہ افطار کے وقت ایسے دس لاکھ آدمیوں کو جہنم سے بری فرماتا ہے جو جہنم کے مستحق ہوچکے تھے اور جب رمضان کا آخری دن ہوتا ہے تو یکم رمضان سے آج تک جس قدر لوگ جہنم سے آزاد کیے گئے ہیں ان کے برابر ایک دن میں آزاد فرماتا ہے۔

(الترغیب والترہیب)

فائدہ: پہلی حدیث کی رو سے ہر شب میں ساٹھ ہزار کی بخشش ہوتی ہے اور دوسری حدیث میں ہر شب میں چھ لاکھ آدمی دوزخ سے آزاد کیے جاتے ہیں، تیسری حدیث سے واضح ہے کہ روزانہ افطار کے وقت جہنم کے مستحق دس لاکھ آدمی جہنم سے رہا ہوتے ہیں جو حق تعالیٰ جل شانہ کا محض کرم ہے

اور مزید کرم یہ ہے کہ ان کی طرف سے ہر رات یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی ہے جو توبہ کرنا چاہے تو اس کی توبہ قبول کرلی جائے؟ کوئی ہے جو دعا کرنا چاہے تو اس کی دعا قبول کرلی جائے؟ اس لیے توبہ استغفار اور دعا کا مسلسل اہتمام رکھنا چاہیے۔

رمضان شریف میں امت پر پانچ خصوصی انعام

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ”رمضان شریف کے متعلق میری امت کو خاص طور پر پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو پہلی امتوں کو نہیں ملیں۔“

1۔ روزہ دار کے منہ کی بو (جو بھوک کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے) اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

2۔ روزہ دار کے لیے دریا کی مچھلیاں تک دعائے مغفرت کرتی ہیں اور افطار کے وقت تک کرتی رہتی ہیں۔

3۔ جنت ہر روز، روزہ داروں کے لیے سجائی جاتی ہے پھر حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہوتا ہے کہ قریب ہے کہ میرے بندے دنیا کی مشقتیں اپنے اوپر سے پھینک کر تیری طرف آئیں۔

4۔ اس ماہ مبارک میں سرکش شیاطین قید کردیے جاتے ہیں اور وہ رمضان میں ان برائیوں کی طرف نہیں پہنچ سکتے جن کی طرف غیر رمضان میں پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی رمضان میں شیاطین قید ہونے کی بنا پر روزہ داروں کو گناہوں پر نہیں ابھار سکتے لیکن انسان کا نفس گناہ کرانے میں شیاطین سے کم نہیں ہے اور گناہوں کا چسکا بھی گناہوں کی پٹری پر چلاتا رہتا ہے۔ لیکن پروردگار کی مدد سے پُرخلوص عبادت کے ذریعے یہ چسکا ملیامیٹ بھی ہوجاتا ہے۔

☆☆☆



شوابے ہومیو کلینک





اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تا کہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تا کہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

وزن بڑھانا ہے

حمزہ علی......کوٹ ادّو

میرا پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں بہت دبلا پتلا ہوں۔ اپنے قد اور عمر کے لحاظ سے میرا وزن بہت کم ہے۔ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز فرمائیں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری آواز بہت باریک ہے بالکل لڑکیوں جیسی اگر اس کا کوئی علاج ہو تو پلیز ضرور بتادیں۔

جواب: حمزہ کیا کرتے ہو نہیں لکھا، کوئی بیماری تو نہیں ہوئی جس کے بعد وزن گرا اور پھر بڑھا نہیں۔ کھانا پینا کیسا ہے؟ ورزش کرتے ہو کہ نہیں؟ تم غذا متوازن لو جس میں تمام پھل اور ان کے شیکس، سبزیاں، گوشت گائے اور بکرے کا، انڈے، دودھ، مکھن پنیر لسی روٹی شامل ہوں۔ چائے، کافی، کولا اور بازاری شربت سے بچو۔ صبح سویرے ورزش کرو۔ دوا بیماری کی علامات کے مطابق استعمال کی جائے تو فائدہ تب ہی ہوگا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Ferrum Pentarkan Ptk-45 کی 2-2 گولیاں صبح و شام سادہ پانی کے ساتھ لیں۔ Alfalfa-Ø کے 15 قطرے آدھے گلاس پانی

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

اگست 2015

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ______________

پتا: ______________

____

میں ہر کھانے کے ایک گھنٹے بعد لیں۔ 3 ماہ بعد اپنا حال بتائیں۔

بچوں کے عمومی مسائل

(بستر پر پیشاب، بھوک، ٹانسلز)

مسز شفاعت.........مانسہرہ

ڈاکٹر صاحب! میرے بیٹے کی عمر گیارہ سال ہے۔اس کی ناک رات کو بند ہوتی ہے، بلغم گلے میں گرتا ہے، بستر پر رات کو پیشاب کر دیتا ہے، بھوک نہیں لگتی، ٹانسلز بھی ہیں، ایک طرف کا غدود کافی بڑھا ہوا ہے۔ برائے مہربانی کوئی نسخہ تجویز کریں۔کافی علاج کروایا ہے افاقہ نہیں ہوا۔مہربانی فرما کر جواب دے دیں۔

جواب: بچے کو ٹھنڈی چیزوں (فریج کی رکھی ہوئی آئس کریم، کولڈ ڈرنکس، فروٹ، شربت، جوس اور ٹھنڈا پانی) سے اور کھٹی چیزوں سے مکمل پرہیز کرائیں۔کوئی بھی چیز کھا کر خاص طور پر جس میں چاٹ مصالحہ یا کھٹاس ہو اس پر پانی پینے کی عادت کو ختم کریں۔رات کو سونے سے 2 گھنٹے پہلے بچے کو پانی، دودھ بالکل نہ دیں۔ سونے سے پہلے پیشاب کرائیں۔ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Cinnabaris Pentarkan Ptk-31 ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ چوسنے کو دیں۔ Baryta carb-30, Rhustox-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔2 ماہ بعد بچے کی مکمل کیفیت کے ساتھ آگاہ کریں۔ Urine D/R کرا کر اس کی رپورٹ ضرور بھیجیں۔

وزن کی زیادتی

چاند گیلانی.........مانسہرہ

میں پاکیزہ کا مستقل قاری ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ یورک ایسڈ کی زیادتی ہو جاتی ہے۔ جوڑوں اور پٹھوں میں درد رہتا ہے۔ کمزوری بہت ہوگئی ہے۔ بلڈ



پریشر بھی کبھی تھوڑا زیادہ ہو جاتا ہے۔سال بھر سے جسم پر خشک خارش ہے۔ جسم پر خشکی بہت زیادہ ہے۔ بہت دوائیاں، کریمیں اور لوشن استعمال کیے پہلے سے آرام ہے لیکن رات کو خارش زیادہ ہو جاتی ہے۔ زیادہ وزن کی وجہ سے پریشان ہوں۔گیس کی تکلیف بھی ہے۔ گیس سے کبھی کبھی سینے میں دائیں طرف درد بھی ہو جاتا ہے۔ برائے کرم آپ جوڑوں اور پٹھوں کے درد، خشک خارش، گیس اور طاقت کے لیے اور وزن کم کرنے کے لیے کوئی اچھی سی شوابے کی دوا تجویز کریں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ یہ بتائیں کہ مانسہرہ ایبٹ آباد میں آپ کی تجویز کردہ دوائیں کہاں سے ملیں گی۔

جواب: محترم لگتا ہے کہ آپ پر کام کا بہت لوڈ ہے اور کھانا عموماً آپ باہر سے کھاتے ہیں۔ جب وزن زیادہ ہوگا تو بلڈ پریشر، جلد کے امراض، کولسٹرول، یورک ایسڈ بڑھ سکتے ہیں۔ آپ پیدل بھی نہیں چلتے۔ ذیل میں بیان کردہ Healthy Habits اپنائیں۔ وزن میں کمی، گیس، کولسٹرول، بلڈ پریشر، یورک ایسڈ میں انشاء اللہ نمایاں کمی ہوگی۔

1- صبح بعد نماز فجر ایک گھنٹا چہل قدمی کریں۔ ابتدا پانچ منٹ سے کریں۔

2- صبح نہار منہ پانی پئیں اور یاد رکھیں کہ موسم گرم ہے لہٰذا پانی کی مقدار کم از کم 10 گلاس ضرور ہونی چاہیے۔ لیکن کھانے کے ساتھ اور کھانے کے فوراً بعد نہیں پئیں گے۔

3- کھانا آہستہ آہستہ چبا کر کھائیں۔ تلی ہوئی، بھنی ہوئی، اور زیادہ مرچ مصالحوں والی اشیا سے پرہیز کریں۔

4- چائے کا استعمال 3-2 کپ اور کافی ایک کپ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

5- کولڈ ڈرنکس اور تمام بازاری مشروبات ہرگز



ہرگز استعمال نہ کریں۔ ہاں ستو مفید ہے۔ تمباکو کا استعمال اگر کرتے ہیں تو بند کردیں۔

ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیں۔

Berberis Pentarkan Ptk-15

Bismutum Pentarkan Ptk-16

Graphites Pentarkan Ptk-50، کی 2-2 گولیاں دن میں 3 مرتبہ تھوڑے پانی سے لیں یا چوس لیں۔

Rhustoxicodendron Pentarkan Ptk -73، Urtica Pentarkan Ptk -86، Viscum Pentarkan Ptk -80

کے 7 قطرے آدھے گلاس پانی میں 3 مرتبہ لیں۔

کمر کے مہرے میں درد ایک الارم

والدہ مسعود............راولپنڈی

اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں اضافہ کرے۔ میں کمر کے درد کی مریض ہوں۔ مہروں کو مسئلہ ہے۔ شروع شروع میں کمر میں درد ہونے پر درد کا ٹیکا لگوا لیتی تھی جس سے وقتی آرام آجاتا ہے۔ علاج کرتے کرتے درد بڑھ گیا ہے۔ ایم آر آئی کروانے پر معلوم ہوا کہ مہرے بہت کمزور ہیں۔ آپریشن بھی کروایا۔ ایلو پیتھک دوائیاں کھا کھا کر تنگ آ گئی ہوں۔ ہومیو پیتھک علاج بھی کروایا۔ فزیوتھراپی بھی دو سال کراوئی، واکر لے کر چلتی ہوں۔ اگر زیادہ بیٹھ جاؤں تو پاؤں کی انگلیوں سے ٹانگوں کے جوڑوں تک کھنچاؤ بڑھ جاتا ہے۔ بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ٹانگوں کی جکڑن بہت ہے۔ اگر آپ کے پاس میری بیماری کی دوائی ہے تو لکھ دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے گا۔ بغیر سہارے کے دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔ اب تو گھٹنوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ پاکیزہ میں آپ کی بہت تعریف پڑھی تو اللہ تعالیٰ کے توکّل پر اپنی بیماری لکھ رہی ہوں اگر آپ جلد دوائی لکھ دیں تو مشکور ہوں گی۔

جواب: درد الارم ہوتا ہے اس بات کا کہ آپ کے جسم میں کوئی خرابی ہے جس کی آپ کو تشخیص کرانی ہے۔ ہم غلط کام کرتے ہیں کہ Pain Killer ادویات یا انجکشن استعمال کر کے وقتی طور پر اس درد کو آرام دے کر اس شتر مرغ کی طرح کی حرکت کرتے ہیں جو خطرہ دیکھ کر اس کا حل نکالنے کے بجائے زمین میں منہ چھپا لیتا ہے۔ جب ہڈیاں گلنے لگتی ہیں تو آپریشن کرانے یا ان کو تبدیل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ فزیوتھراپی بھی اس صورتِ حال میں کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچاتی۔ دیگر طریقہ ہائے علاج میں اس کے لیے کوئی شافی علاج نہیں لہٰذا وقت اور پیسا برباد کر کے بیماری کو آگے نہ بڑھائیں۔ لگ کر ہومیو پیتھک علاج کریں کیونکہ صرف اور صرف اسی سے فائدہ ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Rhustoxicodendron pentarkan Ptk -73 کے 10 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھے گلاس پانی میں ڈال کر پئیں جبکہ Angustura vera-30، Calc. carb-30 کے 10 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

صحت کو اہمیت دیں

عائشہ منیر.........سرائے نورنگ

میں اپنی بیٹی کا مسئلہ بیان کر رہی ہوں۔ دیکھنے میں نہایت کمزور لگتی ہے۔ کچھ کھاتی نہیں ہے۔ مختلف ایلو پیتھک اور ہومیو پیتھک دوائیاں استعمال کی ہیں۔ جب تک دوائی کھاتی ہے اس وقت تک تھوڑی بھوک بڑھ جاتی ہے جونہی دوائی ختم ہوتی ہے اس کی بھوک مر جاتی ہے۔ منہ سے سخت ناگوار بدبو آتی ہے۔ لیکوریا بھی بہت زیادہ ہے۔ مینسز بھی تکلیف سے آتے ہیں۔ ہاتھ

پاؤں میں سخت درد ہوتا ہے۔ کبھی کبھار اتنا درد اٹھتا ہے کہ درد کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ رنگت نہایت زرد ہے۔ سستی چھائی رہتی ہے۔ چڑچڑا پن طاری رہتا ہے۔ اکثر چکر آتے ہیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اکثر دل کی دھڑکن بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے جب کوئی کام کرتی ہے یا چلتی پھرتی ہے۔ روٹی نہیں کھاتی۔ جب ہم زبردستی اپنے ساتھ بٹھاتے ہیں تو صرف منہ میں چبائے جاتی ہے۔ حلق سے بمشکل نگل پاتی ہے۔ پانی کا گھونٹ بھرتی ہے پھر نوالہ حلق سے اندر اتارتی ہے۔ نسوانی حُسن کی بھی شدید کمی ہے۔ اس وجہ سے اس کو احساسِ کمتری ہوتا ہے۔

جواب: آپ جیسے لوگوں کا خط پڑھ کر دل چاہتا ہے کہ جواب نہ دیا جائے بلکہ پھاڑ کر پھینک دیا جائے کیونکہ شادی ہونے سے دو ماہ پہلے آپ خط لکھ رہی ہیں اور جب تک اس خط کا جواب شائع ہوگا ایک ماہ رہ جائے گا۔ ہم جادو سے علاج نہیں کرتے، ادویات سے کرتے ہیں۔ مسئلے مسائل ایک عرصے سے ہیں اور ہوش شادی سے چند ماہ قبل آرہا ہے۔ ہم صحت کو اولین اہمیت کیوں نہیں دیتے۔ بچی کا الٹرا ساؤنڈ ہونا چاہیے تھا۔ CBC، ESR Profile, U/S Whole Abdomen ہونا چاہیے۔ ہارمونز کی کمی بھی لگ رہی ہے۔ بہرحال اس کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات فوراً شروع کروائیں اور لکھے گئے ٹیسٹ کرا کر رپورٹیں بھیجیں۔ Ferrum Pentarkan، Megnesium Phosphoricum Ptk -45، Pentarkan Ptk -60 کی 2-2 گولیاں دن میں 3 مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ نگلنے کو دیں دیں۔

نوجوان بچی کے مسائل

شاہدہ حسین.......لاہور

ڈاکٹر صاحب میری بیٹی کا مسئلہ یہ ہے کہ ہر پندرہ دن بعد پیریڈز ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر کو چیک اپ



کروایا تو انہوں نے کہا کہ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائیں گے۔ اس کی کوئی دوائی نہ دی مگر اس کے بعد لیکوریا کی پرابلم شروع ہوگئی جس سے اس کا جسم کمزور ہوگیا، رنگت بھی خراب ہوگئی ہے۔ پہلے گوری چٹی تھی مگر اب کالی اور پیلی ہوتی جارہی ہے۔ منہ پر دانے وغیرہ بھی نکل آتے ہیں مگر کبھی کبھی، زیادہ نہیں ایک یا دو نکلتے ہیں۔ اسے قبض کی بھی شکایت رہتی ہے۔ قبض کی وجہ سے کمر میں درد ہو جاتا ہے اور ہلا بھی نہیں جاتا (یہ ایک دفعہ نہیں ہوا) ڈاکٹر کو چیک اپ کروایا تو کچھ نہ تھا بس طاقت اور قبض کی دوا دے دی۔ تقریباً ایک ماہ سے اس کے سر کے بال بھی بہت اتر رہے ہیں اور چہرے پر بال خاص طور پر گالوں کے بال بڑھ رہے ہیں۔ مہربانی فرما کر ان مسائل پر خصوصی توجہ دیں اور قد بڑھانے کے لیے بھی دوا تجویز کریں کیونکہ سب گھر والوں کے قد بڑے ہیں اس چیز کا بھی اسے کمپلیکس ہے۔ ان مسائل کی دوائیں تجویز کر دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

جواب: آپ کو چاہیے تھا کہ شروع میں ہی کسی ماہر ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے ملتیں تاکہ اتنے مسائل نہ بڑھتے۔ ہم ڈرتے بھی ہیں اور جاتے بھی پہلے دوسری ہی طرف ہیں۔

بچی کو متوازن غذا کھلائیں جس میں پھل اور سبزیاں زیادہ ہوں۔ باربی کیو، جنک فوڈز سے اجتناب کریں۔ ہلکی پھلکی ورزش، چہل قدمی کا اہتمام کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ کے استعمال کے بعد حال بتائیں۔ Magnasium Phos Pentarkan Ptk-60, Ferrum Pentarkan Ptk No.-45 کی 2-2 گولیاں دن میں 3 مرتبہ چوسنے کے لیے دیں یا تھوڑے سے پانی سے کھلائیں۔ Asterias rubrum-30, Baryta carb-30,

Cantheris-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر یہ بھی دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔

بیمارِ عید

قارئین! آپ نے اب تک جوان عید (جو 29 ویں روزے کے بعد ہوتی ہے) اور بوڑھی عید (جو 30 ویں روزے کے بعد ہوتی ہے) سنا ہوگا۔ آج میں ایک اور قسم بیمار عید کا تذکرہ آپ سے کر رہا ہوں۔ بیمار عید بالکل اسی طرح ہے جس طرح جوان یا بوڑھی عید لیکن یہاں اس کو بتانے کا مقصد آپ کو عید پر کی جانے والی چند غلطیوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کرنا ہے جو ہم عید کی خوشی میں ایک ماہ کی نفس کی ٹریننگ کو یکدم بھلا دیتے ہیں۔

رمضان المبارک کا مہینا جو ہمیں وقت کی اہمیت، نفس پر قابو پانا (کھانا پینا، نفسانی خواہش، غصہ وغیرہ) ایک ماہ تک سکھاتا ہے۔ ویسے تو افطار اور سحر میں ہم میں سے اکثر لوگ کیا کچھ نہیں کھاتے جو عام دنوں میں نہیں کھاتے۔ پورا رمضان بڑے شوق سے روز کھاتے ہیں۔

عید پر حال اور 10 ہاتھ آگے نکل جاتا ہے۔ نتیجتاً بدہضمی، کھٹے ڈکار، الٹی، قے، دست، یرقان، پیچش، کولسٹرول، یورک ایسڈ، شوگر کی زیادتی، بلڈ پریشر کا بڑھنا، کوما، ہارٹ اٹیک کے کیسز اچانک بڑھ جاتے ہیں۔ یوں عید خوشی منانے کے بجائے بیماری میں ہو جاتی ہے۔ خود کو بھی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اور دیگر لواحقین بھی پریشانی میں اس وقت عید کو گزار دیتے ہیں۔

یاد رکھیں سحری و افطار میں کھانے کی زیادتی دن بھر کے فاقے میں کسی حد تک کنٹرول ہو جاتی ہے۔ لہٰذا معاملات دیر میں خراب ہوتے ہیں۔ (ہاں خراب ضرور ہوتے ہیں)۔ عید پر صبح سے کھانوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو وہ رات گئے تک جاری رہتا ہے اس میں مٹھائیاں، کیک، کباب، پراٹھے، شربت، کولڈ ڈرنکس، آئس کریم وغیرہ وغیرہ۔ گھر میں آنے والے مہمانوں کی تواضع خود مہمان بن کر جائیں تو تواضع میں یہی لوازمات ہوتے ہیں۔

لہٰذا ہاضمہ بگڑ جاتا ہے۔ شوگر، کولسٹرول، یورک ایسڈ کی زیادتی ہو جاتی ہے، بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے، ہارٹ اٹیک (حملۂ قلب) ہو جاتا ہے۔

کیا کریں؟

گرمی کے دن ہیں۔ ہاضمہ سست ہو جاتا ہے۔ پانی کی کمی بھی نہیں ہونی چاہیے لہٰذا......

1- پانی ہلکا ٹھنڈا اور تازہ پئیں، پھلوں کے جوس یا شیکس ایک حد تک استعمال کریں۔

2- فروٹ کا استعمال مفید ہے، جلد ہضم ہوں گے لیکن یاد رکھیں اس کے اوپر پانی اور شربت کا استعمال نہ کریں۔

3- ہلکے کھانوں کا اہتمام کریں۔ مرغن کھانوں سے بچیں۔

4- تیز مرچ مصالحوں سے بھی گریز کریں۔

5- ٹی وی وغیرہ کے سامنے بیٹھنے کے بجائے چہل قدمی کا اہتمام کریں۔ یاد رکھیں کہ چہل قدمی کھانا ہضم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ غذا کو جزو بدن بنانے میں مدد دیتی ہے۔ ہڈیوں اور جسم کو مضبوط بناتی ہے۔ وزن، کولسٹرول، شوگر، بلڈ پریشر، ڈپریشن کو کنٹرول کرتی ہے۔

امید ہے کہ اگر آپ نے میری ان گزارشات کو سمجھ کر عمل کر لیا تو انشاء اللہ عید، عید ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک توفیق اور ہدایت عطا فرمائیں، آمین!